سلسلۂ انتخاب الناظر لکھنؤ (۱۹۰۹ء — ۱۹۳۷ء) — ۲

تذکرے

مرتبہ: رخشاں فضا علی

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

سلسلۂ انتخاب الناظر لکھنؤ (۱۹۰۹ء — ۱۹۳۷ء) — ۳

تذکرے

نامِ نیک رفتگاں ضائع مکن

خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

سن اشاعت : ۲۰۰۱ء

قیمت : ایک سو بیس روپے (۱۲۰)

غیر ممالک کے لیے : چھ ڈالر (۶)

پرنٹر پبلشر: خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

حرف آغاز

ماہنامہ الناظر مطلع صحافت پر نمودار ہونے والا انتہائی روشن اور درخشندہ ستارہ تھا۔ یہ جولائی ۱۹۰۹ء کو طلوع ہوا اور ۱۹۳۷ء تک افق صحافت اور اس کے وسیلہ سے علمی و ادبی فضا کو منور کرتا رہا۔ اس دوران اسے کئی بار گہن بھی لگا۔

الناظر اودھ کے دارالخلافہ لکھنؤ سے نکلتا تھا۔ لکھنؤ اس زمانے میں شعر و ادب کا ایک بڑا مرکز تھا۔ اس کے علاوہ یہ اپنی حسن معاشرت اور مخصوص تہذیب و تمدن کے لیے بھی چاردانگ عالم میں مشہور تھا۔ الناظر کے مالک و ایڈیٹر ظفر الملک علوی (اصلی نام: اسحاق علی کاکوروی-۱۸۷۱ء تا ۱۹۴۶ء) اسی تاریخی صوبۂ اودھ کے علمی خانوادہ کے چشم و چراغ تھے۔ اور یہیں کے مخصوص علمی و ادبی ذوق نیز طرز معاشرت کی نمائندگی کرتے تھے۔ عملی سیاست میں بھی حصہ لیتے تھے۔ قومی تحریک سے وابستہ رہے۔ حکومت کے خلاف تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے؛ پُرجوش تقریریں کرتے۔ اس لیے اس کی آنکھ میں کانٹا بن کر چبھتے اور اس کے ظلم و تشدد کا شکار بنتے رہے جس سے خود ان کو اور ان کے عزیز از جان رسالے ''الناظر'' کو نقصان پہنچتا۔ لیکن یہ دھن کے ایسے پکے تھے کہ بڑے سے بڑے نقصان کی بھی پرواہ نہ کرتے تھے۔ جس کام کا آغاز کرتے بڑے جوش و خروش اور اولوالعزمی سے کرتے۔ چنانچہ ''الناظر'' جاری کیا تو وہ بھی اس عزم کے ساتھ کہ اردو ادب میں انقلاب برپا کر دیں گے۔

''الناظر'' کے مشمولات کا کینوس بہت وسیع تھا۔ ان میں غزلیات و منظومات اور انشائیوں کے علاوہ تنقید و تحقیق، سوانح، سماجیات، معاشیات، فلسفہ، اسلامیات، مذہبیات، تعلیم نسواں، اخلاقیات، جیسے اہم موضوعات پر بھی معیاری مضامین شائع ہوتے۔

''الناظر'' اب قصۂ پارینہ بن چکا ہے۔ اس کے شمارے اب عام طور پر دستیاب

نہیں ہیں۔ لیکن اس کی معنویت آج بھی مسلم ہے۔ اس کو زندہ و پائندہ رکھنے کی ضرورت ہے۔ اسی کے پیش نظر خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری نے طے کیا کہ اس کے مضامین کا انتخاب شایع کر کے اسے نئی زندگی عطا کی جائے۔ اور چوں کہ ان کی تعداد بہت زیادہ ہے اس لیے یہ مناسب تصور کیا گیا کہ ان کو موضوع کے اعتبار سے آٹھ جلدوں میں ترتیب دے کر قارئین کی خدمت میں پیش کیا جائے۔ وہ عنوانات جن کے تحت یہ مضامین ترتیب دیے جائیں گے، اس طرح ہیں:

١۔ اردو شعراء ٢۔ مقالات تاریخ ہند ٣۔ تذکرے

٤۔ اردو شعر و ادب ٥۔ ہندوستانی مسلمان ٦۔ اسلامیات

٧۔ تعلیمات ٨۔ تعلیمی ادارے

ان میں سے اردو شعرا اور تاریخ ہند سے متعلق مضامین کی دو جلدیں شایع ہو چکی ہیں جنھیں علمی و ادبی حلقوں میں کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اب ''تذکروں'' سے متعلق مضامین شایع کیے جا رہے ہیں۔ امید ہے انھیں بھی سابقہ جلدوں کی طرح قبول عام نصیب ہوگا۔

محمد ضیاء الدین انصاری

فہرست

تذکرے

صحابہ/صحابیہ:

اولیاء:

فلاسفہ

مورخین

مشاہیر

ادباء اردو

ادباء فارسی

شعراء فارسی

تنقید الفاروقؓ

مولانا شبلی مرحوم کی تاریخی تالیفات میں الفاروق کو ایک خاص درجۂ قبول حاصل ہوا۔ حضرت خلیفۂ ثانی عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جامع کمالات شخصیت کے ساتھ مسلمانوں کو جو عقیدت و ارادت ہے اُسکے بیان کی حاجت نہیں۔ لیکن ناانصافی ہوگی اگر الفاروق کی مقبولیت کے اسباب میں خود مؤلف کے اسلوبِ بیان اور اندازِ ترتیب کو نمایاں جگہ نہ دی جائے۔ لیکن یہ بات کچھ کم قابلِ افسوس نہیں کہ جہاں ادبی حیثیت سے الفاروق کو یہ منزلت نصیب ہوئی۔ وہاں اربابِ نظر کی نگاہوں میں اُسے ایک مستند تاریخ کا درجہ میسر نہیں ہُوا۔ کیونکہ اکثر صاحبانِ علم کی رائے میں واقعات و حالات کے بیان میں جو درجۂ حزم و احتیاط تاریخ کی کسی مستند کتاب کا طرۂ امتیاز ہونا چاہیے الفاروق اُس سے محروم ہے۔ یہ ضرور ہے کہ عام طور پر اُن اصحاب نے جو عہدِ فاروقی کے واقعات و حالات کی جانچ پڑتال کے اہل تھے اس کتاب پر تنقید و تبصرہ کی زحمت گوارا نہیں فرمائی۔ اور انھیں میں ایسے لوگ بھی تھے جو الفاروق کے اوپر عدمِ اعتماد کا اظہار اپنے گھروں یا احباب کی محفلوں میں تو کرتے تھے لیکن بحث و مناظرہ سے اپنا دامن بچانے کے خیال سے یا مولانا شبلی کی شہرت و مقبولیت کے سبب سے قلم اُٹھانے کی جرأت نہ کر سکے۔

سرسیدؒ اور اُن کے اتباع میں مولانا شبلی کا سارا زور اسپر صرف ہوتا رہا ہے کہ علمبردارانِ عقلیت کی طرف سے اسلام کے خلاف جو دلائل پیش کیے جائیں اُن کا جواب دیا جائے لیکن جواب دینے کا مقصد یہ نہیں ہوتا تھا کہ

اُن کے براہین کا رد کیا جائے یا جو معیارِ عقلی اُنھوں نے بزعم خود قائم کیا ہے اُسکی حقیقت کا پردہ فاش کیا جائے بلکہ اسکے برخلاف ان اربابِ عقل کو رہبر طریق قرار دے کر اور اُنکے مفروضات کو اصول موضوعہ تسلیم کرکے اسلامی تعلیمات، دینی مسائل اور تاریخی واقعات کو اُن رایوں سے مطابقت دینے کی انتہائی کوشش ہوتی رہی۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ انکی ایسی تمام تحریروں نے اگر ایک طرف حاملان شریعت اور علمائے مذہب کو برافروختہ اور کبیدہ خاطر کیا تو دوسری طرف خود اسلام کی قوت کو ناقابل تلافی نقصان پہونچایا ہے۔

مولانا شبلی نے امرتسر کے جلسۂ ندوۃ العلما میں جو فارسی ترجیع بند پڑھا تھا اُس میں جدید تعلیم یافتہ گروہ کو اس طرح مخاطب کیا ہے:۔

اے کہ بر مائدۂ یورپ مہماں باشی — حیف باشد اگر از جملۂ ایشاں باشی
حیف اگر از اثرِ فلسفۂ مغربیاں — منکرِ فلسفۂ سنت و قرآں باشی
مسحر از شعبدۂ جادوۂ دہ سحر بینی — منکرِ معجزۂ موسیِ عمراں باشی
گفتۂ سولن و آئینِ جہانبانیِ او — برزباں داری و بیگانہ ز لقماں باشی
از ہنیبال صد افسانہ و دستاں گوئی — جاہل از معرکہ ہائے شہِ مرداں باشی
قیصراں را ہمہ یک یک بشماری ز آغاز — بے خبر از عمر و حیدر و عثماں باشی

لیکن ہمیں تو خود مولانا کا دامن بھی اس معصیت سے سرتاسر آلودہ نظر آتا ہے۔ گو اُنھوں نے اپنے چہرہ پر ایک اپنا نقاب ڈال رکھا ہے جس کی وجہ سے لوگ عموماً دھوکا کھا جاتے ہیں۔ ہاں اتنا فرق ضرور ہے کہ جدید تعلیم یافتہ اصحاب اگر قرآن و حدیث سے ناواقف ہونے کی بنا پر عقلائے یورپ کے ناموں پر ایمان لے آئے ہیں تو ہمارے مولانا پرستاران عقلیت کی رایوں کے مطابق اسلام کی تاریخ گذشتہ اور قرآنی تعلیم کو ایسے سانچے میں ڈھال دیتے ہیں کہ خواہ مذہب کا منشا پورا نہ ہو لیکن متبعین یورپ کی تشفی ہو جائے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ذاتِ قدسی تمام دنیائے اسلام کے لیے موجب صد مایہ و ناز ہے اور انشاءاللہ رہے گی۔ لیکن اگر اُنکے کسی قول یا فعل کو عقلائے یورپ اور تہذیب مغربی کی بارگاہ سے سندِ قبول نہیں حاصل ہو سکتی تو خود حضور موصوف کے کمالات میں اس سے کوئی کمی نہیں ہو سکتی۔ اور نہ مسلمانوں کو یہ شایاں ہو سکتا ہے کہ وہ ان روزانہ تبدیل ہونے والے نظریات کی بنا پر اپنی عقیدت و ارادت میں ترمیم کریں۔ اور اگر لامذہبی یا مذہب حقہ

سے عدم واقفیت کی بنا پر کچھ ایسے بدبخت ہیں کہ حق و باطل میں تمیز نہیں کر سکتے۔ تو اربابِ علم و دانش کو یہ زیبا ہیں کہ اُن کو قابو میں رکھنے کی غرض سے غلط اور خود ساختہ تاویلات پیش کر کے مذہب و تاریخ کی قلب ماہیت کر دیں۔

سطور بالا کی تصدیق کے لیے ناظرینِ کرام کے ملاحظہ میں ایک طولانی شہادت پیش کرتا ہے جو ہمارے مکرم و محترم جناب مولانا حافظ محمد جان صاحب غازی پوری کی مساعیِ جمیلہ سے فراہم ہوئی ہے۔ صاحب موصوف ایک عالم باعمل ہونے کے علاوہ ادب و تاریخ کا ذوق بھی بدرجۂ اتم رکھتے ہیں۔ چنانچہ عرصہ ہوا جب اُنھوں نے **نقد الفاروق** کے نام سے ایک بسیط تنقید **الفاروق** پر لکھی تھی۔ یہ رسالہ جس کا حجم موجودہ حالت میں بھی الناظر کے تین پرچوں کے برابر ہے پہلے دفتر وکیل کو بھیجا گیا۔ مگر نامعلوم اسباب کی بنا پر نہ تو اُسکی اشاعت ہی گوارا کی گئی اور نہ مسودہ ہی واپس ملتا تھا۔ بالآخر مدت کے بعد مولانا کے ایک مخلص خاص اسی غرض سے امرت سر گئے اور مسودہ واپس لے آئے۔ اسکے کچھ ہی دنوں بعد مولوی رشید احمد صاحب انصاری جو علی گڈھ میں بزمرۂ مدرسین ملازم ہیں مولانا کو ملے اور اس رسالہ کا ذکر آیا تو وہ مطالعہ کی غرض سے مسودہ کو علی گڈھ لے گئے اور کچھ عرصہ تک اُنکے پاس رہا۔ اس دوران میں کسی جگہ اُس کی کتابت بھی کرائی گئی جس کے نشانات مسودہ پر موجود ہیں۔ مگر غالب ہے کہ اُسکے طبع ہونے کی نوبت نہیں آئی۔ البتہ شروع کے چار ورق اور آخر کے کچھ اجزا اس عارضی بیدخلی کے زمانہ میں غائب ہو گئے۔

حال ہی میں خاکسار کو یہ مسودہ عنایت ہوا ہے۔ اور اگرچہ موجودہ حالت میں اس قابل نہیں کہ بصورت کتاب شائع کیا جا سکے اور مرضِ چشم کی وجہ سے خود مولانائے کرم ابھی غالباً عرصہ تک اُسکے تلف شدہ اوراق کی تکمیل نہ فرما سکیں گے تاہم الناظر کے ذریعہ سے اُسکے چیدہ چیدہ اجزا اربابِ بصیرت کے ملاحظہ کے لیے پیش ہوتے رہیں گے تاکہ **الفاروق** کی تاریخی منزلت کے متعلق اُن کو صحیح رائے قائم کرنے کا موقع ملے۔

مولانا شبلی مرحوم زندہ ہوتے تو خود اُن سے یہ درخواست کی جاتی کہ راقمِ تنقید نے جو اغلاط و اسقام دکھائے ہیں اُن کو پیش نظر رکھ کر الفاروق میں حسب موقع اصلاح کر لیں اور اب بھی اُن کے جانشینوں سے غالباً یہ توقع بے محل نہ ہوگی کہ وہ اس استدعا پر توجہ فرمائیں۔

اگر جانشینانِ شبلی کو اس میں کچھ عذر ہو یا وہ ان اعتراضات کی صحت و واقعیت پر یقین کرنے میں متامل ہوں تو اُنھیں اس تنقید کی تردید کا پورا موقع حاصل ہے۔ الناظر میں اُن کے جوابات نہایت خوشی سے درج کیے جائیں گے۔ کیونکہ ہمارا مقصود اظہارِ حق اور تحقیقِ واقعات ہے نہ کہ تخریب و تضحیک۔

ہمیں اور ہم یقین رکھتے ہیں کہ دنیا بھر کے مسلمانوں کو اس سے زیادہ کسی بات سے مسرت نہیں ہو سکتی کہ حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے آثار و سیر سے مسلمانوں اور نہ صرف مسلمانوں بلکہ دنیا کی تمام قوموں کو پوری واقفیت حاصل کرنے کے مواقع فراہم کیے جائیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ہم یہ بھی ضرور چاہتے ہیں کہ جس طرح ہمارے ہادیٔ برحق اور اُن کے اصحاب کرام کی مقدس و پاکیزہ زندگیاں حق و صداقت، راستی و دیانت کے لیے مایۂ افتخار تھیں اُسی طرح جن کتابوں میں ان کے برگزیدہ حالات درج ہوں اُن کا دامن بھی ہر طرح کی آلودگیوں سے پاک و صاف ہو۔

ان معروضات کے بعد **نقد الفاروق** کا ایک طولانی اقتباس ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے۔ وہو ہذا

الفاروق صفحہ ۱۶۰ - اخیر میں ہم کو اُن واقعات کی حقیقت بھی بتانا ضرور ہے جن کی وجہ سے لوگوں کو یہ غلط خیال پیدا ہوا ہے یا ہو سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے بلکہ خود اسلام نے ذمیوں کے ساتھ ناانصافانہ سلوک کیے۔ اس مسئلہ کو مخالف اس طرح بیان کر سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ذمیوں کے حق میں یہ حکم دیا کہ وضع اور لباس وغیرہ میں کسی طرح مسلمانوں کا تشبہ نہ کرنے پائیں۔ کمر میں زنار باندھیں، لمبی ٹوپیاں پہنیں، گھوڑوں پر کاٹھی کسیں، نئی عبادت گاہیں نہ بنائیں، شراب اور سور نہ بیچیں، ناقوس نہ بجائیں، صلیب نہ نکالیں، بنو تغلب کو یہ بھی حکم تھا کہ اپنی اولاد کو اصطباغ نہ دینے پائیں، ان سب باتوں پر مستزاد یہ کہ حضرت عمرؓ نے عرب کی وسیع آبادی میں ایک یہودی یا عیسائی کو نہ رہنے دیا اور بڑے بڑے قدیم خاندان جو سیکڑوں برس سے عرب میں آباد تھے جلاوطن کر دیے۔ بے شبہ یہ اعتراضات نہایت توجہ کے قابل ہیں اور ہم ان کے جواب دینے میں کسی قدر تفصیل سے کام لیں گے، کیونکہ ایک زمانۂ ممتد کے تعصب اور تقلید نے واقعیت کے چہرے پر بہت سے پردے ڈال دیے ہیں۔“

نقد الفاروق۔ الفاروق کے تمام مقامات میں جو مقام معرکے کا سمجھا جاتا ہے اور جو خصوصیت کے ساتھ زیادہ مہتم بالشان خیال کیا گیا ہے وہ صرف یہی ایک مقام ہے۔

اگرچہ مصنف نے اپنے زعم میں کتاب کے ہر ایک بحث کو ایسی ہی تحقیقات کے ساتھ لکھا ہے کہ اُس سے بڑھ کر گویا اب ناممکن ہے۔ لیکن تاہم اُس نے ایک امتیازی حیثیت دکھانے کے لیے اس مقام پر اپنی تحقیقات کا بہت بڑا حصہ صرف کر دیا ہے۔ اُس کا خیال ہے کہ ذمیوں کے احکام کے

متعلق اسلامی دنیا میں ایک عام غلطی پھیلی ہوئی ہے اور صدہا برس بیشتر کے علما جن باتوں کو مذہبی احکام سمجھتے تھے وہ درحقیقت مذہبی احکام نہیں ہیں، اس لیے پوری کوشش کے ساتھ اُس نے چاہا ہے کہ آج اپنی تحقیقات کی صاف اور تیز روشنی ڈال کر ناواقفیت اور جہالت کی اُس تاریکی کو بالکل دور کر دے جس میں اُسکے نزدیک مدتِ دراز سے تمام اسلامی دنیا گرفتار چلی آتی ہے۔

اس خصوص میں مصنف کو جو کد وکاوش ہے اُس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اُس نے اپنی متفرق تصانیف میں محض ضمنی ہی تحریروں پر اکتفا نہ کرکے ایک خاص رسالہ "حقوق الذمیین" کے نام سے بھی لکھا ہے جو ایک مدتِ دراز سے اُسکے تاریخی مضامین کے سلسلہ میں شایع و متداول ہے۔

اس رسالہ میں بھی مصنف نے جہاں تک ہو سکا ہے بڑے طمطراق سے فقہاے کرام کے اقوال کو غلط اور نامعتبر ثابت کرنے میں اپنی انتہائی کوششیں صرف کر دی ہیں، بلکہ "حقوق الذمیین" میں تو نہایت پیچ وتاب کھا کر صاف یہ الفاظ لکھ دیے ہیں کہ "ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ یہ احکام خدا کے، رسول کے، صحابہ کے ائمہ مجتہدین کے، نہیں ہیں" - ان امور پر نظر کرتے ہوے غالباً یہ امر کچھ بیجا نہ ہوگا کہ اس بحث کے ہر پہلو پر بڑی احتیاط کے ساتھ ایک غائر نظر ڈالی جائے، اور نہایت نکتہ سنجی سے دیکھا جائے کہ اُسکی غیر معمولی کوششیں اُسکے پُرجوش اظہار کے موافق اس بارے میں کہاں تک سرسبز ہیں، اور اسکے خارج از حوصلہ دعاوی آیا فی الواقع جیسا وہ کہتا ہے صحیح و درو براہ ہیں، یا اُس نے محض اپنی زباں فروشی سے مختلف مواقع پر خلافِ تحقیق ایک ایسی بات کو غلط اور بے اصل ثابت کرنے کی عبث کوشش کی ہے، جسے انصاف کسی طرح غلط اور بے اصل نہیں سمجھ سکتا،

میں اپنی اس تنقید میں صرف اُنھیں اقوال کی بحث پر انحصار نہ کروں گا جو کہ خاص الفاروق میں ہیں، بلکہ جہاں تک بحث کا تعلق ہے، حقوق الذمیین، سیرۃ النعمان وغیرہ کے بھی چیدہ چیدہ مقامات زیر بحث لاؤں گا، اور اس لیے کلام کی طوالت ایک امر ناگزیر ہے، جس کی نسبت مجھے امید ہے کہ ناظرین معاف فرمائیں گے۔

لائق مصنف نے اپنی کتاب الفاروق کے خاص اس مقام پر کُل دس باتیں ایسی لکھی ہیں جن کی نسبت اُس کا خیال ہے کہ اُنکی واقفیت کے چہرے پر آج سے نہیں بلکہ مدتِ دراز سے

تعصب و تقلید کے پردے پڑے چلے آئے ہیں،

ان باتوں کی تفصیل اگرچہ اوپر گذر چکی ہے، لیکن سلسلۂ کلام کے قائم کرنے کے لیے ہم پھر آغازِ بحث میں ایک دفعہ اور اُنکا اعادہ کرنا مناسب سمجھتے ہیں، وہ باتیں یہ ہیں،

(۱) وضع و لباس وغیرہ میں ذمیوں کا مسلمانوں کے ساتھ تشبہ نہ کرنا۔

(۲) اُنکا لمبی ٹوپیاں پہننا، (۳) گھوڑوں پر کاٹھی کسنا،

(۴) نئی عبادت گاہیں نہ بنانا، (۵) شراب اور سور نہ بیچنا،

(۶) ناقوس نہ بجانا، (۷) صلیب نہ نکالنا،

(۸) اصطباغ نہ دینا، (۹) زنار باندھنا،

(۱۰) جلا وطنی

اب اسکے بعد ہم ان باتوں میں سے ہر ایک کا تاریخی ثبوت دیتے ہیں اور مصنف کے خلاف ثابت کرتے ہیں کہ یہ احکام فقہا کے ذہنی تعصب کے نتائج نہیں ہیں، بلکہ درحقیقت یہ وہ ارشادات ہیں جنھیں وقتاً فوقتاً خود صحابہ اور ائمہ مجتہدین نے اپنی زبان مبارک سے افادہ فرمائے ہیں، اور جو مستند اور قابلِ وثوق طریقوں سے ہم تک پہونچے ہیں۔

یہ امر لحاظ کے قابل ہے کہ اس مقام پر مصنف نے باوجود اس آتش بیانی اور درازگوئی کے جسے اس نے اپنی مطول جوابی تقریر میں، جو آیندہ کئی صفحوں میں آئے گی، دکھائی ہے، سرے سے تین باتوں کے جواب کو بالکل قلم انداز کر دیا ہے یعنی گھوڑوں پر کاٹھی کسنا، نئی عبادت گاہیں نہ بنانا، شراب اور سور نہ بیچنا؛ البتہ سور کی نسبت خارج از بحث اتنا ضرور لکھا ہے کہ مسلمانوں کے احاطے میں اُسکے لے جانے کی ممانعت تھی۔ لیکن یہ کسی طرح سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سے سور کے بیچنے کی ممانعت کا اعتراض کیونکر اُٹھ گیا،

لمبی ٹوپیاں پہننا چونکہ وضع و لباس سے متعلق تھا اس لیے مصنف نے جواب میں اُسکو ایک ہی امر قرار دیا ہے، اور اس طرح سے اب دس باتوں میں سے کُل چھ ہی باتیں رہ گئیں جن کے جواب اور جواب الجواب کی تقریر حسب ذیل ہے،

وضع و لباس اس بحث کے متعلق ہم بایں وجہ مصنف کے نہایت ممنون ہیں کہ اُس نے اس قدر

خود تسلیم کر لیا ہے کہ حضرت عمر ذمیوں کو مسلمانوں کی مشابہت سے منع کرتے تھے، لیکن اُسکا یہ خیال البتہ ہمارے نزدیک کسی طرح قابل قبول نہیں ہو سکتا کہ یہ ممانعت حضرت عمر کا ایک مذاقِ طبعی تھا جس کے صرف یہ معنی تھے کہ تمام قومیں اپنی اپنی خصوصیتوں پر قائم رہیں، چونکہ اس بحث پر ہم کو بالاستیعاب گفتگو کرنی ہے اور عموماً فقہا کے ساتھ مصنف کو جو بدگمانی ہے اُس کا جواب دینا ہے اس لیے ہم تسہیل بیان کی ضرورت سے مناسب سمجھتے ہیں کہ پہلے چند تنقیحیں قائم کریں، پھر اُنکے جوابات دیں،

میرے نزدیک ان جوابات سے کم از کم اتنا ضرور ہوگا کہ ناظرین حق و ناحق کے متعلق ایک خوش اسلوبی کے ساتھ کوئی آخری فیصلہ کر سکیں گے،

(تنقیح اول) کیا در اصل فقہا یہ کہتے ہیں کہ ذمیوں کو بمقابلہ مسلمانوں کے اُن خاص خاص لباسوں کا اختیار کرنا ضروری ہے جنھیں خود اسلام یا خلفاے اسلام نے اُن کے لیے تجویز کر دیا ہے، اور کیا قرون اول میں ایسا کوئی لباس، کوٹ، پتلون، جیکٹ وغیرہ وغیرہ کی قسم سے تجویز ہوا تھا یا نہیں؟

(دوم) خلفا اور اُن میں سے بھی خاص حضرت عمر نے کیا اہل ذمہ کے لباس یا لباس کے علاوہ وضع وغیرہ دوسری باتوں میں کوئی روک ٹوک یا مزاحمت کی تھی یا یہ کہ اُنکو ایسے تمام امور میں پورے طور پر آزادی حاصل تھی؟

(سوم) مزاحمت اور روک ٹوک ہونے کی صورت میں کیا یہ راز بے پردہ ہو سکتا ہے اور اسکے سمجھنے کے لیے کافی وجوہ ہیں کہ ایسی کارروائیاں ذمیوں کی عزت کے لحاظ سے تھیں یا ذلت کے خیال سے یا یہ کہ ان دونوں باتوں کے سوا اُسکا منشا کچھ اور تھا؟

ان تنقیحوں پر ہم کو بڑی احتیاط سے بحث کرنی ہے جس کے متعلق ہم ذیل کی تفصیل سے کام لیتے ہیں

پہلی تنقیح کی نسبت ہم بحفاظت تمام کہہ سکتے ہیں کہ قرنِ اول میں ہرگز کوئی خاص قسم کا جداگانہ لباس ذمیوں کے لیے نہیں تجویز ہوا تھا، اور نہ فقہا قاطبۃً ایسے کسی خاص قسم کے نامعلوم الاسم والمسمّٰی لباس کو ذمیوں کے استعمال کے لیے ضروری سمجھتے ہیں، بلکہ اصولاً عام طور پر تمام اگلے پچھلے فقہا یہی کہتے اور لکھتے چلے آئے ہیں کہ ذمیوں کو مسلمانوں کے ساتھ لباس وغیرہ میں تشبہ نہ کرنا چاہیے جو نہ صرف ہمارے نزدیک صحیح و ثابت ہے بلکہ مصنف کو بھی الفاروق وغیرہ متفرق تصانیف میں اُسکا علانیہ اعتراف ہے،

البتہ مقام تفصیل میں فقہانے بعض خاص چیزوں کے نام لیے ہیں مثلاً لمبی ٹوپیاں پہننا، سواری میں زین پر نہ بیٹھنا، مسلمانوں کی سی جوتیاں نہ سلوانا، اپنی جوتیوں کے تسمے دوہرے رکھنا وغیرہ وغیرہ، لیکن ایسی باتیں بجائے اسکے کہ فقہا کی کوئی ایجاد من تلقاء انفسہم کہی جاسکیں، خود روایات واحکام صحابہ میں معتبر طور پر جستہ جستہ انکی تصریحات موجود ہیں، جیسا کہ آئندہ اسکی تفصیل آتی ہے۔

اس لیے ایسی صورت میں ہم بالکل خیال نہیں کرسکتے کہ فقہا خواہ مخواہ کسی طرح فرضی احداث فی المذہب کے جرم میں جائز طور پر ماخوذ ہوسکیں گے؛

تنقیح نمبر ۲ کے جواب میں ہمارا علانیہ دعوےٰ ہے کہ بیشک حضرت عمر نے ذمیوں کے لباس وغیرہ کے متعلق ایک تحکمانہ روک ٹوک کی تھی جس کی نسبت ہم مصنف کے خلاف آئندہ یہ ثابت کریں گے کہ وہ حضرت عمر کا کوئی طبعی مذاق نہ تھا اور نہ اس سے قومی خصوصیتوں کو قائم رکھنا منظور تھا، اس موقع پر ہم صرف دکھانا چاہتے ہیں کہ وہ مزاحمتیں کیا کیا تھیں؟

بے شبہ حضرت عمر نے ذمیوں کے لیے یہ قرار دیا تھا کہ وہ کسی طرح مسلمانوں کے ساتھ لباس، سواری، ہیئت وغیرہ میں مشابہت نہ کرنے پائیں، وہ لمبی ٹوپیاں پہنیں، اپنے زینوں کے آگے انار کی شکل کی گول لکڑی لگائیں، جوتیوں کے تسمے دوہرے رکھیں، مسلمانوں کی سی جوتیاں نہ سلوائیں، انکی پیٹیاں کاٹ ڈالی جائیں، انکی عورتیں کجاؤں میں نہ سوار ہوں وغیرہ وغیرہ۔ چنانچہ ان باتوں کی تصدیق کے لیے ملاحظہ ہو کتاب الخراج وغیرہ کی عبارت منقولۂ ذیل جو مختلف مقامات سے لی گئی ہے۔

وینبغی + + + ان یتقدم فی ان لایترک احد منہم یتشبہ بالمسلمین فی لباسہ ولا فی مرکبہ ولا فی ہیأتہ ویوخذوا + + بان یکون قلانسہم مضربۃ وان یتخذوا علیٰ سروجہم فی موضع القرابیس مثل الرمانۃ من خشب وان یجعلوا شراک نعالہم مثنیۃ ولایحذوا علیٰ حذو المسلمین وتمنع نساؤہم من رکوب الرحائل + + + ولکن قلانسہم طوالا مضربۃ + + + ہکذا کان عمر بن الخطاب رضی اللہ

لباس اور سواری وغیرہ میں کسی ذمی کو مسلمانوں کے ساتھ تشبہ نہ کرنے دے۔ انکی پابندی کرائی جائے کہ انکی ٹوپیاں خاص طور کی اور لمبی ہوں، انکی زینوں پر قرابیس کی جگہ انار کی شکل کی گول لکڑی ہو انکی جوتیوں کے تسمے دوہرے اور جوتیاں مسلمانوں کی جوتیوں کی سی نہ ہوں، انکی عورتیں کجاؤں کی سواری سے منع کی جائیں، ان کی ٹوپیاں خاص طور کی لمبی ہوں۔ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اپنے عاملوں کو حکم کیا تھا کہ ذمیوں سے

عنه امر عماله ان یاخذوا اهل الذمة بهذا الزی[1]

اس خاص ہیئت کی پابندی کرائیں۔

ان عمر بن الخطاب کتب الی امراء الاجناد ان ... تجزوا نواصیهم من اتخذ منهم شعراً وتمنعوهم الرکوب الا علی الاکف عرضا ولا یرکبوا کما یرکب المسلمون[2]

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے افسران فوج کو لکھا کہ انکے سر کے آگے کے بال کاٹ ڈالو اور منع کرو کہ وہ پالان کے سوا زین وغیرہ پر نہ سوار ہوں۔ جس طرح مسلمان سوار ہوتے ہیں اُس طرح سواری نہ کریں۔

حضرت عمر کے علاوہ عمر بن عبدالعزیز جن کو مصنف نے اسلام کا نمونہ بتایا ہے[3]، اور یہ بھی لکھا ہے کہ وہ دوسرے عمر کہے جاتے ہیں[4]، انھوں نے ذمیوں کے متعلق جو خاص خاص امتناعی احکام صادر کیے تھے وہ یہ ہیں،

عموماً یہودی و نصرانی پالان کے سوا زین پر نہ سوار ہوں، اُن کی عورتیں بھی پالان کے سوا کجاوے کی سواری نہ کریں، نصرانی قبا نہ پہنیں، خز' جو ایک قسم کا ریشمی کپڑا ہوتا ہے وہ بھی نہ پہنیں، عصب جو ایک قسم کی رنگین چادر ہوتی ہے وہ بھی نہ اوڑھیں، عمامہ بھی نہ باندھیں، جمام اور وفر بھی نہ رکھیں، تقصیص کے پابند رہیں، وغیرہ وغیرہ چنانچہ اُنکے فرمان کے خاص الفاظ بحوالہ کتاب الخراج حسب ذیل ہیں

ولا یرکبن یهودی ولا نصرانی علی سرج ولیرکب علی الاکاف ولا ترکبن امرأة من نسائهم علی رحالة ولکن رکوبها علی الاکاف وتقدم فی ذلک تقدما بلیغا وامنع من قبلک فلا یلبس نصرانی قباء ولا ثوب خز ولا عصب وقد ذکر لی ان کثیرا من قبلک من النصاری قد راجعوا لبس العمائم وترکوا المناطق علی اوساطهم واتخذوا الجمام والوفر وترکوا التقصیص ... فانظر کل شئ نهیت عنه فاحسم عنه من فعله[5]

یہودی اور نصرانی پالان کے سوا زین پر نہ سوار ہوں، اُنکی عورتیں بھی پالان کے سوا کجاووں میں نہ بیٹھیں اس بات کی سخت پابندی کرانی چاہیے، اور منع کرو کہ کوئی نصرانی قبا، خز، عصب استعمال نہ کرے، مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ تمہارے یہاں بہت سے عیسائی عمامے باندھنے لگے ہیں اور زنار باندھنا چھوڑ دیا ہے، لمبے لمبے بال رکھتے ہیں، دیکھو جن باتوں سے ممانعت کی گئی ہے، ہرگز کوئی شخص اُنھیں نہ کرے، روکو، اور منع کرو۔

---

[1] کتاب الخراج صفحہ ۷۲، [2] کنز العمال بحوالہ مصنف عبدالرزاق و ابن ابی شیبۃ و بیہقی وغیرہ صفحہ ۲۹۶ جلد ۲، [3] حقوق الذمیین صفحہ ۶۲، [4] حقوق صفحہ ۴۸، [5] کتاب الخراج صفحہ ۷۲،

ان ممانعتوں کے بعد کس کو شبہ ہو سکتا ہے اور کون خیال کر سکتا ہے کہ ذمی عموماً لباس، سواری وضع وغیرہ امور میں پورے طور پر آزاد تھے، اور اُن کے لیے خاص خاص باتوں کا پابند ہونا کوئی لازمی امر نہ تھا۔

افسوس! یہی پابندیاں اور یہی مزاحمتیں ہیں جنھیں فقہائے اسلام نے خدمتِ اسلام سمجھ کر اپنی کتابوں میں ذرا تفصیل سے لکھ دیا جسکے وہ ہر طرح مستحق تھے۔ لیکن یہ زمانے کی خوبی ہے کہ آج اُنکی یہ خدمت اسلام بیجا طور پر ایک مکروہ خلط سمجھی گئی ہے اور اس لیے بعض نکتہ چین نگاہیں اُن پر بڑی تیزی کے ساتھ پڑ رہی ہیں،

نمبر۳ کے متعلق جیسا کہ میں ابھی اوپر کہہ آیا ہوں، مصنف کا خیال ہے کہ یہ تمام مزاحمتیں حضرت عمر کے مذاقِ طبیعت کی بنا پر تھیں، اور اس لیے کہ تو یں اپنی اپنی خصوصیتوں پر قائم رہیں، لیکن میں نہایت ادب سے مصنف سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ اگر ایک امر صحیح طور پر حضرت عمر کا مذاقِ طبیعت تھا تو بجائے اسکے کہ وہ اُنھیں کے زمانہ کے ساتھ مخصوص رہتا، کیوں زمانۂ مابعد کے خلفا نے اُن پر سختی کے ساتھ عمل کیا، مثلاً حضرت عمر ابن عبدالعزیز جن کی تعریف مصنف ہی کی زبان سے ابھی گذر چکی، کیوں انھوں نے اپنے عامل کو یہ لکھا کہ خبردار! کوئی یہودی و نصرانی مرد ہو یا عورت پالان چھوڑ کر زین یا کجاوے پر نہ سوار ہو، نصرانی قبا نہ پہنیں، خز نہ پہنیں، عصب نہ اوڑھیں، عمامہ نہ باندھیں، بال کٹوائیں، کمر میں زنار یعنی جنیو باندھیں، وغیرہ وغیرہ کیا فی الواقع مذاقِ طبیعت بھی کوئی آیت یا حدیث کا حکم رکھتا تھا کہ جس کے اتباع میں ایسا تشدد و اہتمام ایک ناگزیر امر سمجھا جاتا تھا؟ یا یہ کہ حضرت عمر ہی کے مذاقِ طبیعت میں کوئی ایسی خاص خصوصیت تھی جسکی وجہ سے اُن کے بعد کے جانشین خلفا اُنکے احکام کے ذرہ برابر بھی خلاف نہیں کر سکتے تھے؟

معہذا، حضرت عمر کا یہ حکم کہ ذمیوں کے سروں پر سے چُٹیا کاٹ ڈالی جائے، اور حضرت خالد کے معاہدے میں یہ شرط (جسے حضرت عمر وغیرہ نے بھی بحال رکھا) کہ مسلمانوں کے ساتھ لباس میں تشبہ نہ کرنے کے علاوہ اہلِ ذمہ فوجی لباس بھی نہ پہنیں ورنہ بازپرس کے وقت اگر معقول وجہ نہ ہوگی تو سزایاب ہوں گے، کیا یہ باتیں بھی مذاقِ طبیعت کی وجہ سے تھیں؟

صرف قومی خصوصیتوں پر قائم رہنے کی نہایت لغو اور رکیک تاویل کو ہم اُس وقت تسلیم کر سکتے ہیں جبکہ لائق مصنف ثابت کر دے کہ خز، قبا، عصب وغیرہ کا پہننا خاص مسلمانوں ہی کے لیے مخصوص تھا، ذمی ان کو پہلے سے نہیں پہنتے تھے،

نیز یہ کہ یہود و نصاریٰ کی یہ قومی خصوصیت تھی کہ وہ ہمیشہ سے پالان ہی پر سوار ہوتے تھے، اُنکی خاص قسم کی زین کے آگے قدیم سے گول لکڑی لگی ہوتی تھی، اُنکی جوتیوں کے تسمے دوہرے ہوتے تھے، چُٹیا نہیں رکھتے تھے، اُنکی سواری کی ہیأت مسلمانوں کی سواری کی ہیأت سے الگ ہوتی تھی، وہ ہمیشہ پالان پر سوار ہوتے تو عرضاً، طولاً وغیرہ وغیرہ، کیونکہ بغیر اسکے کہ ان باتوں کا قومی خصائص میں سے ہونا ثابت کیا جائے، یہ کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ ان باتوں کی پابندی اُنکے لیے اس وجہ سے ضروری کی گئی تھی کہ وہ اپنی قومی خصوصیتوں پر قائم رہیں۔ بات یہ ہے کہ بات بنانے کے لیے بھی انسان کو ایک سلیقہ چاہیے! مصنف نے سخن سازی کی بھی تو ما یا: لکھنے کو تو لکھ دیا کہ حضرت عمر کی اس روک ٹوک کا خاص منشا یہ تھا کہ قومیں اپنی اپنی خصوصیتوں پر قائم رہیں، لیکن یہ خیال کیا کہ چُٹیا، جسکے کاٹنے کا حکم حضرت عمر نے دیا تھا، اگر وہ قدیم سے اہل ذمہ کی خصوصیت تھی تو اُس کا کاٹنا بجائے اسکے کہ اُنکی قومی خصوصیت کو قائم رکھنا کہا جائے، اور اسکو مٹانا ہے، اور اگر وہ پہلے سے نہیں رکھتے تھے، بلکہ پیچھے رکھنے لگے تھے، تو اس سے میں نہیں سمجھ سکتا، کہ مسلمانوں کی کون سی قومی خصوصیت مٹی جاتی تھی، اور کس اسلامی شعار کے ساتھ تشبہ پیدا ہوا جاتا تھا، جسکے تدارک کے لیے ایسا کرنا لازم آیا،

میرے نزدیک اسی طرح یہ خیال بھی ایک لغو اور نامعقول خیال ہے کہ خز اور عصب پہننے سے روکنا، اور پالان پر عرضاً سوار ہونے کا حکم دینا، اور یہ حکم دینا کہ جس ہیأت سے مسلمان سوار ہوتے ہیں اُس ہیأت سے اہلِ ذمہ نہ سوار ہوں، یہ سب محض اس لیے تھا کہ جانبین اپنی اپنی قومی خصوصیتوں پر قائم رہیں، حالانکہ ایک معمولی فہم کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ قومی خصوصیتوں کے بقا و قیام کے بجائے ان احکام کا منشا صاف طور پر یہ تھا کہ غیر قومیں فاتح قوم کی ہمسری نہ کرنے پائیں، جیسا کہ فقہا بھی لکھتے ہیں یہ منشا اُس وقت اور زیادہ موکد اور قرینِ قیاس ہو جاتا ہے جبکہ یہ دیکھا جائے کہ خز کا استعمال

بوجہ ریشمی کپڑا ہونے کے مسلمانوں کے لیے پہلے ہی سے مذہباً ناجائز تھا اور اس طور سے غیر قوموں کا خز استعمال کرنا جانبین کی قومی خصوصیتوں پر کچھ بھی مخالف اثر نہیں ڈال سکتا تھا، پھر بھی اُنکو اس کے استعمال سے روکنا، اسکے صریح معنی یہ ہیں کہ مسلمانوں کے مقابلہ میں غیر قوموں کا معاشرانہ پہلو دبا ہوا اور ہمسری و افتخار کے پایہ سے گرا ہوا ہونا چاہیے۔

کیا یہ امر تعجب سے نہ دیکھا جائیگا کہ جناب مصنف دوسروں کے مقابلہ میں تو ہمیشہ درایت اصول درایت کا نغمۂ شیریں الاپتے ہیں لیکن بسا اوقات خود ایسے مقامات میں جہاں درایت سے کام لینا چاہیے تھا ایسی سادگی و بالاروی کا ارتکاب فرماتے ہیں کہ شاید دوسرے سے ممکن نہ ہو۔

اسی تنقیح کا تتمہ ایک دوامر بھی ہے یعنی یہ کہ اس طرح کی قیدوں اور پابندیوں سے کیا ذی الحکمہ ذمیوں کی تحقیر بھی مقصود تھی؟ مصنف کو نہایت سختی سے اسکی نفی پر اصرار ہے۔ لیکن ہمکو اسکے فیصلہ کے لیے سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ خود صحابہ بلکہ خود شارع علیہ السلام کے خیالات اہل ذمہ کے باب میں کیسے تھے؟

آیتِ جزیہ جس میں "وَہُم صاغرون" کا لفظ موجود ہے اور جس سے شارع کی نظر میں جزیہ دینے والوں کا ہمیشہ کے لیے ذلیل و خوار رہنا اگرچہ ایک بدیہی امر ہے، اسی طرح یہود و نصاریٰ کو ابتدائے سلام نہ کرنا، اور راستہ میں اُنکو بچکر نکلنے، اور کنارے چلنے پر مجبور کرنا جو کہ نہایت صحیح طور پر آں حضرت سے ثابت ہے، جیسا کہ آیندہ اس سے بحث آئے گی اگرچہ ایک معنی خیز امر ہی نہیں، بلکہ صاف صاف تصریح مافی الباب ہے، لیکن اس سے بھی قطع نظر ہم اس مقام پر صرف کتاب الخراج کے حوالہ سے یہ دکھانا چاہتے ہیں، کہ ایک موقع پر معاوضۂ صلح کی گفتگو میں مقدس صحابی حضرت معاذ نے حضرت ابوعبیدہ سے کیا کہا تھا؟ اس گفتگو کو قاضی ابو یوسف نے کتاب الخراج میں جن الفاظ میں نقل کیا ہے وہ یہ ہیں:

ان اعطیتم الصلح علی شیٔ مسمی فعجزوا عنہ لم یکن لک ان تقتلہم ولم تجد بدا من ابطال ما اشترطت علیہم من التسمیۃ وان ایسروا ادوہ علی غیر الصغار الذی امر اللہ فیہم[۱]

اگر تم نے ایک معین مقدار پر ان سے صلح کرلی اور پھر وہ اس کے ادا کرنے سے قاصر رہے تو تم نہ تو انہیں قتل کر سکو گے اور نہ اسکے کوئی چارہ پاؤ گے کہ تعیین کی شرط کو باطل کردو اور اگر وہ غنی ہوگئے تو وہ ذلت کے بغیر ادا کردینگے حالانکہ خدا نے انکے بارے میں حکم دیا ہے۔

---

۱۵ کتاب الخراج صفحہ ۲۳

مع ہذا کنز العمال جلد دوم میں بیہقی کے حوالے سے خاص حضرت عمر کی یہ روایت بھی منقول ہے۔

لا تشتروا رقیق اہل الذمۃ فانہم اہل خراج وارضہم فلا تبتاعوہا ولا یقرن احدکم بالصغار بعد اذا نجاہ اللہ منہ[1]

ذمیوں کے غلاموں کو نہ خریدو، اس لیے کہ وہ اہل خراج ہیں، اور نہ اُن کی زمینوں کو خریدو، تم میں سے کوئی آدمی ذلت کا اقرار نہ کرے، جبکہ خدا نے اُسے اس سے نجات دے دی ہے۔

اس سے بڑھ کر یہ کہ خود فتوح البلدان بلاذری میں جہاں اہل تفلیس کے معاہدے کو نقل کیا ہے وہاں معاہدے کے خاص الفاظ یہ ہیں،

بالامان علے انفسہم وبیعہم وصوامعہم وصلواتہم ودینہم علے اقرار بالصغار والجزیۃ علے کل اہل بیت دینار[2]

اُن کی جانیں، دین، مذہب، عبادت گاہیں، صومعے وغیرہ سب محفوظ رہیں گے اس شرط پر کہ ذلت کا اقرار کریں، اور جزیہ دیں، جو ہر گھر والوں پر ایک دینار ہوگا،

دوسری جگہ یہ الفاظ ہیں،

اتونی بکتاب امان لہم من حبیب بن سلمہ علے الاقرار بصغار الجزیۃ[3]

وہ لوگ میرے پاس امان کا ایک نوشتہ لیکر آئے، جو حبیب بن سلمہ کی طرف سے جزیہ کی ذلت قبول کر لینے پر مشتمل تھا،

جس قوم کی نسبت ارشاد خداوندی کے علاوہ خود رسول اور رسول کے صحابہ کے ایسے خیالات ہوں اُسکی نسبت نہایت آسانی سے قیاس ہو سکتا ہے کہ ایسی جزئی قیدیں لباس اور غیر لباس میں خاص اُس قوم کی عزت افزائی کے لحاظ سے تھیں یا ذلت و تنگ گیری کے خیال سے،

لباس کی بحث میں مصنف نے یہ لکھ کر کہ مجوزہ لباس عجم کا قدیم لباس تھا، اور اسکا ثبوت یہ ہے کہ حضرت عمر کے معاہدے میں "وان نلزم زینا حیث ما کنا" ہے اور نیز یہ لکھ کر کہ خلیفہ منصور نے جو لباس اپنا درباری لباس قرار دیا تھا وہ یہی لباس تھا، جس میں اُس نے عجم کی تقلید کی تھی، اور جو ایک بین دلیل اس بات کی ہے کہ یہ لباس بطور علامتِ تحقیر کے تجویز نہیں ہوا تھا، گویا فیصلہ کر دیا ہے کہ وضع و لباس میں ذمیوں کے لیے خاص اپنی قدیم وضع کے علاوہ کسی اور جدید وضع کی پابندی ضروری نہ تھی،

لیکن میں نہیں سمجھ سکتا کہ ذمیوں کے صرف اس اقرار سے کہ ہم اپنی زی پر قائم رہیں گے، یہ کیونکر

---

[1] کنز العمال صفحہ ۳۰۱ جلد ۲ [2] فتوح صفحہ ۲۰۹، [3] فتوح صفحہ ۲۱۰،

لازم آتا ہے کہ ہم ابن زی کے علاوہ اور اوضاع جدیدہ کی پابندی نہ کریں گے؟ یا یہ کہ ایسی اوضاع کی پابندی کا اُن کو حکم نہ دیا جائے گا؟

اور منصور، وہ منصور، جس کے محاسن اوصاف مصنف کو بخوبی یاد ہیں اور جسکی زندگی کا مختصر خاکہ مصنف نے سیرۃ النعمان میں بھی کھینچا ہے، اگرچہ اُسکے طرز عمل سے کسی شرعی باب میں استدلال ایسا ہی ہے جیسے ڈوبتے کو تنکے کا سہارا، لیکن تاہم کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اُسکے درباری لباس کو اُن قیود زائدہ اور اُن اوضاعِ مختصہ مذکورہ سے کیا تعلق ہے جن کی پابندی خاصکر ذمیوں کے لیے ایک ضروری بات تھی،

ذمیوں کے لیے صرف لمبی ٹوپیاں اور بقول مصنف پیٹیاں ہی نہیں تجویز ہوئی تھیں، جس کی تقلید منصور نے اپنے درباری لباس میں کی، بلکہ اُنکو تو خاص لباس و وضع کے متعلق بہت سی باتوں کا پابند کیا گیا تھا، تو کیا اُن تمام امور کی پابندی منصور کے درباریوں کے لیے بھی ضروری تھی؟

معہذا، جناب مصنف اُن مذکورہ بالا واقعاتِ تاریخی کی تکذیب پر کس طرح جرأت کریں گے، جن میں علانیہ اور صاف طور پر منع کیا گیا ہے کہ اہل ذمہ فلاں فلاں کپڑے نہ پہنیں اور خاص فلاں فلاں وضع، اور فلاں ہیأت کی پابندی اُن سے عملاً کرائی جائے، جن کا انکار اگر انصاف سے دیکھو تو روز روشن میں گویا آفتاب کا انکار ہے،

اسی طرح ایک اور عجیب فقرہ جو لباس کی بحث میں مصنف کے قلم سے نکلا ہے قابل لحاظ ہے، وہ یہ کہ "حضرت عمر کا معاہدہ جسکو کنز العمال وغیرہ میں نقل کیا ہے، اگرچہ راویوں نے اُسکو بہت کچھ کم و بیش کر دیا ہے، تاہم جہاں ذمیوں کی طرف سے یہ اقرار مذکور ہے، کہ ہم فلاں فلاں لباس نہ پہنیں گے، وہاں یہ الفاظ بھی ہیں' وان نلزم زینا حیث ما کنا' اب تھوڑی دیر کے لیے اس بیان کو الفاروق صفحہ ۷۰ کی عبارتِ ذیل سے بھی ملا کر دیکھو،

"آنحضرت بڑے جاہ و جلال سے مکہ میں داخل ہوئے اور در کعبہ پر کھڑے ہو کر نہایت فصیح و بلیغ خطبہ پڑھا جو بعینہ تاریخوں میں منقول ہے"

کیا درایت! اور اصول درایت کا مقتضا یہی ہے کہ خطبات جن کے حفظ کی چنداں ضرورت نہیں ہوئی

وہ تو راویوں کی یاد سے بعینہا تاریخوں میں منقول ہوں لیکن معاہدات جن کے یاد کی بڑی ضرورت ہوا کرتی ہے وہ باوجود دواعی حفظ کے ایک روایت میں بھی بلاکم وبیش منقول نہ ہوں ؟

پھر لطف یہ ہے کہ پہلے انھیں معاہدات کی نسبت حقوق الذمیین میں بوضاحت تمام یہ بھی ارشاد ہو چکا ہے کہ

"تاریخ طبری وغیرہ میں سیکڑوں معاہدے بالفاظہا (یعنے اصلی لفظوں میں) موجود ہیں"

سبحانک ہذا شئی عجاب' اب میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس بحث کو یہیں ختم کروں اور بقیہ امور کے جواب کی طرف متوجہ ہوں '

ناقوس، اصطباغ، صلیب وغیرہ کی بحث کرتے ہوئے مصنف کی تقریر میں ایک غیر معمولی جوش آ گیا ہے، وہ نہایت طیش میں آکر ان احکام کا ذکر کرنے کے بعد لکھتا ہے، کہ ان سے روکنا بہ شبہ مذہبی دست اندازی ہے لیکن میں بیباکانہ اس راز کی پردہ دری کرتا ہوں کہ یہ احکام جن قیدوں کے ساتھ حضرت ابوبکر و عمر نے جاری کیے تھے وہ بالکل مناسب تھے لیکن زمانہ مابعد کے اور مورخوں نے ان قیدوں کا ذکر چھوڑ دیا اور اس وجہ سے تمام دنیا میں ایک عالمگیر غلطی پھیل گئی - تم کلامہ

میں کہتا ہوں، ہاں سچ ہے، ؎ فکر ہر کس بقدر ہمتِ اوست، میں پہلے مصنف کو اسکی اس پردہ دری پر آفریں و مبارکباد کہتا ہوں، پھر مؤدبانہ عرض کرتا ہوں کہ خود حضرت ابوبکر وحضرت عمر ہی نے ان قیدوں کے بغیر بھی یہ احکام جاری کیے تھے اور زمانہ مابعد کے مورخین بجائے اسکے کہ احکام میں ایسی ضروری قیدوں کا ذکر چھوڑتے انھوں نے جن عام اور مطلق روایتوں کو لیا ہے وہ واقع میں بھی اپنے عموم اور اطلاق پر تھیں اور اب بھی ہیں، اگرچہ میرے نزدیک مصنف کے لیے اس پردہ دری سے پردہ داری بہتر تھی، کیونکہ میں دیکھتا ہوں کہ حسن اتفاق سے نہیں بلکہ اتفاق بد سے وہ خود ایسی نامستحسن حرکت میں مبتلا ہے، یعنی خود مصنف نے حفاظ صحابہ کی تعداد بیان کرتے ہوئے الفاروق صفحہ ۱۳۰ میں روایت سے صاف انصار کی قید کو اڑا دیا ہے، اور یہ ایک بدیہی امر ہے کہ انسان خود جس عیب میں مبتلا ہو اُسی عیب سے دوسروں کی عیب جوئی حد درجہ شرمناک ہے، لیکن تاہم انصافاً اس پردہ دری کی بخیہ گری کے بغیر بھی میں نہیں رہ سکتا، چنانچہ اب اس

اجمال کی تفصیل ملاحظہ ہو۔

ناقوس کی نسبت لائق مصنف کتاب الخراج کے حوالہ سے لکھتا ہے کہ اوقات نماز کے علاوہ عموماً تمام وقتوں میں اسکے بجانے کی اجازت تھی، لیکن اسی کتاب الخراج کے صفحہ ۸۰ میں اُس نے یہ کیوں نہیں دیکھا، کہ ابو عبیدہ نے شام کے معاہدے میں صاف طور پر لکھوایا تھا کہ

لا یضربوا نواقیسہم قبل اذان المسلمین ولا فی اوقات اذانہم — وہ ناقوس نہ بجائیں، نہ مسلمانوں کی اذان سے پہلے اور نہ اُنکی اذانوں کے وقتوں میں،

معہذا، حضرت ابن عباس سے جبکہ عجمیوں کے متعلق نئی عبادت گاہوں کے بنانے کا مسئلہ پوچھا گیا تو اُنھوں نے جواب میں حسب ذیل تقریر کی:-

اما مصر مصرتہ العرب فلیس لہم ان یحدثوا فیہ بناء بیعۃ ولا کنیسۃ ولا یضربوا فیہ بناقوس ۔۔۔ و کل مصر کانت العجم مصرتہ ففتحہ اللہ علی العرب فنزلوا علی حکمہم فللعجم ما فی عہدہم وعلی العرب ان یوفوا بذلک — جو شہر عربوں کے آباد کردہ ہیں اُنھیں عجمی نئی عبادت گاہیں نہیں بنا سکتے اور نہ ناقوس بجا سکتے ہیں البتہ جو شہر عجمیوں نے آباد کردہ ہیں اور عربوں نے اُنھیں فتح کر لیا ہے اور وہ اُنکے تابع ہو گئے ہیں تو ان میں اُن باتوں تک مجاز ہیں جو اُنکے عہدنامہ میں ہیں اور عربوں کو اُنکا ایفا لازم ہے۔

کون کہہ سکتا ہے کہ اس سے بلاد عرب میں عموماً تمام وقتوں میں ناقوس بجانے کی ممانعت نہیں سمجھی جاتی ہے۔ اگر مصنف کو بیجا طرفداری اور ناحق کی ضد نے حق پوشی پر مجبور نہیں کیا ہے تو وہ انصاف سے کہے کہ ناقوس بجانے کی عام ممانعت فقہائے متاخرین کی ایجاد ہے یا یہ خود ایک جلیل القدر صحابی کا فتوے ہے؟

صلیب کی نسبت مصنف کا بیان ہے کہ معاہدے میں جو الفاظ تھے اُس میں یہ قید تھی لا یرفعوا فی نادی اہل الاسلام صلیباً یعنی مسلمانوں کی مجلس میں صلیب نہ نکالیں، لیکن قاضی ابو یوسف کتاب الخراج میں حضرت عمر کا یہ عام حکم سناتے ہیں

ولا یظہرون الصلبان فی الامصار[1] — شہروں میں صلیب نہ نکالیں

حضرت عمر بن عبدالعزیز اپنے عامل کو ایک فرمان میں یوں لکھتے ہیں

فلا تدعن صلیبا ظاہرا الا کسر و محق[2] — کسی ظاہر اور کھلم کھلا صلیب کو توڑے اور مٹائے بغیر مت چھوڑ

شام کے معاہدے میں خود ذمیوں نے جب ابو عبیدہ سے یوں درخواست کی کہ،

---

[1] کتاب الخراج صفحہ ۸۰، ۸۳ الف

اجعل لنا یوما فی السنة نخرج منه صلباننا بلا رایات وهو یوم عیدنا الاکبر

سال میں ایک دن ہمارے لیے مقرر کر دیجیے کہ ہم اُس میں بغیر جھنڈوں کے اپنی صلیبیں نکالیں، اور وہ ہماری بڑی عید کا دن ہے،

اور اُنھوں نے اس معاہدے کے شرائط حضرت عمر کو لکھ بھیجے تو حضرت عمر نے ابو عبیدہ کو خاص صلیب کے بارے میں ترمیم کر کے یہ لکھا کہ

واما اخراج الصلبان فی ایام عیدهم فلا تمنعهم من ذلک خارج المدینة بلا رایات ولا بنود علی ما طلبوا منک یوما فی السنة فاما داخل البلد بین المسلمین ومساجدهم فلا تظهر الصلبان[1]

تیوہار کے دنوں میں صلیبوں کے نکالنے کی ممانعت نہیں، جبکہ وہ شہر سے باہر بغیر جھنڈوں وغیرہ کے ہو، برس میں ایک دن جیسا کہ خود اُنھوں نے تم سے درخواست کی ہے۔ لیکن شہر کے اندر، مسلمانوں اور انکی مسجدوں کے درمیان اُنھیں صلیبوں کے نکالنے کی اجازت نہیں ہے

اس پر حضرت ابو عبیدہ نے برس میں ایک دن کے لیے اُنھیں اجازت دی جس کے الفاظ یہ ہیں،

فاذن لهم ابو عبیدة فی یوم من السنة وهو عیدهم الذی فی صومهم فاما فی غیر ذلک الیوم فلم یکونوا یخرجون صلبانهم[2]

ابو عبیدہ نے برس میں ایک دن کیلیے جو اُنکی عید کا دن ہوتا تھا اُنھیں اجازت دیدی ، اس دن کے علاوہ اور دنوں میں وہ صلیب نہیں نکالتے تھے۔

کنز العمال کا وہ معاہدہ جس کا ذکر مصنف نے لباس کی بحث میں کیا ہے اور اُسکا ایک ٹکڑا ابھی معرض استدلال میں پیش کیا ہے اُس میں خاص صلیب کی نسبت یہ الفاظ ہیں

وان لا نظهر صلیبنا وکتبنا فی شیء من طرق المسلمین ولا فی اسواقهم[3]

اور ہم اپنی صلیبوں وغیرہ کو مسلمانوں کے کسی راستہ میں نکالیں گے اور نہ اُن کے بازاروں میں،

اب ان مفصل تاریخی بیانات کو بھی دیکھ کر اہل انصاف فیصلہ کریں کہ مصنف نے اپنے بیان میں انصاف و دیانت کو کہاں تک دخل دیا ہے، نیز یہ کہ اُسکے ایسے خود غرضانہ مضامین فقہائے کرام یا متاخرین اہل تاریخ پر قدح و الزام کے لیے کس حد تک موزوں ہیں؟

صلیب کے بعد مصنف نے سُور کو فنائے مسلمین میں لیجانے کے متعلق جیسا کہ میں پہلے لکھ آیا

---

[1] کتاب الخراج صفحہ ۸۲ [2] ایضا [3] کنز۔ صفحہ ۳۰۲ ج ۲ ۔

بدوں بالکل خارج از بحث تقریر کی ہے حالانکہ مورد بحث بیع خنزیر کا مسئلہ تھا اگر اس مسئلہ سے مصنف کا گریز بربنائے تسلیم ہے جیسا کہ ظاہر بھی یہی ہے، تو چشم ما روشن، ورنہ اسکے متعلق بھی حضرت عمرؓ کا فتویٰ قاضی ابو یوسف کی زبانِ بیان سے سن لینا چاہیے

ویترکون یسکنون فی امصار المسلمین واسواقھم یبیعون ویشترون ولا یبیعون خمراً ولا خنزیراً [1] — اور مسلمانوں کے شہروں میں وہ رہنے دیے جائیں گے، اور ان کی بازاروں میں بیع وشرا کریں گے لیکن شراب اور سور نہ بیچیں،

بحث اصطباغ کے متعلق نصارائے بنی تغلب میں مصنف کی گرانمایہ تحقیق یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے مسلمان عیسائیوں کے بچوں کو اصطباغ دینے کی ممانعت تھی، حالانکہ اس باب میں حضرت عمرؓ سے یہ عام روایت کتاب الخراج میں آج بھی موجود ہے،

وکان عمر قد اشترط علی نصاریٰ بنی تغلب ان لا ینصروا ابناءھم — حضرت عمر نے نصارائے بنی تغلب پر شرط لگادی تھی کہ وہ اپنی اولادوں کو نصرانی نہ بنائیں۔

ابن قتیبہ نے معارف میں لکھا ہے،

فقال لہ زرعۃ بن النعمان او النعمان بن زرعۃ التغلبی انشدک اللہ فیھم فانھم قوم عرب یانفون من الجزیۃ وھم قوم لھم نکایۃ فلا تعن عدوک علیک فاضعف علیھم الصدقۃ وشرط علیھم ان لا ینصروا اولادھم [2] — زرعہ بن نعمان یا نعمان بن زرعہ تغلبی نے کہا کہ بنی تغلب قوم عرب ہیں اور باعزت اور طاقتور ہیں، یہ جزیہ سے ناک بھوں چڑھاتے ہیں تو خواہ مخواہ اپنے دشمنوں کو اپنے اوپر دلیر نہ بنائیے۔ اب حضرت عمر نے ان پر صدقہ المضاعف کردیا اور شرط لگائی کہ اپنی اولاد کو نصرانی نہ بنائیں،

کتاب الخراج کی ایک دوسری عبارت زیادہ مصرح ہے،

قال فصالحھم عمر علی ان لا یغمسوا احداً من اولادھم فی النصرانیۃ ویضاعف علیھم الصدقۃ [3] — حضرت عمر نے ان سے اس شرط پر صلح کی کہ اپنی اولادوں میں سے کسی کو نصرانی نہ بنائیں اور یہ کہ ان پر صدقہ دوچند کیا جائے گا،

ان صریح الفاظ سے عموم کا ثبوت جیسا کہ ظاہر ہے ایک بدیہی امر ہے اور احتمال تخصیص قائم کرنے سے پہلے ان امور کو پیش نظر رکھنا چاہیے کہ جن تغلبیوں سے صلح ہوئی تھی یعنی جن پر صدقہ المضاعف کیا گیا

---

[1] بیع خنزیر کے علاوہ خود خنزیر کو اسلامی شہروں میں رکھنے کے متعلق بھی کتاب الخراج صفحہ ۸۰ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ ممانعت منقول ہے "ولا یظھروا فیہ خمراً ولا یتخذوا فیہ خنزیراً۔"

[1] کتاب الخراج صفحہ ۳، [2] کتاب الخراج صفحہ ۸، [3] معارف صفحہ ۱۹۲ [4] کتاب الخراج صفحہ ۶۸

تھا اور جو جزیہ دینے سے ناک بھوں چڑھاتے تھے اُنھیں سے یہ بھی کہا گیا تھا کہ اپنی اولاد کو اصطباغ نہ دو اسکے صریح مفہوم میں اگر اُنکی صلبی اولاد کا حصر نہ ہو تو انصافاً اُسکو خارج بھی نہ ہونا چاہیے، رہی طبری طبری کی روایت میں تخصیص، اسکی نسبت بعد تسلیم، ممکن نہیں، ایک زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ مختلف معاہدے ہوے ہوں یا یہ کہ نومسلموں کے اولاد کے بارے میں خود اُدھر سے اصطباغ نہ دینے کی شرط یا اقرار پیش ہوا ہو اور حضرت عمرؓ نے اُدھر سے عموم کی شرط اضافہ کی ہو، عموم کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ حضرت عمر کو خاص بنو تغلب کے اسلام لانے کا زیادہ خیال تھا اور اسلیے وہ اُن پر اوروں کے مقابلہ میں سختی اور درشتی بھی کرتے رہتے تھے کہ چونکہ یہ عرب ہیں اہل کتاب نہیں ہیں اس لیے تغلیظ کے عار کو گوارا نہ کریں گے اور اسلام لائیں گے۔ چنانچہ کتاب الخراج کی مذکورہ بالا روایت متعلقہ صفحہ ۱۸ کا پہلا حصہ یہ ہے؛
وامرنی ان اغلظ علی نصاری بنی تغلب قال انھم قوم من العرب لیسوا باہل کتاب فلعلھم یسلمون، اور مجھ نصارائے بنی تغلب کے ساتھ درشتی سے پیش آنے کا حکم دیا اور کہا کہ وہ عرب کی ایک قوم ہیں وہ اہل کتاب نہیں ہیں شاید مسلمان ہو جائیں،

اور اگر ہم ان بیانات سے قطع نظر مصنف کی خاطر سے تسلیم بھی کرلیں کہ واقع میں ناقوس صلیب اصطباغ وغیرہ کے متعلق احکامی روایتیں عام نہ تھیں بلکہ اُن میں قیدیں اور خصوصیتیں بھی تھیں جو کہ چھوڑ دی گئیں تو اس سے ابن الاثیر وغیرہ متاخرینِ اہلِ تاریخ کے سر ہونا کیا معنی؟ انصاف تو اسکا مقتضی ہے کہ لائق مصنف خود قاضی ابو یوسف اور ابن قتیبہ وغیرہ قدمائے دست و گریبان ہوں یا صاف لفظوں میں اقرار کرے کہ امام ابو یوسف اور ابن قتیبہ وغیرہ بھی متعصب تھے، جنھوں نے ان قیدوں کے حذف کرنے میں انصاف کا خون کیا،

اسکے بعد مصنف نے بطور نتیجہ اور خلاصۂ تقریر کے چند سطریں اظہارِ افسوس کے لیے وقف کی ہیں۔ لیکن جیسا کہ بُلغا اور جامع البیان لوگوں کا قاعدہ ہے کہ اُنکی معمولی اور عام باتیں بھی کسی نہ کسی فائدہ زائدہ سے خالی نہیں ہوتیں، بعینہ اُسی طرح مصنف نے بھی اظہارِ افسوس میں غریب ابن الاثیر پر ہاتھ صاف کرنے کے فائدہ کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے، ابن الاثیر ایک طرف، فقہا جن سے مصنف زیادہ خوش اعتقاد ہے، اور جو اسی لیے ہمیشہ اُسکے ممدوح و مراحم رہے ہیں، وہ بھی النصیب یصیب کے موافق حصہ رسدی سے کامیاب ہوے بغیر نہ رہ سکے،

میں مناسب سمجھتا ہوں کہ ان سطروں کو بطور شرح حال المتن کے ذیل میں لکھ دوں، تاکہ ناظرین کی دلچسپی کے علاوہ یہ بات بھی ظاہر ہو جائے کہ مصنف نے جو کچھ لکھا ہے اُس میں خلاف گوئی اور مبالغہ کی رنگ آمیزی کس حد تک ہوتی ہے،

"اب ہر شخص انصاف کر سکتا ہے کہ امن عام میں خلل نہ واقع ہونے کے لیے عیسائیوں کو اگر یہ حکم دیا جائے کہ وہ مسلمانوں کی مجلسوں میں صلیب اور سور نہ لائیں، خاص نماز کے وقت ناقوس نہ بجائیں، نو مسلم عیسائیوں کی اولاد کو اصطباغ نہ دیں، تو کیا کوئی شخص اسکو تعصب مذہبی کے نام سے تعبیر کر سکتا ہے؟"

بیشک نہیں تعبیر کر سکتا، لیکن اگر حقیقتِ حال کی واقعی اور اصلی تصویر دیکھنی ہو تو اُسکے لیے بیانات سابق کا آئینہ پیشِ نظر رکھنا چاہیے،

"افسوس اور سخت افسوس یہ ہے کہ ہمارے پچھلے مورخوں نے ان احکام کی قیدوں اور خصوصیتوں کو اُڑا دیا۔"

ناحق پچھلوں کا نام اُچھالنے سے کیا حاصل؟ اگر زبان ہی کھُجلاتی ہے اور خواہ مخواہ ملامت ہی منظور ہو تو قرن اول سے چلیے اور زینہ بزینہ نیچے اُترتے چلے آیئے،

"بلکہ قدما میں بھی جو تعصب آمیز طبیعت رکھتے تھے، روایت میں ان خصوصیتوں کو چھوڑ جاتے تھے۔"

یعنی یہ کہ عبد اللہ بن مسلم بن قتیبہ جنھیں مصنف نے خود ہی الفاروق صفحہ ۶ میں نہایت نامور اور مستند مصنف بھی لکھا ہے، اور قاضی ابو یوسف جن کی شہرت محتاجِ بیان نہیں، یہ دونوں کے دونوں متعصب تھے، اور متعصب بھی صرف اس وجہ سے کہ اُنکی کتابوں میں مصنف کی ذاتی رائے کے خلاف معتبر بیانات پائے جاتے ہیں،

حقیقت میں انسان کی خود غرضی بھی عجیب چیز ہے، مصنف بننا اور منصف ہونا ان دونوں باتوں میں جو فرق ہے ظاہر ہے، یہی مصنف ہے کہ خود اُس نے رسائل شبلی صفحہ ۲۴۳ میں صاف صاف لکھا ہے کہ "مسلمان ہمیشہ سے اس بات کے عادی ہیں کہ جو روایت اُنکو ہاتھ آئے اُسکو بغیر کسی تصرف اور کاٹ چھانٹ کے بیان کر دیں" اور یہی مصنف یہاں بیباکی سے یوں خامہ فرسا ہے کہ "پچھلے مورخوں نے ان احکام کی قیدوں اور خصوصیتوں کو اُڑا دیا، بلکہ قدما میں بھی جو تعصب آمیز طبیعت رکھتے تھے روایت میں ان خصوصیتوں کو چھوڑ جاتے تھے" جس کا حاصل دوسرے لفظوں میں یہ ہوا کہ ہمارے پچھلوں نے جو تصرف اور کاٹ چھانٹ میں کمال حاصل کیا، یہ ہمارے اگلوں کا فیض تعلیم ہے ؎ ببیں تفاوتِ راہ از کجاست تا بکجا۔

بھلا اس سے بڑھ کر کسی قوم کی بدنصیبی اور کیا ہو سکتی ہے کہ خود اُسی قوم کا ایک سر آوردہ اور علماً ممتاز شخص علمی دنیا میں اپنی ہی قوم کی انتہا درجہ کی بے اعتباری، کمینہ خصلتی، خیانت و دغل، مثلاً حق پوشی، نفاق پرستی وغیرہ وغیرہ علانیہ بیان کرے، اور لطف یہ کہ وہ سراسر خلافِ واقع ہو، قوم کو کبھی آسمان پر چڑھائے اور کبھی تحت الثرے میں گرا دے، اور باوجود ادعائے عدل و انصاف یہ سب کچھ پوچ و گزاف ہو، اگر واقعی اگلے اور پچھلے سلمان، یعنی متقدمین و متاخرین دونوں ایسے ہی تھے کہ وہ دینی احکام و روایات میں ضروری اور حتمی قیدوں کو بھی محض تعصباً اڑا دیتے تھے تو ؎

اے وائے بریں امتِ اسلام و دگر ہیچ

"یہ غلطیاں اگرچہ سخت نتائج پیدا کرتی تھیں لیکن چونکہ ظاہر میں خفیف تھیں ابن الاثیر وغیرہ نے انکا کچھ خیال نہیں کیا"

کتنا سچا مضمون اور کیا معقول عذر ہے

"رفتہ رفتہ یہ غلطیاں اس قدر پھیل گئیں کہ عربی زبان سرتاپا اس سے معمور ہو گئی"

یہاں تک کہ ان غلطیوں کے مٹانے یا کم سے کم اُن پر متنبہ کرنے کے لیے خود خدا کو جناب مصنف کے خلق کی ضرورت لاحق ہوئی۔ ناظرین کے لیے خصوصیت کے ساتھ اس مقام پر یہ امر قابل لحاظ ہے کہ کہ تخطیہ اور رد و قدح کا دائرہ اب تک تو فقہ کی پچھلی تصنیفات ہی تک محدود تھا، لیکن اس قول میں اس دائرے کو تمام زبان عربی تک وسعت دیدی گئی، اور بات بھی یوں ہی ہے کہ انسان جب جھوٹ پر آئے تو پھر اچھی طرح کیوں نہ بولے "فقہا چونکہ تاریخ سے بہت کم واقفیت رکھتے تھے، اُنھوں نے بے تکلف انھیں غلط روایتوں کو قبول کر لیا، اور ان پر فقہ کے مسائل تفریع کر لیے"

بہت درست، فقیہ ابو یوسف بھی تاریخ سے جاہل تھے، کیونکہ اُنھوں نے بھی تو جیسا کہ کتاب الخراج کے حوالاتِ سابقہ سے ظاہر ہے انھیں غلط روایتوں کو قبول کیا ہے، جو صرف اس لیے غلط ہیں کہ وہ حسب منشائے مصنف مذکورہ بالا قیدوں اور خصوصیتوں سے مخلی ہونے کے بجائے معرّی ہیں، اور شاید یہی وجہ ہے کہ امام ابو حنیفہ نے جبکہ وہ ایک دفعہ فقیہ ممدوح کی عیادت سے واپس آرہے تھے، یہ کہا تھا کہ خدانخواستہ اگر یہ شخص ہلاک ہوا تو دنیا کا عالم ہلاک ہوا، دنیا کا عالم وہی شخص ہو بھی سکتا ہے جو خاصکر تاریخ سے بہت کم واقفیت یا دوسرے لفظوں میں جاہل ہو،

محمد جان

(الناظر، ستمبر ۱۹۱۹ء)

تنقید الفاروق

۲

اسکے بعد اگرچہ ترتیب کلام کا اقتضا یہ تھا کہ عقد زنار کا مسالہ حل کیا جاتا، لیکن چونکہ اسکے متعلق ہمارا ایک دلچسپ مستقل جواب علیحدہ موجود ہے جو عنقریب آتا ہے اور جہاں ہمنے مصنف کے خلاف اس بات کو اچھی طرح ثابت کیا ہے کہ یقیناً زنار کے معنی پیٹی کے نہیں ہیں، بلکہ ذمیوں کی بحث میں اس سے مراد وہی جنیؤ یا موٹا ڈورا ہے جسے فقہا کہتے ہیں، اسلیے ہم اس بحث کو یہاں قلم انداز کرتے ہیں اور بجائے اسکے جلاوطنی کی بحث کو لیتے ہیں۔

اس خاص بحث میں چونکہ مصنف نے یہ احتیاط کی ہے کہ اپنی عادت مستمرہ کے خلاف کسی شخص کو نگاہ عنایت کا بسمل نہیں بنایا ہے اس لیے ہم بھی اسکے متعلق زیادہ کاوش کو ضروری نہیں سمجھتے تاہم مصنف کے خلاف اس موقع پر اتنا ضرور کہیں گے کہ نجرانیوں کا اخراج یمن اور اُسکے اطراف سے جیسا کہ مصنف کا خیال ہے صرف پولٹیکل ضرورت سے نہیں تھا، بلکہ زیادہ تفحص سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ ضرورت کے علاوہ جب خود اہل نجران نے باہمی حسد کی بنا پر اپنے آپ جلاوطن کیے جانے کی درخواست حضرت عمر سے کی، اُس وقت اُنھوں نے اُنھیں خارج کیا، چنانچہ یہ مضمون بعض معتبر روایات میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ مذکور ہے، پس اس مقام پر مصنف ابن ابی شیبہ سے ایک روایت اس مضمون کی نقل کرتا ہوں جو سالم کی روایت سے منقول اور متصل السند بھی ہے، اور وہ یہ ہے

نا وکیع نا الاعمش عن سالم قال کان اہل نجران قد بلغوا اربعین الفاً قال وکان عمر یخافہم ان یمیلوا علی المسلمین فتحاسدوا بینہم فاتوا عمر فقالوا اجلنا قال وکان رسول اللہ قد کتب لہم کتابا ان لا یجلوا فاغتنمہا عمر فاجلاہم فندموا فاتوہ فقالوا اقلنا فابے ان یقیلہم[1]

سالم کہتے ہیں کہ نجرانیوں کا شمار چالیس ہزار تک پہونچ گیا تھا، حضرت عمر اس بات سے ڈرتے تھے کہ کہیں وہ مسلمانوں پر ٹوٹ نہ پڑیں، پھر آپ ہی اُنھوں نے باہم حسد کیا اور حضرت عمر کے پاس آکر کہا کہ ہمکو جلاوطن کر دیجیے (رسول اللہ نے اُنکو ایک نوشتہ دیا تھا جسمیں لکھا تھا کہ وہ جلاوطن نہ کیے جائیں) حضرت عمر نے اس موقع کو غنیمت سمجھا کہ درخواست خود انکی طرف سے ہوئی ہو پھر اُنھیں جلاوطن کر دیا، جب وہ نادم ہو کر پھر آئے اور حکم سابق منسوخی اور درگذر چاہا تو حضرت عمر نے نہ مانا۔

اس روایت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ گو حضرت عمر اہل نجران کے اجتماع سے خائف تھے لیکن تاوقتیکہ خود نجرانیوں نے باہمی حسد کی بنا پر اپنی طرف سے جلاوطن کیے جانے کی درخواست نہیں کی حضرت عمر نے اُنھیں جلاوطن نہیں کیا۔

نیز یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اہل نجران کے پاس جناب رسول اللہ کا ایک نوشتہ تھا جس میں آپنے لکھ دیا تھا کہ وہ جلاوطن نہ کیے جائیں، پھر کیونکر قیاس ہو سکتا ہے کہ حضرت عمر نے آنحضرت کے حکم کے خلاف بغیر اُنکی درخواست کے اپنی طرف سے (گو سخت سے سخت ضرورت کی بنا پر کیوں نہ ہو) اُنھیں جلاوطن کیا ہوگا،

اسکے بعد انھیں مباحث کے سلسلے میں مصنف نے جزیے کی بحث بھی چھیڑ دی ہے، یہ بحث بھی مصنف کی معرکۃ الآرا بحثوں میں سے ایک ہے، اسکے متعلق اگرچہ ہم نے ایک مختصر تنقید علیحدہ مصنف کے اُس قول پر کی ہے جہاں اُس نے الفاروق صفحہ ۱۶۸ میں لکھا ہے کہ جزیے کا مصرف فوجی مصارف پر محدود تھا یعنی اُس رقم سے صرف اہلِ فوج کے لیے خوراک، لباس اور دیگر ضروریات مہیا کی جاتی تھیں لیکن اسکے علاوہ ہم اس مقام پر دوسری حیثیتوں سے بحث کر کے مصنف کی دیانت اور تحقیق کو منظر عام میں لانا چاہتے ہیں،

مصنف نے اپنے اس دعوے پر کہ جزیہ صرف حفاظت کا معاوضہ تھا، جہاں اور بہت سے دلائل الفاروق وغیرہ میں لکھے ہیں، وہاں یہ بھی لکھا ہے کہ

خاص معرکہ یرموک کے پیش آنے کے وقت جب اسلامی فوجیں شام کے مغربی حصے سے ہٹ آئیں اور

---

[1] منقول از نسخہ قلمی موجودہ کتبخانہ مولانا عبدالحی مرحوم لکھنؤ،

انکو یقین ہوگیا کہ جن شہروں سے وہ جزیہ وصول کر چکے تھے یعنی حمص، دمشق وغیرہ وہاں کے باشندوں کی

حفاظت کا اب وہ ذمہ نہیں اُٹھا سکتے تو جزیہ سے جس قدر رقم وصول ہوئی تھی سب واپس کر دی گئی،

اور اُن سے صاف کہہ دیا گیا کہ چونکہ ہم اس وقت تمہاری حفاظت نہیں کر سکتے، اس لیے ہم کو جزیہ

کے لینے کا کوئی حق نہیں"

بیشک یہ صحیح ہے کہ حضرت ابو عبیدہ نے اس نازک وقت میں عام طور پر تمام عمالانِ ماتحت کو لکھا تھا کہ

وہ اُن رقوم کو واپس کر دیں جو اُنھیں جزیے سے وصول ہوئی ہیں، لیکن واقعہ کی خاص خصوصیتیں

جنھیں مصنف نے قلم انداز کر دیا ہے یہ ہیں،

(۱) اس میں جزیہ کی کوئی تخصیص نہیں تھی، بلکہ خراج سے جو رقم وصول ہوئی تھی اُسکی بھی واپسی

کا حکم تھا جو ایک معنی خیز امر ہے،

۲ اس واپسی کی وجہ جن الفاظ میں بیان کی گئی تھی وہ یہ ہیں،

انما رددنا علیکم اموالکم لانہ قد بلغنا ما جمع لنا من الجموع
وانکم قد اشترطتم علینا ان نمنعکم وانا لا نقدر علی ذلک

جتنے تمہارے مال کو اس لیے واپس کر دیا ہے کہ ہم کو دشمنوں کی تیاری کی خبر ہو گئی
ہے، اور تم لوگوں نے ہم سے شرط کی تھی کہ ہم تمہاری حفاظت کریں، یہ بات ہم نہیں کر سکتے

جس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ واپسی کی بڑی وجہ یہ تھی کہ مفتوحین نے خاص طور پر اپنی حفاظت

کی شرط لگائی تھی جسے ابو عبیدہ نے بھی تسلیم کر لیا تھا اور اُس وقت اُس شرط کا ایفا نہیں ہو سکتا تھا،

۳ - معاہدات شام میں امیر فوج حضرت ابو عبیدہ کا ایسی شرطوں کو تسلیم کرنا اور مفتوحہ قوموں

کو اُنکے مطلوبہ حقوق کا دینا محض تالیفِ قلوب کی حکمت عملی پر مبنی تھا اور اس میں یہ غایت مضمر تھی کہ

دوسری قومیں بھی سن سن کر مصالحت کی طرف جلد جلد مائل ہوتی جائیں، خاص الفاظ یہ ہیں،

انما کان ابو عبیدة یجیبہم الی الصلح علی ہذہ الشرائط
ویعطیہم ما سألوا یرید بذلک تالفہم ویسمع بہم غیرہم
من اہل المدن التی لم یطلب اہلہا الصلح فیسارعوا
الی طلب الصلح،

حضرت ابو عبیدہ جو ان شرطوں پر صلح کر لیتے تھے اور جو حق وہ
مانگتے تھے وہ اُنھیں دیتے تھے اس سے غرض تالیف قلب تھی اور یہ
کہ دوسرے شہر والے جنھوں نے ابھی تک صلح نہیں کی ہے اس
بات کو سنیں اور صلح کی طرف پیش قدمی کریں،

اس سے قیاس ہو سکتا ہے کہ شرط حفاظت کو عموماً داخل معاہدات کرنا ایک ضروری مصلحت پر مبنی تھا

نہ خاص اس لیے کہ جزیہ کے واسطے حفاظت کی شرط ایک لازم غیر منفک بات تھی،

۴ - جزیے کی کل رقم واپس نہیں ہوئی تھی بلکہ صرف وہ رقمیں دی گئی تھیں جو شہروں سے وصول ہوئی تھیں، اور دیہات کی کل وصول شدہ رقمیں بجائے واپس دینے کے مسلمانوں میں تقسیم ہوئیں اور یہ بھی ایک معنی خیز امر ہے، خاص الفاظ یہ ہیں،

وما كان ابو عبيدة اخذه من القرى التي حول المدن من الاموال والسبي والمتاع فلم يرده عليهم وقسمه بين المسلمين بعد ان، الخ

حضرت ابو عبیدہ نے دیہاتوں سے جو مال و متاع لونڈی غلام وغیرہ لیے تھے اُنھیں واپس نہیں دیا بلکہ اُن کو مسلمانوں میں تقسیم کیا، الخ

۵ - جو رقمیں واپس دی گئی تھیں پھر اُنکو دوبارہ واپس کرنے کے لیے خود باشندگان شہر اُسوقت لائے جبکہ حضرت ابو عبیدہ دوبارہ ان اضلاع میں ہوکر گذرے اور انھوں نے شرائط سابقہ پر اُنھیں بحال رکھا، خاص الفاظ یہ ہیں،

وكلما مر على مدينة مما كان صالح اهلها وكان اليه فيها قدر وعليهم ما كان اخذ منهم تلقوه بالاموال التي كان ردها عليهم مما كانوا صولحوا عليه من الجزية والخراج، الخ[۱]

جب وہ کسی ایسے شہر میں گذرتے جہاں کے لوگوں نے صلح کر لی تھی اور حاکم نے وصول شدہ جزیے اور خراج کی رقمیں انکو واپس دی تھیں تو وہ لوگ پھر اُن مالوں کو لیکر آتے اور حضرت ابو عبیدہ سے ملتے ؛

اب ان قلم انداز باتوں کو بھی پیش نظر رکھ کر انصاف سے دیکھنا چاہیے کہ جزیہ مقرر کرتے وقت خاص حفاظت کی شرط کو اپنے اوپر لازم کر لینا کن اسباب کی بنا پر تھا ؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ خیال بہت صحیح ہے کہ وضع جزیہ کے بعد اکثر صورتوں میں مسلمانوں پر ضرور تھا کہ وہ اہلِ ذمہ کی حفاظت کریں، لیکن کلام اس میں نہیں، بلکہ اس میں ہے، اور دیکھنا بھی خاصکر یہ ہے کہ آیا جزیہ اہل ذمہ کی صرف اُس حفاظت کا معاوضہ تھا جو بیرونی حملوں سے اُنکی کیجاتی تھی، یا یہ کہ اسلام کو قبول نہ کرنے کے بعد شارع نے محض ترحماً ایک زائد صورت اُنکی جان بچانے کی یہ نکالی تھی، کہ وہ جزیہ دیں جس کے بعد وہ قتل سے محفوظ رہیں گے،

جہاں تک میں خیال کرتا ہوں اس بحث کے متعلق مصنّف کی تمام خامہ فرسائی کا اصل اصول ایک امر معلوم ہوتا ہے، اس لیے مناسب بلکہ ضروری ہے کہ اُس پر بڑی احتیاط سے نظر ڈالی جائے سب سے پہلے جب ہم اس باب میں اسلام کی حقیقی و اصلی کتاب قرآن مجید کی طرف

۱؎ اس عبارت اور عبارات سابقہ کے لیے ملاحظہ ہو کتاب الخراج صفحہ ۸۱

بحث کرتے ہیں۔ تو نہایت خوشی سے دیکھتے ہیں کہ اللہ سبحانہ نے صاف لفظوں میں سورۂ توبہ کے اندر یہ آیت نازل فرمائی ہے

وقاتلوا الذین لا یومنون باللہ ولا بالیوم الاخر (الآیۃ) | اور ان لوگوں سے مقاتلہ کرو جو خدا پر اور قیامت کے دن پر ایمان نہیں لاتے

یہ آیت ذمیوں کے باب میں بغیر کسی پیچیدگی کے نہایت واضح طور پر پکار کے کہہ رہی ہے کہ اُن سے لڑو اور مقاتلہ کرو یہاں تک کہ وہ ذلیل ہو کر ہاتھ سے جزیہ دیں، جزیہ دینے کو مقاتلہ کی غایت قرار دینا، اسکے صریح یہ معنی ہیں کہ جب تک وہ جزیہ قبول نہ کریں، اُنکے مقاتلہ سے باز نہ رہو، ہاں جب جزیہ دیں تو اُنکی جان بخشی کرو،

اس سے ایک غیر متعصب انصاف پسند شخص سمجھ سکتا ہے کہ جزیہ اصلی طور پر فی حد ذاتہ کیا حیثیت رکھتا تھا؟ جزیہ صرف قتل سے بچنے کے لیے ایک سپر تھی جسکی آڑ میں اہل ذمہ مسلمانوں کی تلوار سے پناہ لیتے تھے، یہ شارع کا وہ قرارداد ٹکیس تھا جسے دے کر وہ فاتح قوم کے قتل سے اپنے لیے ذریعۂ نجات حاصل کرتے تھے، اگرچہ شارع کی فیاضی اور مزید عنایت سے بعد میں اور بہت سے حقوق کے علاوہ یہ حق بھی اُنھیں دیا گیا کہ بسا اوقات بیرونی حملوں سے اُنکی حفاظت کا ذمہ اپنے اوپر لیا گیا، لیکن اس سے صحیح طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ دشمنوں سے بچانے اور اُنکی طرف سے لڑنے کا ایک معاوضہ تھا جسے اہل ذمہ مسلمانوں کو بطور اجرت و معاوضہ کے دیتے تھے، حدیث اور آثار صحابہ میں اگرچہ ایسی تصریحیں جو بالکل قاطع احتمالات ہوں قریباً نہیں ہیں، لیکن سچ یہ ہے کہ قرآن کی اس واضح تعلیم کے ہوتے ہوئے ہم کو اُن تصریحات کی ضرورت بھی نہیں ہے، مگر دقت یہ ہے کہ جو لوگ مورخانہ تحقیق کو صرف تاریخ کی چند کتابوں کی اوراق گردانی پر منحصر سمجھتے ہیں، اُنکی تسلی صرف اسقدر سے نہیں ہو سکتی، اس ضرورت اور صرف اس ضرورت سے ہم تاریخی حیثیت سے بھی اس بحث پر نظر ڈالنا چاہتے ہیں،

اولاً خود مضمون نے الجزیہ میں جہاں یزدگرد کے پاس نعمان بن مقرن کا بطور سفیر کے جانا لکھا ہے وہاں نعمان کی سفارتی گفتگو کا خاتمہ مع ترجمہ یہ بیان کیا ہے،

وان اتقیتمونا بالجزاء قبلنا ومنعناکم[1] | یعنی اگر جزیہ ادا کرنے کے ذریعہ سے جان بچاؤ گے تو ہم قبول کرینگے اور تمکو تمہارے دشمنوں سے بچائینگے

---

[1] رسائل شبلی صفحہ ۲۰۰

انصاف سے کہو کیا یہ اس بات کی تصریح بلکہ اقرار نہیں ہے کہ جزیہ دراصل ذمیوں کے لیے مسلمانوں کے ہاتھ سے جان بچانے کا ایک ذریعہ تھا، لیکن نظر بمصالح اُسکے ساتھ مزید رعایت یہ تھی کہ مسلمان اکثر اُنکی بیرونی حفاظت کا ذمہ بھی کر لیتے تھے، (اتقیتمونا کے لفظ پر غور کرو پھر وسعناکم کی الگ تصریح دیکھو)[1]

اسکے علاوہ شام کی فتح میں جب ممالک مفتوحہ کی تقسیم اور رعایا کے لونڈی غلام بنانے کے متعلق اہل فوج کا اصرار ہوا تو حضرت عمرؓ نے ابو عبیدہ کو جو جوابی فرمان بھیجا تھا اُس میں یہ الفاظ تھے،

لا سبیل لک علیھم وانا للمسلمین معک ان نجعلھم فیئًا وتقسمھم للصلح الذی جری بینک وبینھم ولاخذک والجزیۃ منھم بقدر طاقتھم ۔۔۔ فاذا اخذت منھم الجزیۃ فلا شیٔ لک علیھم ولا سبیل ۔۔۔ فاضرب علیھم الجزیۃ وکف عنھم السبی[2]

تم کو اور تمھارے ہمراہی مسلمانوں کو اب یہ حق نہیں ہے کہ تم اُنکو فئ قرار دیکر باہم بانٹ لو اس لیے کہ تم میں اور اُن میں صلح ہو چکی ہے اور تم نے اُن سے جزیہ بھی لے لیا ہے ۔۔۔ جب تم نے ان سے جزیہ لیا تو اب تمھارا کوئی حق اپر نہیں ہے ۔۔۔ اپر جزیہ مقرر کرو، اور لونڈی غلام نہ بناؤ،

ان الفاظ میں صاف طور پر جو جزیے کی اصلیت سمجھائی گئی ہے، ظاہر ہے، یعنی یہ کہ جزیہ بجاے اسکے کہ اہل ذمہ کو اُنکے بیرونی دشمنوں سے بچانے کا کوئی معاوضہ یا بدل ہو، وہ خاص اُنکی جان بخشی کا معاوضہ ہے، اور جب شارع نے جزیہ لیکر اُن کی عقب گذاری اور جان بخشی کا حکم دیا ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ مسلمان جزیہ لینے کے بعد بھی اُنکے نفوس سے تعرض کریں، اور اُنھیں ناجائز طور پر لونڈی غلام بنائیں، قاضی ابو یوسف کتاب الخراج میں ایک جگہ صاف صاف لکھتے ہیں،

ولا یحل للوالی ان یدع احدا من النصاری والیھود والمجوس والصابئین والسامرۃ الا اخذ منھم الجزیۃ ۔۔۔ لان دمائھم واموالھم انما احرزت باداء الجزیۃ[3]

حاکم کو یہ جائز نہیں ہے کہ نصرانیوں اور یہودیوں، مجوسیوں صابیوں، سامرہ میں سے کسی کو بھی بغیر جزیہ لیے چھوڑے اس لیے کہ جزیہ ہی کے دینے سے اُنکے خون اور مال و دولت بچائے گئے ہیں،

---

[1] معرکۂ فارس میں سعد نے رستم سے سفارتی گفتگو کرنے کے لیے ربعی بن عامر کو بھیجا تھا اُنھوں نے بھی اپنی تقریر میں صاف صاف فرمایا تھا اخترنا الاسلام، ندعک ارضک، او الجزیۃ نقبض ونکف عنک، ان احتجت الینا نصرناک او المنابذۃ فی الرابع الخ (اخبار فارسیہ صفحہ ۹۵ - ابن خلدون) اس عبارت میں بھی نقبض ونکف عنک اور وان احتجت الینا نصرناک کو غور سے پڑھو اور سمجھو کہ خود صحابہ رضی اللہ عنھم جزیہ کی حقیقت کیا سمجھے ہوے تھے۔ [2] کتاب الخراج صفحہ ۸۲ [3] ایضاً صفحہ ۷۰،

آخری جملہ بتلائیے کہ رہا ہے کہ جزیہ دراصل کوئی اُجرت نہ تھی بلکہ وہ جان بخشی کا معاوضہ تھا جسکے بعد اہل ذمہ کی جان ومال سے تعرض نہیں ہوتا تھا،

اس قدر لکھنے کے بعد اب ہم مصنف کے اور استدلالات پر بھی ایک اجمالی نظر ڈالنا چاہتے ہیں الفاروق اور خاص کر الجزیہ میں مصنف نے اپنے دعوے کو ثابت کرتے ہوئے مختلف معاہدات کی ان عبارتوں سے بھی استناد کیا ہے جن میں بیان ہے کہ ذمیوں سے فوجی خدمت لینے کی صورت میں جزیہ معاف کر دیا جائے، بلکہ اُسکے استدلال کا ایک کافی حصہ ایسی ہی عبارتیں ہیں، لیکن ہم نہیں سمجھ سکتا کہ کسی حاکم یا بادشاہ کے اس فعل سے کہ وہ اپنی محکوم رعیت سے کسی نمایاں خدمت سے خوش ہو کر اپنا کوئی حق اُسے معاف کر دے، یہ کیونکر ثابت کیا جائیگا کہ اصل میں بھی وہ حق اُسی خدمت کا معاوضہ تھا،

مثلاً آج کوئی زمیندار اپنی کسی رعیت سے صرف اس لیے خوش ہو کر برس دو برس کا خراج لے معاف کر دے کہ اُس نے زمیندار کو اُسکے دورے کے وقت شکار میں مدد دی تھی، یا یہ کہ اُسے ایک نازک موقع پر مثلاً شیر کے حملے سے بچایا تھا، تو کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ واقع میں ہی خراج، شکار میں مدد دینے یا شیر سے بچانے کا معاوضہ تھا؟

معہذا، اگر خود غرضی نے مصنّف کو خلاف گوئی پر مجبور نہیں کیا ہے، اور فی الواقع امر حق کے انکشاف دل سے چاہتا ہے تو ہمارے نزدیک اُسکو چاہیے کہ وہ قدرت کے اُس بیش بہا عطیہ سے جسکا نام آنکھ ہے، پورے طور پر کام لے، یعنی اگر اُس نے اب تک صرف ایک آنکھ سے اُن معاہدات کو دیکھا ہے جن میں خاص خاص موقعوں پر جزیے کی معافی مذکور ہے، تو اب وہ دوسری آنکھ سے ذیل کے اُن معاہدات کو بھی دیکھے جن میں نہایت صاف اور کھلے لفظوں میں اصل مدعا کی تائید کے علاوہ اسکی بھی تصریح ہے کہ ہم جزیہ لینے کے باوجود بھی تمہاری حفاظت اور تمہاری طرف سے لڑنے کے ذمہ دار نہیں ہیں،

یہ معاہدے مورخ بلاذری نے فتوح البلدان میں نقل کیے ہیں اور ہم اُسی کے حوالہ سے اس مقام پر لکھتے ہیں،

پہلا معاہدہ جس میں مصنّف کے خلاف اس بات کی صاف تصریح ہے کہ ہم جزیہ بھی لیں گے اور معہذا تمہارے دشمنوں سے لڑیں گے بھی نہیں، کتاب فتوح البلدان بلاذری میں بہ ایں الفاظ منقول ہے،

فصالحهم على سبعة آلاف ومائتي دينار يؤدونها في كل عام وصالحهم الروم على مثل ذلك ثم يؤدون خراجين واشترطوا ان لا يمنعهم المسلمون اداء الصلح الى الروم واشترط عليهم المسلمون ان لا يقاتلوا عنهم من ارادهم من ورائهم وان يؤذنوا المسلمين بسير عدوهم من الروم[1]

پھر اُن سے سات ہزار دو سو دینار سالانہ ادا کرنے پر صلح کی اور رومیوں نے بھی اُن سے اتنے ہی پر صلح کی تو وہ دوہرا خراج ادا کرتے تھے، انکی شرط مسلمانوں سے یہ تھی کہ مسلمان انھیں رومیوں کو رقم صلح ادا کرنے سے منع نہ کریں، اور مسلمانوں نے یہ شرط کی تھی کہ وہ انکے دشمنوں کے ساتھ انکی طرف سے نہیں لڑیں گے، اور اُن لوگوں پر لازم تھا کہ وہ مسلمانوں کو دشمنوں کی نقل و حرکت سے اطلاع بھی دیں،

دوسرا معاہدہ[2] جس میں علی رغم مخالف اس بات کی تصریح ہے کہ جزیہ برقرار ہے اور اگر کسی وجہ سے ہم تمہاری حفاظت یا مدد نہ کرسکے اور تمہارے دشمن تم پر غالب آگئے، تو اسکے ہم جواب دہ نہیں، اور نہ یہ امر نقض عہد ہوسکتا ہے، خاص الفاظ یہ ہیں،

وان اجبتم واقمتم الصلوٰة فاخواننا في الدين والا فالجزية عليكم وان عرض للمسلمين شغل عنكم فقهركم عدوكم فغير ماخوذين بذلك ولا هو ناقض عهدكم[2]

اگر تم نے رجوع کیا، اور نمازیں قائم کیں تو ہمارے دینی بھائی ہو، ورنہ تم پر جزیہ مقرر ہوگا، اور اگر مسلمانوں کو کوئی مشغولی پیش آگئی اور تمہارے دشمن تم پر غالب آگئے تو اسکے نہ تو وہ جواب دہ ہونگے اور نہ یہ امر باعث نقض عہد ہوسکتا ہے،

تیسرا معاہدہ[3] اس میں یہ تصریح ہے مخاطب (جو ایک معزز نصرانی تھا) اگر اپنے دین پر قائم رہے تو جزیہ دینا لازمی ہے، یا بالفاظ دیگر، غیر مذہب شخص کا اپنے دین پر قائم رہنا ہی ایجاب جزیہ کے لیے کافی ہے، کما سبق منا فیما سبق، خاص الفاظ یہ ہیں،

ان جبلة اتى عمر بن الخطاب وهو على نصرانية فعرض عمر عليه الاسلام واداء الصدقة فابى ذلك وقال اقيم على ديني وادوي الصدقة فقال عمر ان اقمت على دينك فاد الجزية فانف منها[3]

جبلہ حالت نصرانیت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا حضرت عمرؓ نے اسپر اسلام پیش کیا اور زکوٰۃ ادا کرنے کو کہا، اُسنے انکار کیا اور کہا میں اپنے دین پر قائم رہونگا، اور صدقۂ زکوٰۃ ادا کرونگا، حضرت عمر نے کہا اگر تو اپنے دین پر قائم رہیگا تو جزیہ دے، اسپر اُسنے ناک بھوں چڑھائی۔

چوتھا معاہدہ۔ اس میں مصنف کے خلاف اس بات کی توضیح ہے کہ جزیہ اور خراج پر جو صلح واقع ہوئی، وہ اس بنا پر ہے کہ مفتوحین قتل نہ کیے جائیں اور نہ انھیں لونڈی غلام بنایا جائے وغیرہ

صالح اہل الدامغان ودراباذ مقتبة على الجزية و

دامغان اور دراباذ والوں نے جزیہ و خراج پر مقتبہ سے صلح

---

[1] فتوح صفحہ ۱۶۰ [2] فتوح صفحہ ۲۱۰ [3] فتوح صفحہ ۱۴۲ و ۱۴۳۔

الخراج علی ان لا یقتلوا ولا یسبوا ولا یمنعوا طریقاً یسلکونہ | کرلی، اس شرط سے کر وہ قتل نہ ہوں، اور نہ لونڈی غلام بنائے جائیں اور نہ اپنے اختیار کردہ طریقے سے روکے جائیں،

اب اگر انصاف اور انصاف کے ساتھ خوفِ خدا بھی ہو تو مصنف کو چاہیے کہ وہ ان معاہدات کو بھی پیش نظر رکھ کر بتائے کہ ان سے جیسا کہ مصنف کا خیال ہے آیا یہ ثابت ہوتا ہے کہ جزیہ صرف بیرونی حفاظت کا معاوضہ یا حق المحنت تھا؟ یا یہ کہ بخلاف اسکے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جزیہ فی حد ذاتہ ایک ذریعۂ جان بخشی تھا جس سے غیر قومیں مسلمانوں کے ہاتھوں سے اپنی جان و مال بچا سکتی تھیں گو کہ اکثر اُنکی بیرونی حفاظت کا ذمہ بھی مسلمان کر لیتے تھے،

یہ بات کہ جزیہ لینے کے باوجود بھی ہم تمہاری حفاظت کے ذمہ دار نہیں، جیسا کہ پہلے اور دوسرے معاہدہ کے الفاظ صاف صاف بتا رہے ہیں، ایک نہایت روشن دلیل اس امر کی ہے کہ جزیہ فی الواقع کوئی اجرت یا حق المحنۃ نہ تھا، اور کہ مصنف نے جو کچھ اُسکا منشا سمجھا ہے غلط ہے،

معزز ناظرین! یہ تھی مصنف کے اُن مباحث کی حقیقت جن کی بنا پر اُس نے فقہاء و متاخرین اہل تاریخ پر نہایت رکیک الزامات عائد کرنے میں آسمان و زمین کے قلابے ملا دیے ہیں، جن کے انکشاف نفس الامری کو وہ اپنے مختصات میں سے سمجھتا ہے، اور جن کے متعلق بڑی بیباکی اور ناانصافی کے ساتھ اُسکا یہ خیال ہے کہ نہ صرف متاخرین علما بلکہ قدما بھی ایک مدت دراز سے غلطی و جہالت میں گرفتار چلے آتے ہیں،

طوالت کے لحاظ سے اب میں اس بحث کو یہیں ختم کرنے کے بعد چاہتا ہوں کہ اپنی اس تنقید کے خاتمہ پر بعض اُن اختلافی مباحث پر بھی ایک روشنی ڈالوں، جن کی نسبت مصنف کا خیال ہے کہ وہ بھی متعصب فقہا کی تنگ گیری کے نتائج ہیں، اور جن کا ذکر مصنف نے اپنی کسی نہ کسی تصنیف میں مخالفانہ و معترضانہ پیرایہ میں کیا ہے،

ان مباحث کے سلسلے میں ایک سلام کا مسئلہ ہے جسکے متعلق مصنف نے رسائل شبلی صفحہ ۷۵ میں لکھا ہے کہ

"مخالفوں کی طرف سے ایک خود متعصب مسلمانوں کی طرف سے بڑا استدلال یہ پیش کیا جاتا ہے کہ رسول اللہ

---

[1] فتوح صفحہ ۱۴۱'۳"

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود یہ حکم دیا تھا کہ عیسائیوں اور یہودیوں کو سلام نہ کرو . . . . یہ اور اسی قسم کی روایتیں بہت زیادہ شہرت پکڑ گئی ہیں اور ہمارا فرض ہے کہ ہم اس راز سے بالکل پردہ اُٹھا دیں“

تم کلامہ۔ اسکے بعد مصنف نے اپنی عادت مستمرہ کے موافق پردہ اُٹھایا ہے، لیکن چشم بد دور، اس محبوبانہ انداز سے، کہ خود اُس پردے کو اُٹھا کر اپنی ہی آنکھوں پر ڈال لیا ہے، ورنہ یقیناً کوئی وجہ نہ تھی کہ اُس کو صحیح مسلم جیسی حدیث کی نہایت معروف و مستند کتاب میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذیل کا حکم جو کہ یہود و نصاریٰ ہی کے باب میں ابتدا السلام کی ممانعت کے متعلق ہے نظر نہ آتا، یعنے

لا تبدؤا الیہود والنصاریٰ بالسلام الحدیث[1] یہود و نصاریٰ سے ابتدا اسلام نہ کرو۔ الخ

اب میں نہیں سمجھ سکتا کہ جن سچے اور نیکدل مسلمانوں نے اس ارشادِ نبوی کے موافق کوئی واقعی استدلال پیش کیا وہ خواہ مخواہ کیوں متعصب ہو گئے؟ اگر وجہ تعصب صرف یہی ہے کہ اُنھوں نے حدیث صحیح کے مطابق ایک بات کہی تو میرے نزدیک ہر مسلمان نہایت خوشی سے متعصب بننے کے لیے آمادہ ہوگا۔ اور بے شبہہ سچے مسلمانوں کے نزدیک ایسا تعصب شرافتِ اسلام کا تمغائے اسلام ہے[2]۔

مصیبت یہ ہے کہ یہاں تو حدیث صحیح کے مطابق ایک بات کہنے پر جنابِ مصنف کو ایسا جوش آیا کہ بجود ہو کر اُنھوں نے متبعانِ حدیث کو فوراً متعصب کہدیا، اور ساتھ ہی بلا توقف پردہ اُٹھانے کی بھی ٹھیر ادی، لیکن خیر سے آپ ہی رسائل شبلی صفحہ ۴۷ میں یوں زمزمہ پیرا ہوتے ہیں کہ

”اسلام صرف اُن مسائل اور احکام کا نام ہے جو قرآن مجید یا احادیث صحیحہ سے ثابت ہوں، اسکے سوا جو کچھ ہے گو اُس نے قوم میں اور ملک میں کوئی اعتبار حاصل کر لیا ہو، لیکن وہ اسلام کا اصلی قانون نہیں ہے“

---

[1] دیکھو تلخیص ابن حجر صفحہ ۳۷۹ بحوالہ مسلم بروایت ابی ہریرہ، تلخیص کے علاوہ اذکار نووی وغیرہ کتب حدیث میں بھی یہ روایت موجود ہے ۱۲

[2] لطف کی بات یہ ہے کہ اسی ابتدا اسلام کی ممانعت کو شاہ ولی اللہ صاحب جو اسرار و حقائق دین کے بہت بڑے ماہر تھے نہ صرف ایک صحیح و ثابت مسئلہ اپنی کتاب حجۃ اللہ صفحہ ۳۷۹ میں اسکا یوں بیان کرتے ہیں اقول سرہ ان احدی المصالح التی بعث النبی صلی اللہ علیہ وسلم لہا التنویہ بالملۃ او سیاسیۃ وجعلہا اعلی الملل وعلوہا لا یتحقق الا بان یکون لہم طول علی من سواہم ۔ مگر جناب مصنف اسکو ایک غیر شرعی اور تعصبی بات فرماتے ہیں حالانکہ شاہ صاحب کی نسبت خود مصنف ہی کا قول ہے کہ وہ ایسے شخص تھے کہ انکی نکتہ سنجیوں کے آگے غزالی، رازی، اور ابن رشد کے کارنامے بھی ماند پڑ گئے۔

جسکا ماحصل یہ ہے کہ ابتدا اسلام کی ممانعت یہود و نصاریٰ کے متعلق جو آں حضرت سے بطریق صحیح مروی ہے اور جو صحیح مسلم جیسی حدیث کی نہایت معتبر کتاب میں آج بھی موجود ہے، وہ خود جناب مصنف ہی کے بیان کے مطابق اسلام کا حقیقی مسالہ بلکہ عین اسلام ہے،

ایک اور مقام پر یعنی رسائل شبلی صفحہ ۵۴ میں یوں ارشاد ہوتا ہے کہ

"پادری وغیرہ اپنے منصب پر بحال رہیں گے، اور مذہب سے کچھ تعرض نہ کیا جائیگا، یہ خاص رسول اللہ کے احکام ہیں اور اس لیے دوسرے لفظوں میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ خاص اسلام کے احکام ہیں"

سبحان اللہ! یہ عجیب نیچرل منطق ہے کہ جو بات حدیث صحیح سے ثابت ہو، وہی اسلام اور اسلام کا قانون بھی ہو، اور وہی جناب مصنف کے نزدیک تعصب بھی ہو، رسول اللہ کا خاص حکم، اسلام کا خاص حکم بھی ہو، اور وہی وہ بات بھی ہو جسکے ماننے سے غریب مسلمان کٹر، متعصب بھی کہلائیں؛

تفو بر تو اے چرخِ گرداں تفو

جناب مصنف نے نئی عبادت گاہوں کے بنانے کے مسائل کو بھی جسے میں نے ذکر کیا ہے الفاروق میں صرف نقل اعتراض کے موقع پر ذکر کرکے بے جواب چھوڑ دیا ہے، اگرچہ اسکے متعلق مختلف تحریریں میں مصنف کی مختلف صدائیں اُسکی باد فروشی کا اعلیٰ ثبوت دے رہی ہیں، چنانچہ رسائل شبلی صفحہ ۵۸ میں مخالفین کے اس اعتراض کو کہ مسلمانوں کے عہد میں نئے گرجاؤں یا بتخانوں کے بننے کی اجازت نہ تھی نقل کرکے وہ لکھتا ہے کہ یہ اُنکی سرسری معلومات کا نتیجہ ہے، حالانکہ سیرۃ النعمان صفحہ ۲۶۰ میں یوں لکھ چکا ہے کہ

"البتہ امام ابو حنیفہ نے یہ حکم دیا ہے کہ اہل ذمہ اسلامی شہروں میں اپنی عبادت گاہیں نہ بنائیں، لیکن اُن کا مقصد صرف اس قدر تھا کہ امن وامان میں خلل نہ ہو۔" الخ'

اسکے بعد ہی اسی صفحہ میں ارشاد ہوتا ہے

"مسلمانوں کے آباد کردہ جو دو چار شہر تھے اُن کے سوا باقی تمام ملک میں عموماً ذمیوں کو عبادت گاہوں کے بنانے کی اجازت تھی۔"

بجائیکہ رسائل شبلی صفحہ ۵۸ میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی منقول ہونا بتایا ہے کہ قدیم

شہروں میں جو مسلمانوں کے آباد کردہ نہیں ہیں وہاں ذمیوں سے جو معاہدہ ہے مسلمانوں کو اسکا پورا کرنا ضرور ہوگا، جس کا ماحصل یہ ہے کہ عموماً تمام بلاد قدیم میں ذمیوں کو نئی عبادت گاہیں بنانے کی کوئی عام اجازت نہیں، بلکہ یہ بات معاہدے کی نوعیت پر منحصر ہے جیسا معاہدہ ویسی اجازت یا عدم اجازت لیکن شکر ہے کہ الفاروق کی تحریر کے وقت مصنف کا اضطراب بالکل دفع ہوگیا، اُسکے متضاد اور پریشان خیالات کا رخ ہوا کے رخ سے نکل گئے، حضرت عبداللہ بن عباس کے فتوے ذیل سند الفاروق میں اُنکی زبان پکڑلی اور یوں بیچارے فقہا اُسکے تخامل بیجا سے نجات پاگئے۔ کتاب الخراج صفحہ ۸۸ میں ہے۔

عن ابن عباسؓ سُئل عن العجم الھم ان یحدثوا بیعۃ او کنیسۃ فی بلاد امصار المسلمین فقال اما مصر مصرتہ العرب فلیس لھم ان یحدثوا فیہ بناء بیعۃ ولا کنیسہ ۔۔ وکل مصر کانت العجم مصرتہ ففتحہ اللہ علی العرب فنزلوا علی حکمھم فللعجم ما فی عہدھم وعلی العرب ان یوفوا بذلک۔	حضرت ابن عباس سے سوال کیا گیا کہ آیا عجمی لوگ مسلمانوں کے شہروں میں نئی عبادتگاہیں بناسکتے ہیں؟ آپنے فرمایا کہ جو شہر مسلمانوں کے آباد کردہ ہیں اُنمیں وہ نئی عبادتگاہیں نہیں بناسکتے اور جو شہر عجمیوں نے خود آباد کیا ہے لیکن وہ مسلمانوں کے ہاتھ پر فتح ہوا اور عجمی محکوم ہوکر وہاں رہے، تو اُس میں عہدنامہ کے موافق عجمیوں کو اُن کے حقوق ملیں گے اور مسلمان ایفاء عہد کے پابند ہوں گے،

کتاب الخراج صفحہ ۸۰ کی یہ عبارت بھی لاحظہ طلب ہے

واما ما احدث من بناء بیعۃ او کنیسۃ فان ذلک یھدم[ل]	لیکن نئی عبادت گاہیں جو بنائی گئی ہیں وہ گرادی جائیں گی۔

کیا اب بھی جناب مصنف اسکو متاخرین فقہا کی ایجاد، اور اسے بھی فقہ کی پچھلی تصنیفات ہی کی جدت گوئیاں قرار دیں گے؟

رسائل شبلی صفحہ ۶۲ میں آپ نے اس مسئلہ کو بھی چھیڑا ہے کہ ذمی راستے میں مسلمانوں سے بچکے نکلیں، لیکن کمال یہ کیا ہے کہ عیسائی مصنفوں کی طرف سے منجملہ اور چند اعتراضوں کے اس اعتراض کو بھی نقل کرکے نہایت دلیری کے ساتھ یہ لکھ دیا ہے، کہ ہم بے شبہ تسلیم کرتے ہیں کہ فقہ کی پچھلی تصنیفات میں ذمیوں کی نسبت یہ احکام موجود ہیں لیکن ہمارا یہ دعوی ہے کہ یہ احکام خدا کے، رسول کے، صحابہ کے،

[ل] صفحہ ۷، کتاب الخراج میں قاضی ابویوسف فرماتے ہیں ولینوا من ان یحدثوا بناء بیعۃ او کنیسۃ فی المدینۃ الا ما کانوا صولحوا علیہ آہ ۔ ۱۲

ائمۂ مجتہدین کے احکام نہیں ہیں، اسی کے ساتھ ہمارا یہ بھی دعوے ہے کہ یہ احکام کسی زمانہ میں رواج نہیں پائے، جہاں تک میں خیال کرتا ہوں مصنّف کو چاہیے کہ وہ اس پچھلے غلط، بے تکے، اور مہمل دعوے کو تو صندوق سینہ میں مقفل کرکے رکھ دے، اس لیے کہ قطع نظر اسکے کہ یہ ایک ادعائے محض ہو کسی اسلامی حکم کا کسی زمانے میں رواج نہ پانا یقیناً اس بات کی دلیل نہیں ہو سکتا کہ وہ حکم واقع میں بھی اسلامی احکام کے دائرے سے باہر ہے،

البتہ دعوے اول قابلِ لحاظ ہے، لیکن میں مصنف کے خلاف علانیہ کہتا ہوں کہ یہ دعویٰ بھی محض غلط اور بے بنیاد ہے، منجملہ اُن چند باتوں کے ایک یہ بات کہ ذمی راستہ میں مسلمانوں سے بچکر چلیں، اسکے متعلق صاف طور پر حدیث صحیح موجود ہے کہ راستہ میں ذمیوں کا تادباً مسلمانوں سے بچکر نکلنا تو کیا، خود مسلمان اگر راستہ میں ذمیوں سے ملیں تو اُنکو حکماً تنگ راستہ کی طرف جانے پر مجبور کریں، ملاحظہ ہو نلمنیس انجیریہ صفحہ ۲۷۹ میں صحیح مسلم کی یہ حدیث بروایت ابوہریرہ

اذا لقیتموہم فاضطروہم الی اضیق الطریق	جب تم اُن سے راستہ میں ملو تو اُنھیں تنگ راستہ کی طرف جانے پر مجبور کرو،

ابوداود کے الفاظ یہ ہیں اذا لقیتموہم فی الطریق فاضطروہم الی اضیق الطریق، اس حدیث صحیح کے ہوتے ہوئے کس کی مجال ہے جو یہ کہے کہ مذکورۂ بالا حکم رسول کا حکم نہیں ہے؟ اور حکم رسول ہونے کی صورت میں کون ہے جو یہ کہ سکتا ہے کہ وہ خاص خدا کا حکم نہیں؟ وقس علیہ احکام الصحابۃ والمجتہدین،

علاوہ ازاں مصنف نے رسالۂ شبلی صفحہ ۲۷ میں یہ بھی فرمایا ہے کہ

"اسلام نے اور اسلامی حکومتوں نے کبھی یہ قاعدہ نہیں بنایا کہ جو شخص ولایت زادہ ہو اُسکو فلاں قسم کے حقوق نہیں مل سکتے یا فلاں فلاں عہدے فاتح قوم کے افراد کے ساتھ مخصوص ہیں"

لیکن شاید انکو استق رومی والی وہ پوری روایت یاد نہیں رہی جس میں خود حضرت عمر نے اسی استق نصرانی سے نہایت واضح طور پر فرمایا تھا کہ

انہ لا یحل لی ان استعین بک علی امانۃ المسلمین و لست علی دینہم[1]	مجھے یہ جائز نہیں ہے کہ تجھ سے مسلمانوں کے امانتی کاموں میں مدد لوں بجائیکہ تو اُن کے دین پر نہیں ہے،

کیا اس سے بالبداہتہ یہ نہیں سمجھ میں آتا کہ غیر قوموں اور غیر مذہب والوں سے ایک حد تک یعنی مسلمانوں

---

[1] کنز العمال صفحہ ۳۰۹ جلد ۵،

کے مالی اور انتظامی کاموں پر مطلقاً مدد لینا حضرت عمر کے نزدیک جائز نہ تھا؟ شاید اسکا جواب مصنف کی طرف سے یہ ہو کہ حضرت عمر کی حکومت اسلامی حکومت نہ تھی۔

ہاں خوب یاد آیا گھوڑوں پر کاٹھی کسنے کے مسئلہ کو بھی مصنف نے الفاروق ہی میں ذکر کیا ہے لیکن وہی کہ جوش کی حالت میں معترض کی طرف سے اعتراض تو جا بیٹھے مگر جواب دیتے وقت قلم کو جو ہاتھ سے رکھا تو پھر اُٹھانا قسم تھا، بے شبہ اکابر فقہا کو موردِ الزام و مستوجب ملام بنانا ایک آسان کام ہے، لیکن اُنکے خلاف اپنے اس دعوے کو ثابت کرنا کہ اُنھوں نے جو کچھ کیا یہ اُنکی تو ایجاد اور تعصبی کارروائی ہے، البتہ کارے دارد، مسئلہ بالا کے متعلق فقہا پر سے الزام اُٹھانے کے لیے میرے نزدیک صرف قاضی ابو یوسف کی کتاب الخراج سے استناد کافی ہوگا، دیکھو کتاب مذکور صفحہ ۷۲ میں حضرت عمر بن عبد العزیز کے فرمان کی عبارتِ ذیل،

ولا یرکبن یہودی ولا نصرانی علی سرج ولیرکب علی اکاف ولا ترکبن امرأة من نسائہم علی رحالة ولکن رکوبہا علی اکاف

کوئی یہودی اور نصرانی پالان کے سوا زین پر نہ بیٹھے، اُن کی عورتوں میں سے بھی کوئی عورت کجاوے میں نہ سوار ہو، بلکہ اُسے بھی پالان ہی پر سوار ہونا چاہیے،

کنز العمال ج ۲ صفحہ ۲۹۶ میں خاص حضرت عمر کا ارشاد ان لفظوں میں منقول ہے،

وتمنعوہم الرکوب الا علی الاکف عرضاً[1]　　(اُنکو پالانوں کے سوا زین وغیرہ پر بیٹھنے سے منع کرو پالان پر بھی عرضاً سوار ہوں)

---

[1] "اکف" کے لفظ پر اسوقت میرا ذہن مصنف کی ایک خوش فہمی کی طرف منتقل ہوا ہے جو اب سے پہلے خود اُسی کی کتاب سیرۃ النعمان صفحہ ۲۵۸، ۲۵۹ میں خاص اُسی کے قلم سے بیساختہ ٹپک پڑی ہے، اس خوش فہمی کی طرف ذہن کا منتقل ہونا تھا کہ وہ حکایت بھی یاد آئی، جو عام طور پر مشہور ہے اور اکثر بیان کی جاتی ہے کہ کسی حکیم نے اپنے نسخے میں شربت بنفشہ اور آلو بخارا لکھا تھا، لیکن نسخہ جب ایک تیز طبع طالب علم کو پڑھنے کے لیے دیا گیا تو اُنھوں نے (چونکہ تیز طبع تھے) شربت بنفشہ کو شربتُ نبفسہ اور آلو بخارا کو اُلّو بیچارا پڑھا۔

معزز ناظرین ذرا متوجہ ہو کر سنیں (کیونکہ ایک خوش فہم کی خوش فہمی کو سراہنا ہے) لائق مصنف سیرۃ النعمان صفحہ ۲۵۸ و ۲۵۹ میں بحوالہ جامع صغیر امام محمد لکھتے ہیں کہ "امام ابو حنیفہ سے جو کچھ اس باب میں مروی ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ ذمی زنار باندھیں اور ایسے زین پر سوار ہوں جن کی شکل "ہتھیلی" کی سی ہوتی ہے (ہتھیلی کا لفظ پیشِ نظر رہے) اب جامع صغیر کے الفاظ بھی ملاحظہ

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اب اس قدر لکھنے کے بعد میں خیال کرتا ہوں کہ غالباً ذمیوں کے مذکورہ بالا احکام کے متعلق کسی مزید بیان کی حاجت نہیں رہی مصنف نے جس ذمہ دعوے سے ان احکام کو خواہ مخواہ متاخرین فقہا کی ایجاد اور اُنکی مذہبی تنگ نظری کا نتیجہ قرار دیا تھا اُسکی ایک حد تک کامل احتیاط کے ساتھ پوری جانچ ہو چکی، معتبر تاریخوں اور صحیح احادیث کے حوالہ سے ہر ایک حکم کے متعلق دکھا دیا گیا کہ وہ بجائے اس کے کہ کسی پچھلے عالم کی کوئی واقعی ایجاد ہو، خود جناب رسول اللہ کے، صحابہ کے، ائمہ مجتہدین کے احکام ہیں، ایسی صورت میں ناظرین قیاس کر سکتے ہیں کہ مصنف کا وہ عامیانہ جوش جسکے اثر سے اُس نے متاثر ہو کر "حقوق الذمیین" میں یہ لکھ دیا ہے کہ "ہمارا یہ دعوے ہے کہ یہ احکام خدا کے رسول کے، صحابہ کے، ائمہ مجتہدین کے احکام نہیں ہیں" کیسا ٹھنڈا اور بے بنیاد جوش تھا:

معہذا یہ بھی معلوم ہو گیا کہ علمی مقامات اور خاصکر مذہبی مسائل کے دوران بحث میں مصنف کی تحقیق بالعموم کس قدر امانت و دیانت کے اصول پر مبنی ہوتی ہے، بلکہ باانہمہ ناانصافی خود جناب مصنف کے اندر آج دیانت و انصاف کا اعلیٰ جوہر کہاں تک موجود ہے، اور خاصکر متاخرین فقہا و اہل تاریخ پر فرضی الزامات عائد کرنے میں مصنف کو کیسا سچا عشق اور کیسی گہری دلچسپی ہے کہ غالباً اُنکی کوئی تصنیف بلکہ تصنیف کا کوئی حصہ بھی اُسکی اس الزام پرستی کی نمایاں خصوصیت سے خالی نہ ہوگا حالانکہ بیشتر اور اکثر مقامات میں خاصکر حقوق الذمیین کی طول طویل بحث کے موقع پر تیقناً مصنف کی تمام قلمی کوشش بالکل غالب مرحوم کے اس شعر کی مصداق ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۵ کا)

ہوں، "ویو خذ اہل الذمۃ باظہار علامات والرکوب علی السروج التی ہی کہیأۃ الاکف" (آخر جامع صغیر صفحہ ۱۴۲)" دیکھو خوش فہمی اس کا نام ہے کہ "اُکف" جو کتب کے وزن پر اکاف کی جمع ہے اور جس کے معنی پالان کے ہیں وہ "اَکُف" کف کی جمع پڑھا گیا، اور اُس کے معنی ہتیلی کے بنائے گئے جو مقام سے انصافاً کہو کس قدر چسپاں ہے؟ اگرچہ ہم نے اور تم نے ہتیلی اور پنجے کی شکل کے زین آج تک نہ دیکھے اور نہ سُنے ہوں گے، لیکن کیا ہوا ممکن ہے کہ جناب مصنف کے عالم خیال میں ایسے بھی زین ہوں جو ہتیلی اور پنجہ تو کیا ہوبہو کوے اور ایڑی کی شکل کے بنتے ہوں حقیقت میں انسان بیشک اس درجہ خوش فہم ہو اکابر کی نکتہ چینی کے لائق بھی کب ہو سکتا ہے، مزید برکہ قوم کے مسلم الثبوت علما کی محض فرضی غلطیاں نمایاں کرنے کیلئے کم سے کم ایسا ہی نکتہ پرداز عقل اور ایسا ہی بلند پرواز ذہن ہونا چاہیے جیسا کہ قدرت کے فیاض ہاتھوں نے آج چشم بد دور ہمارے شمس العلما جناب مولوی شبلی صاحب کو عطا فرمایا ہے۔

نو و حشو و ادعائے محض و اطناب مخل　　　مار و موش و سوسمار دگر یکجا کردہ است[۵]

ناظرین سے امید ہے کہ وہ ایک منصفانہ اور غیر طرفدارانہ نظر سے اس بحث کو اول سے آخر تک دیکھیں گے اور پھر فیصلہ کریں گے کہ مصنف نے اس مدعائے خاص میں کہاں تک اصابت رائے سے کام لیا ہے جس کو مصنف نے تمامتر تعصب اور نا انصافی کے خلعت سے مخلع کرکے قوم کے سامنے پیش کیا ہے

---

[۵] مار و موش و سوسمار دگر یکجا کردن کا مضمون تو خاصکر سیرۃ النعمان کے حصہ دوم میں اس مقام پر نمایاں طور سے معلوم ہوتا ہے جہاں کہ مصنف نے مذاہب ائمہ کے نقل کرنے میں اپنی روشن دماغی اور وسعت معلومات کے عجیب غریب کرشمے دکھائے ہیں! بالفاظ دیگر اپنی خطاکاری اور غلط نگاری کا تحریری اور تحقیقی ثبوت دیا ہے۔ خوش اعتقادی شاید بعض صاحبوں کو جب تک کہ کچھ مثالیں پیش کی جائیں اس بات کا یقین نہ ہونے دیگی اس لیے باوجود اسکے کہ نہ وقت ہی مساعد ہے اور نہ محل ہی متقاضی، پھر بھی مشتے نمونہ از خروارے کچھ مثالیں پیش کرتا ہوں، و ھو ھٰذہ

(۱) سیرۃ النعمان صفحہ ۱۴۱ میں مصنف لکھتا ہے کہ (سرقہ کی صورت میں) نادان بچے پر امام ابو حنیفہ کے نزدیک قطع ید نہیں، لیکن امام مالک کے نزدیک ہے، حالانکہ امام مالک کے نزدیک نادان بچے پر قطع ید کہنا علانیہ غلطی ہے (ملاحظہ ہو اس مسئلہ اور باقی مسائل کے لیے میزان شعرانی و رحمۃ الامہ وغیرہ کتب مذاہب جو خود مصنف کے بھی ماخذ ہیں)

(۲) اسی صفحہ میں جاحد عاریت پر صرف امام اعظم کے نزدیک مصنف قطع ید نہیں بتاتا باقی اور ائمہ کے نزدیک قطع ید لکھتا ہے، حالانکہ یہ بھی محض غلط و پوچ ہے (ملاحظہ ہو رحمۃ الامہ صفحہ ۱۴۲ کی عبارت ذیل "وہل یقطع جاحد العاریۃ قال ابو حنیفۃ و مالک الشافعی لا یقطع وقال احمد یقطع)

(۳) پھر اسی صفحے میں امام ابو حنیفہ کے نزدیک لکڑی کے سرقہ پر مطلق قطع ید نہیں بتاتا حالانکہ یہ اطلاق بھی غلط ہے اور صحیح یہ ہے کہ بعض لکڑیاں جیسے ساج، آبنوس، صندل وغیرہ انکے سرقہ پر امام صاحب کے مذہب میں بھی قطع ید لازم آتا ہے،

(۴) نکاح سے متعلق مسائل میں سیرۃ النعمان صفحہ ۱۵۱ میں مصنف لکھتا ہے "اگر کوئی شخص مرض الموت میں طلاق دے اور عدت کے زمانہ میں اسکا انتقال ہو جائے تو امام شافعی کے نزدیک میراث نہیں ملیگی" حالانکہ یہ محض غلط ہے، امام شافعی کے نزدیک مرض الموت میں طلاق دینے کی صورت میں علی اظہر الاقوال میراث ملیگی، (ملاحظہ ہو میزان شعرانی و کتب شافعیہ وغیرہ)

(۵) اسی صفحہ یعنی ۱۵۱ میں مصنف یہ بھی لکھتا ہے کہ امام مالک کے نزدیک بغیر استشہاد کے رجعت صحیح نہیں ہے، حالانکہ یہ بھی صریح غلطی اور جھوٹا دعوے ہے، صحیح یہ ہے کہ امام مالک کے نزدیک رجعت پر اشہاد اصلا شرط نہیں،

(۶) صفحہ ۲۵۲ میں مسائل خلع کے متعلق امام شافعی و امام مالک کا مذہب مصنف لکھتا ہے کہ انکے نزدیک مرد جس قدر چاہے معاوضہ لے سکتا ہے اور اسپر عورت کو مجبور کر سکتا ہے، حالانکہ یہ محض غلط بلکہ اتہام ہے، اور اصلیت صرف اس قدر ہے کہ "ہل یکرہ الخلع باکثر من المسمی قال مالک والشافعی لا یکرہ ذلک" (رحمۃ الامہ صفحہ ۲۰۰)، (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کیا وہ فی الواقع بھی ایسے ہی متعصب تھے، جیسا کہ مصنف نے محض اپنی چرب زبانی سے غلط طور پر اُنھیں متعصب ثابت کرنا چاہا ہے؟ کیا دراصل اُنھوں نے حقوق اہلِ ذمہ کے متعلق احادیثِ صحیحہ یا احکام خلفائے راشدین و ائمہ مجتہدین کے خلاف کوئی خانہ ساز یا منگھڑت بات محض تعصبِ مذہبی کی بنا پر لکھی ہے؟ کیا یہ بالکل صحیح ہے کہ متاخرین فقہا اور متاخرین اہلِ تاریخ نے عام اس سے کہ وہ تعصبِ مذہبی کی وجہ سے ہو، یا قلتِ تدبر، نقصانِ معلومات، نارسائیِ ذہن، وغیرہ وغیرہ کی بنا پر ہو، احادیث اور آثارِ صحابہ میں سے بعض ایسی ایسی اختراعی اور ضروری خصوصیتیں اُڑا دی ہیں کہ جن کی بنا پر آج سے نہیں بلکہ مصنف کے بے بنیاد دعوے کے موافق مدتِ دراز سے تمام دنیا میں ایک عالمگیر غلطی پھیل گئی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ غریب عربی زبان بالکل سر سے پاؤں تک اور ایڑی سے چوٹی تک غلطی ہی غلطی میں لت پت ہو گئی ہے۔

(بقیہ حاشیہ صہ ۳۷ کا)

(۷) آگے چل کر مصنف لکھتا ہے کہ "اس سے بڑھکر یہ کہ گو شرارت اور زیادتی مرد کی ہو تاہم وہ عورت سے معاوضہ لے سکتا ہے اور جس قدر چاہے لے سکتا ہے، حالانکہ یہ صریح ناانصافی ہے کہ عورت بیگناہ بھی ہو اور معاوضہ بھی ادا کرے" لیکن لطف یہ ہے کہ یہی صریح ناانصافی کہ عورت بے گناہ بھی ہو اور معاوضہ بھی ادا کرے امام ابوحنیفہ کے مذہب میں بھی ہے، یعنی اُن کے نزدیک بھی مذکورہ بالا صورت میں مرد عورت سے معاوضۂ خلع لے سکتا ہے (ملاحظہ ہو رحمۃ الامہ صفحہ ۹۰ میں وصح مع الکراہۃ کا لفظ) لیکن فقہ حنفی کی ترجیح کے موقع پر جہاں مصنف نے اور بہت سے قابل قدر انصاف کیے ہیں وہاں اُس کا ایک نوشیروانی انصاف یہ بھی ہے کہ گو مسائل واحد ہے اور حکم بھی واحد، مگر مذہب شافعی میں وہی حکم ناانصافی ہے اور مذہب حنفی میں نہیں (دیکھو صفحہ ۲۸)

غرض یہ اور اسی قسم کے بیسیوں دوسرے مسائل ہیں کہ جن کے صرف نقل میں مصنف سے ٹھوکریں کھائی ہیں، تا بعقل چہ رسد، اور دیانت و انصاف جس پر مصنف اپنے تئیں دوسرے اہل قلم سے کسی قدر زیادہ ممتاز سمجھتا ہے، کوئی یہ خیال کرے کہ وہ صرف الفاروق، یا الفاروق میں بھی صرف مبحث حقوق الذمیین ہی کے ساتھ مخصوص ہے، نہیں، بلکہ جناب مصنف نے اپنے اس جوہر کو اپنی تمام کتابوں میں عموماً اور سیرۃ النعمان میں خصوصاً بہت اچھی طرح سے چمکایا ہے، سیرۃ، جس میں نقد اور خاصکر فقہ حنفی کے پردے میں تحقیق و تدقیق کی بہت سی راگ اور راگنیاں گائی گئی ہیں، ناظرین بہ تعجب سے دیکھیں گے کہ مصنف نے اس میں علانیہ دعویٰ کیا ہے کہ "مذاہب فقہا میں سے صرف مذہب حنفی ہی ایک ایسا مذہب ہے کہ جس کے مسائل نہایت آسان، نرم اور یسیر التعمیل ہیں، بخلاف اسکے اور ائمہ کے بہت سے احکام بہت سخت اور عسیر التعمیل ہیں" اس دعوے کے ثبوت میں مصنف نے جو منصفانہ اور بے لاگ کارروائی کی ہے اُسکے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان مباحث کے لکھتے وقت مصنف کا داہنا ہاتھ اگر لکھنے کے کام میں مصروف تھا تو بائیں ہاتھ سے اُسکی ایک آنکھ بھی ضرور میچی تھی، بھلا ایک مصنف کے لیے اس سے بڑھکر ناانصافی اور کیا ہو سکتی ہے کہ فقہ حنفی و شافعی میں

(باقی آئندہ صفحہ پر)

یا یہ کہ ان تمام خوش گپیوں اور بیہودہ طبع آزمائیوں کے بجائے مصنّف کے یہ زبانی اور محض غلط دعوے اُسکی تعلّی اور خود ستائی کے نہایت قبیح اور مذموم بیانات ہیں، جن کے ذریعہ سے اُس نے ایک ہوائی اور خام طبع شخص کی طرح چاہا ہے کہ وہ تماشا گاہِ عالم میں باوجود جگنو ہونے کے دیکھنے والوں کی نگاہ میں آسمان کا کوئی بڑے سے بڑا تارا بنکر دکھائی دے، تاکہ وہ گناہ فقہا کو خاطی، مورخین کو غلط نگار؛ علما کو کج بحث، خادمانِ دین کو پست خیال، متبعانِ شریعت کو سادہ لوح، وغیرہ وغیرہ بتا کر، اعتباری دنیا سے ایک ایک کو چُن چُن کر نکال دے، اور پھر باطمینان تمام ان مدارج کے طے ہونے کے بعد علمی تحقیقات کے بازار میں بلا خوفِ مزاحمت خود فروشی کی دوکان چمکائے، اور رفتہ رفتہ قوم کو فرضی واد عائی انکشافاتِ لدنی کے جعلی سرٹیفکیٹ دکھا کر بلا استحقاق مکبت گروئی کا قابلِ فخر منصب بھی اپنے لیے حاصل کرے، فاتلاً عاقبل

وانند بزرگاں کہ رہ دور و دراز است ۔۔۔ از کوچۂ مقصود بہ بازارِ تمنا

محمد جان

(الناظر، اکتوبر ۱۹۱۹ء)

(بقیہ حاشیہ ص ۳۸ کا)

فرق دکھاتے ہوئے اُس نے چُن چُن کر ایک طرف تو مذہبِ حنفی کی آسانیاں رکھدی ہیں اور دوسری طرف خاصکر مذہبِ شافعی کی چیدہ چیدہ دشواریاں، پھر کہہ دیا ہے کہ دیکھو مذہبِ حنفی ایسا آسان ہے اور باقی مذاہب ایسے دشوار، کتاب مذکور کے صفحات ۲۴۲ و ۲۴۳ و ۲۵۰ وغیرہا میں اسی طرح مصنف نے مذہبِ شافعی کی بہت سی سختیاں دکھائی ہیں اور نتیجہ اپنے مدعا کے موافق اخذ کیا ہے، حالانکہ انکے مقابلہ میں مختصراً مذہبِ حنفی کی بعض دشواریاں صرف ایک باب کے متعلق ایک شخص مزاج شناس احکام شرع دکھا سکتا ہے کہ مثلاً دار الاسلام میں غیر قوموں کے منہدم شدہ گرجاؤں اور عبادت خانوں کی ترمیم و تجدید کے متعلق امام شافعی کے نزدیک تو عام اجازت ہے کہ وہ ترمیم و تجدید کریں، لیکن امام ابو حنیفہ علیہ الرحمہ نے یہ شرط لگا کر کہ اگر وہ گرجا یا عبادت خانہ اُس زمین میں ہو جو صلح سے فتح ہوئی ہے تو اجازت ہے ورنہ نہیں، اس حکم کو سخت کر دیا ہے، یا مثلاً امام ابو حنیفہ کا قول ہے کہ ذمی پر جزیہ ابتدائے سال سے واجب ہوتا ہے، جو ایک سخت حکم ہے، اسکے مقابلہ میں امام شافعی آخر سال میں واجب کہتے ہیں اور یہ آسان ہے، پھر امام ابو حنیفہ کے یہاں جزیہ کا مطالبہ عقد ذمہ کے بعد ہی سے کر سکتے ہیں، لیکن اس سختی کے برخلاف امام شافعی وغیرہ کے یہاں یہ آسانی ہے کہ یہ مطالبہ ایک برس گزر جانے کے بعد ہوگا، امام شافعی کا قول ہے کہ "لو صالح الامام قوماً من الکفار علی ان اراضیہم لہم و جعل علیہا شیئاً فہو کالجزیۃ ان اسلموا سقط عنہم وکذا ان اشتراہ منہم مسلم" لیکن امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں "لا یسقط عنہم خراج اراضیہم بالاسلام ولا بشراء المسلم" (قس علیٰ ہٰذا من المسائل الاُخریٰ)

تو جب آسانیوں کے ساتھ دشواریاں بھی ہر مذہب میں ہیں، پھر آنکھ بند کر کے یہ کیکر فیصلہ کر دینا کہ فلاں مذہب آسان ہے اور باقی تمام مذاہب کے احکام سخت اور بہت سخت ہیں، کہاں کا انصاف اور کہاں کی دیانت ہے؟ ۔ ۱۲

ام عمارہؓ

سنہ۱۹۰۶ء مین سیرۃ ابن ہشام کا مطالعہ کرتے وقت جنگ احد کے بیان مین ان کا ذکر دیکھنے مین آیا۔ اوسیوقت سے مین انکے حالات کی جستجو مین پڑ گیا۔ لیکن اگلی تاریخون مین عورتون کے حالات نہایت مختصر لکھے گئے ہین۔ سیرۃ النبویہ اور سیرۃ محمدیہ مین وہی ابن ہشام والی روایت دہرائی گئی ہے۔ سیرۃ الحلبیہ مین بھی صرف وہی واقعہ ہے لیکن کسیقدر تفصیل کے ساتھ۔

اصابہ۔ اسد الغابہ اور استیعاب مین انکے حالات اسقدر کم ملے کہ اس شبنم سے میری پیاس نہ بجھ سکی۔ تاریخ طبری۔ تاریخ الخمیس اور بعض دوسری مستند تاریخون مین بھی انکا نام آتا ہے لیکن مورخ انکے کارنامون کی طرف سرسری اشارہ کرتے ہوے گذر جاتا ہے۔

انکے جنگ یمامہ کے کارنامہ کا ذکر اکثر مورخین نے کیا ہے لیکن تفصیل کسی نے نہین لکھی البتہ فتوحات اسلامیہ کے مصنف نے اپنے معمول کے خلاف اس واقعہ کا کسی قدر بسط کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

ریاض المستطابہ مین بھی کچھ حالات ملے لیکن نہ ملنے کے برابر۔ ابن سعد نے طبقات کی آٹھوین جلد مین انکا تذکرہ کیا ہے اور اگرچہ فی الجملہ دوسرے مورخون سے زیادہ لکھا ہے لیکن پھر بھی ناکافی ہے۔ تاریخ وفات تک کا پتہ نہین۔

تہذیب التہذیب کا خلاصہ تو صرف نامون کی فہرست ہے۔ اب اصل کتاب چھپ رہی ہے اسکی گیارہ جلدین چھپکر آ بھی چکی ہین مگر افسوس کہ انکا تذکرہ بارہوین جلد مین ہے اور وہ ابتک نہین آئی۔

زینب فواد کی کتاب دار النشر مصر مین چھپی ہے۔ اسکے لئے دو خط بھیجے کہ شاید اونھون نے کچھ مفصل لکھا ہوگا۔ ہر چند وہان تلاش کی گئی لیکن بدقسمتی سے نہین ملی۔ ان سب کوششون کے بعد مجبور ہو کر جو حالات مل سکے ہین بالفعل انھین کو پیش کرتا ہون۔

ابھی تک مین نے ہمت نہین ہاری ہے جستجو کا سلسلہ انشا اللہ جاری رکھونگا یہانتک کہ اس

شیر دل بہادر صحابیہ کی جو آنحضرتؐ کے لئے سینہ سپر ہو کر لڑی ہے مکمل سوانح عمری لکھنے کے قابل ہو جاؤن۔ ؎ مرا عہدیست با جانان کہ تا جان در بدن دارم ؛ ہواداران کویش را چو جان خویشتن دارم

ام عمارہ کا نام نسیبہ ہے لیکن یہہ اپنی اسی کنیت کے ساتھ زیادہ مشہور ہین۔ باپ کا نام کعب تھا۔ وہ قبیلہ بنی نجار مین سے تھے۔ انکی والدہ رباب بنت عبد اللہ قبیلہ خزرج مین سے تھین۔ ولادت ہجرت سے تخمیناً چالیس سال پہلے مدینہ مین ہوئی۔ انکا نکاح انہین کے چچازاد بھائی زید بن عاصم کے ساتھ ہوا۔ انسے دو بیٹے پیدا ہوے عبد اللہؓ اور حبیبؓ۔ زید بن عاصم کے انتقال کے بعد انکا دوسرا نکاح انھین کے قبیلہ کے ایک شخص غزیہ بن عمر سے ہوا۔ انسے ایک بیٹا تمیم اور ایک بیٹی خولہ پیدا ہوئی۔

جب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو نبوت عطا ہوئی اور آپ نے لوگونکو اسلام کی طرف بلانا شروع کیا تو مکہ کے اکثر لوگ دشمن ہو گئے۔ اُنھون نے اسلام کی سخت مخالفت کی۔ جو لوگ مسلمان ہوتے تھے اُنکو تکلیفین پہونچاتے تھے۔ انکی ایذا رسانی کی وجہ سے کوئی مسلمان مکہ مین مشکل سے ٹھہر سکتا تھا۔ چنانچہ آپ سبکو حبشہ کی طرف بھیجدیا کرتے تھے کیونکہ وہاں کا بادشاہ مسلمانونکا بڑا حامی تھا اور اُنکو آرام دیتا تھا۔ جب آپ نے سالہا سال کوشش کرکے دیکھ لیا کہ اللہ تعالے نے انکے دلونپر مہر لگادی ہے اور انکی عداوت اور دشمنی برابر بڑھتی چلی جاتی ہے تو انکا پیچھا چھوڑ دیا۔ اور بڑے بڑے بازارون اور مجمعون مین جہان عرب کے تمام قبایل جمع ہوتے تھے لوگون کے سامنے اسلام کو پیش کرنے لگے۔ یہہ خواہش بھی تھی کہ اگر کوئی دوسرا قبیلہ اسلام کی حمایت کیلئے آمادہ ہو جائے تو آپ ان لوگون کو چھوڑ کر انھین مین جا ملین۔

اتفاق سے ایک سال مدینہ کے چھ آدمی آپکا وعظ سنکر مسلمان ہو گئے۔ دوسرے سال چھ اور بڑھے۔ اب حضورؐ نے ایک صحابی کو جنکا نام مصعب بن عمیرؓ تھا ان مسلمانونکے ساتھ مدینہ کو روانہ کر دیا کہ وہان قرآن کی تعلیم دین۔ حضرت مصعب اور ان بارہ مسلمانونکی کوشش سے مدینہ کے بڑے بڑے سردار اسلام لاے اور بہت سے لوگ مسلمان ہو گئے۔ انھین اسلام لانیوالون مین حضرت ام عمارہ اور انکا گھرانا تھا۔

تیسرے سال مدینہ سے ۷۵ مسلمان مکہ پہونچے۔ مشرکون کے خوف سے حج کے دو تین دن کے

بعد رات کو پچھلے پہر ایک پہاڑ کی گھاٹی مین یہہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے۔ وہان حضور کے ہاتھ پر ان سب لوگون نے بیعت کی اور یہہ عہد و پیمان ہوا کہ "حضور مدینہ تشریف لیچلین ہم جان مال اور اولاد سب کچھ اللہ کے دین کی مدد مین قربان کرین گے"

اسی بیعت کو بیعت عقبہ کہتے ہین۔ جو لوگ اسمین شریک تھے اُنکا درجہ تمام انصار مین بلند ہے اس بیعت مین دو عورتین بھی تھین ایک تو یہی ام عمارہؓ دوسری ام منیع رضہ

اس عہد و پیمان کے مطابق آنحضرتؐ مکہ سے ہجرت کرکے مدینہ چلے آئے۔ کفار مکہ نے یہان بھی چین نہ لینے دیا کئی بار چڑہائی کر کے آئے اور لڑائیان کین۔ یہان تک کہ بدر کی لڑائی ہوئی جسمین مکہ کے کافرون کے اکثر بڑے بڑے سردار مارے گئے۔ اور اللہ تعالے نے اسلام کو کفر پر نمایان فتح عطا فرمائی۔ کفار نے اپنے سردارون کا بدلہ لینے کی غرض سے بڑی سخت تیاری کی۔ اپنے آس پاس کے تمام قبیلون کو جمع کیا۔ سب کو ہتھیار اور سواری دی اور تین ہزار سے کچھ زیادہ جنگی آدمی جمع کرکے بڑے جوش و خروش کے ساتھ مدینہ پر چڑہائی کی۔ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے یہہ خبر سنکر مسلمانونکو جمع کیا۔ تقریباً ایک ہزار آدمی تھے۔ انکو لیکر جب لڑائی کیلئے نکلے تو انمین سے بھی تین سو منافق راستہ سے واپس چلے آئے۔ اب صرف سات سو مسلمان رہگئے منافقونکے بھاگ آنے سے اُنکا حوصلہ بھی پست ہو گیا تھا۔ مگر آنحضرت نے انکو ہمت دلائی اور اللہ پر بھروسہ کر کے مقابلہ کیلئے بڑھے۔

مدینہ سے دو تین میل کے فاصلہ پر ایک پہاڑ ہے جسکا نام احد ہے اسکے دامن مین شنبہ کے دن ۱۱ شوال سنہ ۳ھ کو مقابلہ ہوا۔ مسلمان اچھے موقع پر پہونچگئے تھے۔ ایک محفوظ درّہ تھا۔ کفار کے سات آٹھ سو سوار تھے۔ خالد بن ولیدؓ جو اسوقت تک اسلام نہین لائے تھے ان سوارونکے سردار تھے سوائے اس درہ کے اُنکے آنے کا اور کوئی راستہ نہ تھا آنحضرتؐ نے اس درہ پر ساٹھ ستر مسلمانونکو مقرر کردیا کہ اسطرف سے جب سوار حملہ کرین تو تم لوگ روکنا انکو آگے نہ بڑھنے دینا۔ اور جبتک ہم حکم نہ دین اُسوقت تک ہرگز اس جگہ سے نہ ہٹنا۔ یہ لوگ لوہے کی دیوار کی طرح وہین جمگئے۔ جب کفار ادھر سے آنے لگے تو ان تھوڑے سے مسلمانون نے انکو نیزو و تیر پر رکھ لیا۔ مجبور ہو کر رک گئے اور یہ ان مین نہ آسکے۔ ادھر گھمسان کی لڑائی شروع

ہوئی۔ قریب تھا کہ مشرکوں کو شکست ہوجائے کہ اتنے میں اسلامی فوج کا علم بردار شہید ہوگیا۔ بعض کافروں نے سمجھا کہ یہی رسول اللہ تھے۔ اُنھوں نے خوشی کا نعرہ لگایا کہ ہم نے نبی کو قتل کردیا۔ مسلمانوں نے جب یہ آواز سنی تو اکثر بدحواس ہوگئے۔ اُنکو کسی چیز کی خبر نہین رہی۔ کوئی جہاں تھا وہین مایوس ہوکر بیٹھ گیا۔ کوئی اگر پڑا۔ کوئی بیہوش ہوگیا۔ کسیکی آنکھین کھلی کی کھلی رہگئین اور ہاتھ سے ڈھال تلوار گر پڑی۔ مشرک خوشی کے جوش مین ٹوٹ پڑے۔ درّہ پر جو مسلمان تھے وہ بھی سراسیمہ ہوکر دوڑے کہ یہ کیا ماجرا گذرا۔ ان لوگونکا وہان سے ہٹنا تھا کہ خالدرض نے اپنے سوارونکو لیکر حملہ کیا۔ اور قیامت پر قیامت برپا کردی۔ سرور کائنات کے عم محترم امیر حمزہ رض اور بہت سے مسلمان شہید ہوگئے۔

اس سخت وقت مین حضور کے اردگرد صرف چند مسلمان جنکی تعداد دس سے زیادہ نہ ہوگی حفاظت کیلئے رہگئے انھین مین ام عمارہ رض انکے دونون بیٹے عبداللہ اور حبیب اور انکے شوہر عزیہ بن عمر تھے۔ خود حضرت ام عمارہ رض کی زبانی مورخون نے اس واقعہ کی کیفیت لکھی ہے ہم اسکا ترجمہ کرتے ہین۔

"ام عمارہ نے کہا کہ مین اپنے کندھے پر مشک لئے ہوے پیاسون کو پانی پلارہی تھی۔ یکایک مسلمانون نے شکست کھائی۔ اور انکے قدم اکھڑگئے۔ کفار نے چارون طرف سے سخت یورش کیا مین نے اسوقت مشک پھینکی۔ اور ایک تلوار اُٹھاکر آنحضرت کی حفاظت کیلئے کھڑی ہوگئی۔ میرے پاس ڈھال نہ تھی کسی پلٹ کر جانے والے کی طرف حضرت نے اشارہ کیا وہ اپنی ڈھال پھینکتا گیا۔ مین دشمنون کے تیرون اور تلوارون کو اسی ڈھال پر روکنے لگی۔ مصیبت یہ تھی کہ ہم پیدل تھے اور غنیم سوار یون پر۔ اگر وہ ہماری طرح پیدل ہوتے تو ہم آسانی سے اُنسے نبگت لیتے۔ سوار اپنی پوری قوت سے ہمارے اوپر حملہ کرتے تھے۔ اُنکا روکنا بہت دشوار ہوتا تھا۔ مین نے تو یہ ترکیب نکالی کہ جب کوئی سوار وار کرتا تو اُسکو روک لیتی اور جون ہی وہ آگے بڑھتا پیچھے سے ایک ایسا وار کرتی کہ اُسکے گھوڑے کا پاؤن کٹ جاتا اور وہ مع سوار کے وہین گر پڑتا۔ یہ دیکھکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم میرے بیٹے عبداللہ کو زور سے آواز دیتے کہ اپنی ماں کی مدد کر۔ وہ فوراً آجاتا اور مین اور وہ دونون ملکر اس سوار کا خاتمہ کردیتے"

حضرت ام عمارہ کے بیٹے عبداللہ کی زبانی روایت ہے وہ بیان کرتے ہین کہ

"مین اور میری ماں دونون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کر رہے تھے۔ مین دوسری طرف مشغول تھا کہ ایک مشرک نے پیچھے سے آکر میرے بازو پر ایک تلوار ماری۔ زخم بہت کاری پڑا۔ مین نے مڑکر اسپر حملہ کیا لیکن وہ سیدھا نکل گیا۔ مین لڑ رہا تھا مگر میرا خون بند نہین ہوتا تھا۔ حضور نے ام عمارہ کو حکم دیا کہ اسکے زخم پر پٹی باندھو۔ وہ اپنے ساتھ اسی غرض کیلئے بہت سی پٹیان لائین تھین فوراً ایک پٹی نکالکر زخم کو خوب مضبوط باندھ دیا۔ اور بولین کہ بیٹا اٹھو اور لڑو۔ مین خون کے نکلنے سے بہت کمزور ہو گیا تھا اُٹھنے کی طاقت نہین تھی آنحضرت نے فرمایا کہ اے ام عمارہ ہر شخص مین وہ طاقت کہان ہوتی ہے جو تجھ مین ہے۔ اتنے مین وہ شخص جسنے مجھے زخمی کیا تھا پھر پلٹ کر اسی طرف آیا۔ آنحضرت نے اُسکو دیکھکر فرمایا کہ اے ام عمارہ دیکھ وہی شخص آرہا ہے جسنے عبداللہ کو زخمی کیا ہے۔ ام عمارہ نے لپک کر اسپر تلوار کا وار کیا۔ اُسکی ایک پنڈلی صاف کٹ گئی اور وہ اوسی جگہ دھم سے گر پڑا۔ پھر اُنہون نے آگے بڑھکر اُسکا سر کاٹ لیا۔ حضور مسکرائے اور فرمایا کہ ام عمارہ اللہ تعالے نے بڑا تازہ بدلہ تجھکو عطا کیا۔"

کئی گھنٹوں تک یہی حالت رہی۔ حضرت ام عمارہ کے زخمون کا کچھ شمار نہ تھا لیکن انکے جسم مین فولاد کے تارونکی رگین تھین۔ ذرا بھی تو ان زخمونکی پروا نہین کرتی تھین۔ اور برابر چستی اور چالاکی کے ساتھ حضور کی حفاظت مین مشغول تھین۔ اسی درمیان مین کسی کافر نے ایک پتھر پھینک مارا جس سے سرور کائنات کا بھی نیچے کا لب زخمی ہو گیا۔ اور نیچے کے سامنے کے دو دانتون مین سے داہنا دانت شہید ہو گیا۔ پھر ایک مشہور کافر نے جس کا نام ابن قمئہ تھا اور جو بہت بہادر اور مشہور سوار تھا آپ پر تلوار کا وار کیا۔ جس سے خود کے دو حلقے رخسار مبارک مین دھنس گئے۔ حضرت ابی عبیدہ بن الجراح نے ان حلقونکو نکالا۔ رخسار مبارک سے خون کے قطرے ٹپکنے لگے۔ یہ دیکھکر حضرت ام عمارہ نے نشتر کی طرح اچھلکر ابن قمئہ پر حملہ کیا۔ اسنے انکے مونڈھے پر بھی ایک تلوار ماری جس سے بڑا گہرا زخم آیا۔ باوجود اس زخم لگنے کے بھی حضرت ام عمارہ نے پیاپے اسپر تلوار کے کئی وار کئے لیکن وہ دشمن خدا دو زرہین پہنے ہوئے

تھا - ابن قمئہ تو بھاگ گیا - لیکن حضرت ام عمارہ کے بڑا کاری زخم لگا تھا - خون مین لت پت ہو گئین - حضور نے اپنے سامنے کھڑے ہو کر انکے زخم پر پٹی بندھوائی - اور فرمایا کہ واللہ ام عمارہ کا آج کا کارنامہ فلان فلان زچند ہا در صحابہ کے نام لیکر انکے کارنامے سے بہت بڑھکر ہے - ام عمارہ نے کہا کہ یا رسول اللہ میرے لیئے دعا فرمائیے کہ اللہ تعالے آپکے ہمراہ مجکو جنت مین داخل کرے - آپ نے دعا فرمائی - ام عمارہ نے کہا کہ اب اسکے بعد دنیا مین جو مصیبت چاہے میرے سر پر گذر جائے مجھے ذرا بھی پروا نہین -

میدان جنگ سے جن مسلمانون کے قدم اُکھڑ گئے تھے انمین سے بعض بعض مدینہ کے قریب تک پہونچ گئے - ایک صحابیہ جنکا نام ام ایمن رض تھا مدینہ سے مشک لیکر احد کیطرف آرہی تھین کہ مسلمانون کو پانی پلائین - دیکھا کہ لوگ بھاگے آرہے ہین - کیفیت پوچھی - انھون نے واقعہ بیان کیا - حضرت ام ایمن نے زور سے چلا کر انکو ڈانٹا - اور مٹھی مین خاک بھر کر انکی طرف پھینکی - اور کہا کہ رسول اللہ کو چھوڑ کر تم لوگ کس منھ سے یہان چلے آئے - مرد بنے ہو - لو - یہ ہماری چوڑیان پہنو - اور گھر کا چولھا چکی سنبھالو - اور اپنی تلوارین ہمکو دیدو ہم جاکر لڑین - انکے اس کہنے سے وہ غیرت مند مسلمان پلٹے - ادھر یہ بھی معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم محفوظ ہین - اب انکی ٹوٹی ہوئی ہمت پھر بندھی اور میدان مین جم گئے ظہر کے وقت لڑائی ختم ہو گئی - حضرت ابو بکر - حضرت عمر رض اور بڑے بڑے صحابہ کے ساتھ آپ پہاڑ پر گئے وہان نماز پڑھائی اور پھر مدینہ کیطرف روانہ ہوئے -

ایک دنیاوی بیوی کا حال سنے - مدینہ مین جب آنحضرت کے شہید ہو جانیکی خبر اڑی - تو وہ رنج وغم سے بیتاب ہو کر نکل کھڑی ہوئین - دونون آنکھون سے آنسو جاری تھے اور گرتی پڑتی احد کی طرف چلی جارہی تھین - راستہ مین ایک شتر سوار ملا دوڑ کر اس سے پوچھا کہ کیا خبر ہے ؟ اوسنے کہا کہ خیریت ہے لیکن تمہارا باپ - بھائی اور شوہر تینون شہید ہو گئے - انھون نے کہا اور رسول اللہ ؟ کہا کہ وہ ٹیلہ کے پاس دیکھو فوج کے ہمراہ تشریف لا رہے ہین - خوشی سے اچھل پڑین اور کہا جب رسول اللہ زندہ ہین تو ہمکو کسی کی کچھ پروا نہین ہے اللہ تعالی اپنے بندون مین سے جسکو چاہے شہادت عطا کرے -

ہم تکو روک نہین سکتے۔ مسیلمہ کذاب نے بڑا سخت مقابلہ کیا اور بڑی گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ قدم قدم پر لاشون کے ڈھیر لگ گئے بارہ سو مسلمان شہید ہوے اور آٹھ نو ہزار کافر مارے گئے۔ اسی کش مکش اور ہنگامہ مین حضرت ام عمارہ نے اپنی نگاہ کے سامنے مسیلمہ کو رکھ لیا۔ جنگی بہادرونکو اپنے سامنے سے ہٹاتی برچھی کی نوک اور تلوار کی دھار سے اپنا راستہ نکالتی ہوئی غنیم کی بیچ فوج مین گھستی چلی جارہی تہین نیزہ اور تلوار کے گیارہ زخم انکے لگے اور جب مسیلمہ کے بالکل قریب ہو پہنچ گئین تو کلائی پر سے ایک ہاتھ بھی کٹ گیا لیکن مطلق پروا نہ کی۔ اور آگے بڑہین کہ مسیلمہ پر وار کرین۔ اتنے مین کیا دیکھتی ہین کہ ایکدم سے اسپر دو تلوارین پڑین اور وہ کٹ کر گھوڑے سے گر پڑا۔ انہون نے دیکھا تو انکے بیٹے عبد اللہ رض کھڑے ہین۔ پوچھا کہ تو نے اسکو قتل کیا۔؟ انہون نے کہا کہ ایک تلوار میری پڑی ہی دوسری

وحشی رض کی اسپر وحشی وہ ہے جس نے اپنی کفر کی حالت مین جنگ احد مین حضرت امیر حمزہ کو شہید کیا تھا) اب معلوم نہین کس کے وار سے وہ مرا ہے۔ یہ دیکھکر ام عمارہ اسیوقت سجدہ مین گر گئین اور اللہ تعالی کا شکریہ ادا کیا۔

زخمونکی وجہ سے اور خاصکر ہاتھ کے کٹ جانے سے وہ کمزور ہوگئی تہین حضرت خالد رض جو فوج کے سردار تھے اور جنکی بہادری ضرب المثل ہے وہ ام عمارہ کی شجاعت اور بزرگی کی وجہ سے انکا بڑا ادب کرتے تھے۔ انہون نے انکے زخمونکے علاج اور تیمار داری مین کوئی دقیقہ اٹھا نہین رکھا جب حالت کچھ ٹھیک ہوگئی تو عبد اللہ رض انکو مدینہ مین لائے خود خلیفہ وقت حضرت ابوبکر رض انکو دیکھنے کیلئے انکے گھر آتے تھے۔

حضرت عمر رض خلیفہ دوم کے زمانہ مین ایک مرتبہ مال غنیمت مین چند بیش قیمت کپڑے آئے۔ انمین سے ایک دوپٹہ زرکش نہایت قیمتی تھا۔ کسی نے حضرت عمر رض کو یہ راے دی کہ آپ اسے عبد اللہ بن عمر کی بی بی کو دین۔ کسی نے کہا فلان کو دین غرض مختلف لوگون نے مختلف رائین ظاہر کین۔ حضرت عمر رض نے فرمایا کہ تمام لوگون مین مین سب سے زیادہ حقدار اسکا ام عمارہ کو سمجھتا ہون۔ انہین کو دونگا۔ کیونکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے مین نے احد کے دن سنا تھا

حضور کو ام عمارہ کا بڑا خیال تھا۔ آپنے ساتھ ہی عبد اللہ بن کعب کو انکے دیکھنے کیلئے بھیجا۔ معلوم ہوا اب حالت اچھی ہے۔ زخم مہلک نہین ہے۔ تب آپکو اطمینان ہوا۔ پورے ایک سال تک علاج کرنیکے بعد یہ زخم اچھا ہوا۔

بالاتفاق تمام مورخ لکھتے ہین کہ واقعہ حدیبیہ۔ خیبر اور حنین کی لڑائیون مین بھی ام عمارہ آنحضرت صلعم کے ہمراہ شریک ہوئین لیکن مجھکو ابتک کسی کتاب سے ان لڑائیون مین انکے کارنامون کی تفصیل معلوم نہین ہوسکی ہے۔ جنگ یمامہ کا حال جو کچھ معلوم ہوا ہے وہ لکھتا ہون۔ اہل یمامہ کا سردار مسیلمہ کذاب ایک نہایت زبردست اور بڑا جابر شخص تھا۔ پہلے تو مسلمان ہوا لیکن پھر دنیا کی لالچ مین مرتد ہوگیا۔ آنحضرت کے انتقال کے بعد اُسنے بڑی سرکشی پر کمر باندھی۔ اسکا قبیلہ بہت بڑا تھا لڑنے والے تقریباً چالیس ہزار آدمی تھے اس نے اپنی اس قوت کے گھمنڈ مین آکر نبوت کا دعویٰ کردیا۔ اور سب سے اپنے آپ کو نبی کہلانا شروع کیا۔ جو نہ کہتا اوسکو طرح طرح کی سزائین دیتا۔

حضرت ام عمارہ کے بیٹے حبیب عمان سے مدینہ شریف کو آرہے تھے۔ مسیلمہ نے راستہ مت انکو پکڑوالیا اور کہا کہ تم گواہی دیتے ہو کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہین؟ انھون نے کہا کہ ہان۔ اسنے کہا نہین۔ یہ گواہی دو کہ مسیلمہ رسول اللہ ہے۔ انھون نے کہا ہرگز نہین۔ تب اسنے انکا ایک ہاتھ کاٹ ڈالا۔ پھر یہی سوال کیا۔ انھون نے پھر وہی جواب دیا۔ دوسرا ہاتھ کاٹ ڈالا۔ الغرض پھر پاون کاٹے۔ رانین کاٹ ڈالین لیکن انھون نے اس کذاب کی نبوت کا اقرار نہ کیا پر نہ کیا۔ اور جان دیدی۔ حضرت ام عمارہ نے جب یہ واقعہ سنا تو کلیجہ تھام کے رہگئین۔ اور اپنے دل مین ٹھان لیا کہ اگر مسلمانون نے لشکر کشی کی تو اس مرتد ظالم کو مین انشا اللہ خود اپنی تلوار سے جہنم مین داخل کرونگی۔

حضرت ابوبکر رضہ خلیفہ نے جب مسیلمہ کذاب کے حالات سنے تو حضرت خالد بن ولید رضہ کو چار ہزار فوج کے ساتھ اسکے مقابلہ کیلئے روانہ کیا حضرت ام عمارہ حضرت ابوبکر رضہ کے پاس گئین۔ اور ان سے اجازت چاہی کہ اس لڑائی مین مجھے بھی جانے دیجئے۔ انھون نے

فرمایا کہ ہم تمہاری بہادری اور جرات بہت اچھی طرح دیکھ چکے ہین اسلئے تم شوق سے جب
آپ فرماتے تھے کہ مین جدہر نظر ڈالتا تھا ام عمارہ ہی ام عمارہ مجکو نظر آتی تھین۔ داہنے
دیکھتا ہون تو ام عمارہ۔ بائین دیکھتا ہون تو ام عمارہ۔ چنانچہ آپنے اپنے پاس اسکو بیجدیا۔
راقم کو اسوقت تک اس سے زیادہ حالات نہین معلوم ہو سکے۔ فقط

اسلم۔ جیراج پوری

(الناظر: جون ۱۹۱۰ء)

غوث الاعظم

مکرم و محترم جناب مرزا محمد عسکری بی اے سکریٹری انجمن اُردو لکھنؤ نے یہ مضمون انسائیکلوپیڈیا آف اسلام سے لیا ہے، جو اقوامِ اسلامی کے جغرافیہ و انساب وغیرہ کے متعلق ڈاکٹر ہوتسما کی ادارت میں شایع ہو رہی ہے۔ صاحب ممدوح نے اضافۂ حواشی کے علاوہ متن میں بھی ضروری موقعوں پر الفاظ اور جملے بڑھا دیے ہیں جنکو ممتاز کرنے کے لیے قوسین سے محدود کر دیا ہے۔ انجمن اُردو نے بھی اسی قسم کی ایک کتاب کی ترتیب و اشاعت اپنے نظام کار میں شامل کی ہے، جو ادب اُردو میں یقیناً ایک نہایت ہی مفید اور قیمتی اضافہ ہوگا۔

ایڈیٹر

(حضرت شیخ) عبد القادر جیلی (جیلانی یا گیلانی) محی الدین ابو محمد بن ابی صالح زنگی دوست[1] مشہور واعظ اور صوفی، جنکے نام سے سلسلۂ قادریہ مشہور ہے، ۴۷۱ھ ہجری مطابق ۱۰۷۸ء میں پیدا ہوئے اور ۵۶۱ھ[2] ہجری مطابق ۱۱۶۶ء میں انتقال فرمایا۔ آپ کی متعدد سوانح عمریاں موجود ہیں جن میں روایات ضعیفہ کثرت سے پائی جاتی ہیں مگر صحیح واقعات بھی مل سکتے ہیں۔ مثلاً آپ کا شجرۂ نسب آپ کے پدر بزرگوار کی جانب سے (حضرت امام) حسن (علیہ وعلیٰ آبائہ الصلوٰۃ والسلام) دختر زادۂ پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) تک پہونچایا جاتا ہے۔ حالانکہ آپ کے پدر بزرگوار کا عجمی نام اور خود (حضرت) شیخ کا ابتدا میں "عجمی" کے لقب سے مشہور ہونا اسکے منافی پڑتا ہے[3]۔

---

[1] معتبر کتب عربی میں جن میں حضرت شیخ کے حالات درج ہیں، "جنگی دوست" ہے۔

[2] بعض کتابوں میں آپ کی پیدایش کی تاریخ لفظ "عاشق" (۴۷۱) اور وفات لفظ "معشوق الٰہی" (۵۶۲) سے نکلتی ہے۔ اس حساب سے بھی آپ کی عمر ۹۱ سال ہوتی ہے۔

[3] امام یافعی نے مرآۃ الجنان (نسخہ قلمی ورق ۳۰۰) اور خواجہ پارسا نے "فصل الخطاب" (نسخہ قلمی ورق ۲۴۲) میں آپ کا شجرۂ نسب حضرت امام حسن علیہ السلام تک پہونچایا ہے۔ اسی طرح زبیدی نے "شرح قاموس" میں لفظ "جنگیدوست" کے تحت میں جو کچھ امام ذہبی کا قول حسنی لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑے بڑے لوگ اور ائمۂ فن آپ کی سیادت کے قائل تھے۔ قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ غالباً بعض نے بھی یا رشک و حسد سے آپ کو سید ماننے سے انکار کر دیا۔ اور ممکن ہے کہ آپ کے زمانہ میں بھی لوگ اسی رشک کا دبے اور آپ کے پدر بزرگوار کے "جنگی دوست" لقب سے آپ کو "عجمی" کہتے ہوں۔ جو لوگ آپ کے نسب سے انکار کرتے ہیں اور آپ کو سید نہیں مانتے وہ بھی کوئی قوی دلایل اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش نہیں کر سکتے۔

فی الواقع شجرۂ مذکورہ آپ کے پوتے قاضی ابوصالح نصر کا تیار کردہ ہے جن تک اکثر روایات غیر صحیح
جو (حضرت) شیخ کی جانب منسوب ہیں پہنچائی جاسکتی ہیں۔ آپ کی والدۂ ماجدہ فاطمہ بنت عبداللہ
الصومعی تھیں۔ اور یہ دونوں (حضرات) اولیاء اللہ میں شمار کیے جاتے ہیں۔ اُس گاؤں
کا نام جس میں آپ کی ولادت ہوئی نیف (بالکسر یا بالفتح) ہے جو بحر کاسپین کے جنوب ضلع گیلان
میں واقع ہے۔ (حضرت) شیخ اٹھارہ برس کی عمر میں بغرض تعلیم بغداد تشریف لائے جہاں
آپ کی والدۂ ماجدہ ابتداءً آپ کے اخراجات کی متکفل تھیں۔ آپ نے صرف ونحو کی تعلیم
امام تبریزی (متوفی ۵۰۲ھ) سے اور فقہ حنبلی (اور بعض کے نزدیک فقہِ شافعی) متعدد شیوخ
سے حاصل کی۔ اور اپنی تصانیف میں آپ ہبۃ اللہ بن مبارک، اور ابوغنم محمد بن البناء سے بکثرت
روایت کرتے ہیں۔ آپ کے حالات زندگی مابین ۴۸۸ھ اور ۵۲۱ھ بہت کم معلوم ہیں
سوائے اسکے کہ آپ نے اس عرصہ میں فریضۂ حج سے فراغت حاصل کی اور نکاح کیا
اس وجہ سے کہ آپ کی اُنچاس اولاد میں سے ایک کی ولادت ۵۰۸ھ میں واقع ہوئی
تھی بعض مورخین لکھتے ہیں کہ آپ امام ابوحنیفہؒ کے مزار کے متولی تھے۔ آپ نے طریقۂ
سلوک وتصوف (حضرت) ابوالخیر محمد بن مسلم الدباس[1] سے حاصل کیا۔ جنکا پایۂ بزرگی اس قدر
بلند ہے کہ شعرانی کی فہرست میں اُن کا نام داخل ہے۔ انھیں بزرگ کی نظر توجہ اثر نے
(حضرت) شیخ پر فقر وتصوف غالب ہوگیا۔ اس طرح کہ آپ اُنکے پاس ایک مرتبہ ملنے آئے
تھے اور چونکہ اس موقع پر کسی نے ایک باز پکڑا تھا اسی وجہ سے دمیری کے نزدیک آپ کا
لقب "بازالاشہب" ہوگیا[2]۔ (شیخ) دباس کے طریقۂ تعلیم میں سخت مشکلات اور تکالیف

---

[1] اکثر کتابوں میں بجائے "محمد" کے "حماد" لکھا ہے۔

[2] تعجب ہے پروفیسر مارگولیتھ ایسے عربی داں بلکہ عربی نژاد محقق نے اس مقام پر فاش غلطی کی اور سخت دھوکا کھایا ہے۔ انگریزی کی اصل عبارت بالکل وہی ہے جیسا کہ ترجمہ میں ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کسی دوسرے شخص کے باز پکڑنے اور حضرت غوث الاعظم کو بازاشہب کا لقب ملنے سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ صحیح واقعہ یہ ہے کہ جب غوث الاعظمؒ شیخ دباس کی خدمت میں بغرض ارادت حاضر ہوئے تو شیخ نے فرمایا کہ "میں نے خواب میں دیکھا تھا کہ میں نے ایک باز شکار کیا ہے، اور غالباً وہ باز تمہیں ہو" یہ واقعہ تفصیل کے ساتھ آگے دیکھیے صفحہ [illegible]

سے سامنا تھا اور اُنکے دیگر صوفی مشرب مُریدوں اور شاگردوں کو ایک فقیہ کی شرکت اپنے۔

سلسلۂ طریقت و درس میں نہایت گراں معلوم ہوتی تھی - بہرحال (حضرت) شیخ بھوڑے ہی عرصہ میں اس قابل ہو گئے؛ اور مراحلِ سلوک اس قدر طے کر لیے کہ آپ کو خرقۂ تصوف قاضی ابوسعید مبارک المخرمی کے دستِ مبارک سے عطا ہوا جو اُسوقت فقہ حنبلی کے مشہور امام اور بغداد میں باب الازج کے قریب ایک مدرسہ میں درس دیتے تھے جہاں (حضرت) شیخ بھی بغرض استفادہ حاضر ہوتے تھے - ۵۲۱ھ میں شیخ یوسف الہمدانی (۴۴۰ھ لغایت ۵۳۵ھ) کی صلاح سے (حضرت) شیخ نے اپنا سلسلۂ وعظ علانیہ طور پر شروع کر دیا - جہاں گو ابتدا میں سامعین کی تعداد مختصرا!... ہوتی تھی مگر رفتہ رفتہ اتنی بڑھ گئی کہ آپ بغداد میں باب الحلبا کے قریب وعظ و نصیحت کی پُرجوش و فصیح تقریریں فرماتے؛ اور مشتاقانِ سخن کی کثرت کی وجہ سے اکثر آپ کو باب مذکور کے باہر نکل جانا پڑتا تھا - اسی جگہ آپ کے واسطے ایک رباط تعمیر کی گئی اور ۵۲۸ھ میں باشندگانِ شہر کی فراخ حوصلگی سے المخرمی کا یہ مدرسہ اس قدر وسیع کر دیا گیا کہ آس پاس کے مکانات بھی اُس میں شامل کر لیے گئے - اور (حضرت) شیخ اس کے مدرس اعلیٰ (امام) قرار دیے گئے - اس مدرسہ کے درس کی نوعیت تقریباً وہی تھی جیسا کہ جلال الدین الجوزی (ابن جوزی) کے درس کی تھی جس کا حال ابن جبیر نے نہایت تفصیل و وضاحت سے تضمین کیا ہے - جمعہ کے دن صبح کو اور دوشنبہ کے دن شام کو (حضرت) شیخ اسی مدرسہ میں وعظ بیان فرماتے اور یکشنبہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۰ کا)

دمیری کی کتاب الحیوان جلد اول صفحہ ۹۵ میں درج ہے اور قرینہ کہتا ہے کہ اُسی سے پروفیسر موصوف نے نقل کیا ہوگا - مگر بجائے اسکے کہ خود شیخ دباس نے "خواب میں" بازکرا او لکھ گئے کہ کسی دوسرے شخص نے "فی الواقع" بازکرا تھا - اور یہی وجہ اس لقب کی ہوئی - یہ مبارک لقب جو پیر نے جوشِ محبت میں دیا تھا آپ کو اس قدر پسند آیا کہ اپنے ایک مشہور قصیدہ میں جس کا مطلع ہے

سقانی الحب کاسات الوصال   فقلت لخمرتی نحوی تعالی

اسی کی طرف اشارہ کرتے ہیں:-

انا البازی و اشہب کل شیخ   ومن ذا فی الرجال اعطی مثالی

کے دن صبح کو حضرت کی خانقاہ میں محفل وعظ منعقد ہوتی تھی۔ آپ کے حلقۂ مریدین و تلامذہ میں بہت سے مشہور اولیاء اللہ ہوئے مگر بعض نے مثل آپ کے سوانح نگار سمعانی کے، دیگر علوم میں کمال دستگاہ حاصل کی۔ مشہور ہے کہ (حضرت) شیخ کے وعظ و نصائح اتنے پُرجوش و بااثر ہوتے تھے کہ اُنکو سُن کر اکثر یہود و نصاریٰ دولتِ اسلام سے مشرف ہوئے اور اکثر مسلمان صوفیِ صافی ہو گئے۔ اکثر تحف و ہدایا جو زیادہ تر نذر و نیاز کی صورت میں ہوتے تھے مقامات دور دراز سے جہاں آپ کی شہرت پہنچ گئی تھی (حضرت) شیخ کی خدمت میں بھیجے جاتے تھے جو تلامذہ اور ارادتمندوں کی مہمان نوازی کے لیے وقف تھے۔ اسی طرح سوالات فقہیہ استفتے کی صورت میں دُور دُور سے بکثرت آپ کی خدمت میں پیش کیے جاتے جنکا جواب فی البدیہہ آپ ارشاد فرماتے۔ اکثر خلفا اور وزرا بھی آپ کے ارادت کیشوں اور معتقدوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔

(حضرت) شیخ کی تصنیفات جن میں زیادہ تر آپ کے خطبے اور مواعظ ہیں سب مذہبی رنگ میں ہیں۔ آپ کی وہ تصانیف جن کا ہم کو علم ہے حسب ذیل ہیں:۔

(۱) "الغنیہ لطالبِ طریقِ الحق"۔ ایک مذہبی اور اخلاقی رسالہ ہے (مطبوعہ قاہرہ ۱۲۸۸ھ)

(۲) "الفتح الربانی"۔ باسٹھ خطبوں کا مجموعہ۔ جو ۵۴۵-۴۶ھ میں دیے گئے تھے مع تتمہ (مطبوعہ قاہرہ ۱۳۰۲ھ) بعض قلمی نسخوں میں اس کا نام "ستین مجالس" ہے۔

(۳) "فتوح الغیب" اٹھتر خطبوں کا مجموعہ مختلف مضامین پر مشتمل ہے جسکو (حضرت) شیخ کے صاحبزادہ (شیخ) عبدالرزاق نے جمع کیا تھا۔ اسکے آخر میں آپ کے وصایا، آپ کا شجرۂ پدری و مادری، حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ آپ کے تعلق کا ثبوت، آپ کے مذہبی اعتقادات اور آپ کی بعض نظمیں درج ہیں۔ (حاشیہ بہجۃ الاسرار مطبوعہ قاہرہ ۱۳۰۴ھ)

(۴) "حزب بشائر الخیرات" ایک صوفیانہ دعا ہے۔ (مطبوعہ اسکندریہ ۱۳۰۴ھ)

(۵) "جلاء الخاطر" (متذکرۂ حاجی خلیفہ) خطب کا مجموعہ ہے جن میں پہلے خطبہ کی تاریخ وہی ہے جو نمبر (۲) کے خطبہ ۵۹ کی اور آخری خطبہ کی وہ ہے جو نمبر (۲) کے خطبہ نمبر ۵۷ کی ہے۔ شاید یہ اُسی کتاب کا دوسرا نام ہو۔

(۶) "المواہب الرحمانیہ والفتوح الربانیہ فی مراتب الاخلاق السنیہ والمقامات العرفانیہ"۔

جس کا ذکر روضۃ الجنات صفحہ ۴۴۲ میں ہے۔ شاید یہ وہی کتاب ہو جو مذکورۂ بالا نمبر ۲ یا ۳ ہے۔

(۷) "مواتیت الحکم" (تذکرۂ حاجی خلیفہ)

(۸) "الفیوضات الربانیہ فی الاوراد القادریہ" - مجموعۂ ادعیہ (مطبوعہ قاہرہ ۱۳۰۳ھ)

(۹) مجموعۂ خطب مشمولۂ بہجۃ الاسرار و دیگر رسالجات۔ (اس کا ناتمام قلمی نسخہ انڈیا آفس کی فہرست میں نمبری ۷۲۶ ہے۔ فارسی مورخین اس کا ذکر عام طور پر "ملفوظات قادری" کے نام سے کرتے ہیں)

تمام تصانیف مذکورۂ بالا میں (حضرت) شیخ من حیث المصنف ایک زبردست فقیہ اور ایک پُر زور و پُر استدلال زاہد و فصیح واعظ نظر آتے ہیں۔ الغنیہ میں بہت سے اعلیٰ درجے کے خطبے شامل ہیں اور اسلام کے تہتر فرقوں کے حالات بھی درج ہیں جو دس ابواب پر منقسم ہے۔ اس میں اکثر مشہور نحویوں کا ذکر ہے مثلاً مبرد اور قدمائے مفسرین اور اولیاء اللہ کے حالات بھی مندرج ہیں۔ اس کتاب سے (حضرت) شیخ کے مذہبی اعتقادات ایک پورے پیرو شریعت کے ایسے معلوم ہوتے ہیں اور طرز بیان من اولہ الیٰ آخرہ متانت سے خالی نہیں۔ البتہ بعض آیاتِ قرآنی کی تفسیر و توضیح میں متصوفانہ تاویل سے کام لیا گیا ہے اور پوشیدہ معنی بیان فرمائے ہیں۔ اسکے ساتھ بعض اوراد کا بھی ذکر ہے جن کو پچاس پچاس یا سو سو مرتبہ پڑھنے کی تاکید ہے۔

کتاب نمبر (۲) مذکورۂ بالا میں بعض خطاب ایسے ہیں جو ادب اسلامی میں بے نظیر ہیں۔ ان میں مذہبی رواداری اور انسان دوستی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ خطیب کا دل چاہتا ہے کہ تمام بنی نوع انسانی پر دوزخ کے دروازے بند اور بہشت کے دروازے کھول دیئے جائیں۔ اصطلاحات صوفیہ بہت شاذ و نادر استعمال ہوئے ہیں اور مطالب ایسے عام فہم طریقہ سے بیان فرمائے ہیں کہ معمولی قابلیت کے پڑھنے والے بھی اُس سے اچھی طرح بہرہ اندوز ہو سکتے ہیں۔ البتہ یہ بھی مشہور ہے کہ (حضرت) شیخ کے ایک شاگرد کا قول ہے کہ میں اُس کا ایک لفظ بھی نہیں سمجھ سکتا۔ خُطب کا لب لباب اور عام مفہوم یہ ہے کہ ابتدائی مراحل طے کرنے کے لیے جویائے حق کو لازم ہے کہ دنیوی عیش و آرام، لذات و لذات کو خیر باد کہے البعد کو جب اس قابل ہو جائے کہ دوسروں کو اپنے دائرۂ ارادت میں لے سکے تو پھر عود کرے۔ اسی طرح یہ مسئلہ بھی کہ ہر چیز جو خواہ اس عالم سے تعلق رکھتی ہو یا دوسرے عالم سے، وہ درمیان طالب و مطلوب کے

ایک حجاب ہے، اور طالب کا مقصد اصلی فنا فی المطلوب ہونا چاہیے، بہت خوبی اور شرح وبسط سے بیان کیا گیا ہے۔ سامعین یا قارئینِ وعظ کو ہدایت ہے کہ وہ اپنے اموال سے اولیاء اللہ کی خدمت کریں، اور انکو اپنے اہلِ خاندان پر ترجیح دیں۔ خطبوں میں خود خطیب اپنی طرف اشارہ بہت کم کرتا ہے اور جہاں کہیں ہے وہ بھی زیادہ تفاخر کے لہجہ میں نہیں۔ مثلاً جس جگہ اپنے تئیں "اہل عالم کی کسوٹی" فرمایا ہے تو مراد اُس سے صرف اتنی ہے کہ میں اہل حق اور اہل باطل یا سچے اور مصنوعی جویائے حق میں بخوبی تمیز و تفریق کر سکتا ہوں۔ مگر اسکے ساتھ اسپر بھی زور دیا گیا ہے کہ میں جو کچھ کہتا ہوں فرمان الٰہی کے مطابق کہتا ہوں۔

(حضرت) شیخ کے حالات جو آپ کے مریدین عبد اللہ بن محمد البغدادی اور عبد المحسن البصری اور عبد اللہ بن نصر الصدیقی نے لکھے ہیں (جن کا نام "انوار الناظر" ہے اور بہجۃ الاسرار کے صفحہ ۱۰۹ پر مذکور ہیں) بالفعل ہم کو نہیں مل سکتے۔ سمعانی نے اپنی لغت (کتاب الانساب) میں (حضرت) شیخ کا نام "جیل" لکھ کر اُسکے آگے کچھ جگہ چھوڑ دی ہے۔ آپ کے حالات سمعانی کے صاحبزادہ نے بھی کچھ قلمبند کیے ہیں۔ جن میں تہذیب و متانت تو ضرور ہے مگر ارادت سے خالی ہیں۔ پھر آپکے کچھ حالات موفق الدین عبد اللہ المقدسی نے بھی جمع کیے ہیں جو (حضرت) شیخ کی آخر عمر میں ۵۰ دن تک آپ کی خدمت میں برابر حاضر رہے۔ ان کا بیان ہے کہ اہل بغداد (حضرت) شیخ کی بڑی عزت کرتے اور بہت مانتے تھے اور کشف و کرامات کے بھی قائل تھے مگر میں نے کوئی کشف و کرامت (حضرت) شیخ کی اپنی آنکھ سے نہیں دیکھی۔ مقدسی مذکور اور ایک شخص اور زمانۂ مذکور میں (حضرت) شیخ کے تنہا تلامذہ تھے۔ محی الدین ابن عربی (ولادت ۵۶۰ھ) نے بھی اپنی تصانیف میں (حضرت) شیخ کا اکثر جگہ ذکر کیا ہے۔ کہیں لکھتے ہیں کہ "وہ عادل ہیں" "اپنے زمانہ کے قطب ہیں"۔ (فتوحاتِ مکیہ جلد اول صفحہ ۲۶۳) "امام طریقت ہیں" "اہل عالم کے مستند قاضی ہیں" (ایضاً جلد دوم صفحہ ۲۴) "فرقۂ ملامتیہ سے تھے" (جلد سوم صفحہ ۳۴) کہیں یہ بھی لکھا ہے کہ (حضرت) شیخ بطن مادر میں مصروف حمد تھے۔ اور یہ کہ اُن کا مرتبہ اتنا بلند ہے کہ سوا خدا کے سب سے بالا تر ہیں۔ صاحب بہجۃ الاسرار (متوفی ۷۱۳ھ) نے (حضرت) شیخ کی اکثر کرامات کا ذکر کیا ہے اور ایک زبردست سلسلۂ شواہد پیش کیا ہے۔ جس وجہ سے ابن تیمیہ (متوفی ۷۲۸ھ)

کا قول ہے کہ شواہد مذکورکافی طور سے اطمینان بخش ہیں۔ مگر بعض کے نزدیک کتاب مذکور قابلِ اطمینان نہیں۔ مثلاً ذہبی اُن کو مصنوعی قصوں سے تعبیر کرتے ہیں۔ مگر ابن الوردی نے (تاریخ جلد دوم صفحات ۱۰۷، ۱۰۷ میں) اسکی نقل کی ہے۔ بعض جملے اس قسم کے بھی آپ کی طرف منسوب ہیں جو تفاخر آمیز ہونے کی وجہ سے بعض کو ناگوار معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً بہجۃ الاسرار میں اُن اشخاص کی پوری فہرست دی ہے جنہوں نے (حضرت) شیخ کو فرماتے ہوئے سُنا "قدمی ہذہ علیٰ رقبۃ کل ولی اللہ" (میرا پاؤں ہر ولی اللہ کی گردن پر ہے) اسی طرح یہ جملہ بھی آپ کی طرف منسوب ہے کہ ستر ابواب علم مجھ پر کشادہ ہیں جن میں سے ہر ایک اتنا وسیع ہے جتنا زمین و آسمان کے درمیان کا فاصلہ۔ معتقدین متاخرین (حضرت) شیخ کے (مثلاً صاحب رسالہ "مخازن قادریہ" فارسی قلمی نسخہ برٹش میوزیم نمبری ۲۴۸) ایک طرف تو جملۂ مقدم الذکر کی عمومیت کو محدود کرنا چاہتے ہیں مگر دوسری طرف اسکے بھی قائل ہیں کہ (حضرت) شیخ اس قسم کے ادعا کے ہر طرح مجاز ہیں اور نیکدل سفینہ مثل دیبری کے اس قسم کے جملوں سے صرف (حضرت) شیخ کی فضیلت استنباط کرتے ہیں (دیبری جلد اول صفحہ ۳۴۰) معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے جملے (حضرت) شیخ کی مستند تصانیف میں نہیں پائے جاتے۔ البتہ اس قبیل کی باتیں اُن نظموں میں ملتی ہیں جو آپ کی طرف منسوب ہیں۔ اور آپ کے پیرووں اور مریدوں کے وفور جوش و اعتقاد کی دلیل ہیں۔ ان لوگوں میں آپ کی شہرت اور محبت خود پیغمبر اسلام (علیہ الصلوٰۃ والسلام) سے بھی بڑھ کے پائی جاتی ہے۔ آپ "سلطان الاولیا" کے لقب سے مشہور ہیں۔ اور کبھی بھی آپ کا نام نہیں لیا جاتا جب تک اُسکے ساتھ ذیل کے لقب نہیں شامل کیے جاتے: مشاہد اللہ، امر اللہ، فضل اللہ، امان اللہ، نور اللہ، قطب اللہ، سیف اللہ، فرمان اللہ، برہان اللہ، آیات اللہ، غوث اللہ، غوث الاعظم۔

بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اس شہرت و نمود کو آپ کے صاحبزادوں نے ترقی دی، جن میں سے گیارہ کے نام بہجۃ الاسرار میں اس طرح گنوائے ہیں اور لکھا ہے کہ یہ (حضرات) اپنے پدر بزرگوار کے قدم بہ قدم چلتے تھے (۱) شیخ عیسیٰ متوفی ۵۷۳ھ مصر میں۔ (۲) شیخ عبد اللہ متوفی ۵۸۹ھ بغداد میں (۳) شیخ ابراہیم متوفی ۵۹۲ھ واسط میں (۴) شیخ عبد الوہاب متوفی ۵۹۳ھ بغداد میں (۵) و (۶) شیخ یحییٰ و محمد متوفی ۶۰۰ھ بغداد میں (۷) شیخ عبد الرزاق متوفی ۶۰۳ھ بغداد میں۔

(۸) شیخ موسیٰ متوفی ۶۱۸ھ دمشق میں (۹) شیخ عبدالعزیز۔ جو سنجار کے ایک گانوں میں رحلت کر گئے تھے جہاں ۶۰۲ھ میں انتقال کیا (۱۰) شیخ عبدالرحمن متوفی ۵۸۷ھ (۱۱) شیخ عبدالجبار متوفی ۵۷۵ھ۔ بعض ارباب تاریخ اس فہرست میں کچھ اور نام بھی اضافہ کرتے ہیں۔ ان میں سے شیخ عبدالوہاب اپنے پدر بزرگوار کے قائم مقام اور جانشین ہوئے۔ پھر اُنکے بعد اُنکے صاحبزادے شیخ عبدالسلام (۵۴۳ھ تا ۶۱۱ھ) اور اُنکے بعد اُنکے برادر عم زاد شیخ ابو صالح نصر بن عبدالرزاق (۵۶۴ھ تا نہایت ۶۳۳ھ) ہوئے۔ خلیفہ ناصر بامر اللہ کے زمانۂ حکومت میں (حضرت) شیخ کی اولاد اور متوسلین کے کچھ لوگ تھوڑے عرصہ کے لیے بغداد سے جلاوطن کیے گئے اور بعض حضرات تاتاریوں کے مشہور حملہ میں شہید ہوئے مگر سلسلۂ قادریہ کا مستقل مقام اور مرکز ہمیشہ بغداد ہی رہا۔

فہرست اسناد

(حضرت) شیخ کی سوانح عمریوں کی ایک فہرست جرمن مستشرق اہلوردو نے دی ہے۔ جن میں سے کتب ذیل شایع ہو چکی ہیں:۔ (۱) شطنوفی "بہجۃ الاسرار" (مطبوعہ قاہرہ ۱۳۰۴ھ) (۲) محمد بن یحییٰ تادفی "قلائد الجواہر" (قاہرہ ۱۳۰۳ھ) (۳) محمد الداعی "نتیجۃ التحقیق" (مطبوعہ فیز ۱۳۰۹ھ) جس کا ترجمہ ویئر کا رسالہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی ۱۹۰۲ء میں چھپ گیا ہے انکے علاوہ "غبطۃ الناظر" جو ابن حجر کی طرف منسوب ہے مگر اہلوردو کی فہرست میں داخل نہیں۔ اسکو ڈاکٹر ڈینزن راس نے کلکتہ میں ۱۹۰۳ء میں ایڈٹ کیا تھا۔ شاید بہترین موجودہ سوانح (حضرت) شیخ کے ذہبی کی "تاریخ الاسلام" میں ملیں گے۔ جس کا ماخذ ابن النجار ہے اور رسالہ ایشیاٹک سوسائٹی ۱۹۰۷ء کے صفحات ۱۲۶ لغایت ... میں شایع ہو چکی ہے۔ موجودہ زمانہ میں شیخ سنوسی نے بھی کچھ حالات (حضرت) شیخ کے تحریر کیے ہیں۔ اگر کسی کو (حضرت) شیخ یا سلسلۂ قادریہ کے متعلق یورپی تحریروں سے فائدہ اُٹھانا ہو تو کتب ذیل مطالعہ کرے:۔ (۱) ال دن "مرابوزلے خوان" (پیرس ۱۸۸۴ء) (۲) لے شاتیلیر کا نفریریہ سلمانی دو حجاز" (پیرس ۱۸۸۷ھ) (۳) دیپون اور کاپولانی "کا نفریریز ریلیجیوسے سلمانی" (الجیرس ۱۸۹۷ھ) (۴) قرادیوز "غزالی" (پیرس ۱۹۰۲ء)

محمد عسکری (الناظر، دسمبر ۱۹۲۴ء)

تذکرۂ صوفیۂ کرام نمبر ۱

حضرت داتا گنج بخش رح علی الہجویری اللاہوری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

الناظر کے قدیم قدردانوں کو یاد ہوگا کہ ایک زمانہ مین ہمارے فاضل و عارف مقالہ نویس عبداللہ کے قلم سے متعدد صوفیائے کرام کے تذکرے ان اوراق مین شائع ہوئے تھے۔ انھین بزرگ نے اب اپنے نتائج قلم کی تجدید فیض کا از سر نو وعدہ فرمایا ہے اور بطور قسط اول مضمون ذیل عنایت کیا ہے۔ انشاء اللہ اسی طرح اکابر طریقت کے تذکرے برابر نکلتے رہین گے اور کچھ عرصہ مین اردو مین ایک معقول و مفصل تذکرۃ الاولیاء مدون ہو جائیگا۔ مضمون نگار صاحب کا نام نامی ناظرین الناظر کے لیے اجنبی نہین لیکن خانقاہ طریقت مین جب وہ قدم رکھتے ہین تو اپنی شخصیت کو فنا کر کے محض "عبدیت الٰہی" کے قالب مین جلوہ گر ہوتے ہین ہم بھی اس سے زیادہ کچھ عرض نہین کر سکتے، کہ ع ایک معشوق ہے اس پردۂ زنگاری مین۔

(ایڈیٹر الناظر)

سرحلقۂ جملہ اقطاب محرم جمیع ابواب معشوق بہ اوصاف معنوی شیخ علی بن عثمان بن علی الغزنوی قدس سرہ کمل اولیائے زمانہ سے تھے آپ کی کنیت ابو الحسن تھی۔ ہجویر آپ کا وطن ہے جو مضافات غزنی سے ہے، سلطان محمود غزنوی کے بیٹے کے زمانہ مین شہزادہ مسعود کے ساتھ ہندوستان تشریف لائے اور لاہور مین اقامت فرمائی اور داتا گنج بخش رح کے لقب سے مشہور ہوگئے۔ آپ ہی کے قدوم میمنت لزوم کی برکت سے لاہور کے اطراف و اکناف مین اسلام پھیلا۔ مراۃ الاسرار مین آپ کے پیر و مرشد کا نام نامی ابو الحسن خضری مرقوم ہے جو تصوف مین حضرت جنید رح کا مذہب رکھتے تھے۔ نفحات الانس مین ہے کہ کنیت وے ابو الحسن است عالم و عارف بود و مرید شیخ ابو الفضل بن حسن ختلی است" و بہ صحبت از مشائخ دیگر رسیدہ است غالباً مراۃ الاسرار مین سہو کاتب ہوا ہے۔ مراۃ الاسرار مین ہے کہ خواجہ احمد حمادی رح سرخسی جو اپنے زمانہ مین مبارز لعباد کہلاتے تھے ان کا اور حضرت کا بہت ساتھ رہا ہے۔ ایک روز آپ نے پوچھا کہ اے خواجہ احمد آپ کے توبہ کا باعث کیا ہوا۔ کیا واقعہ گذرا جو آپ نے پہلے پہل توبہ کی اور تمام مشاغل دنیاوی سے کنارہ کشی فرمائی۔ خواجہ نے فرمایا۔ ایک زمانہ کا واقعہ ہے کہ سرخس سے مین نکل کر ایک بیابان مین پہنچا

جہان اونٹ چرا کرتے تھے اس مقام پر مین نے ایک عرصہ تک قیام کیا۔ ہمیشہ بھوکا رہتا اور اپنا کھانا دوسرے کو دیدیتا تھا۔ ایک روز کیا دیکھتا ہون کہ جنگل سے ایک شیر نکلا اور ایک اونٹ کو لیگیا اور ایک اونچے ٹیلہ پر لیجا کر اُسے مارا۔ اور آواز دی۔ آواز کے سنتے ہی جنگل سے طرح طرح کے درندے گرگ۔ شغال وروباہ وغیرہ دوڑے اور اونٹ کا گوشت کھانا شروع کیا۔ جب یہ سب سیر ہوکر چلے گئے تو شیر خود آیا اور کچھ کھانا چاہا کہ دور سے ایک لومڑی دکھائی دی شیر لومڑی کو آتا دیکھ کر ہٹ گیا اور لومڑی کو کھانے دیا۔ جب یہ لومڑی کھا کر چلی گئی تو پھر خود آیا اور تھوڑا سا گوشت کھایا۔ حضرت داتا گنج بخش رح یہ سب تماشا دور سے دیکھ رہے تھے۔ جب شیر جانے لگا تو مجھ سے گویا ہوا کہ اے ابواحمد لقمہ پر ایثار کرنا کتون کا کام ہے۔ مردان دین کا ایثار یہ ہے کہ جان پر کھیل جائین۔ اُس سے یہ کلمات سُن کر مین نے تمام شغلون سے کنارہ کشی اختیار کی۔

نفحات الانس مین ہے کہ ایک مرتبہ حضرت شیخ علی الہجویری رح نے حضرت شیخ المشایخ ابوالقاسم گرگانی سے دریافت کیا کہ درویش را کمتر چیزے بباید تا اسم فقر را سزاوار گردد حضرت شیخ المشایخ نے فرمایا کم سے کم تین چیزین (۱) پارہ راست بتواند دوخت (۲) سخن راست بتواند گفت وشنود (۳) پاے راست بر زمین بتواند زد۔ آپ فرماتے ہین کہ ہمارے ساتھ درویشون کی ایک جماعت تھی۔ اپنے ٹھکانے پر پہونچکر ہم نے کہا آؤ ان کلمات کے شرح مین ہر اک کچھ نہ کچھ بیان کرے ہر اک نے اپنی اپنی سمجھ کے موافق بیان کیا۔ لیکن جب شیخ علی الہجویری رح کی نوبت آئی تو انھون نے فرمایا کہ پارہ راست دوختن آن بود، فقر دوزند نہ بزینت۔ سخن راست آن باشد کہ بحال شنود نہ بمنیت یعنی از روے تحقیق ہونا چاہیے نہ کہ از روی تصور۔ و بجد وجد دران تصرف کنند نہ بہزل و بزندگانی مرآنرا فہم کنند نہ بعقل۔ و پای عدالت بر زمین زدن آن باشد کہ بوجد بر زمین زنند نہ بہ ادد۔ شیخ علی الہجویری کے اس کلام کو لوگون نے شیخ المشایخ ابوالقاسم گرگانی کے سامنے بیان کیا آپ نے فرمایا۔ اصاب علی جبرہ اللہ تعالیٰ۔

حضرت داتا گنج بخش علی الغزنوی ثم الہجویری ثم اللاہوری رحمۃ اللہ علیہ صاحب دیوان تھے۔ ایک مرتبہ ایک صاحب آپ کے دیوان کو مانگ کر لے گئے اتفاق سے صرف وہی ایک نسخہ تھا ان حضرت نے اس دیوان کو اُلٹ پلٹ کر دیا اور حضرت شیخ کا نام نکالکر اپنے نام سے اُسے مشہور کر دیا چنانچہ اس واقعہ کو آپ خود کشف المحجوب مین بیان فرماتے ہین۔ اسی طرح آپ نے تصوف مین ایک کتاب تصنیف فرمائی تھی جس کا

نام منہاج الدین تھا۔ ایک دوسرے صاحب اُس کو عاریتاً مانگ کر لے گئے اور سرقہ کرکے اپنے نام سے لوگون مین شایع کیا۔ افسوس ہی کہ یہ دیوان اور کتاب اب کہین نہین ہی۔ اس کے بعد پھر آپ نے ایک اور کتاب تصنیف فرمائی جو آج تک امہات کتب تصوف مین شمار کی جاتی ہی۔ اس کا نام کشف محجوب ہی۔ اس کتاب کے بعض مضامین پر انشاء اللہ تعالیٰ آگے بحث کی جاے گی۔

ابوسعید ہجویری رح نے آپ سے دریافت کیا کہ تصوف کے طریقہ کی تحقیق کیا ہی اور اہل تصوف کے مقامات کی کیفیت اُن کے اقوال و مذاہب۔ اُن کے رموز و اشارے۔ خداے بزرگ و برتر کی محبت و حقیقت۔ دلون پر اس کے اظہار سے جو کیفیت پیدا ہوتی ہی اور اسکی ماہیت تک پہونچنے مین عقول کے محجوب رہنے کا سبب کیا ہی۔ نفس اُسکی حقیقت سے کیون متنفر ہی اور روح کو اپنی پاکیزگی و صفائی سے کیا آرام پہونچتا ہی اور روح کی پاکیزگی کس شے مین ہی۔ ان سوالون کے جواب مین غالباً کشف المحجوب تصنیف فرمائی گئی ہے

آپ کہتے ہین کہ ہمارے زمانہ مین یہ علم حقیقت پرانا ہو گیا ہی ابناے ملک نفسانی خواہشون مین مبتلا اور رضاے الٰہی کے راستہ سے بھٹکے ہوے ہین۔ عام علما نے جو طریقت کی صورت بیان کی وہ اصل کے خلاف ہی۔ عام کہتے ہین کہ ہم حق کو پہچانتے ہین اور خواص دلون کی آرزو و محبت نفوس اور میلان سر کو رویت کا شوق اور محبت کی سوزش سمجھ کر آسودہ خاطر ہین۔ مریدون نے مجاہدہ سے ہاتھ اُٹھا لیا ہی اور معلول ظن کا نام مشاہدہ رکھا ہی۔ زمانہ کی اس حالت کو بیان کرکے آپ فرماتے ہین کہ مین نے اس مضمون پر پہلے کئی کتابین لکھی تھین مگر وہ سب ضایع ہو گئین۔ جھوٹے مدعیون نے لوگون کو پھانسنے کے لیے اسمین سے بعض اقوال لے لیے اور باقی کو ترک کر دیا اور ناپید کر دیا۔ بعض پڑھنے کے لیے بیٹھے مگر پڑھا نہین بعض نے پڑھا مگر سمجھا نہین۔ دل مین کسی کے طلب کا درد نہین تھا۔ اگر ہوتا تو اپنی درمان کی ضرور جستجو کرتا ؎

فکل فی فواده وجع لیطلب شیئاً یوافق الوجعا

چونکہ کسی کو درد طلب نہ تھا اس لیے ان کتابون کو ضایع کر دیا۔

مرتبع پہنچنے پر آپ نے ایک کتاب لکھی تھی جسکا نام اسرار الخرق والمؤنات ہی۔ اُس زمانہ مین مریدون مین اسکا رواج تھا مگر اب کہین نظر نہین آتی۔ اپنے حالات مین ایک جگہ حضرت تحریر فرماتے ہین کہ ایک مرتبہ دیار آذر بائیجان کا سفر درپیش آیا۔ وہان فقراے ملامتیہ مین سے ایک کی صحبت مین بیٹھنے کا مجھے اتفاق ہوا۔ ایک دفعہ انھین خوش پاکر مین نے سوال کیا کہ بھائی صاحب ان شوریدہ اور پریشان افعال سے آپ کا مقصود کیا ہی؟

اُنھون نے فرمایا کہ لوگون سے پیچھا چھوڑانا۔ مین نے کہا کہ لوگ بہت ہین اور عمر کم ہی۔ آپ اُن سے پیچھا نہین چھڑا سکتے پھر خود ہی کیون نہین انکا پیچھا چھوڑ دیتے۔ تاکہ اِن تمام مشاغل سے آپ کو نجات مل جائے۔ یہ بیان کرکے آپ فرماتے ہین کہ ایسے لوگ بہت ہوتے ہین جو لوگون مین مشغول ہوئے ہین اور سمجھتے ہین کہ لوگ اُن کی طرف مشغول ہین۔

حضرت خود ایک مرتبہ کا اپنا واقعہ بیان فرماتے ہین کہ مجھے ایک واقعہ پیش آیا جسکے حل کی مین نے بہت کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی۔ آخر شیخ بایزید بسطامیؒ کے مزار اقدس پر مجاوری شروع کی۔ آخرکار وہان حل نصیب ہوا۔ لیکن اس کے بعد پھر ایک واقعہ پیش آیا اور اُس کے حل کرنے کے لیے تین ماہ مین مزار شیخ بایزیدؒ پر مجاوری کرتا رہا مگر کوئی فائدہ نہوا۔ حل ہونے کی امید پر ہر روز تین دفعہ نہاتا اور تیس ۳۰ دفعہ وضو کرتا تھا۔ جب یہ سب کچھ کام نہ آیا تو وہان سے اُٹھا اور خراسان کا رُخ کیا حتی کہ شہر کش کے ایک گاؤن مین پہنچا۔ وہان ایک خانقاہ مین صوفیون کی ایک جماعت مقیم تھی میری حالت یہ تھی کہ ایک گدڑی بدن پر تھی اور ہاتھ مین عصا اور چمڑے کا ایک لوٹا اور بس اس جماعت نے مجھے بہت حقیر اور ذلیل سمجھا مجھے ایک بالاخانہ پر جگہ ملی اور وہ جماعت صوفیہ اُس سے بلند تر دوسرے بالاخانہ پر مقیم ہوئی۔ وہ خود اچھا اچھا کھانا کھاتے تھے حتی کہ میرے ناک مین بو آتی تھی اور مجھے صرف ایک سوکھی روٹی جو پڑے پڑے سبز ہو گئی تھی۔ کھانے کو دی اور مجھپر طنز اور طعنے پھینکنے لگے۔ جب وہ کھانا کھا چکے تو خربزے کھانے لگے اور میری حقارت اور اپنی خوش طبعی کے طور پر چھلکے میرے سر پر پھینکتے جاتے تھے۔ مین اپنے دل مین کہتا تھا کہ اے اللہ اگر مین ان لوگون مین سے ہوتا جو تیرے دوستون کا لباس پہنے ہوئے ہین تو مین اُن سے الگ نہ ہوتا۔ جسقدر وہ لوگ مجھپر زیادہ طنز و طعنہ کرتے تھے اُسی قدر اپنے نفس کی تحقیر دیکھکر مین خوش ہوتا جاتا تھا۔ یہانتک طعنون کا بوجھ اُٹھاتے اُٹھاتے وہ عقدہ جسکے حل کے لیے مین سرگردان تھا حل ہو گیا اور اس وقت مین نے جانا کہ بزرگون نے کس لیے جاہلون کی حرکتون کو روا رکھا ہی اور کس لیے اُن کے بوجھ اُٹھائے ہین۔

اپنے پیر و مرشد کے حال مین کشف المحجوب مین لکھتے ہین کہ ایک مرتبہ مین آپ کو وضو کرا رہا تھا اور ہاتھ پر پانی ڈال رہا تھا کہ میرے دلمین آیا کہ جب سب کام تقدیر اور قسمت سے ہین تو کیون حصول کرامت کے لیے لوگ اپنے ہم جنسون مین سے پیر بنایا کرتے ہین۔ میرے دل کے اس خطرے پر مطلع ہو کر آپ نے فرمایا

لہ ہر حکم کے لیے ایک سبب ہوتا ہے۔ جب خدائے بزرگ و برتر چاہتا ہے کہ سختی کرنیوالے اور ظالم بچہ کو ملک کا تاج عطا فرمائے تو پہلے اُسے توبہ بخشتا ہے اور اپنی ایک دوست کی خدمت میں مشغول کرتا ہے تاکہ یہ خدمت اُس کے لیے کرامت کا سبب ہو۔ پھر حضرت آگے تحریر فرماتے ہیں، کہ وفات کے وقت میرے پیر و مرشد حضرت ابو الفضل حسن ختلی رح کا سر مبارک میری گود میں تھا۔ اپنے دوست میں سے ایک شخص سے میرے دل میں کچھ رنج تھا۔ شیخ علیہ الرحمہ میرے اس حال سے مطلع ہو گئے اور فرمانے لگے کہ بیٹا کیا اعتقاد کا ایک مسئلہ میں تمھیں بتاؤں۔ اگر اپنے تئیں اس پر مستحکم رکھو گے تو سب رنجوں سے چھوٹ جاؤ گے۔ یاد رکھو کہ ہر محل کے نیک و بد تمام احوال خدائے جل و علیٰ کے پیدا کردہ ہوتے ہیں۔ تمھیں چاہیئے کہ خدا کے فعل پر خصومت نہ کرو اور دل میں کوئی رنج نہ رکھو۔

حضرت شیخ علی الہجویری داتا گنج بخش رح نے جن مشایخ کو دیکھا اور اُن کی صحبت میں رہے اُن کے نام نامی یہ ہیں حضرت شیخ ابو الفضل حسن ختلی رح۔ ابو القاسم عبد الکریم قشیری رح۔ ابو العباس احمد بن محمد شقانی رح ابو القاسم علی بن عبد اللہ الکرکانی رح۔ ابو احمد مظفر بن احمد بن حمدان رح۔ ان بزرگوں کے علاوہ حضرت شیخ نے کشف المحجوب کے باب ہفتم میں ان مشایخ کے نام گنائے ہیں جو ان کے ہمعصر تھے اور جو یگانۂ قوم اور ارباب معانی میں سے تھے۔ اُن کی تعداد ۲۴ ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ حضرت شیخ ابو العباس احمد رح سے میری بڑی دوستی تھی بلکہ بعض علوم میں وہ میرے اُستاد تھے۔ میں نے اُن سے زیادہ شیخ کی تعظیم کرنیوالا اور موجودات سے قطع تعلق کرنے والا کوئی نہیں دیکھا۔ آپ کا قول تھا کہ وہ نیستی جو دیدار میں ہو اس بہشت سے بہتر ہے جو حجاب میں ہو اور جب خدا وہ ہستی ہو جس پر عدم جائز نہیں تو پھر اگر میں ایسا نیست ہو جاؤں کہ میری نیستی کو پھر ہستی نصیب نہ ہو تو کیا مضائقہ ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ ایک دن میں حضرت شیخ ابو القاسم علی بن عبد اللہ الکرکانی کے سامنے بیٹھا ہوا تھا اور اپنی وارداتوں کا تذکرہ کر رہا تھا تاکہ حضرت کھرے کو کھوٹے سے الگ فرما دیں۔ آپ میرے حال کو بہت توقیر کے ساتھ سمع فرما رہے تھے۔ میرے دل میں یہ خیال گذرا کہ شاید ابتدا میں آپ کا گذر اس کوچہ میں نہیں ہوا ہے۔ شیخ علیہ الرحمہ کو میرے باطن کا حال معلوم ہو گیا اور فرمایا یہ فروتنی و نیاز تمھارے لیے نہیں ہے بلکہ اُس کے لیے ہے جس نے یہ حال تمھیں بخشا تھا۔ اسمیں تمھاری خصوصیت نہیں بلکہ تمام طالبوں کے لیے یہ عام ہے۔ میں یہ سنکر چپ ہو گیا۔ شیخ نے پھر فرمایا کہ بیٹا اس طریق میں آدمی کو صرف

اسی قدر نسبت حاصل ہو کہ جب اس طریقت کو اس سے متعلق کرتے ہیں تو وہ اس کی بانت کے پندار کو اختیار کرتا ہو اور جب اُسے معزول کرتے ہیں تو پندار کی صرف عبارت ہی عبارت باقی رہ جاتی ہو نفی و اثبات عدم و وجود دونوں پندار میں داخل ہیں۔ اس قید سے آدمی کو کبھی رہائی حاصل نہیں ہوتی۔ اس لیے اُسے چاہیے کہ بندگی کی راہ اختیار کرے اور مردانہ دشتی اور فرمانبرداری کے سوا تمام نسبتیں گم کر دے۔

ایک مرتبہ حضرت داتا گنج بخشؒ حضرت خواجہ ابو احمد مظفر بن احمد بن حمدانؒ کی خدمت میں بیٹھے تھے اور نیشاپور کا ایک مدعی بھی پاس بیٹھا ہوا اپنی عبارت میں یہ کہہ رہا تھا کہ فانی ہو گا اور پھر باقی۔ خواجہ مظفرؒ نے فرمایا کہ فنا پر بقا کی صورت کیونکر ہو سکتی ہو اس لیے کہ فنا سے نیستی مراد ہو اور بقا ہستی کی طرف دلالت کرتی ہو۔ فنا سے ہر ایک اپنے صاحب کے نفی کرنے والا ہوتا ہو پس فنا فنائے معلوم ہو۔ جب معلوم نیست ہوتا ہو تو عین باقی رہتا ہو نیست نہیں ہوتا کیونکہ وہ شے دیگر ہو۔ اور یہ روا نہیں ہو کہ حقیقتیں فنا ہو جائیں۔ فنا صفت کے لیے مخصوص ہو اور سبب کا فنا ہو جانا جائز رکھا گیا ہو پس صفت اور سبب جب فنا ہو جاتے ہیں تو موصوف اور سبب باقی رہتا ہو جسکے ذات پر فنا کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا حضرت خواجہ ابو احمد مظفر کے اس بیان کی تشریح آپ یوں فرماتے ہیں کہ بندہ کا اختیار بندہ کی صفت ہو اور اپنے اختیار میں بندہ جناب باری تعالیٰ کے اختیار سے محجوب ہو۔ پس بندہ کی صفت اس کی اور حق کے درمیان میں حجاب بنجاتی ہو۔ جناب باری عزاسمہ کا اختیار ازلی و ابدی ہو اور بندہ کا اختیار حادث۔ جو شے ازلی و ابدی ہو وہ فنا پذیر نہیں ہو سکتی اور حادث فانی و غیر باقی ہو۔ چنانچہ جب خدا جل جلالہ کا اختیار بندہ کے حق میں بقا پاتا ہو تو اُس وقت بندہ کا اختیار فانی اور اس کا تصرف منقطع ہو جاتا ہو۔

گرمی کے موسم میں ایک دن آپ پریشان حضرت خواجہ ابو احمد مظفرؒ کی خدمت میں آئے۔ اُنھوں نے فرمایا ابوالحسن، کیا حال ہو۔ میں نے عرض کیا کہ مجھے سرود چاہیے۔ حضرت خواجہؒ نے اسی وقت ایک آدمی کو بلا بھیجا اور قوال اور نیز اہل عشرت کی ایک جماعت کو طلب فرمایا۔ عشق کی آگ، ارادہ کی قوت اور بنا میں پڑنے کی کوشش نے سماع کے چند کلموں کے بعد ہی مجھے بیقرار کر دیا۔ اور کچھ عرصہ بعد جب جوش میں کمی ہوئی تو حضرت خواجہ نے مجھ سے پوچھا کہ اس سماع میں تمھارا کیا حال ہوا۔ میں نے عرض کیا کہ بہت خوش ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ ایک وقت آنے والا ہو کہ اس سماع اور کوے کی آواز تمھارے لیے برابر ہو گی۔ آپ کا مطلب یہ تھا کہ سماع کا اسی وقت تک قوت ہوتی ہو جب تک مشاہدہ نہ ہو۔ جب

شاہدہ حاصل ہوجاتا ہے تو دلالت سماع کی ضرورت باقی نہین رہتی حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ نے تاکید فرمائی کہ سماع کو عادت و طبیعت نہ بنانا اور نہ اسپر قیام کرنا۔

شیخ ابوالقاسم گورگانی کا واقعہ آپ خود بیان فرماتے ہین کہ شیخ کی زیارت کا خیال ایک مرتبہ جبکہ مین طوس مین مقیم تھا پیدا ہوا۔ چنانچہ مین گیا اور انھین مسجد کے حجرہ مین تنہا پایا۔ وہ میرا واقعہ ہو بہو ستون سے کہہ رہے تھے۔ مین نے عرض کیا حضرت یہ کس سے کلام ہو رہا ہے؟ ارشاد ہوا کہ اس ستون سے بے خدا نے میرے واسطے گویا کیا۔ اور اس نے مجھسے اک سوال کیا جسکا جواب دیرہا ہون۔

ایک مرتبہ آپ سلانگ نامی ایک گاؤن مین جو علاقہ فرغانہ سے تھا ایک درویش سے ملنے تشریف لے گئے۔ اُنھون نے آنے کا سبب پوچھا آپ نے کہا کہ آپ کی زیارت کے واسطے حاضر ہوا ہون فرماتے ہین کہ یہ سُن کر اُنھون نے محبت کی نظر سے مجھے دیکھا اور فرمایا کہ فلان روز سے تمھین دیکھ رہا ہون اور جب تک مجھسے غائب نہ کرین مین دیکھنا چاہتا ہون۔ جب مین نے حساب کیا تو معلوم ہوا کہ وہ فلان دن میری توبہ کی ابتدا کا دن تھا۔ درویش نے فرمایا کہ اے بیٹا باہر سفر کرنا لڑکون کا کام ہے۔ بس اگر زیارت کرنے آئے ہو تو خلوص دل سے زیارت کرو۔ کیونکہ حضور قلب کے سامنے حضور جسم کوئی شے نہین

آپ فرماتے ہین کہ ایک مرتبہ مین صوفیون کی مبتدی جماعت کو بعض مسائل سکھایا کرتا تھا مین ایک مرتبہ اونٹ کے صدقہ کا بیان کر رہا تھا کہ ایک جاہل آیا اُس نے میرا بیان سُنا تو گھبرانے لگا اور تنگ آکر اُٹھ کھڑا ہوا۔ مین نے کہا کہ اے شخص جیسا کہ ہمین زکوٰۃ دینے کے لیے علم حاصل کرنا چاہیے اسی طرح زکوٰۃ لینے کے لیے بھی۔ اگر کسی کے پاس نہ مال ہو اور نہ حصول مال کی لیاقت ہو تب بھی حصول علم کا فریضہ اس سے ساقط نہین ہوجاتا۔ نعوذ باللہ من الجہل۔

آپ صاحب عیال تھے چنانچہ خود فرماتے ہین کہ " تقدیر نے اس آفت مین مجھے پھنسا دیا اور اہل و عیال کی صحبت مین دل و جان سے گرفتار ہوگیا اور ایک سال تک اس آفت مین غرق رہا یہانتک کہ قریب تھا کہ میرا دین تباہ ہوجائے مگر خدائے جل و علیٰ نے اپنی کمال مہربانی بخشش سے دل بیچارہ کے استقبال کے واسطے عصمت کو بھیجا اور اپنی رحمت سے خلاصی عطا فرمائی والحمد للہ علیٰ جزیل نعمائہ۔

آپ فرماتے ہین کہ ایک دن مین شیخ ابوالعباس شقانی کے پاس آیا وہ یہ آیت پڑھ رہے تھے ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا عَبۡدًا مَّمۡلُوۡکًا لَّا یَقۡدِرُ عَلٰی شَیۡءٍ اور رو رہے تھے اور نعرہ مارتے تھے مین سمجھا کہ دنیا سے گذر جائین گے

مین نے عرض کیا یہ کیا حال ہی فرمایا گیارہ سال ہوئے کہ میرا درد بیان تک پہنچا ہی اور اس جگہ سے
مین نہین گذر سکتا۔

آپ فرماتے ہین کہ ایک مرتبہ مین مرو مین تھا۔ وہان حدیث کے ایک امام تھے جنھون نے
کہا کہ مین نے سماع کی اباحت مین ایک کتاب لکھی ہی۔ مین نے کہا غضب ہوا جناب نے جو امام ہین ایک
لہو کو جو گناہون کے اصل ہی حلال کیا ہی۔ اُنھون نے فرمایا اگر تم خود حلال نہین سمجھتے ہو تو کیون سماع سنتے
ہو۔ مین نے عرض کیا اس کی کئی صورتین ہین یعنی اگر دل مین حلال کی تاثیر ہو تو سماع حلال ہی اور اگر
حرام کی تاثیر ہو تو حرام ہی۔ اور اگر مباح کی ہو تو مباح ہی۔ جس چیز کو بظاہر اسباب گناہ کہا جاتا ہی اور باطنا
اُس کی رفتار کئی وجہون پر ہی تو ایک چیز پر اُس کا اطلاق کرنا محال ہوتا ہی یعنی سماع مین جو کوئی صواب کو صواب
دیکھے اور خطا کو خطا اُسکے کے لیے سماع حلال ہی۔ آپ فرماتے ہین کہ شیخ مسلم نارسی سے مین نے سنا ہی
کہ ایک درویش سماع مین بہت بیقراری ظاہر کرتا تھا۔ ایک شخص نے اسکے سر پر ہاتھ رکھدیا اور کہا کہ بیٹھ جا
جونہی بیٹھا روح پرواز کر گئی۔ مرید کو سماع کے غلبہ مین اسقدر حال چاہیے کہ اس کا سماع گنہگارون کو گناہ
سے چھڑادے۔ آپ فرماتے ہین کہ مین نے اپنی آنکھون سے ایک درویش کو دیکھا ہی جو آذربائجان کے پہاڑون
مین فکر مین ڈوبا ہوا یہ اشعار پڑھتا جاتا تھا ؎

والله ما طلعت الشمس ولا غربت — الا وانت فی قلبی و وسواسی
ولا جلست الی قوم احدثهم — الا وانت حدیثی بین جلسائی
ولا ذکرتک محزونا ولا طربا — الا وحبک مقرونا بانفاسی
ولا هممت بشرب الماء من عطش — الا رایت خیالا منک فی کاسی
ولو قدرت علی الاتیان زرتکم — سحبا علی الوجه او مشیا علی الراسی

وہ درویش ان اشعار سے ایسا متغیر و متاثر ہوا کہ ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور روح پرواز کر گئی۔ آخر مین آپ
فرماتے ہین کہ مین علی بن عثمان جلابی اس کو زیادہ دوست رکھتا ہون کہ اپنے مریدون کو سماع مین پڑنے
دون تاکہ اُن کی طبیعت پریشان نہو کیونکہ اسمین بڑے خطرے اور بڑی آفتین ہین۔

صاحب مراۃ الاسرار کی روایت کے بموجب آپ کا سنہ وفات ۴۶۵ھ (خمس و ستین و اربعمایہ) ہی
اور لاہور مین حضرت کا مزار مبارک ہی جو مرجع خاص و عام اور خود حضرت خواجہ غریب نواز خواجہ معین الدین سنجری

م الاجمیری رحمۃ اللہ علیہ نے بیان جاہ کیا ہو۔

آپ کے چند کلمات طیبات درج ذیل کیے جاتے ہین تاکہ تازگی بخش ارواح طالبین ہون

آپ فرماتے ہین کہ ہمارے زمانہ مین علم حقیقت پرانا ہوگیا ہو خاصکر اس ملک مین کہ سب لوگ نفسانی خواہشون مین پڑے ہوے ہین اور رضاے الٰہی کے راستہ سے الگ ہین۔ مدعیان زمانہ اور علماے دنیا نے طریقت کی صورت اُسکے اصل کے خلاف پیدا کردی ہو بس ہمت کر واس چیز کے لیے کہ خاصان حق کے سوا عوام کی دست رسی وہان تک نہین ہو۔ ابناے زمانہ پر افسوس ظاہر کرتے ہوے آپ فرماتے ہین کہ خداے جل وعلی نے ہمین اس زمانہ مین پیدا کیا ہو جس مین لوگون نے حرص ولالچ کا نام شریعت جبر وجاہ وریاست کی طلب کا نام عزت اور علم۔ اور ریا کا نام خوف الٰہی۔ اور کینہ پوشیدہ رکھنے کا نام حلم۔ آپسمین لڑائی جھگڑے کا نام بحث ومباحثہ۔ لڑائی جھگڑائی اور کمینہ پن کا نام عظمت۔ نفاق کا نام زہد۔ خواہش نفسانی کا نام ارادت۔ ہذیان طبع کا نام معرفت۔ اور نفسانی حرکات قلب کا نام محبت۔ خدا کے راستے سے پھرنے اور بیدین ہونے کا نام فقیری۔ جان بوجھکر انکار کرنے کا نام صفائی۔ زندقہ اور حق تعالیٰ اور آخرت پر ایمان نہ رکھنے کا نام فنا فی اللہ۔ پیغمبر خدا صلعم کی شریعت ترک کردینے کا نام طریقت۔ اہل زمانہ کے آفت کا نام معاملہ رکھا ہو۔ آپ فرماتے ہین کہ علم اسی قدر سیکھنا فرض ہو جس سے عمل درست ہو۔ کیونکہ بیفائدہ علم سیکھنے والون کی حق تعالیٰ نے مذمت فرمائی ہو۔ ویتعلمون ما یضرہم ولا ینفعہم اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پناہ مانگی ہو اعوذ باللہ من علم لاینفع۔ علم باعمل ہونا چاہیے۔ پیغمبر خدا صلعم نے فرمایا ہو کہ المتعبد بلافقہ کالحمار فی الطاحون۔

آپ فرماتے ہین کہ موحد جبری القول اور قدری الفعل ہونا چاہیے تاکہ قدر اور جبر مین اسکی رفتار درست آئی۔ حضرت ابوبکر وراق ترمذی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہین کہ التوحید دون الجبر وفوق القدر

فقر وغنا کے باب مین آپ فرماتے ہین کہ غنا کا نام خاص خداے جل وعلی کے لائق ہو لوگ اس نام کے مستحق نہین ہوسکتے اور فقر کا نام لوگون کے لیے ہے خداے بزرگ وبرتر کے لیے روا نہین۔ مجازاً ایک شخص کو غنی کہا جاتا ہو مگر حقیقۃً وہ غنی نہین ہوتا۔ غنا وجود اسباب سے متعلق ہو ہم قبول اسباب غنا کی حالت مین اسباب کے محتاج ہین اور حق تعالیٰ مسبب الاسباب ہو۔ غناے حقیقی جو حق تعالیٰ کی صفت ہو یہ ہو کہ اسکو کسی کی حاجت نہین یفعل ما یشاء ویحکم ما یرید۔ کوئی اُسکی مراد کو

رفع نہین کر سکتا۔ نہ کوئی اُسکی قدرت کو روک سکتا ہو وہ حقیقت موجودات کو اُلٹ دینے اور خلق اضداد پر قادر ہو ہمیشہ اُسی صفت سے رہا ہو اور رہیگا۔ غنائے مجازی جو خلق کی صفت ہو اسباب زندگی کا بافرصت و فراغت حاصل ہونا یا کسی بلا سے چھوٹنا یا کسی مشاہدہ سے آرام پانا ہو۔ یہ سب حدث و تغیر طلب و حسرت کا سلسلہ اور عاجزی اور خواری کا مقام ہو۔ یا ایھا الناس انتم الفقراء الی اللہ واللہ ھو الغنی الحمید فقر ما سوا سے دل کی فراغت ہو اور غنا ما سوا کی طرف دل کا مشغول ہونا جب فراغت حاصل ہوگی تو فقر غنا سے بہتر نہین اور نہ غنا فقر سے بہتر ہو۔ غنا متاع کی کثرت ہو اور فقر متاع کی قلت۔ اور متاع سب ملک خدا ہو۔ جب طالب نے ملک کے ترک کی خواہش کی تو شرکت درمیان سے اُٹھ گئی اور دونوں آسمون سے فارغ ہو گیا۔ اس گروہ کی عبارتون مین عدم و فنا سے مراد بُرے اسباب اور ناقابل تعریف صفات کو پسندیدہ صفات اور ستودہ اسباب کے طلب مین ترک کر دینا ہو۔

صوفی اُس کو کہتے ہین جو اپنی معاملہ اور اخلاق کو مہذب بنائے اور طبیعت کی آفتون سے کنارہ کرے۔ یہ اسم بطور اسمائے اعلام کے ہو۔ پھر آپ فرماتے ہین کہ اللہ تعالیٰ نے اس زمانہ مین بہت لوگون کو تصوف اور اہل تصوف سے حجاب مین کر رکھا ہو پس کوئی تو یہ خیال کرتا ہو کہ یہ طریق صرف ظاہری اصلاح کی ورزش ہو اور باطن کے مشاہدہ سے کوئی تعلق نہین رکھتا اور کوئی یہ کہتا ہو کہ یہ ایک بے حقیقت اور بے اصل رسم ہو یہانتک کہ علمائے ظاہر نے تصوف سے انکار کیا ہو اور باطن کی صفائی کی خواہش کو دل سے دور کر دیا ہو اور گذشتہ بزرگون اور اصحاب کے طریق کو ترک کر دیا ہو ؎

ان الصفا صفة الصدیق ان اردت صوفیاً علی التحقیق

صفائی کی جڑ خدائے جل و علیٰ کے سوا سب سے دل کو ہٹا لینا ہو اور شاخ بیوفا دنیا سے علیحدگی اختیار کرنا ہو آپ فرماتے ہین کہ اس معاملہ مین تین قسم کے آدمی ہوا کرتے ہین۔ صوفی متصوف۔ اور مستصوف۔ صوفی وہ ہو جو اپنے آپ سے فانی ہو اور حق تعالیٰ کے شوق مین باقی ہو طبیعتون کی قید سے آزاد اور حقیقتون سے وابستہ ہو۔ متصوف وہ ہو جو اس درجہ کے مجاہدہ کا طلبگار ہو اور طلب مین اپنے تئین انکے معاملہ پر درست رکھتا ہو اور مستصوف وہ ہو جس نے مال۔ مرتبے اور دنیا کی نگاہ رکھنے کے لیے اپنے تئین ان لوگون کے مانند بنایا ہو اور ان دونون کے معاملات سے بیخبر ہو۔

آپ تصوف کی تعریف یہ کرتے ہین کہ التصوف حقیقة لا رسم لہ۔ اس لیے کہ رسم معاملات بندہ سے

متعلق ہے اور اسکی حقیقت خدا سے وابستہ ہے۔ جب تصوف خلق سے منھ پھیرنا ہوا تو یقیناً اُس کے لیے کوئی
رسم نہیں ہو سکتی۔

آپ فرماتے ہین کہ رضا دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک حق تعالیٰ کی رضا ہے بندہ سے اور دوسرے بندہ
کی رضا ہے حق تعالیٰ سے رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ۔ حق تعالیٰ کی رضا یہ ہے کہ بندہ کو نعمت اور
ثواب کی کرامت کرنے کا ارادہ فرمائے اور بندہ کی رضا یہ ہے کہ خدائے بزرگ و برتر کے فرمان پر قائم رہے
اور اُس کے حکم سے سرتابی نہ کرے۔ آپ فرماتے ہین کہ رضا قضا کے وارد ہونے سے پہلے درست نہیں
ہوتی۔ حضرت سرور کائنات علیہ الف الف تحیات نے دعا فرمائی ہے کہ اللّٰھم انی اسئلک الرضاء بعد القضاء
یعنی اے اللہ (جل جلالہ) مجھے اس صفت پر رکھ کہ جب تیری طرف سے قضا آئے تو اپنی وارد ہونے پر مجھے
راضی پائے۔ رضا کا ارادہ عین رضا نہیں اس لیے قضا کی پہلی ہی رضا ظاہر کرنا بےمعنی ہے۔ اہل خراسان
کہتے ہین کہ رضا احوال مین سے ہے اور اہل عراق کہتے ہین کہ رضا مقامات مین سے ہے۔

آپ فرماتے ہین کہ حال وہ حقیقت ہے جو خدائے بزرگ و برتر کی طرف سے انسان کے دل مین آئے اور کسب
و دفع نہ کی جا سکے اور تکلف سے حاصل نہ ہو سکے۔ اور مقام طالب کا راستہ اور اسکی قدمگاہ ہے اور راہ حق
مین بندہ کی کسب کا درجہ ہے۔ حال خدا کی عطا ہے اور مقام مجاہدہ سے قائم ہوتا ہے۔ ایک گروہ حال کا دوام
روا رکھتا ہے اور دوسرا نہیں رکھتا۔ اول الذکر مین شیخ حارث محاسبیؒ کا گروہ ہے۔ اسی واسطے رضا کو
احوال مین شمار کرتے ہین۔ ثانی الذکر مین حضرت جنیدؒ کا گروہ ہے۔ یہ لوگ کہتے ہین الاحوال کالبروق
فان بقیت فحدیث النفس۔ یہ لوگ رضا کو مقامون مین سے شمار کرتے ہین۔

سکر و صحو کے بیان مین آپ فرماتے ہین کہ خدا کی محبت کے غلبہ کو سکر کہتے ہین اور مراد کے
حصول کو صحو کہتے ہین۔ ایک گروہ کے لوگ جنمین حضرت بایزید بسطامیؒ بھی ہین سکر کو صحو سے افضل
سمجھتے ہین۔ یہ لوگ کہتے ہین کہ صحو آدمیت کے صفت کے اعتدال اور تمکین پر جو سالکون کا ایک مقام ہے
حاصل ہوتا ہے اور یہ خدا کی طرف سے بہت بڑا حجاب ہے۔ اور سکر آفت کے جاتے رہنے۔ صفات بشریت
کے دور ہونے۔ تدبیر و اختیار بندہ کے اٹھ جانے۔ بندہ کے تصرف کے فنا فی الحق ہونے اور جو قوت بندہ
مین اُس کی جنس کے خلاف ہے اسکی فنا ہونے سے حاصل ہوتا ہے۔ دوسرے گروہ کے لوگ صحو کو سکر پر
فضیلت دیتے ہین۔ اُن کے امام حضرت جنیدؒ ہین۔ یہ لوگ کہتے ہین کہ سکر آفت کا محل ہے۔ کیونکہ وہ احوال کی

پریشانی اور صحت کا چلا جانا اور اپنے سررشتہ کا گم کرنا ہو۔ طالب اگر صحیح الحال نہین ہو تو تحقیق کا فائدہ
حاصل نہین ہوتا اس لیے کہ اہل حق کا دل تمام موجودات سے تنہا ہونا چاہیے ۔ لوگ اشیاء کو جیسے کہ
وہ ہین نہین دیکھتے، اس لیے اس کی ماسوا مین پھنسے رہ جاتے ہین۔ اشیاء کا دیکھنا دو طرح پر ہوتا ہے
ایک تو بقا کی نظر سے دوسرے فنا کی نظر سے۔ بقا کی نظر سے دیکھنا یہ ہو کہ کل موجودات کو اپنی بقا مین
ناقص پائے اور فنا کی نظر سے دیکھنا یہ ہو کہ کل اشیاء کو خدا بزرگ و برتر کی بقا کے مقابلہ مین فانی پائے اور
دراصل ان دونون کا نقطۂ اتصال ایک ہی ہو یہ صرف ایک ہی مقصد کو دیکھنے کے دو پہلو ہین۔ صحو و سکر
کے بیان مین حضرت شیخ علی الہجویری داتا گنج بخش رح کی رائے جنیدیون کی رائے کے موافق ہو۔ آپ کہتے
ہین کہ صاحب سکر کے حال کا کمال صحو ہوتا ہو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام صاحب سکر تھے ایک تجلی کے
برداشت کی طاقت نہ رکھی۔ اور ہوش جاتے رہے۔ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم صاحب صحو
تھے۔ کہ مکہ سے قاب قوسین تک عین تجلی مین تھے اور ہر لحظہ زیادہ ہوشیار اور زیادہ بیدار ہوتے جاتے
تھے ؎

شربت الراح کاساً بعد کاس   فما نفد الشراب وما رویت

سکر سب فنا کی برداشت ہو اور بقای صفت کا عین ہو اور یہ حجاب ہو اور صحو سب صفت کے فنا مین
بقا کا دیدار ہو اور یہ عین کشف ہو۔ سکر کی دو قسمین کی گئی ہین۔ مودتی اور محبتی۔ مودتی باعلت ہوتا ہو
کیونکہ اس کا پیدا ہونا نعمت کے دیکھنے سے ہوتا ہو اور محبتی بے علت ہوتا ہو کیونکہ اس کا پیدا ہونا
منعم کے دیکھنے سے ہوتا ہو۔ اسی طرح پر صحو کی دو قسمین ہین۔ غفلتی اور محبتی۔ غفلتی بہت بڑا حجاب ہو اور
محبتی امانت دار کشف ہو۔ غفلتی اگرچہ صحو ہو مگر سکر ہوتا ہو اور محبتی اگرچہ سکر ہو مگر صحو ہوتا ہو۔ درحقیقت یہ
دونون سالکون کے قدمگاہ ہین اور سلطان حقیقت جب جلوہ دکھاتا ہے تو صحو و سکر کے دونون
ایک ہی وسیلے نظر آتے ہین ؎

اذا طلع الصباح بنجم راح   تساوی فیہ سکران وصاح

آپ فرماتے ہین کہ ایثار کی حقیقت یہ ہو کہ صحبت مین اپنے ساتھی کا حق نگاہ رکھے اور اپنا حصہ اسی کو دیدے
اور ساتھی کے آرام کے لیے خود رنج اٹھائے۔ اسکی دو قسمین بیان کی جاتی ہین ایک وہ ایثار جو صحبت مین ہوتا
ہو اور دوسرا جو محبت مین ہوتا ہو۔ ایثار صحبت تو وہ ہو جسکا ذکر ہوا۔ ایثار محبت وہ ہو جسمین رنج و اندوہ کا نام

ہے اور سب راحت ہی راحت ہو۔

نفس اور روح کے بارے میں آپ فرماتے ہیں کہ یہ دونوں لطیف چیزوں میں سے ہیں۔ لیکن اصطلاح صوفیہ میں ایک خیر کا محل ہے اور دوسرا شر کا۔ جیسے کہ آنکھ بینائی کا مقام ہے اور کان شنوائی کا۔ نفس کی مثال شیطان کی سی ہے اور روح کی فرشتے کی سی۔ اور نفس کی خلاف ورزی کی تلقین قرآن میں فرمائی گئی ہے۔ ونہی النفس عن الھویٰ فان الجنۃ ھی الماویٰ۔ آپ فرماتے ہیں کہ طلب معرفت سب طالبوں پر فرض ہے۔ بندہ معرفت باری تعالیٰ پر مکلف کیا گیا ہے۔ پس جب بندہ خدا جل وعلیٰ کی معرفت پر مکلف ہے تو اسکو اپنی معرفت بھی حاصل کرنی چاہیئے۔ اپنی سے مراد انسانیت کی معرفت ہے۔ اس میں لوگوں کے مختلف اقوال ہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ انسان سے مراد صرف روح ہے اور یہ بدن اُس کی زرہ اور شکل ہے اور اس کا گھر اور جائے پناہ ہے تاکہ طبیعتوں کے خلل سے حفاظت میں رہے۔ مگر یہ خیال باطل ہے اس لیے کہ انسان کا اطلاق مردہ پر بھی ہوتا ہے اور چارپائی میں بھی جان ہوتی ہے مگر وہ انسان نہیں کہلاتا۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ یہ نام روح اور بدن پر ایک جگہ میں واقع ہوتا ہے اور جب ایک دوسرے سے جدا ہوتا ہے تو یہ نام ساقط ہو جاتا ہے مگر یہ خیال بھی باطل ہے اس لیے کہ اللہ جل شانہٗ فرماتا ہے۔ ھل اتی علی الانسان حین من الدھر لم یکن شیئاً مذکوراً۔ آدم کی بجائے مٹی کو بھی قبل روح انسان کہا ہے۔ ایک دوسرا گروہ ہے جو کہتا ہے کہ انسان ایک جزو لایتجزیٰ ہے اور اس کا محل دل ہے۔ مگر یہ خیال بھی باطل و محال ہے کیونکہ اگر ایک آدمی کو مار ڈالیں اور اس کا دل باہر نکال لیں تب بھی انسانیت کا نام اسپر عائد کیا جاتا ہے ایک اور اہل باطل و لاعبوں کا گروہ ہے جو کہتا ہے کہ کھانے پینے والا اور جو تغیر ہونے والا ہو وہ انسان نہیں ہو سکتا۔ انسان سر الٰہی ہے اور یہ جسم اس کا لباس ہے۔ اس خیال کی غلطی بالکل بین ہے اس لیے کہ مجنونوں کافروں اور فاسقوں کو بھی انسان کہتے ہیں۔ اور اُن میں کوئی سر الٰہی نہیں ہے۔ اور سب تغیر پذیر اور کھانے پینے والے ہیں۔ خود اللہ بزرگ و برتر فرماتا ہے ولقد خلقنا الانسان من سللۃ من طین ثم جعلناہ نطفۃ فی قرار مکین ثم خلقنا النطفۃ علقۃ فخلقنا العلقۃ مضغۃ فخلقنا المضغۃ عظاماً فکسونا العظام لحما ثم انشاناہ خلقاً آخر فتبارک اللہ احسن الخالقین۔ پس انسان وہ ہے جو اس مخصوص صورت میں ہے اور تغیر پذیر ہے وہ ایسا حی ہے جو تندرستی اور بیماری قبول کرتا ہے کیونکہ موت اس اسم کو صورت معہودہ اور آلہ موسومہ یعنے

جنون (عقل) سے ظاہراً یا باطناً زائل نہین کردیتی۔ انسان کی کامل ترین ترکیب تین معنون سے
ہوتی ہی۔ ایک روح۔ دوسرا نفس۔ تیسرا بدن۔ ان تین سے ہر ایک کے لیے ایک صفت مخصوص
ہی۔ جو عین کی وجہ سے قائم ہی۔ روح کے لیے صفت عقل ہی۔ نفس کے لیے ہوا اور بدن کے لیے
حس اور آدمی کل عالم کا نمونہ ہی عالم سے یہ جہان اور آخرت کا دوسرا جہان دونون مراد ہین۔ اس جہان
کی نشانی پانی۔ خاک۔ ہوا اور آگ ہی۔ اور بلغم۔ دم۔ صفرا۔ اور سودا سے اُسکی ترکیب ہی اور اس جہان کی
نشانی بہشت۔ دوزخ اور میدان قیامت ہی۔ جان بہ باعث لطافت کے بہشت کے مانند ہی۔ اور نفس
بہ باعث آفت و جشت کے بمنزلہ دوزخ کے ہی۔ اور جسم گویا میدان قیامت ہی۔ بہشت خدا کی رضا کی
تاثیر ہی۔ اور دوزخ اُس کی ناخوشی کا نتیجہ۔ مومن کی روح راحت و معرفت سے ہی اور اس کا نفس
حجاب و گمراہی سے مرکب ہی پس جبتک مومن دوزخ سے خلاصی نہ پائے اور بہشت مین نہ پہونچے
لقائے الٰہی کی حقیقت سمجھ ہی نہین سکتا۔ اسی لیے کہا گیا ہی دع نفسک وتعال۔ طالب خدا کے
لیے عقل مدبر کامل ہی۔ اور روح چونکہ بمنزلۂ بہشت کے ہے اس لیے اپنے معنوی شریک کی طرف
ہر مومن کو بلاتی ہی۔ اور نفس اُپنے شریک معنوی کی طرف بلاتا ہی۔ اس لیے لازم ہی کہ نفس کی مخالفت
کی جائے۔ اور روح و عقل کو مدد پہونچائی جائے۔ غرضکہ نفس کی مخالفت بڑا مجاہدہ ہی۔ آپ فرماتے
ہین کہ من طلب وجد اور من وجد طلب مین جو اختلاف ہی وہ محض ظاہر معنون مین ہی حقیقت مین
کوئی اختلاف نہین۔ اس لیے کہ مقصود مشاہدہ ہی جو ایک عطائے ربانی ہی۔ اگر مجاہدہ سے حاصل ہوا
تو کہنا چاہیے کہ توفیق الٰہی نے مجاہدہ کی راہ بتائی۔ اور اگر بغیر مجاہدہ کے حاصل ہوا تو یہ سمجھنا چاہیے
کہ توفیق الٰہی امید کے مجاہدہ مین ڈالے گی۔ لیکن یاد رہے کہ مجاہدہ مین مجاہدہ کی رویت آفت ہی
مجاہدہ کے نفی کرنیوالون نے عین مجاہدہ کے نفی مراد نہین لی۔ بلکہ رویت مجاہدہ کے نفی مراد لی ہی
پس جہانتک ہوسکے اپنے فعل کو درمیان مین مت لاؤ۔ اور کسی طرح نفس کی پیروی نہ کرو۔ کیونکہ
غرض نفس کی وصفون کا فنا کرنا ہی نہ کہ عین نفس کا اور اسی کو حقیقی فنا کہتے ہین ورنہ تمھارا
وجود حجاب مین ہوجائے گا۔ وجودک ذنب لایقاس بہا ذنب۔

فنا و لقا کے لغت مین اور معنی ہین اور حال کی زبان مین اور معنی ہین۔ حال کی زبان مین بقا و فنا
سے یہ مراد ہی کہ جب جہل فانی ہی تو ضرور علم باقی ہوگا۔ جب گناہ فانی ہوتے ہین تو طاعت باقی رہنے والی ہی

ان الحسنات یذھبن السیئات۔ اِسی طرح جب بندہ علم وطاعت کو حاصل کرتا ہو اور غفلت سے فانی ہوتا ہو تو دوسری بقا سے باقی ہوتا ہو اور یہ دوسری بقا بُری صفتون کو دور کرنے اور نیک صفتون کے قیام کرنے مین ہوتی ہو، لیکن اہل طریقت فنا وبقا کی اصطلاحون کو اہل ولایت کے کمال کے درجہ کے سوا اور کسی مین استعمال نہین کرتے۔ جو لوگ مجاہدون کے رنج سے آزاد۔ مقامون کی قید اور احوال کے تغیر سے فارغ اور طلب مقصود مین رسیدہ۔ قابل دید چیزون کو دیکھے اور قابل سمع چیزون کو سُنے ہوے اور دل کے جاننے کے لائق تمام باتون کو جانے ہوے۔ بھید سے کے سب بھیدون کو پائے ہوئے ہین۔ اُنھون نے اپنے بھیدون کے پانے مین اپنی یافت مین خودبینی کی آفت کو دیکھا۔ اور سب سے مُنھ موڑ لیا۔ مراد مین اُن کا ارادہ فانی ہوا۔ رسیدہ ہونے کی وجہ سے دعوی کو ترک کر دیا عین مراد مین مراد سے بے مراد ہوے کل سے اپنی شرب کو الگ کر کے دنیاوی اشیاء سے دل کو ہٹا لیا۔ پس جب اسطرح پر بندہ وجود صفات کی حالت مین عادات صفات سے فانی ہو گیا تو مراد کی فنا مین مراد کی بقا سے باقی ہوا اس لیے قرب وبعد۔ وحشت ومحبت۔ صحو وسکر۔ فراق ووصل۔ طمس واصطلام۔ اسم وعلم نقوش ورسوم کی قید سے آزاد ہو گیا۔ بعض لوگون کا یہ خیال ہو کہ کسی شے سے فنا اس چیز سے محجوب ہونے کے سوا درست نہین ہوتی۔ مگر یہ غلط خیال ہو۔ ایسا نہین ہو کہ کوئی شخص کسی چیز کو اگر دوست رکھتا ہو تو کہا جاے کہ وہ اُس سے باقی ہو۔ یا اگر اُسے دشمن رکھتا ہو تو کہا جاے کہ وہ اُس سے فانی ہو اس لیے کہ یہ دونون صفتین طالب کی ہین اور فنا مین نہ محبت ہو اور نہ عداوت اور بقا نہ جمع کی رویت ہو نہ تفرقہ کی۔ نہ فنا کے معنی ذات مین گم ہوتے اور وجود کے نیست ہونے کے ہین اور نہ بقا کے معنی بقاے الٰہی کے بندہ سے ملنے کے ہین اس لیے کہ کلیت کی فنا نہین ہو سکتی اور نہ کسی سرشت کے اجزا کا فنا ہونا اور اُنکا بالکل منقطع ہونا جائز سمجھا گیا ہو بندہ کے لیئے فنا صرف خدا کے جلال کے دیکھنے اور دل پر اُس کی عظمت کے کشف ہونے سے مترتب ہوتی ہو۔ اس کے جلال کے غلبہ میں دنیا وعاقبت فراموش ہو جاتا ہو اور اُسکی بزرگی کے سامنے احوال ومقام حقیر نظر آنے لگتے ہین۔ اس حال مین نفس فانی ہوتا ہو اور اس فنا کے میدان مین بندہ زبان حق سے ناطق اور تن عاجزی وفروتنی کرنیوالا ہوتا ہو۔

نفی فنائی فنا فنائی ۔۔۔ وفی فنای وجدت انت

محوت اسمی ورسم جسمی ۔۔۔ سئلت عنی فقلت انت

حضور و غیبت کے معاملہ مین آپ فرماتے ہین کہ حضور سے مراد حضور دل بہ دلالت یقینی ہے تاکہ غیبی حکم اس کے لیے عینی حکم کی طرح ہو اور غیبت سے مراد ماسوائے دل کا غائب ہونا ہے اس حد تک کہ اپنے سے بھی اور غیبت سے بھی غائب ہو۔ جو اپنے سے غائب ہوا وہ حق کی درگاہ مین حاضر ہوا اور جو اپنے سے حاضر ہوا وہ حق کی درگاہ سے غائب ہوا لیکن جب جذبۂ الٰہی طالب کے دل کو مقہور کر دیتا ہے تو غیبت حضور ہو جاتی ہے اور اثنانت باقی نہین رہتی ابن عطا حسین بن منصور ابوبکر شبلی ابو حمزہ بغدادی اور سمنون محب غیبت کو حضور پر تقدم دیتے ہین اور حارث محاسبی جنید سہل تستری ابو حفص حداد ابو حمدون قصار ابو محمد جریری حصری اور محمد بن خفیف حضور کو غیبت پر مقدم سمجھتے ہین۔

جمع و تفرقہ کی تعریف مین آپ بیان کرتے ہین کہ الجمع ما جمع باوصافہ والتفرقہ ما فرق بافعالہ یعنی ارادہ کا قطع کرنا اور خدائے تعالیٰ کے ارادہ کے ثبوت مین لوگون کے تصرف کو ترک کرنا ہے۔ مگر ان الفاظ کے استعمال مین لوگون نے مختلف راہین اختیار کی ہین۔ ایک جماعت کہتی ہے کہ اُس کا تعلق توحید سے ہے۔ اور اُس کا ایک درجہ خدائے بزرگ و برتر کی صفات سے متعلق ہے اور دوسرا بندہ کی صفات سے اول الذکر مین بندہ کا کسب منقطع ہے۔ یعنی حق تعالیٰ کی صفتین قدیم ہین اور دوسرا ہے مخصوص ہین۔ ایک دوسرا گروہ ہے جو علم سے متعلق کرتا ہے اور کہتا ہے کہ الجمع علم التوحید والتفرقہ علم الاحکام۔ مگر اہل تصوف عموماً لفظ تفرقہ سے مراد مکاسب اور لفظ جمع سے مراد مواہب لیتے ہین۔ حق تعالیٰ کی خصوصیت بندہ کے لیے جمع ہوتی ہے اور بندہ کی عبودیت حق تعالیٰ کے لیے تفرقہ کہلاتی ہے۔ لیکن جمع دو طرح پر ہے ایک جمع سالم دوسری جمع تکسیر۔ جمع سالم یہ ہے کہ جو حق تعالیٰ غلبہ حال۔ قوت وجد اور قلق شوق مین ظاہر کرتا ہے اور خود بندہ کی حفاظت کرتا ہے اور اس کے ظاہر حال پر اپنا فرمان جاری فرماتا ہے اور نگاہ رکھتا ہے کہ بندہ اسے ادا کرے اور جمع تکسیر یہ ہے کہ بندہ ہونے کی حیثیت سے بیہوش و مجنونون کی طرح۔ یعنی معذور ہو۔ لان التفرقہ فصل والجمع وصل۔ بعض لوگ کلام کو مشکل اور دقیق بنانے کے لیے جمع الجمع کا لفظ بھی استعمال کرتے ہین حضرت شیخ علی الہجویریؒ فرماتے ہین کہ بہتر یہ ہے کہ تو جمع الجمع نہ لکھ جب جمع ایک مرتبہ کے تفرقہ کے جمع ہوئی اور پھر اپنے احوال سے تجاوز نہین کرتی تو پھر جمع الجمع کیسے ہو سکتی ہے۔ آپ فرماتے ہین کہ یہ لفظ ہمت کے محل مین استعمال ہوا ہے اس لیے کہ جو جمع کے محل مین ہو اُسکو اپنے سے اوپر نیچے اور باہر دیدار نہین ہوتا چنانچہ جب معراج مین حضور سرور کائنات صلعم کو دونون جہان دکھائے گئے تو آپ نے

کسی کی طرف توجہ نہ فرمائی۔ کیونکہ آپ (صلعم) جمع میں جمع تھے اور جو جمع کے محل میں ہو وہ تفرقہ کو نہیں دیکھتا ۔ مازاغ البصر وماطغیٰ۔

آپ فرماتے ہیں کہ معرفت دو طرح پر ہے۔ ایک علمی اور دوسری حالی۔ علمی معرفت دنیا و آخرت کی سب نیکیوں کی بنیاد ہے معرفت دل کی حیات ہے اور ماسوا سے انحراف کرنا ہے۔ علما و فقہا کہتے ہیں کہ خدائے بزرگ و برتر کی معرفت سے مراد صحت علم ہے اور مشائخ طریقت فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ کی معرفت صحت احوال میں ہے اور یہ معرفت علمی معرفت سے زیادہ افضل ہے اس لیے کہ حال کی صحت اسی وقت ممکن ہے جب علم کی صحت حاصل ہو جائے یعنی جسے خدائے جل وعلیٰ کا علم نہ ہو وہ عارف ہو ہی نہیں سکتا مگر عالم ایسا ہو سکتا ہے جو عارف نہ ہو۔ اہل اعتزال کے نزدیک خدائے بزرگ و برتر کی معرفت معرفت عقل سے ممکن ہے مگر اہل سنت والجماعۃ کے نزدیک عقل کی صحت اور نشانی کو دیکھنا معرفت کا ذریعہ ہے نہ کہ علت ۔ اور علت محض خداوند تعالیٰ کا ارادہ اور عنایت پر منحصر ہے حضرت سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ تعالیٰ وجہہ سے جب لوگوں نے معرفت کی نسبت دریافت کیا تو آپ نے فرمایا عرفت اللہ باللہ وعرفت مادون اللہ بنور اللہ جب خداوند جل وعلی نے بندہ کو اپنی تعریف سے واقف فرمایا تو اس نے پہچانا مگر اس شناخت کے ذریعہ سے نہیں جو سبب سے موصول ہوتی ہے۔ بلکہ اُس کے ذریعہ سے جس میں بندہ کا وجود عاریت کے طور پر ہوتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ الہام سے معرفت ممکن نہیں اس میں بندہ کا یقین کبھی زیادہ ہوتا ہے اور کبھی کم لیکن اصل معرفت میں کمی بیشی نہیں ہوتی اس لیے معرفت کی زیادتی بھی نقصان میں داخل ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ کی شناخت پر تقلید کرنی نہیں چاہیے۔ اور اس کو اس کے کمال کی صفتوں سے پہچاننا چاہیے۔ عارف کے لیے سبب کا ثبوت معرفت میں کفر ہے اور ماسوا کی طرف توجہ کرنا شرک میں داخل ہے من التفت الی الاغیار فمعرفتہ اُثار۔ اللہ جل تعالیٰ جسطرح چاہتا ہے بندہ کو اپنی طرف راستہ دکھاتا ہے اور در معرفت اس پر وا کرتا ہے حتیٰ کہ معرفت میں اس درجہ تک بندہ پہنچ جاتا ہے کہ عین معرفت اُس کو غیر دکھلائی دیتی ہے اور معرفت کی صفت اُس کے لیے آفت ہو جاتی ہے۔ حضرت ذوالنون مصری فرماتے ہیں ایاک ان تکون بالمعرفۃ مدعیا معرفت کی حقیقت حضرت خدائے بزرگ و برتر کو تمام اشیا میں متصرف ماننا اور جاننا ہے

آپ فرماتے ہیں کہ توحید تین قسم کی ہے ایک تو خدا کی توحید ہے خدا کے لیے اور یہ اس کی یگانگی ہے

اس کا علم ہے۔ دوسری خدا کی توحید مخلوق کے لیے ہے اور یہ بندہ کے لیے توحید پر خدا کا حکم ہے اور بندہ کے دل مین توحید کا پیدا ہونا اور تیسری لوگون کی توحید خدا کے لیے ہے اور یہ لوگون کا علم ہے خدائے جل وعلیٰ کی وحدانیت پر۔ چونکہ توحید کسی شے کی وحدانیت پر حکم کا نام ہے اور علم کے سوا کوئی حکم نہین لگایا جا سکتا۔ اس لیے اہل سنت والجماعت نے تحقیق کی مدد سے خدائے جل وعلیٰ کی وحدانیت پر یقین کیا ہے جو کوئی توحید کو بندہ کا فعل کہتا ہے تو چونکہ بندہ کا فعل خدا کے کشف کے واسطے علت نہین ہو سکتا بلکہ ایک طرح کا حجاب ہوتا ہے۔ اور بندہ اپنی صفات کے لحاظ سے غیر ہوتا ہے۔ اس لیے اگر وہ اپنی صفت کو حق جانیگا تو صفت کے ساتھ موصوف کو بھی حق جاننا پڑے گا۔ اس وقت موحد۔ توحید اور واحد تینون ایک دوسرے کے وجود کی علت ہو جائین گے۔ جو نصاریٰ کے ثالث ثلاثہ کے مشابہ ہوگا جو باطل محض ہے اس لیے کہ جب تک کوئی صفت طالب کے لیے اپنی فنا سے توحید مین مانع ہوتی ہے۔ اس وقت تک وہ محجوب رہتا ہے اور جب تک محجوب ہے موحد نہین ہوتا الا کل شئ ماخلا اللہ باطل حقیقت یہ ہے کہ خدا کی توحید بندہ کے اسرار مین سے ایک سر ہے اور عبارت مین ظاہر نہین ہوتی۔ عبارت اور عبارت بنانے والا غیر ہوتا ہے اور توحید مین ثبوت غیر ثبوت ماسوا کہلایا جاتا ہے۔

آپ فرماتے ہین کہ اہل تصوف مین سے بعض کہتے ہین کہ قول وتصدیق وعمل ایمان ہے ان لوگون مین حضرت فضیل بن عیاض رح بشر حافی۔ خیر نساج۔ سمنون محب۔ ابو حمزہ بغدادی اور محمد جریری ہین۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔ بعض لوگ جن کی جماعت زیادہ بڑھی ہوئی ہے کہتے ہین کہ ایمان سے مراد صرف قول اور تصدیق ہے۔ ان مین حضرت ابراہیم ادہم رح۔ ذوالنون مصری رح بایزید بسطامی رح۔ سلیمان دارانی رح۔ حارث محاسبی رح جنید بغدادی۔ سہیل بن عبداللہ تستری رح شقیق بلخی۔ حاتم اصم رح۔ اور محمد بن فضیل بلخی ہین۔ رحمۃ اللہ علیہم اجمعین۔

ایمان کی اصل تصدیق قلبی ہے اور اسکی فرع امر الٰہی کی رعایت کرنی ہے۔ ایمان مین جبر وقدر کو دخل نہین اس لیے کہ طریق توحید ماسوا جبر وفوق القدر ہے۔ ولا مر بین الا مرین۔ ایمان کی حقیقت نگاہ داری توکل ہے۔ وعلی اللہ فتو کلوا ان کنتم مومنین۔

آپ فرماتے ہین کہ طہارت کی دو قسمین ہین۔ ایک ظاہری۔ اور دوسری باطنی جس طرح بدن کی پاکیزگی اگر نہو تو نماز درست نہین ہوتی۔ اسی طرح اگر دل کی پاکیزگی نہو تو معرفت درست نہین ہوتی۔ طہارت ظاہری یعنی بدن کی طہارت پانی سے ہوتی ہے۔ اور دل کی طہارت توحید سے ہوتی ہے۔ جو طہارت ظاہری پر

مداومت کرتا ہی فرشتے اُسے دوست رکھتے ہین اور جو طہارت باطنی یعنی باطن مین توحید پر قیام کرتا ہی، خداے تعالیٰ اُسے دوست رکھتا ہی پس لازم ہی کہ ظاہری اور باطنی دونون طہارتون مین موافقت رہے۔ یعنی وضو کے لیے ہاتھ دھوئے تو دل کو دنیا کی دوستی کو دھو ڈالے۔ جب پانی سے دہن صاف کرے تو لازم ہی کہ دہن کو غیر کے ذکر سے خالی رکھے اور جب نتھنون مین پانی ڈالے تو شہوتون کو اپنے اوپر حرام کرلے۔ اور جب مُنھ دھوئے تو لازم ہی کہ تمام اشیا مالوفہ سے مُنھ پھیر کر خداے بزرگ و برتر کی طرف مُنھ کرے۔ اور جب ہاتھ دھوئے تو تمام نصیبون سے کنارہ کرلے اور سر پر مسح کرے تو اپنے امر کو خداے جل و علیٰ کے سپرد کردے اور جب پاؤن دھوئے تو حکم الٰہی کی موافقت کی نیت کرے۔ جب یہ کرے گا تو ظاہر و باطن دونون کی پاکیزگیان اُسے حاصل ہوجائین گی۔

حدیث شریف مین ہی کہ "الندم توبۃ" یعنی پشیمانی توبہ ہی۔ اس قول مین توبہ کی سب شرطین موجود ہین۔ جب دل مین ندامت ہوتی ہی اندوہ و غم ہوتا ہی۔ نفس کو ذلت ہوتی ہی اور اعادہ گناہ سے احتراز ہوتا ہی۔ توبہ کے متعلق مشائخ کے اقوال مختلف ہین۔ حضرت سہل بن عبداللہ تستریؒ فرماتے ہین "التوبۃ ان لاتنسی ذنبک" اور حضرت جنیدؒ فرماتے ہین کہ "التوبۃ ان تنسی ذنبک"۔ اول الذکر مین دوام پشیمانی مقصود ہی اور آخر الذکر کا مطلب یہ ہی کہ توبہ کرنیوالا محب ہوتا ہی اور محب کے لیے مشاہدہ ضروری ہے، اور مشاہدہ مین گناہ کا ذکر کرنا جفا مین داخل ہی۔ اہل تصوف کے نزدیک توبہ تین طرح پر ہوتی ہے۔ ایک خطا سے صواب پر وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ دوسرا صواب سے زیادہ صواب کی طرف۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا ہی تُبْتُ اِلَيْكَ۔ تیسرا اپنی خودی سے حق تعالیٰ کی طرف جیسے حضرت سرور کائنات صلعم فرماتے ہین انی کنت لاستغفر اللہ فی کل یوم سبعین مرۃ

آپ فرماتے ہین کہ نماز مین داخل ہونے کے واسطے حسب ذیل شرطین چاہئین:-

(۱) ظاہری پلیدی سے صفائی اور نجاست باطنی یعنی شہوات سے پاکی

(۲) کپڑے کی پاکی ظاہری یہ ہی کہ اسمین نجاست لگی نہ ہو اور باطنی یہ ہی کہ حلال کا ہو۔

(۳) جگہ کا پاک ہونا۔ ظاہر مین حادثون اور آفتون سے اور باطن مین فساد و گناہ سے۔

(۴) قبلہ رخ مُنھ کرنا۔ ظاہر مین کعبہ کی طرف مُنھ کرنا اور باطن مین عرش اور سِرّ عرش کا مشاہدہ کرنا۔

(۵) قیام۔ ظاہراً قدرت کے حال مین اور باطناً روضۂ قرب مین۔ پہلا شریعت ہی دوسرا حقیقت

(٦) خلوص نیت اور توجہ۔

(۷) ہیبت وفنا کے مقام مین تکبیر کہنا۔ وصل کے محل مین قیام کرنا۔ ترتیل وعظمت سے قرآن پڑھنا۔ دل کی عاجزی سے رکوع وسجود کرنا۔ اجتماع کے موافق تشہد کہنا اور فنا کی صفت سے سلام کہنا۔ کان رسول اللہ صلعم یصلی وفی جوفہ ازیز کازیز المرجل

آپ فرماتے ہین کہ نماز امرہے نہ کہ آلہ حضور وغیبت۔ امر کسی چیز کے لیے آلہ نہین ہوتا حضور کی علت عین حضور ہوتی ہی اور غیبت کے علت عین غیبت

آپ فرماتے ہین کہ روزہ کی حقیقت امساک ہی یعنی پیٹ کو اکل وشرب سے بچانا۔ آنکھ کو شہوت کی نظر سے بچانا۔ کان کو غیبت کے سننے سے۔ زبان کو بیہودہ بکنے سے تن کو دنیا کی پیروی اور شرع کی مخالفت سے بچانا ہی۔ اذا صمت فلیصم سمعک وبصرک ولسانک ویدک وکل عضو منک۔

آپ فرماتے ہین کہ مین نے رسول اللہ صلعم کو خواب مین دیکھا مین نے عرض کیا کہ اوصینی یا رسول اللہ آپ نے فرمایا احبس حواسک یعنی اپنے حواس کو خدا کی نسبت مین مقید کر۔ حواس کو بند کرنا پورا مجاہدہ ہی کیونکہ کلیت علوم کا حاصل ہونا انھین پانچ دروازون سے ہوتا ہی یعنے سامعہ باصرہ۔ ذائقہ۔ شامہ۔ لامسہ سے ان مین سوائے لامسہ کے جس کا محل تمام اعضا مین ہی ہر اک کے لیے ایک ایک محل مخصوص ہی پس روزہ دار کو چاہیے کہ ان دروازون مین سے جو شے مخالف شریعت وفرمان الٰہی داخل ہونا چاہے اُسے روکے ورنہ رب صائم لیس لہ من صومہ الا الجوع والعطش

آپ فرماتے ہین کہ حج کے احکام یہ ہین کہ میقات مین احرام باندھے عرفات مین قیام کرے۔ اور زیارت کے وقت طواف کرے۔ یہ سُنت ابراہیمی ہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دو مقام ہین ایک تن کا اور ایک دل کا تن کا مقام مکہ معظمہ ہی اور دل کا مقام خلت۔ لوگ عموماً تن کا ارادہ کرتے ہین لیکن جو کوئی دل کے مقام کا ارادہ کرتا ہی وہ اشیاء مالوفہ سے روگردانی۔ لذات کو ترک۔ ذکر غیر سے انحراف دنیا سے اعراض کرنے والا ہوتا ہی پھر معرفت کے عرفا مین قیام کرکے الفت کے مزدلفہ کا ارادہ کرتا ہی وہان سے اپنے بھید کو حرم الٰہی کے طواف کے لیے بھیجتا ہی حرص واندیشہ ہاے فاسد کے کنکریون کو منا مین پھینکتا اور نفس کو مجاہدہ کے مقام مین قربان کرتا ہی اس لیے مقام خلت مین پہنچکر قطعیت کے اندیشہ سے

اسی طرح امان پاتا ہے جسطرح حرم کعبہ مین دشمن شمشیر دشمن سے امان پاتا ہے،

آپ فرماتے ہین کہ حج دو طرح پر ہوتا ہے ایک غیبت مین اور ایک حضور مین۔ جو طلب مین ہوتا ہے وہ غیبت مین ہوتا ہے۔ اور جو مشاہدہ مین ہوتا ہے وہ حضور مین ہوتا ہے۔ حج کا مقصود گھر کا دیدار نہین ہوتا بلکہ مشاہدہ حق ہوتا ہے۔ اور مشاہدہ حق یا قدرت حق وہ شے ہے جسمین دل کی زندگانی ہے جسے معرفت کے نام سے بھی موسوم کیا جائے تو مضائقہ نہین۔

آپ فرماتے ہین کہ مشاہدہ کی حقیقت دو طرح پر ہے۔ ایک یقین کی صحت کے ساتھ اور دوسرے غلبۂ محبت سے۔ جب دوست کی محبت کا غلبہ اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ محبت کی کلیت سب حدیث محبوب ہو جاتی ہے تو دوست کے سوا اُسے کچھ نظر نہین آتا۔ حضرت محمد بن واسع فرماتے ہین ما رأیت شیئًا قط الا و رأیت الله فیه ای بصحة الیقین۔ اور حضرت شیخ شبلیؒ فرماتے ہین ما رأیت شیئًا قط الا الله۔ یعنی بغلبات المحبت و غلیان المشاہدہ۔ صحت یقین سے پہچاننے والا غیر کو جگہ نہین دیتا اور محبت رکھنے والا غیر پر نظر نہین ڈالتا۔ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ معراج کی رات آنحضرت صلعم نے خدا کو دیکھا اور حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ نہین دیکھا۔ لوگ اس اختلاف مین پڑ گئے مگر حقیقت یہ ہے کہ حضور صلعم نے ایک سے جو یہ فرمایا کہ مین نے دیکھا تو آپ کی مراد یہ تھی کہ مین نے بھید کی آنکھ سے دیکھا۔ حضرت ابن عباسؓ اہل باطن سے تھے اُن سے آپ نے اس طرح سخن فرمایا اور حضرت ستنا عائشہؓ اہل ظاہر سے تھیں اُن سے آپ نے اہل باطن کی زبان مین کلام نہین فرمایا۔ بھید کی آنکھ سے دیکھنے کے معنی حضرت جنیدؒ کی اس حکایت سے واضح ہو جاتے ہین۔ آپ نے ایک بار فرمایا کہ اگر خداوند تعالیٰ مجھسے کہے کہ مجھے دیکھ تو مین کہونگا کہ مین نہین دیکھتا اس لیے کہ آنکھ دوستی مین غیر اور بیگانہ ہوتی ہے اور غیریت کی غیرت مجھے دیدار سے باز رکھیگی اور بڑی بات یہ ہے کہ جبکہ دنیا مین اُسے آنکھ کے واسطے کے سوا دیکھا کرتا تھا تو عاقبت مین کیوں واسطہ بناؤن

> وانی لاحسد ناظری علیک ۔۔۔۔۔ فاغمض طرفی اذا نظرت الیک

مشاہدہ کی تعریف یہ بھی کی گئی ہے کہ المشاہدة تصور اللسان بحضور الجنان اس لحاظ سے زبان عاجز ہے کہ واردات قلبی کو بیان کر سکے۔ سکوت شاہدہ کی علامت ہے اور گویائی کسی چیز پر گواہی دینے کا نشان ہے اور اُن دونون مین بڑا فرق ہے۔ لا احصی ثناءً علیک انت کما اثنیت علی نفسک

سے اسی شاہدہ کی حالت کا پتہ ملتا ہے یعنی حضور پُر نور صلعم کا منشا رمبارک یہ ہو گا کہ زبان کو اس لائق میں نہیں دیکھتا کہ میرے حال کو بیان کر سکے اور بیان کو اس کا مستحق نہیں جانتا کہ میرے حال کو ظاہر کرے اس لیے تیرا کہا ہوا میرا کہا ہوا ہے اور تیری ثنا میری ثنا ہے ؎

تمنیت من اہوی فلما رایتہ | بُہت فلم املک لسانا ولا طرفا

"عبداللہ"

(الناظر، جون ۱۹۲۳ء)

حضرت شیخ فرید الدین گنج شکر مسعود اجودھنی رحمۃ اللہ علیہ

آفتاب انوار ولایت، پیشوائے عالمِ ہدایت، بدر الطریقت شمس الحقیقت، عمدۃ الابرار قدوۃ الاخیار، سلطان السالکین، شمس العارفین، برہان العاشقین فرید الحق والشرع والدین قدس سرہ العزیز اپنے زمانے کے سرحلقۂ واصلانِ حق تھے۔ صاحب مراٰۃ الاسرار فرماتے ہیں کہ

"وے درایں طریق بغایت شانے بزرگ است۔ و جمیع مشائخ بر کمال عشق و عرفان و احوال وے متفق اند۔ و ریاضت و مجاہدات و ترک و تجرید و فقر و شوق کہ ویرا دست دادہ بود ہیچ یکے ازیں طائفہ را مجموع کمالات صوری و معنوی در یک شخص واحد میسر نشدہ۔ در کشف و کرامات و وجد و حال و ہمت و شجاعت بے نظیر وقت بود۔"

آپ کے والد ماجد کا نام نامی جمال الدین بن سلیمان تھا جو کھتوال (واقع ملتان) کے قاضی تھے۔ اور والدہ ماجدہ ملا وجیہ الدین خجندی کی دختر نیک اختر تھیں۔ آپ کے والد ماجد قاضی شعیب کی اولاد میں سے تھے جن کا سلسلۂ نسب حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک پہونچتا ہے۔ سید محمد کرمانی کتاب سیر الاولیا میں فرماتے ہیں کہ فرخ شاہ عادل والی کابل آپ کے اجداد میں سے تھے۔ کابل کی سلطنت حوادث روزگار سے غزنی کی سلطنت میں منضم ہوگئی لیکن فرخ شاہ کی اولاد چنگیز خاں کے خروج تک کابل ہی میں رہی۔ فتنۂ تاتار کے بعد آپ کے جد قاضی شعیب تمام عیال و اطفال کو لے کر لاہور آگئے۔ مگر وہاں چندروز قیام کر کے قصور کا ارادہ فرمایا۔ قاضی قصور نے آپ کی بڑی خاطر تواضع کی اور بادشاہ وقت کو آپ کے حالات سے مطلع کیا۔ بادشاہ نے قصبۂ کھتوال کی قضاۃ جو ملتان کے قریب واقع ہے آپ کو عطا کی۔ چنانچہ آپ نے وہیں اقامت و سکونت اختیار فرمائی۔

آپ کی والدہ ماجدہ اپنے زمانہ کی بڑی بزرگ بی بی تھیں۔ حضرت سلطان جی کے ملفوظات میں اکثر آپ کی کرامات کا ذکر ہے۔ آپ کا نام قرسم خاتون تھا۔

سفینۃ الاولیا میں ہے کہ آپ کی ولادت باسعادت قصبۂ کھوتوال میں جو ملتان کے توابع

میں سے ہے اور آج کل مشائخ کی چاؤلی کے نام سے مشہور ہے، ۵۶۹ھ پانسو اُنہتر ہجری میں واقع ہوئی۔ یہ موضع پاک پٹن (اجودھن) اور مہاران ضلع ملتان کے درمیان واقع ہے۔ اپنے شیخ کے وصال کے بعد اکتیس (سی ویک) سال قید حیات میں رہے۔ اور پچانوے ۹۵ سال کی عمر میں [1] سہ شنبہ کے دن پانچویں محرم ۶۶۴ھ چھ سو چونسٹھ ہجری کو اس عالم فانی سے عالم جاودانی کی طرف رحلت فرمائی۔ مرأۃ الاسرار میں تاریخ وفات چھ سو اڑسٹھ (۶۶۸) درج ہے یعنی سفینۃ الاولیا سے چار سال کا تفاوت آتا ہے۔ لیکن عمر دونوں نے پچانوے (نود و پنج) سال لکھی ہے۔ آپ کو قصبۂ اجودھن میں جو اب پاک پٹن کے نام سے مشہور ہے دفن کیا گیا۔ مزار مبارک آج تک منبع فیوض و برکات ہے۔ یزار و یتبرک۔

صاحب مرأۃ الاسرار فرماتے ہیں کہ بچپن ہی سے عشق الٰہی آپ کے دل میں موجزن تھا۔ اور عنفوان شباب ہی میں تمام دنیاوی مرادوں سے دست کش ہو کر گھر سے علم ظاہری و باطنی کی طلب میں نکل کھڑے ہوئے تھے۔

سیر العارفین میں حضرت سلطان المشائخؒ سے منقول ہے کہ تلاش علم میں آپ گھر سے نکل کر ملتان پہونچے۔ وہاں مولانا منہاج الدین ترمذی کی مسجد میں اُترے۔ علم فقہ میں ایک کتاب ہے نافع نام، اُسی کا مطالعہ فرما رہے تھے کہ حضرت قطب الاسلام والمسلمین خواجہ بختیار کاکیؒ اس مسجد میں تشریف لائے۔ انھیں دیکھا کہ ایک پاک صورت نیک سیرت ایک کتاب ہاتھ میں لیے پڑھ رہا ہے۔ آپ نے پوچھا مسعود کونسی کتاب پڑھ رہے ہو؟ اُنھوں نے کہا نافع۔ آپ نے فرمایا تم سمجھتے ہو کہ اس سے تمھیں نفع پہنچے گا؟ حضرت گنج شکرؒ نے التماس کیا کہ میرا نفع حضرت کی نظر کیمیا اثر میں ہے۔ یہ کہہ کر قدمبوس ہوئے۔ خواجہ قطب الاسلام نے بہت نوازش فرمائی۔ اور جب ملتان سے دہلی جانے لگے تو حضرت گنج شکر تین منزل تک ہمراہ آئے۔ بعدہٗ حضرت قطب الاسلام نے یہ کہکر رخصت کر دیا کہ ابھی چند ایام علم ظاہری کی تحصیل میں مشغول رہو۔ اسکے بعد دہلی آکر ہمارے پاس ٹھہرنا۔ حضرت سلطان المشائخ قدس سرہ العزیز فرماتے ہیں کہ اس وقت حضرت گنج شکرؒ کی عمر اٹھارہ سال کی تھی۔

---

[1] مرأۃ الاسرار میں روز وفات شنبہ درج ہے اور سفینۃ الاولیا میں سہ شنبہ۔ لیکن دونوں میں پانچویں محرم کی تاریخ وفات بیان کی گئی ہے۔

خواجہ قطب الاسلام سے رخصت ہو کر آپ قندھار کی طرف متوجہ ہوئے اور پانچ سال کامل وہاں تحصیل علم میں مشغول رہے۔ اسکے بعد بغداد کی طرف ارادہ فرمایا۔ یہاں تمام مشائخ وقت سے ملاقات فرمائی خصوصاً شیخ شہاب الدین عمر سہروردی قدس سرہٗ العزیز کی ملازمت بھی حاصل کی چنانچہ خود فرماتے ہیں کہ "شیخ شہاب الدین سہروردی را دعاگو دیدہ است و سعادت قدمبوسی حاصل کردہ۔"

حضرت گنج شکر فرماتے ہیں کہ بغداد میں شیخ اجل شیرازیؒ سے بھی ملا تھا۔ بہت بزرگ و باعصمت پیر تھے۔ جب ہاتھ چومنے کے لیے بڑھا تو آنکھوں میں آنسو بھر لائے اور فرمایا "بیا اے انگر عالم نیک آمدی۔" چند روز اُن کی خدمت میں بھی رہا۔ کسی کو نہیں دیکھا کہ اُنکی خانقاہ سے محروم گیا ہو۔ مجھے بھی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تیرے رزق میں برکت عطا فرمائے۔ بغداد سے نکل کر جب میدانوں میں پہونچا تو ایک درویش کو دیکھا زار و نزار۔ جسم پر صرف استخوان و پوست باقی رہ گیا ہے۔ میرے دل میں یہ خطرہ گذرا کہ اس جنگل میں یہ صاحب کب سے ہیں اور کیا کھاتے پیتے ہیں؟ اس خطرہ پر مطلع ہو کر اُنھوں نے فرمایا کہ اے فرزند چالیس سال سے اس غار میں مقیم ہوں اور سوائے خس و خاشاک اور میرے لیے کچھ نہیں ہے۔ چند روز اُن کی خدمت میں رہا۔ پھر وہاں سے بخارا کی طرف روانہ ہوا جہاں شیخ سیف الدین باخرزی رحمۃ اللہ علیہ سے قدمبوسی حاصل کی۔ بڑے باعصمت بزرگ تھے۔ اُن کی خدمت میں رہا ہوں۔ جب میری طرف نظر فرماتے یہ کہتے کہ یہ لڑکا مشائخ روزگار میں سے ہوگا۔ اور تمام عالم اس کے مُریدوں اور فرزندوں سے بھر جائے گا۔ ایک سیاہ گلیم آپ کے دوش مبارک پر تھی اُتار کر مجھے دی اور فرمایا پہن لو۔ میں نے پہن لی۔ چند روز کے بعد یہاں سے بھی رخصت ہوا۔ ایک مسجد میں پہونچا۔ وہاں سے نزدیک ایک صومعہ تھا وہاں ایک باہیبت درویش کو دیکھا کہ عالم تفکر میں کھڑا ہوا ہے اور آنکھیں آسمان کی طرف ہیں۔ چار روز بعد عالم صحو میں آئے اُس وقت میں نے سلام کیا۔ جواب سلام عطا فرمایا اور کہا کہ میری وجہ سے بڑی تکلیف ہوئی۔ بیٹھو۔ اُنھوں نے اپنا حال بیان فرمایا کہ میں حضرت شمس العارفینؒ کے پوتوں میں سے ہوں اور تیس سال سے یہاں معتکف ہوں۔ سوائے ہیبت و حیرت کے اور کچھ نصیب نہیں ہوا۔ پھر فرمایا کہ "ایں راہ راہے است ہر کہ دریں راہ بہ راستی قدم نہ زند بہ دست نہ رسد۔" بعد ازاں اپنے احوال و مقامات بیان فرمائے اور کہا خویشتن سے بیگانہ ہو جاؤ تاکہ

اُس کے یگانہ نہ ہو۔ رات بھر خدمت میں رہا صبح کو رخصت ہوا۔

آپ فرماتے ہیں کہ بدخشاں میں بھی بہت سے بزرگوں سے نیاز حاصل ہوا۔ ایسے تھے کہ انکی تعریف نہیں بیان کر سکتا۔

اس تمام دورہ و سفر کے بعد آپ ملتان کی جانب واپس ہوئے۔ اور شیخ بہاء الدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات فرمائی۔ وہاں سے مراجعت کر کے دہلی تشریف لائے اور خواجہ قطب الاسلام بختیار اوشی قدس سرہ العزیز کی خدمت میں رہنے لگے۔ خود فرماتے ہیں کہ

"نعمتے کہ در دے دیدم آں نعمت در حد وصف و بیان نیاید پس خود را در پائے ایشاں بستم و بشرف بیعت مشرف شدم۔ سوم روز سر نعمت بمن رواں کرد و ایں سخن ہم فرمود کہ مولانا فرید کار خود تمام کردہ بودی آنگاہ بمن آمدی"

حضرت سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ حضرت گنج شکرؒ نے جب یہ بیان ختم کیا تو نعرہ مارا اور تین شبانہ روز عالم استغراق میں بے خود رہے۔ اسکے بعد جب ہوش میں آئے تو فرمایا مردان خدا نے یہ کیا ہے جب کسی مقام پر پہونچے ہیں۔ اُس راہ میں جب تک کوئی صدق دل سے سفر نہ کرے گا ہرگز ہرگز کسی مقام پر نہ پہونچے گا۔ پھر یہ ابیات زبان فیض ترجمان سے ارشاد فرمائے جامی

تو راہ نہ رفتی و ترا نہ نمودند ورنہ کہ زد ایں در کہ بر دنگشودند

جاں نہ رہ دوست بازاگر بخواہی تو نیز چناں شوی کہ ایشاں بودند

فوائد السالکین میں حضرت گنج شکرؒ فرماتے ہیں کہ جب میں خواجہ قطب الاسلام کے شرف ارادت سے بہرہ مند ہوا تو چار کلاہ ترکی میرے سر پر رکھی اور بہت شفقت فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ شیخ میں اتنی ذاتی قوت اور تصحیح خاطر ہونی چاہیے کہ اگر کوئی اُس کے پاس مُرید ہونے کو آئے تو باطنی نظر کی قوت سے اُس کے سینہ کے زنگار کو جو آلودگی دنیا کی وجہ سے جم گیا ہے صاف کردے تاکہ کوئی کدورت اور آلائش باقی نہ رہے۔ اسکے بعد ہاتھ پکڑ کر خدا تک پہونچادے۔

شرف بیعت کے بعد حضرت گنج شکرؒ غزنی دروازہ کے متصل جو برج ہے اسکے نیچے ایک حجرہ بنا کر مشغول بحق ہوئے۔ وہاں سے ہر دو ہفتے کے بعد خواجہ قطب الاسلامؒ کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ خواجہ صاحب نے آپ سے چلّے کے روزے رکھوائے اور فرمایا کہ تین روز کے بعد جو

یب سے بہم پہونچ جائے اُس سے افطار کرو۔ تیسرے روز ایک شخص کے یہاں سے کھانا آیا جو شرابی تھا۔ آپ کے معدہ نے قبول نہیں کیا۔ خواجہ صاحب کو اطلاع ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ دو تین روز اور طے کرو۔ چھٹے روز اس قدر ضعف ہوا اور ایک گھڑی رات گذرنے کے بعد بھوک کی اس قدر حرارت معلوم ہوئی کہ چند سنگریزے زمین پر پڑے ہوئے تھے حالتِ اضطرار میں اُن پر ہاتھ ڈالا۔ جس وقت دہان مبارک میں پہونچے شکر ہو گئے۔ آپ نے فوراً تھوک دیا کہ کہیں مکر نہ ہو۔ کئی بار ایسی نوبت آئی اور سنگریزے شکر ہو گئے۔ یکایک حضرت خواجہ قطب الاسلام کا ارشاد یاد پڑا کہ جو کچھ غیب سے ملے افطار کر لو۔ اس خیال کے آتے ہی آپ نے مواہب الٰہی خیال کر کے چند سنگریزے منہ میں ڈال لیے جو شکر ہو گئے۔ خواجہ سنائی نے اسی مضمون کو نظم فرمایا ہے

سنگ در دست تو گُہر گردد زہر در کام تو شکر گردد

صبح ہوتے ہی خواجہ قطب الاسلام سے اس واقعہ کو عرض کیا تو آپ نے فرمایا کہ اچھا کیا کہ اس سے افطار کیا۔ غیب سے جو شے پہونچی وہ اچھی ہی ہے۔ انشاء اللہ شکر کے مانند تم شیریں رہو گے۔ اسکے بعد جو آپ کو دیکھتا تھا گنج شکر کے نام سے خطاب کرتا تھا۔ لیکن سفینۃ الاولیا میں گنج شکر کی وجہ تسمیہ دوسری ہی لکھی ہے۔ صاحب سفینۃ الاولیا لکھتے ہیں کہ سات روز گذر گئے کہ آپ نے افطار نہیں کیا تھا۔ ضعف غالب تھا۔ اسی حالت میں اپنے پیر و مرشد کی خدمت میں روانہ ہوئے اثنائے راہ میں ضعف سے پیر لڑکھڑایا اور آپ زمین پر گر پڑے۔ دہن مبارک میں کچھ مٹی چلی گئی جو تمام شکر ہو گئی۔ وہاں سے اُٹھ کر حضرت پیر و مرشد کی خدمت میں پہونچے۔ حضرت شیخ نے فرمایا

"فرید گلے کہ بدہنت رسید و شکر شدہ حق تعالیٰ وجود ترا گنج شکر گردانیدہ است ہموارہ شیریں خواہی بود"۔

پیر کی خدمت سے جب باہر آئے دیکھا کہ جو شخص دیکھتا ہے گنج شکر کے لقب سے آپ کو یاد کرتا ہے۔ صاحب سیر العارفین لکھتے ہیں کہ "روزے وے بخدمت خواجہ می آمد از ضعف ریاضت پایش بلغزید بر زمین اُفتاد پارۂ گِل بدہن رسید شکر شد از آں وقت گنج شکر گویند"۔ مولانا عبد الحق محدث دہلویؒ اخبار الاخیار میں ایک دوسری حکایت لکھتے ہیں کہ ایک سوداگر چند گاؤ شکر بار کر کے کہیں جا رہا تھا۔ حضرت شیخ

فریدالدین گنج شکر نے اُس سے تھوڑی شکر مانگی اُس نے جواب دیا کہ یہ نمک ہے شیخ نے فرمایا کہ نمک ہی ہوگا - چنانچہ سوداگر نے جب بوجھ کھولے تو تمام نمک نظر آیا - شرمندہ ہو کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور نہایت عاجزی کی - آپ نے فرمایا اچھا شکر ہوگی - اسکے بعد جو دیکھا تو تمام شکر تھی - ایک عزیز نے اس مضمون میں چند شعر خوب کہے ہیں -

کان نمک جہاں شکر شیخ بحر و بر　　　　کز شکر نمک کند وز نمک شکر

اس کے بعد حضرت خواجہ قطب الاسلام قدس سرہ العزیز نے چلۂ معکوس کے لیے آپ کو حکم فرمایا کہ ایسے مقام پر جاؤ جہاں مسجد ہو اور اُس مسجد میں ایک کنواں ہو اور اُس کنوئیں کے منہ پر ایک درخت ہو اور اُس مسجد میں ایک ایسا مؤذن ہو جو متدین لایق اور درویشوں کی صحبت کے قابل ہو - وہاں چالیس شب اپنے پاؤں کو سینے سے باندھ کر سرنگوں کوئیں میں لٹکو اور یاد الٰہی میں مصروف رہو - حضرت گنج شکر نے کوشش فرمائی تو ایسا مقام خطۂ اُچہ میں ملا جہاں اسی طرح کی ایک مسجد - کنواں اور درخت تھا - اور خواجہ رشید الدین مینائی مؤذن تھے - آپ نے اس ارادہ کا اُن سے ذکر کیا اور اخفائے راز کی تاکید کی - عشاء کی نماز پڑھ کر آپ وہاں جاتے اور رات بھر اسی حالت میں لٹکے رہتے - صبح کو خواجہ رشید الدین آتے اور آپ کو کنوئیں سے باہر نکالتے - آپ نماز فجر ادا کر کے اُسی مسجد میں مراقب رہتے - اسی طرح چالیس راتیں گذر گئیں اور چلہ ختم ہوا -

خواجہ نظامی :

دارد و دو سر ایں رشتہ کیے عجز و گر ناز　　　　زیں سو ہمہ عجز آمد وزاں سو ہمہ ناز

امیر حسن دہلوی :

ہر دل کہ در و مہر تو آویختہ شد　　　　آویختہ شد عاقبت از کنگرۂ عشق

اس طرح نماز معکوس حضرت سرور کائنات علیہ الف تحیۃ والصلوٰۃ سے بھی مروی ہے - حضرت شیخ ابو سعید ابو الخیر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی پڑھی ہے - سلسلۂ چشتیہ میں خواجہ ابو محمد چشتی نے نماز معکوس بہت ادا فرمائی ہے -

حضرت سلطان المشائخ قدس سرہ العزیز فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ خواجہ بزرگ معین الحق والدین قدس سرہ العزیز دہلی تشریف لائے اور خواجہ قطب الاسلام قدس سرہ العزیز کے مکان پر ٹھہرے -

حضرت گنج شکرؒ اس وقت وہیں قیام فرما تھے۔ خواجہ بزرگ نے اُنھیں دیکھ کر فرمایا "بابا بختیار ایں جوان را چند در مجاہدہ خواہی سوختن، چیزے بخشش کن" خواجہ قطب الاسلام نے عرض کی کہ "مرا چہ مجال کہ در نظر آں حضرت عطائے توانم کرد" آپ نے فرمایا تمھیں سے اس کا تعلق ہے۔ اسکے بعد خواجہ بزرگؒ قبلہ رو حجرہ میں کھڑے ہوگئے۔ خواجہ قطب الاسلام نے بھی موافقت فرمائی اور حضرت گنج شکرؒ کو بُلایا۔ خواجہ بزرگؒ نے انھیں اپنے درخواجہ قطب الاسلام کے درمیان کھڑا کیا۔ پھر دونوں بزرگوار حضرت گنج شکرؒ کے حق میں بہت دیر تک دعائیں مانگتے رہے اور اتنی نوازش فرمائی کہ بیان سے باہر ہے۔ اور یہ ارشاد فرمایا کہ "فرید شمعے ست کہ خانوادۂ درویشاں روشن خواہد کرد"۔ میر سید محمد کرمانی نے سیر الاولیا میں خوب کہا ہے

بخشش کونین ازیں گنجینہ شد در باب تو   بادشاہی یافتی زیں بادشاہانِ جہاں
مملکت دنیا و دیں گشتہ مسلّم مر ترا   عالم کُن گشت اقطاع تو اے شاہ جہاں

سفینۃ الاولیا میں ہے کہ "ایشاں بخدمت حضرت خواجہ معین الدین چشتی نیز رسیدہ بودند و حضرت خواجہ معین الدین درباب ایشاں می فرمودند کہ بختیار عظیم شاہبازے را بقید آوردہ است کہ جز بہ سدرۃ المنتہیٰ آشیاں نگیرد، ویں شمعیست کہ خانۂ درویشاں روشن و منور سازد"۔ آپ اپنے زمانہ کے قطب وقت و غوث زماں ہوئے اور اتنے خوارق عالیہ آپ سے ظاہر ہوئے ہیں کہ اس سلسلہ میں بمشکل کسی سے ظہور میں آئے ہوں گے۔

سلطان المشائخؒ فرماتے ہیں کہ خواجہ قطب الاسلام کے وصال کا وقت جب قریب پہونچا اُس وقت حضرت گنج شکرؒ قصبۂ ہانسی میں تھے۔ قاضی حمید الدینؒ ناگوری اور بدر الدینؒ غزنوی کے دلوں میں گذرا کہ خرقہ و سجادہ ہمیں عطا ہوگا۔ لیکن خواجہ صاحب نے فرمایا کہ میں اپنا خرقہ و عصا اور چوبی نعلین فرید الدین مسعود کو دُوں گا، وہی میرے خلیفہ اور جانشین ہوں گے۔ یہ امانت قاضی حمید الدینؒ کے حوالہ کر کے جاں بحق تسلیم ہوئے۔ ہانسی میں یہ امر حضرت گنج شکرؒ کو معلوم ہوا آپ دہلی کی طرف روانہ ہوئے اور خواجہ قطب الاسلام کی وفات کے چوتھے روز آپ کے مزارِ پاک پر پہونچ کر شرف زیارت سے مشرف ہوئے۔ قاضی صاحب نے وہ تمام نعمتیں آپ کے سپرد کیں۔ حضرت گنج شکرؒ نے بتعظیم خرقہ پہنا اور جس گھر میں خواجہ قطب الاسلام رہتے تھے اُسی میں

قیام فرمایا۔

خواجہ قطب الاسلام اژدہام خلائق کے خیال سے ایک دربان رکھا کرتے تھے۔ حضرت گنج شکرؒ نے اپنے پیر کی سنت سمجھ کر اس دربان کو برقرار رکھا۔ اتفاقاً ایک دن ایک مجذوب "سرہنکا" نام جو ہانسی میں حضرت گنج شکر کی خدمت میں بہت آیا جایا کرتا تھا اور بہت خلوص و محبت رکھتا تھا آیا۔ دربان نے روکا اور اندر نہیں جانے دیا۔ دستور کے موافق حضرت گنج شکر جب جمعہ کے روز باہر تشریف لائے تو "سرہنکا" مجذوب روتا ہوا پیروں پر گر پڑا اور کہنے لگا کہ ہانسی میں روز آپ کو دیکھتا تھا، یہاں تین روز سے آیا ہوا ہوں اور بار نہیں ملتا۔ حضرت گنج شکرؒ نے فرمایا کہ میں نہیں رہوں گا۔ حاضرین نے کہا بھی کہ خواجہ قطب الاسلام نے یہ مقام آپ کو عطا کیا ہے مناسب نہیں کہ کہیں اور تشریف لے جائیں۔ آپ نے فرمایا کہ جو نعمت خواجہ صاحب نے مجھے مرحمت فرمائی ہے وہ کیا شہر کیا بیابان سب جگہ میرے پاس ہے۔ اسکے بعد دہلی سے روانہ ہو کر ہانسی میں تشریف لائے۔ یہیں شیخ جمال الدین ہانسوی کو شرف ارادت حاصل ہوا۔ یہ آپ کے محبوب ترین مُرید تھے۔ ہانسی میں بھی جب بہت بھیڑ بھاڑ ہوئی تو وہاں سے بھی روانہ ہوئے اور قصبۂ کھتوال میں جو آپ کے آباء و اجداد کا وطن تھا قیام اختیار کیا۔ یہ مقام ملتان سے قریب تھا اور دہلی اور ہانسی کی طرح یہاں بھی ہجوم ہونے لگا تو آپ نے لاہور جانے کا ارادہ کیا۔ اس زمانہ میں لاہور چنگیزی مغلوں کی تاخت و تاراج کی وجہ سے بہت خراب اور ویران ہو گیا تھا مگر آخر کار آپ نے اجودھن میں جو اب پاک پٹن کہلاتا ہے قیام فرمایا۔ بعض کہتے ہیں کہ اٹھارہ سال اور بعض کہتے ہیں کہ چوبیس سال آپ اجودھن میں رہے۔ یہ آپ کی عمر کا آخری زمانہ تھا۔ صاحب مرآۃ الاسرار فرماتے ہیں کہ آں مقام بوجود مبارک وے قبلۂ ہندوستان و خراسان گشت و تا روز قیامت خواہد ۔

"بر زمینے کہ نشان کف پائے تو رسد سالہا سجدۂ صاحب نظراں خواہد بود"

حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلیؒ فرماتے ہیں کہ اجودھن میں آپ نے کئی شادیاں کیں۔ اور بچے ہوئے۔ جامع مسجد کے پاس آپ کا مکان تھا وہیں سب اہل و عیال رہا کرتے تھے۔ اور خود کبھی مسجد میں مشغول رہا کرتے تھے اور کبھی جنگل میں درختوں کے تلے بسر کرتے تھے۔ اور قناعت

پر نہایت عسرت کے ساتھ بسر ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ ایک نوکر ایک دانگ کا نمک قرض لایا۔ جب جب افطار کے وقت آپ کے سامنے کھانا آیا تو آپ نے فرمایا اس میں اسراف کی بو آتی ہے۔ اس کھانے کو میں نہیں کھاؤں گا۔ ایک مرتبہ آپ کے ایک صاحبزادے گرسنگی سے ہلاک ہو گئے۔ آپ کی بیوی صاحبہ نے عرض کی تو آپ نے فرمایا کہ مسعود بندہ کیا کر سکتا ہے اگر خدا کی ہی مرضی ہے اور وہ مر گیا ہے تو ایک پیر میں رسی باندھ کر باہر پھینکدو۔ سبحان اللہ۔ یہ کسقدر استغراق، فنا، قناعت، استقامت اور بلندی ہمت تھی۔ یہ زمانہ جب گذر گیا اور فراغت کا زمانہ آیا اور آپ کی عظمت و شہرت کی شہرت تمام عالم میں ہوئی اور ہر طرف سے فتوحات آنے لگیں اُس وقت بھی یہی حال تھا۔ یہ تمام فتوحات مجاورین و مسافروں کے کام آتی تھیں۔ حضرت سلطان المشائخؒ فرماتے ہیں کہ صبح سے ایک گھڑی رات تک جو کوئی آتا طرح طرح کے کھانے آپ کے باورچی خانہ سے کھاتا۔ اور ہر جا نمدات کو آپ کے پاس مٹھائیاں آتیں اور اُنکے انبار لگائے جاتے اور نقد بھی موجود رہتا۔ جو کوئی ماہ نو کی مبارکباد کو آپ کے پاس حاضر ہوتا اُس میں سے ضرور کچھ نہ کچھ اُسے عطا ہوتا۔ کسی کو شیرینی اور کسی کو نقد روپیہ۔ کسی کو دونوں۔ جس کا جو حال ہوتا اُسی کے مناسب اُسے عطا ہوتا۔

حضرت سلطان المشائخؒ فرماتے ہیں کہ آپ اکثر صائم رہتے اور شربت سے افطار فرمایا کرتے۔ ایک پیالہ میں چند مویز بھگو دیے جاتے اُسی کا شربت بن جاتا۔ نصف یا ثلث حاضرین پر تقسیم ہوتا باقی خود نوش فرماتے بلکہ اُس میں سے بھی بچا کر کسی کو مرحمت فرماتے۔ بعد ازاں نماز کے پہلے دو گھی چپڑی روٹیاں لائی جاتیں۔ ایک حاضرین کو تقسیم فرماتے اور ایک خود تناول فرماتے بلکہ اُس میں سے بھی کسی کو دیدیتے۔ اسکے بعد سُرخ دسترخوان بچھایا جاتا اور طرح طرح کے کھانے چُنے جاتے اور لوگ کھاتے۔ خود بہت کم شاذ ہی کبھی ارادہ فرماتے بلکہ اُسی ایک روٹی میں سے کچھ بچا کر دوسرے روز کے افطار کے لیے رکھ دیتے۔ سلطان المشائخؒ فرماتے ہیں کہ آپ اکثر زنبیل کی روٹی کھایا کرتے تھے۔ افطار کے وقت اسی نان زنبیل کے دو ایک ٹکڑے سامنے لائے جاتے۔ کبھی مکان میں دونوں وقت زنبیل کی روٹی تقسیم ہوتی لیکن احباب کو اکثر دن کے وقت نان زنبیل اور رات کے وقت دسترخوان پر کھانا ملتا تھا مصرعہ

ہر تنگ حوصلہ ناشائستہ ہوائی نسبت

صاحب مرأۃ الاسرار سیر الاولیاء کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ جب سلطان ناصرالدین بن سلطان شمس الدین التمش نے اچھ اور ملتان کی طرف لشکر کشی کی تو حضرت گنج شکرؒ کی ملاقات کو بھی اجودھن آیا۔ ملازمت کے بعد کچھ زر نقد اور چار گانوؤں کا فرمان الغ خاں کے ہاتھ خدمت مبارک میں پیش کیا۔ زر نقد تو آپ نے لیکر اُسی وقت درویشوں کو تقسیم کر دیا اور فرمان واپس کر دیا کہ یہ گانوؤں کسی مستحق کو دیے جائیں مجھے ضرورت نہیں۔ الغ خاں کے دل میں یہ خیال آیا کہ سلطان کے کوئی لڑکا نہیں ہے کیا اچھا ہو اگر حضرت کی توجہ سے دہلی کی سلطنت اُسکے بعد مجھے مل جائے۔ اس خیال پر مطلع ہو کر آپ نے دو بیت زبان فیض ترجمان سے ارشاد فرمائے:

فریدون فرخ فرشتہ نبود ز عود و ز عنبر سرشتہ نبود
زداد و دہش یافتہ نیکوئی تو داد و دہش کن فریدوں توئی

سلطان ناصرالدین کی وفات کے بعد ہی الغ خاں بادشاہ ہوا اور سلطان غیاث الدین بلبن کے نام سے مشہور ہوا۔

حضرت سلطان المشائخؒ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ آپ کی محاسن مبارک سے ایک بال اُڑ کر نیچے گرا۔ فدوی نے عرض کیا اگر اجازت ہو تو میں یہ لے لوں اور تعویذ بنا کر رکھوں۔ فرمایا اچھا۔ جب میں دہلی گیا تو یہ تعویذ اپنے ساتھ لیے آیا۔ جس کسی کو کوئی حاجت ہوتی اور مجھ سے تعویذ مانگتا تو میں یہ دے دیتا اور یہ شرط کر لیتا کہ جب کام نکل جائے تو مجھے واپس کر دینا۔ بعض دفعہ ایسا ہوتا کہ کام نکلنے والا نہ ہوتا تو ہر چند تلاش کرتا تعویذ نہ ملتا۔ سبحان اللہ جب ایک موئے مبارک میں یہ عظمت و کرامت تھی تو دیگر خوارقِ عادات کا کیا ذکر۔

آپ کے چند اقوال سیر الاولیا، راحت القلوب، اسرار الاولیا، مرأۃ الاسرار و اخبار الاخیارؒ سے انتخاب کر کے ذیل میں بیان کیے جاتے ہیں:۔

آپ فرماتے ہیں کہ خدائے بزرگ و برتر کے ساتھ معاملہ رکھو۔ سب لیتے ہیں اور وہ دیتا ہے اور جو وہ دیتا ہے اُسے کوئی نہیں لے سکتا۔ اپنے سے بھاگنا (یعنی اپنے نفس کے کرے بچنا) خدا سے ملنا ہے۔ ہر شخص کا کھانا مت کھاؤ۔ لیکن ہر شخص کو کھانا کھلاؤ۔ مستحقین کو کبھی فراموش مت کرو۔

قیاس پر باتیں نہ کیا کرو اور دل کو شیطان کا کھلونا نہ بناؤ۔ جس قدر تم اپنے ظاہر سے واقفیت رکھتے ہو اس سے زیادہ باطن سے واقفیت رکھو۔ ظاہری آرائش کے پیچھے مت پڑو۔ پرانے گھرانوں کی عزت کرو۔ جنگ کی جگہ صلح سے کام لیا کرو۔ اور کسی دشمن سے گو وہ تم سے خوش نظر آئے بے خوف مت رہو۔ جو تم سے ڈرے اُس سے تم بھی ڈرو۔ اور اپنے زورِ بازو پر بھروسہ مت کرو۔ شہوت نفسانی کے وقت تمام اوقات سے زیادہ خویشتن داری سے کام لینا چاہیے۔ جب اہل دولت کے پاس بیٹھو تو اپنے دین کو مت بھول جاؤ۔ عزت و حشمت عدالت و انصاف میں سمجھو۔ تونگری کے وقت ہمت بلند رکھو۔ دیتے وقت اپنی ذات کو درمیان سے اُٹھا لو۔ اپنی نظر نہ پڑے۔ دشمن کو نیک مشورہ سے شکست دو اور دوست کو تواضع سے غلام بناؤ۔ اپنے عیبوں پر نظر رکھو۔ دشمنوں کی سخت کلامی سے برانگیختہ مت ہو۔ اگر آسودگی چاہتے ہو تو حسد سے بچتے رہو۔ اور ہمیشہ یہ کوشش کرتے رہو کہ موت کے بعد زندگی نصیب ہو۔ زندہ دل وہی ہے جس میں محبت اور اشتیاق ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ درویشی پردہ پوشی کا نام ہے۔ درویش کو لازم ہے کہ ان چار چیزوں سے دُور رہے۔ یعنی لوگوں کے عیب نہ دیکھے۔ نہ سُننے کے لائق باتیں نہ سُنے۔ نہ کہنے کی باتیں زبان سے نہ کہے اور جہاں جانا مناسب نہ ہو وہاں نہ جائے۔ نیز درویشی قناعت کا نام ہے۔ جو کچھ تجھے ملے اس پر قناعت کر اور یہ نہ کہہ کہ ایسا ملنا چاہیے تھا۔ اسراف اُسے کہتے ہیں کہ جو دے بے نیت دے اور اللہ تعالیٰ کے نام پر نہ دے۔

آپ فرماتے ہیں کہ جو کوئی میرے پاس آئے اور کوئی چیز نہ لائے تو مجھ پر واجب ہے کہ اُسے کچھ دوں۔ درویشی کا کوئی مقام خوف و امید سے خالی نہیں۔ ہر مقام کی مصیبت اُس کی آزمایش کے واسطے ہوتی ہے۔ اگر ذرا بھی چون و چرا کی تو پھر کبھی وہ مرتبہ حاصل نہیں ہوتا۔ درویش مصیبتوں میں صابر اور خوش رہتا ہے اور اٹھارہ ہزار عالم کی پروا نہیں کرتا۔ دُنیا بندہ اور مولا کے درمیان سب سے بڑا حجاب ہے (یعنی دنیا سے مراد یہ ہے کہ خدا سے غفلت اختیار کرے) اسلئے سب سے بڑا حجاب ہے۔ حب الدنیا راس کل خطیئۃ۔ قال اہل المعرفۃ من ترک الدنیا ملک ومن اخذہا ہلک۔ دل مردہ بھی ہوتا ہے اور زندہ بھی۔ پس مردہ دل کو ذکر الٰہی سے زندہ کرو۔

جب دل دنیا کی لذتوں، شہوتوں، ماکولات اور مشروبات میں مشغول ہو جاتا ہے تو غفلت طاری ہو جاتی ہے اور خواہشات نفسانی غالب آ جاتی ہیں اور دل میں ہر طرف سے خطرات آنا شروع ہوتے ہیں جو اُسے سیاہ کر دیتے ہیں اور جب دل سیاہ ہو جاتا ہے تو گویا مردہ ہو جاتا ہے اسے اندیشہ الٰہی اور ذکر الٰہی سے زندہ کرو۔

آپ فرماتے ہیں کہ جو درویش دنیا کے کاموں میں مصروف ہوا اور مال و مرتبہ و ترقی جاہ کا طلبگار ہوا وہ درویش نہیں بلکہ مرتدِ طریقت ہے۔ اس راہ میں بڑا اصول حضوری دل ہے جو بغیر لقمۂ حلال کھائے اور دنیا سے پرہیز کیے حاصل نہیں ہوتی۔ جب تک دوست کی شناخت حاصل نہ ہو ہزار سال بھی عبادت کرے تو بھی ذوق حاصل نہیں ہوتا۔ وہ جانتا ہی نہیں کہ طاعت کس کے لیے کر رہا ہے۔ اہل سلوک نے فرمایا ہے کہ جو پیر اہل سنت و جماعت کے طریق پر کاربند نہیں اور اُس کے اقوال و افعال، حرکات و سکنات حدیث و قرآن مجید کے مطابق نہیں وہ اس راہ میں راہزن ہے۔ بارگاہِ الٰہی میں مومن کے دل کی بڑی قدر و منزلت ہے لیکن لوگ دل کی اصلاح سے غافل ہیں اسی واسطے گمراہی میں پڑتے ہیں۔ سلوک کا اصل اصول یہی دل ہے۔

آپ کا ارشاد ہے کہ فقیر کے لیے دولتمند کی صحبت سے بڑھ کر کوئی چیز مضر نہیں۔ جب فقیر گوشہ نشینی اختیار کرتا ہے تو اُس کے دینی و دنیوی کام اپنے آپ بنتے چلے جاتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ اگر کسی شخص کا شیخ کامل نہ ہو تو اہل سلوک کی کتاب کو پیش نظر رکھے اور اُس کی متابعت کرے۔

آپ کا ارشاد ہے کہ جس شخص کو کوئی زحمت یا تکلیف ہو سمجھو کہ اُسے گناہ سے پاک کر رہے ہیں۔ بندہ کو سمجھنا چاہیے کہ سب درد و محبت اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتے ہیں اور اپنے نفس کا طبیب خود بننا چاہیے۔

اے بسا درد کاں ترا دارو ست   اے بسا شر کاں ترا آہو ست

آپ نے فرمایا کہ آدمی کو درویشوں کے حق میں ہمیشہ نیک گمان رکھنا چاہیے تاکہ اُن کی حمایت نصیب ہو۔ جو بندہ اللہ تعالیٰ کے کام میں ہوتا ہے اللہ جل شانہٗ اُس کے کام میں ہوتا ہے۔ جو شخص دوست کی رضا کا طلبگار رہتا ہے تو دوست بھی اُسکی رضا کا جویندہ ہوتا ہے۔ طالب کو

ہر حالت میں مطلوب کے عشق و محبت اور اُسکی یاد میں رہنا چاہیے تاکہ متقدمین کے مانند ہو جائے۔ طریقت کی راہ رضا و تسلیم ہے۔ اگر کوئی گردن پر تلوار مارے تو اُسی پر راضی رہے جبکی یہ حالت ہو وہ درویش ہے۔

آپ نے فرمایا کہ اگر عابد سے کوئی ورد یا طاعت فوت ہو جائے تو اُسی کو اُسکی موت کہا جاتا ہے۔ صاحب ورد کو چاہیے کہ جو وظیفہ ہے اگر دن کو پورا نہ کر سکے تو رات کو پورا کرے۔ بہر حال ترک نہ کرے۔

آپ نے فرمایا کہ اپنے تئیں کسی کے پلّہ باندھ لینا اچھا ہے اور یہ شعر پڑھا جو حضرت شیخ قطب الدین بختیار کاکی قدس سرہٗ کی زبان مبارک سے سنا تھا ؎

گر نیک توام مرا ازیشاں گیرند   ور بد باشم مرا بدیشاں بخشند

آپنے فرمایا کہ جب لوگ کھانا کھائیں تو چاہیے کہ طاعت بھی کرو کھائیں کیونکہ طاعت کے لیے کھانا بھی طاعت ہے۔ ہوائے نفس کے لیے کھانا نہیں کھانا چاہیے۔ سعدی

خوردن برائے زیستن و ذکر کردن ست   تو معتقد کہ زیستن از بہر خوردن ست

آپ نے فرمایا کہ اگر لوگوں کو علم کا درجہ معلوم ہو جائے تو تمام کام چھوڑ کر علم ہی تحصیل کیا کریں۔ علم ایک ایسا بادل ہے جس میں رحمت ہی کی بارش ہوتی ہے۔ افسوس علمائے ظاہر علم سے غافل ہیں کیونکہ اُنھوں نے دنیا کو اپنا بُت بنا رکھا ہے اور شریعت کو کھیل کچھ رکھا ہے۔ قیامت کے دن ان علما کے لیے جو دنیا اور اہل دنیا کے ساتھ انہماک رکھتے ہیں اور علم سے جو مقصود ہے اُس پر عمل نہیں کرتے حکم ہوگا کہ انھیں آگ کے طوق پہنا کر دوزخ میں لیجائیں۔ پھر فرمایا کہ حق تعالیٰ کی ذات سب سے بزرگ تر ہے۔ پھر لوگ کیوں ایسی نعمت سے محروم رہتے ہیں اور اپنی ساری عمر اُسکے ذکر و فکر میں صرف نہیں کرتے۔ کوئی ذکر کلام الٰہی سے بڑھ کر نہیں۔ اُسی کو پڑھنا چاہیے۔ اس کا پھل تمام طاعتوں سے بڑھ کر ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ انوار و اسرار کے لیے وسیع حوصلہ چاہیے۔ اسرار و انوار الٰہی جو عاشق پر متجلی ہوتے ہیں اگر اُنکے نور کا ذرہ بھر باہر نظر آجائے تو تمام جہان منور ہو جائے۔ اس راہ میں صدق کی ضرورت ہے تاکہ دوست کے تمام اسرار سے واقفیت حاصل ہو جائے۔ راہ خدا

میں ایسے مرد بھی ہیں کہ ایک ساعت میں دوست کے اسرار کے لاکھ دریا پی جاتے ہیں - اور ذرہ بھر اثر ظاہر نہیں ہوتا -

آپ فرماتے ہیں کہ فقرا اہل عشق ہیں اور علما اہل عقل - لیکن واقف کار وہی لوگ ہیں جنہیں یہ دونوں چیزیں پائی جائیں ؎

در کفے جام شریعت در کفے سندان عشق　　　ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن
ترسیت عاشقاں را در طاقت نہانی　　　پوشیدہ درانہ خود تا تنجا خجل نہ مانی

جہاں محبت آتی ہے وہاں دوئی اُٹھ جاتی ہے - محبت کے معاملہ میں یگانہ ہونا چاہیے تاکہ خانۂ وصال محبت کے معاملہ میں بار حاصل ہو سکے ؎

تا نفس من ز عشق دوست زدم　　　خاست از ما بسے دوئی خبر دوست

عشق کی آگ ایسی ہوتی ہے کہ درویش کے دل کے سوا کہیں اور قرار نہیں پکڑ سکتی - درویشوں کو عشق کی خاک اور انوار تجلی سے پیدا کیا گیا ہے - عشق کی یہ بے بہا نعمت کسی فرشتہ کو بھی نہیں ملی صرف آدمی کو ملی ہے جیسا کہ خود فرمایا ہے ولقد کرمنا بنی آدم - جس وقت عشق پیدا کیا گیا تو اُسے حکم ہوا کہ جا اور اندوہناک آدمیوں کے دل میں قرار پکڑ - وہی مقام تیرے رہنے کے قابل ہے

گفتم صنما گر تو جانانِ منی　　　اکنوں کہ نگاہ می کنم جانِ منی
مرتد گردم اگر ز من برگذری　　　اے جان جہاں تو کفر و ایمانِ منی

اے درویش تجھے قدر ہی نہیں معلوم کہ تیرے دل کے اندر ایسی خوبصورت نعمت مقام کیے ہوئے؟

آپ فرماتے ہیں کہ متعبد اُن لوگوں کو کہا جاتا ہے جن کا ظاہر و باطن حق سے آراستہ ہو اور کسی قسم کی ریا، حسد، بغض اور کھوٹ ظاہر و باطن میں نہ ہو - جو طاعت کریں خالصۃً لوجہ اللہ کریں - پھر فرمایا کہ درویشوں نے دنیا ہی میں بحالت زندگی اپنے تئیں مردہ بنا لیا ہے اور تمام خواہشات نفسانی سے اپنے تئیں باز رکھا ہے - آپ نے فرمایا کہ مومنوں کے دل پاکیزہ زمین کے مانند ہیں - اگر محبت کا بیج اس میں بویا جائے تو رنگ برنگ کی نعمتیں پیدا ہوں گی - پھر فرمایا کہ جب تک تو سانپ کی طرح کینچلی نہ اُتارے گا کبھی محبت حق کے دعوے میں صادق نہیں ہو سکتا -

کامل حال درویش ہے جو کسی اور کی حاجت نہیں رکھتا اور اسرار کی نعمت سے آنے والوں کو اُن کا حصہ دیتا اور اُن کا مدعا پورا کرکے رخصت کرتا ہے ۔ مرد خدا وہی تھے جو ذرہ برابر راہِ خدا سے باہر نہ ہوئے اور رزق کی خاطر کبھی مشوش نہیں ہوئے ۔

آپ کا ارشاد ہے کہ توبہ کی چھ قسمیں ہیں ۔ دل و زبان سے توبہ کرنا ۔ آنکھ ۔ کان ۔ ہاتھ ۔ پاؤں اور نفس کی توبہ ۔ اس کی تشریح یوں بیان فرمائی کہ جب تک دل سے تصدیق اور زبان سے اقرار نہ ہو توبہ درست نہیں ہو سکتی ۔ ایسی چیزوں کے دیکھنے سننے سے توبہ کرے جو دیکھنے اور سننے کے قابل نہیں ہیں ۔ ایسی چیزوں کے چھونے اور مدد کرنے سے ۔ ہاتھ سے مدد اور پاؤں سے تعلق نہ کرے توبہ کرے جو اس قابل نہیں کہ انکی مدد یا اُن کا قصد ہاتھ پاؤں سے کیا جائے ۔ اور نفس کو تمام خواہشات ماکولات و شہوات سے باز رکھا جائے ۔ اور ان سب سے توبہ کی جائے ، اور نفس کی خواہش کے مطابق کام نہ کیا جائے ۔

توبہ کی بہ لحاظ زمانہ اور تین قسمیں بیان فرمائیں ۔ حال ، ماضی و استقبال ۔ حال .... یعنی کیے ہوئے گناہ سے ندامت حاصل ہو ۔ ماضی یہ کہ تلافیٔ گناہ اس کرے مثلاً دشمن کو راضی کرنا کسی سے اگر کوئی شے لی ہے تو اُسے واپس کرنا یا اُس کا معاوضہ کرنا ۔ اور استقبال یہ کہ آئندہ گناہ سے بچنے کا مصمم ارادہ کرنا ۔

آپ فرماتے ہیں کہ اے درویش جس نے سعادت حاصل کی ہے بزرگوں کی خدمت سے حاصل کی ہے ۔ جو کچھ انسان کرے اُسے یہی سمجھنا چاہیے کہ سب خدا کی مرضی سے ظہور میں آ رہا ہے اور خود وہ درمیان میں نہیں ہے ۔

تلاوت قرآن کی آپ بہت تاکید فرماتے ہیں اور ارشاد فرماتے ہیں کہ جو شخص اللہ سے کلام کرنا چاہے وہ کلام الٰہی پڑھا کرے ۔ نیکبخت بندہ وہ ہے جو اپنے دوست اور مولا سے ہمکلام ہو ۔ اس ہمکلامی کی سعادت تلاوت قرآن مجید سے حاصل ہوتی ہے ۔ عاشق و معشوق میں الفت باہم گفتگو سے بڑھتی ہے ۔ پس راہ سلوک میں تلاوت قرآن سے بڑھ کر کوئی شے نہیں ۔

آپ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں خلوت میں یادِ الٰہی میں مشغول تھا ۔ جب سورۂ اخلاص پہ پہونچا تو مجھ پر عالم تجلی سے اسرار و انوار نازل ہونا شروع ہوئے ۔ ان انوار نے عشق و محبت کے سمندر میں

جھے جا پھینکا - جب وہاں سے نکلا تو اللہ جل شانہٗ کے عشق و محبت کے دریا میں غرق ہوا سات دن رات میری یہی حالت رہی پھر عالم صحو میں آیا -

آپ فرماتے ہیں اے درویش خرقہ پہن لینا تو آسان ہے مگر اُس کا حق ادا کرنا بہت مشکل ہے اگر صرف خرقہ پہن لینے سے نجات ہوتی تو تمام لوگ خرقہ پہن لیتے اور نجات حاصل کر لیتے -

درکوہ و دشت ہر سبعی صوفیے بدے　　گر ہیچ سود مند بُدے صوف بیعفا

خرقہ خرقہ پوش کی وجہ سے قابل اعتبار ہوتا ہے - اس کا بطور خود کوئی اعتبار نہیں جب درویش صوف پہن لے تو اُس پر واجب ہے کہ گوشہ نشینی اور تنہائی اختیار کرے اور دولتمندوں سے ملنا جلنا چھوڑ دے -

پھر فرمایا کلام مجید میں ہے الم یان للذین آمنوا ان تخشع قلوبھم یعنی اللہ جل شانہٗ فرماتا ہے کہ اے میرے بندو کیا ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ میرے خوف سے تمہارے دل نرم ہوں یا کوئی تم میں سے ایسا ہے جو ہم سے صلح کرے یعنی توبہ کرے اور ہم اُسکی توبہ قبول کریں - پھر فرمایا کہ خائف اُس شخص کو کہتے ہیں جس میں یہ تین باتیں پائی جائیں - اول روزہ کی خاطر کم کھانا - دوم نماز کی خاطر کم بولنا - سوم ذکر کی خاطر کم سونا - اور جس طرح یہ باتیں درویش کے لیے ضروری ہیں اسی طرح خوف - اُمید - اور محبت بھی ضروری ہیں -

آپ نے فرمایا کہ عقلمند وہ شخص ہے جو سب کاموں میں اللہ تعالیٰ پر توکل کرے اور کسی سے کسی طرح کی اُمید نہ رکھے - پھر فرمایا اہل توکل پر ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ اگر اُس وقت انہیں آگ میں پھینک دیا جائے یا زخمی کیا جائے تو اُنہیں مطلق خبر نہ ہوگی - نیز فرمایا کہ جو شخص عالم توکل میں حق تعالیٰ کے کرم پر بھروسہ کرتا ہے اُسے عالم غیب سے روزی پہونچتی ہے اور جو کچھ وہ طلب کرتا ہے اُسے مل جاتا ہے -

آپ نے فرمایا کہ اے درویش لوگوں کی تین قسمیں ہیں - بعض ایسے ہیں جو دنیا سے محبت کرتے ہیں اور ہر وقت اُسی کی یاد و طلب میں رہتے ہیں - ایسے بہت ہیں - بعض اسے دشمن سمجھتے ہیں اور محبت نہیں کرتے - بعض نہ اسے دوست سمجھتے ہیں نہ دشمن - یہ تیسری قسم کے لوگ پہلی دو قسموں سے اچھے ہیں - پھر فرمایا کہ جو شخص جس قدر اللہ تعالیٰ سے غافل ہے اُسی قدر دنیا میں مبتلا ہے -

پھر فرمایا کہ میں نے خواجہ بختیار اوشی سے سُنا ہے کہ دنیا میں تین کام سب کاموں سے
افضل ہیں۔ اول دُنیا کو پہچاننا اور اُس سے بچنا۔ دوسرے حق تعالیٰ کی طاعت کرنا اور ادب
ملحوظ رکھنا۔ تیسرے آخرت کی آرزو رکھنا اور اُس کی طلب میں کوشش کرنا۔ اس راہ میں
مرد وہی ہے جو ان تین باتوں پر عمل کرے یعنی (۱) دنیا سے بچا رہے (۲) مرنے سے پہلے گور
کے لیے تیاری کرے (۳) حق تعالیٰ کو دیکھنے سے پہلے اُسے خوش کرے۔ پھر فرمایا جو شخص جس قدر
زیادہ موت سے غافل ہوگا اُسی قدر دنیا کا ذکر اس کے دل میں محکم ہوگا۔ سلوک کے بارے میں
لکھا ہے اکثروا ذکر ہادم النفس و ہادم اللذات۔ جو شخص ہمیشہ موت کو یاد رکھتا ہے اللہ جل شانہٗ
اُس سے خوش ہوتا ہے۔

آپ کا ارشاد ہے کہ جس شخص کا اپنے پیر کے حق میں نیک عقیدہ نہیں وہ مُرید نہیں۔ پیر
میں اتنی قوت ہونی چاہیے کہ جب کوئی مرید ہونے کی نیت سے آئے تو اُسکے حسن عقیدت کو دیکھے۔
اگر اُسکو فرمان حق میں راسخ پائے تو کہدے واپس جاؤ ابھی تمہارا وقت نہیں آیا۔

آپ نے فرمایا کہ مذہب۔ تصوف و سلوک کے مطابق وہ شخص صوفی و سالک نہیں ہے
جو یادِ حق میں نہیں۔ کیونکہ جس دم وہ یادِ الٰہی سے غافل ہوتا ہے اُسے نہیں معلوم اُسوقت کن کن
نعمتوں سے محروم رہتا ہے۔ اس لیے جہاں تک ہو سکے یادِ الٰہی سے غافل نہیں رہنا چاہیے۔
اہل تصوف صرف اُسی دل کو زندہ سمجھتے ہیں جو یادِ حق میں مستغرق ہو اور ایک دم بھی یادِ الٰہی
سے غافل نہ ہو۔ جو یادِ الٰہی سے غافل ہیں وہ مردہ ہیں۔

آپ کا ارشاد ہے کہ ہمارے خواجگاں نے سلوک کے پندرہ مراتب مقرر کیے ہیں جن میں سے
پانچواں مرتبہ کشف و کرامت کا ہے۔ اگر سالک اس مرتبہ میں کشف و کرامت ظاہر کر دے تو
اچھا نہیں۔ پورے پندرہ مراتب طے کر کے کشف کا اظہار کرنا چاہیے۔

آپ کا ارشاد ہے مرید کو چاہیے کہ پیر کا فرمان دل و جان سے بجا لائے۔ فرمایا کہ جب
انسان پر رنج و مصیبت نازل ہو تو اُسکے سبب پر غور کرنا چاہیے اور تنبیہ حاصل کرنا چاہیے۔
جو شخص ہر وقت طاعت میں رہتا ہے اُسے کسی قسم کی تکلیف نہیں پہنچتی۔ اے درویش جو لوگ
مصیبت میں صبر کرتے ہیں اللہ جل شانہٗ اُن کے گناہوں کو ملیامیٹ کر دیتا ہے۔ یہ سعادت ہے

جو گناہوں کا کفارہ ہو جاتی ہے ۔ اے درویش ۔ اس راہ میں عاشقوں نے درد و بلا کو اپنی خوراک بنایا ہے ۔ جس دن اُن پر بلا نازل نہیں ہوتی وہ ماتم کرتے ہیں کہ آج ہمیں دوست نے یاد نہیں فرمایا اور جب کسی درد و بلا میں مبتلا ہوتے ہیں تو یاد آوری کے شکر اُسے بجا لاتے ہیں ۔ اے درویش راہِ محبت میں صادق وہی شخص ہے جو بڑی خواہش سے درد و بلا کی تمنا کرے ۔ پھر فرمایا کہ اے درویش ہم مسافر ہیں ، بلا کے سر پر بیٹھے ہوئے ہیں ۔ یہ بلا دنیا ہے ۔ ہماری عمر کی بساط یکایک لپیٹ دی جائے گی اور قبر ہمارا مقام و منزل ہو گی ۔

جہان چیست بگذر ز نیرنگ او ۔۔۔ رہائی بچنگ آر از چنگ او
مقیمے نہ بینی دریں باغ کس ۔۔۔ تماشا کن ہر یکے ہر نفس
دریں چار سو ہیچ بیگانہ نیست ۔۔۔ کہ کیسہ بہ مرد خود کامہ نیست
درو ہر دمے نوبرے می رسد ۔۔۔ یکے می رود دیگرے می رسد
جہاں گرچہ آرامگاہے خوش است ۔۔۔ شتابندہ را نعل در آتش است
دو در دارد ایں باغ آراستہ ۔۔۔ درو بند ایں ہر دو برخاستہ
در آ از درے باغ بنگر تمام ۔۔۔ ز دیگر درے باغ بیروں خرام
اگر زیرکی با گلے خو مگیر ۔۔۔ کہ باشد ز بجا ماندنش ناگزیر
دریں دم کہ داری بہ شادی بسیچ ۔۔۔ کہ آئندہ در زیر پیچ ست و پیچ
یکے را در آرد بہ ہنگامہ تیز ۔۔۔ دگر را ز ہنگامہ گوید کہ خیز
نظامی سبکباش یاراں شدند ۔۔۔ تو ماندی بہ غم غمگساراں شدند

آپ کا ارشاد ہے کہ فقیر جب جامہ پہنے تو یہ سمجھے کہ جامہ نہیں بلکہ کفن پہنا ہے ۔

صاحب سیر الاولیا لکھتے ہیں کہ آپ کے پانچ لڑکے اور تین لڑکیاں ہوئیں لیکن پوتے پوتیاں اور نواسے نواسیاں بہت ہیں ۔ آپ کے سب سے بڑے صاحبزادہ کا نام شیخ نصیرالدین قدس سرہٗ ہے ۔ صاحب مرأۃ الاسرار سیر الاولیا سے نقل کرتے ہیں کہ " بہ او صاف سینہ و اخلاق مرضیہ موصوف بود ۔ روزگار بعبادت باری تعالیٰ و بہ کسب زراعت جہت لقمۂ حلال گذرانید و عمر عزیز در رضائے حق تعالیٰ بسر بردہ رحمۃ اللہ علیہ ۔ آپ کے دوسرے صاحبزادہ کا نام شیخ

شہاب الدین قدس سرہ ہے۔ آپ ذوفور علم وفضائل سے آراستہ تھے اور اکثر اوقات اپنے والد کی خدمت مبارک میں رہا کرتے تھے۔ سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ مجھ میں اور شیخ شہاب الدین میں باہم محبت تھی۔ ایک مرتبہ بلا قصد مجھ سے کوئی خطا سرزد ہو گئی تھی اُنھوں نے درمیان میں پڑ کر معافی دلوائی۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ۔ آپ کے تیسرے صاحبزادہ کا نام بدرالدین سلیمان بن گنجشکر تھا قدس سرہ العزیز۔ یہ بھی علم و تقویٰ میں مشہور اور معارف مشائخ کبار سے موصوف تھے۔ حضرت گنج شکرؒ کے وصال کے بعد انھیں کو تمام بھائیوں اور اہل ارادت کے اتفاق رائے سے سجادہ پر بٹھایا تھا۔ صاحب مرأۃ الاسرار فرماتے ہیں کہ "آں مقام را بنور حضور بر جادۂ طریقت منور گردانید ویر انگنج شکر مرید خلفائے چشت گردانیدہ بودند" چوتھے صاحبزادہ کا نام نظام الدین تھا۔ حضرت گنج شکرؒ کو تمام لڑکوں سے زیادہ انھیں سے محبت تھی۔ آپ نے فوج کی نوکری کی اور والد ماجدؒ کی وفات کے بعد حملہ کفار میں لڑ کر شہید ہوئے۔ بعض کہتے ہیں کہ آپ کی نعش مبارک نہیں ملی۔ اور بعض کہتے ہیں علاء الدین خلجی کے زمانہ میں قلعہ سیوہر کی تسخیر میں آپ شہید ہوئے اور وہیں آپ کا مزار ہے۔ یزار و یتبرک۔ پانچویں صاحبزادہ شیخ یعقوب بن گنج شکر تھے قدس سرہ العزیز۔ آپ سب سے چھوٹے تھے اور بذل و ایثار میں شہرت تام رکھتے تھے۔ . . . .

. . . . آپ کا طریقہ ملامتیہ تھا اور کرامات ظاہر تھیں۔ آپ اکثر سفر میں رہتے۔ اثنائے سفر میں قصبۂ اترو ہہ میں کہتے ہیں کہ آپ مردان غیب کے ساتھ شامل ہو گئے۔

صاحب مرأۃ الاسرار سیر الاولیاء سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت گنج شکرؒ کی بڑی صاحبزادی کا نام بی بی مستورہ تھا۔ دوسری کا نام بی بی شریفہ تھا۔ بی بی شریفہ نہایت عابدہ زاہدہ تھیں اور ... عنفوان شباب ہی میں بیوہ ہو گئی تھیں۔ پھر عمر بھر شادی نہیں کی اور عبادت الٰہی میں بسر کی۔ حضرت گنج شکرؒ نے بارہا فرمایا ہے کہ اگر عورت کو خلافت و سجادۂ مشائخ دینا روا ہوتا تو میں شریفہ کو دیتا۔ تیسری صاحبزادی کا نام فاطمہ تھا۔ ان کا نکاح شیخ بدرالدین اسحاق سے ہوا تھا۔ جنسے دو لڑکے خواجہ محمد اور خواجہ موسیٰ پیدا ہوئے اور حضرت سلطان المشائخ کے زیر تربیت رہ کر مقامات عالی پر پہونچے۔

حضرت گنج شکرؒ کے پوتے شیخ علاء الدین بن شیخ بدر الدین سلیمان بن گنج شکر قدس سرہٗ تمام پوتوں اور نواسوں سے زیادہ ممتاز تھے۔ ایک بار کھیلتے کھیلتے آئے اور اپنے دادا کے سجادہ پر بیٹھ گئے۔ شیخ عیسیٰ ایک درویش نے ہٹانا چاہا مگر حضرت گنج شکرؒ نے فرمایا "بگذار تا نشستہ باشد"۔ ان انفاس متبرکہ کی برکت سے تقریباً دو قرن شیخ علاء الدین اپنے دادا کے سجادہ پر متمکن رہے۔ اور چوّن سال حق سجادگی ادا کیا۔ سلطان فیروز شاہ بادشاہ دہلی آپ کے مریدوں میں تھا۔ شیخ رکن الدین جو شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے پوتے تھے جب دہلی سے ملتان کی طرف معاودت فرماتے تو شیخ علاء الدین سے ضرور ملتے۔ اور فرماتے کہ حق تعالیٰ نے آپ کو ایسی استقامت بخشی ہے کہ کوئی شخص اس جگہ سے آپ کو جنبش نہیں دے سکتا۔ جب آپ کا وصال ہوا تو حضرت گنج شکرؒ کے جوار میں آپ کو دفن کیا گیا۔ اور سلطان محمد تغلق نے جو آپ کا مرید اور معتقد تھا ایک بڑا گنبد مزار پر تعمیر کیا۔ یہ متبرک ویزار۔

"عبداللہ"

(الناظر، نومبر ۱۹۲۴ء)

حضرت محبوب الٰہی محمد نظام الدین بدایونی رحمۃ اللہ علیہ

اے آتشِ فراقت دلہا کباب کردہ
سیلابِ اشتیاقت جاں ہا خراب کردہ

ارباب مشاہدہ کے سردار۔ اصحاب مجاہدہ کے سالار۔ خواجہ دو استاں۔ ملک الفقراء والمساکین۔ سلطان المشائخ والمحبوبین۔ قطب وقت مجمع ارشاد و ارشاد۔ حجۃ اللہ علی العباد۔ مبین فروع و اصول، جامع معقول و منقول۔ وارث انبیاء و مرسلین شیخ نظام الحق والشرع والدین قدس سرہ العزیز۔ آپ کا اسم مبارک محمد بن احمد بن علی البدایونی البخاری ہے۔ صاحب نفحات الانس نے آپ کو خالدی لکھا ہے۔ لیکن یہ نہیں معلوم ہوتا کہ حضرت خالد کون تھے جن کی طرف آپ کی نسبت کی ہے۔ صاحب سفینۃ الاولیاء آپ کا نسب یوں لکھتے ہیں "نام ایشاں محمد بن احمد بن دانیال بدایونی ست"۔ صاحب مرآۃ الاسرار نے بجائے دانیال کے علی لکھا ہے۔ دانیال ممکن ہے کہ آگے چل کر اس سلسلہ میں کسی کا نام ہوگا مگر آپ کے دادا کا نام علی صحیح ہے۔ آپ کا سلسلہ نسب سید جلال الدین مخدوم جہانیاں جہاں گشت سے ملتا ہے۔ آپ کے اجداد بخاری تھے لیکن ہندوستان تشریف لا کر بدایوں (روہیلکھنڈ) میں سکونت اختیار کی اس لیے بدایونی کہے جاتے ہیں۔

شیخ عبدالرحمن چشتیؒ مرآۃ الاسرار میں آپ کے حالات میں لکھتے ہیں کہ "وہ محبوب خدا و سر حلقۂ اولیاء، اہل صفا تھے اور عشق کامل، شوق وافر، وجد صادق، قوی حال اور بلند ہمت رکھتے تھے۔ انبیاء علیہم السلام کے بعد اس قسم کے صوری و معنوی تصرفات اس طائفہ میں کسی کو میسر نہ ہوئے۔ آپ تمام مقامات غوثی و قطبی و فردانیت سے گزر کر مرتبہ محبوبی پر پہونچے۔ آپ کے اقوال و افعال جمیع مشائخ کے لیے حجت قاطع ہیں اور اس فن میں الیٰ یومنا سب آپ کی پیروی کرتے ہیں اور جب تک عالم ہے کیے جائیں گے۔ اس چار دانگ وسعت آباد ہندوستان کو نور ولایت سے آپ نے منور فرمایا اور ایک عالم کے لیے سبب ہدایت ہوئے۔ حق تعالیٰ نے آپ کو سلطان المشائخ کے خطاب سے ممتاز فرمایا اور کرامت کا تاج آپ کے اور آپ کے پیروؤں کے سر پر رکھا۔ آپ کے تصرفات اظہر من الشمس ہیں اور کوئی ان سے انکار نہیں کر سکتا۔

میر سید محمد کرمانی قدس سرہٗ نے آپ کے مفصل حالات کتاب سیر الاولیاء میں لکھے ہیں۔ وہ کتاب حروف کی نظر سے نہیں گزری۔ دوسری کتابوں میں اسکے حوالہ سے جو کچھ لکھا ہے وہ اور جو کچھ مرأۃ الاسرار۔ اخبار الاخیار۔ نفحۃ الانس۔ مرأۃ مظہری۔ راحت القلوب۔ فوائد الفواد۔ افضل الفوائد اور سفینۃ الاولیاء میں نظر سے گذرا اُن سے یہ مختصر گلدستہ بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔

دل خواست کہ در عبارت آرد   وصفِ رخ او بہ استعارت

شمعِ رُخ او زبانہ زد   ہم عقل بسوخت ہم عبارت

آپ کے اجداد نے بخارا سے تشریف لاکر لاہور میں سکونت اختیار فرمائی۔ وہاں سے آپ کے دادا خواجہ علی اور نانا خواجہ عرب معہ اہل و عیال بدایوں تشریف فرما کر سکونت پذیر ہوئے۔ ان دونوں بزرگوں میں باہم قرابت واقع ہوئی۔ خواجہ عرب کی ایک صاحبزادی بی بی زلیخا تھیں وہ خواجہ احمد بن علی کے نکاح میں آئیں۔ خواجہ احمد زیورِ دیانت و صلاح سے بدرجۂ کمال آراستہ تھے۔ اسلئے سلطان وقت نے بدایوں کی قضاۃ آپ کے تفویض فرمائی۔ آپ کا مزار پاک بدایوں میں اس وقت تک زیارتگاہِ خاص و عام ہے۔ صاحب مرأۃ الاسرار فرماتے ہیں کہ حق سبحانہ تعالیٰ ازاں دو صدف پاک دُرِ کان کرامت و سرمایۂ عشق و محبت سلطان المشائخ را بہ وجود آورد۔

آپ کی ولادت مبارک ۲۷۔ صفر ۶۳۶ھ (چھ سو چھتیس ہجری) کو بمقام بدایوں واقع ہوئی۔ ابھی آپ صغیر سن ہی تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا

آفریں از خدائے بر پدرے   کہ از و ماند ایں چنیں پسرے

غرضکہ اس دُرِ یتیم نے اپنی ماں کے گود میں پرورش پانی شروع کی۔ جب کسی قدر بڑے ہوئے تو مکتب میں بٹھایا گیا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں آپ نے قرآن پاک ختم کر لیا اور کتب متداولہ شروع کیں بارہ سال کی عمر میں علم لغت پڑھتے تھے۔ مولانا شمس الملک جو اس زمانہ میں یکتائے روزگار سمجھے جاتے تھے اُن سے مقامات حریری پڑھی اور سند حاصل کی۔ حدیث میں مشارق الانوار حفظ فرمائی اور محدثین وقت سے گوئے سبقت لے گئے۔ علم تفسیر، ہیئت، ہندسہ، فقہ اور اصول بھی اپنے زمانہ کے مشاہیر سے حاصل کیا۔ سیر الاولیاء میں ہے کہ آپ علما اور فضلا وقت کی صحبت میں ہمیشہ رہتے تھے۔ اور نظام الدین بحاث کہلائے جاتے تھے۔ لیکن باوجود اسکے آپ کا دلِ حق منزل ہمیشہ علوم باطن کی تکمیل کی طرف جھکا رہتا تھا اور چاہتے تھے کہ اس صحبت سے نکل کر نور حقیقی کا نظارہ کریں۔

حضرت سلطان المشائخ خود فرماتے ہیں کہ میں ابھی چھوٹا ہی تھا۔ کم و بیش اندازاً بارہ سال کی عمر ہوگی کہ علم لغت پڑھتا تھا ابوبکر خراط (جنھیں ابوبکر قوال بھی کہتے ہیں) ملتان سے میرے اُستاد

کی خدمت میں آئے اور پہلے شیخ بہاء الدین زکریا کے کمالات بیان کیے، مگر میرے دل پر کچھ اثر نہیں۔ اسکے بعد حضرت گنجشکرؒ کی بزرگی بیان کی۔ آپ کا نام پاک سنتے ہی میں بے اختیار ہو گیا اور آپ کی محبت میرے دل پر مستولی ہو گئی۔ حتی کہ ہر نماز کے بعد آپ کے نام کی تسبیح پڑھتا تھا۔ اور دس بار شیخ فرید اور دس بار مولانا فرید نام لیکر سوتا تھا۔ جب سولہ سال کی میری عمر ہوئی تو اپنی والدہ اور چھوٹے بھائی کے ساتھ دہلی کا ارادہ کیا۔ جب شہر میں داخل ہوا تو اتفاقاً شیخ نجیب الدین متوکلؒ جو حضرت گنجشکرؒ کے بھائی تھے انکے پڑوس میں مکان لیا اور آپ کی محبت کی وجہ سے روز بروز حضرت گنجشکرؒ کی پابوسی کا اشتیاق بڑھتا جاتا تھا۔ مگر تین چار سال اور شہر میں رہنا ہوا اور بڑی کوشش سے تمام تعلیم حاصل کی اور علم حدیث کی سند لی"۔

سیر العارفین میں ہے کہ جب آپ کی تحصیل علوم ختم ہو گئی اور علمائے شہر میں امتیاز حاصل ہوا تو ایک روز شیخ نجیب الدین متوکلؒ کے پاس تشریف لے گئے اور التماس فاتحہ کر کے عرض کی کہ دعا فرمایئے میں کسی جگہ کا قاضی ہو جاؤں اور خلق کو نفع پہونچاؤں۔ شیخ نے فرمایا خدا نہ کرے تم قاضی ہو بلکہ تم وہ ہو جاؤ جو ہم جانتے ہیں۔ اسکے چند روز کے بعد حضرت گنجشکرؒ کی پابوسی کا شوق غالب ہونے لگا۔

منقول ہے کہ آپ کی والدہ ماجدہؒ کا جب آخیر وقت قریب آیا تو آپ رونے لگے اور فرمانے لگے کہ مجھے آپ کس کے سپرد کیے جاتی ہیں۔ آپ خاموش رہیں۔ دوسرے روز علی الصباح آپکو بلایا اور ہاتھ پکڑ کر کہا اے اللہ میں تیرے سپرد کرتی ہوں۔ ومن یتوکل علی اللہ فہو حسبہ ان اللہ بالغ امرہ قد جعل اللہ لکل شیٔ قدرا۔

صاحب نفحات الانس فرماتے ہیں کہ آپ تحصیل و تکمیل علوم دینی سے فارغ ہونے کے بعد ایک شب جامع مسجد دہلی میں مقیم تھے کہ نماز صبح کے وقت موذن نے منارہ پر چڑھ کر یہ آیت پڑھی اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ آمَنُوْا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُھُمْ لِذِکْرِ اللہِ۔ یہ آیہ پاک سن کر آپ کی حالت متغیر ہو گئی۔ جب صبح ہوئی تو بے زاد و راحلہ حضرت شیخ فرید الدین گنجشکر کی ملازمت کی نیت سے چل کھڑے ہوئے۔ اس وقت آپ کا سن مبارک تقریباً بیس سال کا تھا یعنی جوش جوانی و عروج شباب کا زمانہ تھا کہ تمام مرادات سے ہاتھ اٹھا کر اس راہ میں قدم ڈالا

راحت القلوب میں خود فرماتے ہیں کہ چہار شنبہ کا روز رجب کی دسویں ۶۵۵ھ چھ سو پچپن ہجری تھا کہ دعاگوئے مسلمانان سلطان الطریقہ فی الارض کا ایک غلام نظام احمد بداؤنی جو اس مجموعہ کا جمع کرنے والا ہے سید العابدین حضرت شیخ فرید الدین گنجشکر مسعود اجودھنی قدس سرہ العزیز کے شرف قدمبوسی سے بہرہ مند ہوا۔ اسی وقت آپ نے کلاہ چہار ترکی جو سر مبارک پر تھی دعاگو کے سر پر رکھدی اور

خرقۂ خاص و نعلین چوبیں عطا فرمائیں۔ الحمد للہ علیٰ ذالک۔ اور یہ بھی فرمایا کہ میں چاہتا تھا کہ نعمت سجادہ اور ولایت ہندوستان کسی دوسرے کو دوں۔ لیکن تو راہ میں تھا۔ اُسوقت میرے سر تیں (ہاتف سے) ندا کی کہ ٹھہرو نظام بداؤنی آتا ہے یہ ولایت اُسے دینا۔ دعاگو نے چاہا کہ پابوسی کا اشتیاق جو حد سے زیادہ تھا کچھ اُسکا حال عرض کرے مگر دہشت حضور کی اسقدر غالب ہوئی کہ کچھ عرض نہ کر سکا۔ یہ دیکھ کر حضرت نے فرمایا کہ تمہارا اشتیاق جتنا کہ تمہیں ہوا اُس سے زیادہ ہے اور دعاگو کے مناسب حال یہ بیت زبان مبارک سے فرمائی

اے آتش فراقت دلہا کباب کردہ　　سیلاب اشتیاقت جانہا خراب کردہ

حضرت سلطان المشائخ اس دفعہ اپنے پیر دستگیر کی خدمت میں ۱۵۔ رجب ۶۵۵ھ ہجری سے ۳۔ ربیع الاول ۶۵۶ھ ہجری تک یعنی سات مہینے اور سترہ اٹھارہ دن رہے۔ اس کل مدت میں حضرت گنج شکر نے جو پند و نصائح فرمائیں وہ سب راحت القلوب میں موجود ہیں جو حضرت بابا صاحب کے ملفوظات ہیں اور حضرت سلطان المشائخ نے خود مرتب فرمائے ہیں۔

ایک مرتبہ آپ اپنے پیر و مرشد کی خدمت میں تنہا تھے خود فرماتے ہیں کہ "دعاگو شستہ مگس می راند گنج شکر بیدار شد فرمود یاراں کجا اند گفتم قیلولہ کردہ اند فرمود بیا تا ترا چیزے گویم۔ آغاز کرد چو در دہلی بروے در مجاہدہ باشی بیکار بودن ہیچ نیست روزہ داشتن نیمے راہ است و اعمال دگر چوں نماز و حج نیمے راہ" ایک مرتبہ کا اور ذکر فرماتے ہیں کہ حضرت شیخ نے فرمایا کہ "من از حق تعالیٰ خواستہ ام ہر چہ تو از حق بخواہی بیابی"۔ ایک وقت کا حال بیان کرتے ہیں کہ حضرت گنج شکر سر برہنہ۔ بشرۂ مبارک متغیر۔ حجرۂ خاص میں یہ اشعار پڑھ رہے تھے

خواہم کہ ہمیشہ در وفائے تو زیم　　خاکے شوم و بزیر پائے تو زیم
مقصود من بندہ ز کونین توئی　　از بہر تو میرم و از برائے تو زیم"

یہ ابیات پڑھتے اور سر مبارک سجدہ میں لیجاتے۔ میں نے یہ دیکھ کر سر قدموں پر رکھدیا۔ آپ نے کمال مہربانی سے فرمایا "مانگو کیا مانگتے ہو؟" میں نے استقامت طلب کی۔ شیخ نے عطا فرمائی۔

ایک مرتبہ کا اور ذکر فرماتے ہیں کہ حضرت شیخ نے میرے دہن میں اپنا لعاب مبارک دیکر حفظ کی وصیت فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ نظام۔ اللہ نے دین و دنیا دونوں دیے ہیں یہاں سب موجود ہے۔ جاؤ ہندوستان کا ملک لو۔ اور خلافت دے کر فرمایا کہ حق تعالیٰ نے تجھے علم و عقل و عشق عطا فرمایا ہے۔ جس کسی میں یہ تین صفتیں ہوں وہی شایان خلافت ہے۔

غرضکہ دوسری ربیع الاول ۶۵۶ھ کو آپ کو نعمت خلافت و سجادگی حاصل ہوئی جسکا حال

راحت القلوب میں آپ خود اس طرح لکھتے ہیں "دوسری ربیع الاول ۶۶۹ھ کو دولت قدم بوسی حاصل ہوئی۔ اس بندہ کو خلعت خاص مرحمت فرمایا، دوسرے اور عزیز اہل صفا بھی حاضر تھے زبان مبارک سے فرمایا نظام الدین کہ ہم نے ہندوستان کی ولایت دی اور صاحب سجادہ کیا۔ آپ کے ارشاد پر میں نے دوبارہ سر جھکایا اور زمین . ی کی۔ حکم ہوا سے جہانگیر عالم سر اٹھا۔ آپ کے فرق مبارک پر حضرت شیخ قطب الدینؒ کی دستار تھی وہ عطا فرمائی۔ عصا دیا۔ خرقہ اپنے ہاتھ سے پہنایا۔ پھر فرمایا کہ دوگانہ ادا کر۔ جب میں رُو بقبلہ ہوا تو ہاتھ پکڑ کر آسمان کی طرف اشارہ کر کے فرمایا تجھے خدا کو سونپا"۔

اسکے دوسرے روز آپ کو رخصت کیا اور فرمایا کہ پہلے ہانسہ جانا اور مثال خلافت شیخ جمال الدین کو دکھلانا۔ اسکے بعد دہلی جانا وہاں قاضی منتخب کو بھی دکھلانا۔ چنانچہ آپ کی خدمت سے روانہ ہو کر میں پہلے ہانسے پہونچا اور شیخ جمال الدین ہانسوی کو خلافت نامہ دکھلایا۔ آپ نے بہت بشاشت و ملاطفت کا اظہار فرمایا اور یہ اشعار پڑھے

خدائے جہاں را ہزاراں سپاس   کہ گوہر سپارد بہ گوہر شناس

اسکے بعد تقریباً ۱۲ سال حضرت گنجشکرؒ اور بقید حیات رہے لیکن خود حضرت سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ میں اپنے شیخ کی خدمت میں دہلی سے جا کر تین مرتبہ عالم حیات میں قدمبوس ہوا ہوں اور سات مرتبہ بعد وفات مزار مبارک کی زیارت کی ہے۔

حضرت سلطان المشائخ تربیت حاصل کرنے کے بعد سلوک و ریاضت میں مشغول ہوئے مگر ابھی علم کا شوق باقی تھا اس لیے ایک دن حضرت شیخ علیہ الرحمہ سے التماس کیا کہ اگر حکم ہو تو ترک تعلم کر دوں۔ آپ نے فرمایا میں کسی کو تعلیم سے منع نہیں کرتا دونوں کام کیے جاؤ۔ ان میں سے جو غالب ہو گا وہ رہ جائے گا۔ اسکے چند روز بعد شغل باطن میں آپ کو اسقدر استغراق ہونے لگا کہ تعلیم و تعلم کا سلسلہ خود جاتا رہا۔

جائے کہ سلطان خیمہ زد غوغا نماند عام را

سیر الاولیاء میں ہے کہ جب آپ حضرت شیخ کی خدمت سے واپس ہو کر دہلی پہونچے تو چند روز کے بعد ہی اس قدر خلائق کا ہجوم ہوا کہ تنگ آ گئے خیال ہوا کہ کسی گوشہ صحرا میں جا رہیں لیکن اجازت نہ تھی اور اشارہ غیبی سے موضع غیاث پور میں جو دریائے جمنا کے کنارے ہے چند جھونپڑیاں ڈال کر قیام فرمایا اور وہیں ساری عمر گذار دی۔ نواب عماد الملک کے وکیل ضیاء الدین نے آپ کے لیے ایک بڑی خانقاہ تیار کی اور آپ کے متعلقین کے لیے ایک حویلی تعمیر کرائی۔ لیکن اس سے بہتر

آپ پر سخت فقر و فاقہ کا زمانہ گزرا ہے۔ چنانچہ خود ایک مرتبہ کا حال بیان فرماتے ہیں کہ غیاث الدین بلبن کے زمانہ میں ایک من خربوزے دو جیتل کو ملتے تھے۔ ساری فصل گزر گئی اور میں نے ایک پھل بھی نہ چکھا۔ اتفاقاً ایک روز ایک آدمی کئی خربوزے اور روٹیاں میرے پاس لایا۔ جسے میں نے فرشتہ غیب کا انعام سمجھ کر لے لیا۔ لیکن پھر ایک زمانہ ایسا آیا کہ فتوحات کے دروازے کھل گئے اور بکثرت تحفہ و تحائف خدمت مبارک میں آنے لگے۔ لیکن جو کچھ آتا آپ شام تک سب صرف فرمادیتے اور جو لوگ کوئی چیز لاتے اس سے بہتر انہیں خود عطا فرماتے۔

سلطان معزالدین کیقباد کا جب زمانہ آیا تو اس نے بھی اتفاق سے غیاث پور کو پسند کیا اور اس کے قریب سکونت اختیار کی اس وجہ سے امیر امراء اور خلائق کا ہجوم اور بڑھ گیا۔ چونکہ اس سے آپ کو سخت نفرت تھی اس لیے ارادہ کیا کہ کہیں چلدینا چاہیے۔ آپ فرماتے ہیں کہ میں اسی اندیشہ میں تھا کہ ایک حسین جوان دبلا پتلا اسی روز میرے پاس آیا اور مجھ سے کہنے لگا

آن روز کہ مہ شدی نمی دانستی   کانگشت نمائے عالمے خواہی شد

امروز کہ زلفت دل خلقے بربود   در گوشہ نشستنت نمی دارد سود

پھر کہا کہ پہلے تو مشہور ہی نہ ہونا چاہیے لیکن اگر مشہور ہوگئے تو اس کا خیال رکھنا چاہیے کہ کل قیامت کے روز رسول خدا صلعم سے شرمندگی نہ ہو۔ یہ بھی فرمایا کہ یہ بھی کوئی حوصلہ ہے کہ خلق اللہ سے کنارہ کرکے گوشہ گیری اختیار کی جائے۔ قوت و حوصلہ اس کا نام ہے کہ باوجود ازدہام خلق کے مشغول بحق رہیں۔ یہ نصیحت سن کر پھر میں نے جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

آپ فرماتے ہیں کہ تیسری مرتبہ میں رمضان مبارک ۶۶۹ھ (۶۶۸ھ؟) میں اجودھن گیا۔ حضرت گنج شکرؒ سے وہ آخری ملاقات تھی۔ جب واپس ہونے لگا تو میری طرف منہ کر کے فرمایا اللہ تعالیٰ تجھے نیک بخت کرے اسعدک اللہ فی الدارین ورزقک اللہ علماً نافعاً وعملاً مقبولاً۔ اور فرمایا کہ تم ایسے درخت ہوگے جس کے سایہ میں ایک خلق آرام پائے گی۔ حصول استعداد کے لیے مجاہدہ برابر کرتے رہنا۔

دہلی میں آپ کا ایک گھر غیاث پور میں تھا اور ایک کیلوکھڑی میں۔ جمعرات کے دن کیلوکھڑی آتے جمعہ کی نماز وہیں ادا فرماتے۔ اس کے بعد غیاث پور چلے جاتے۔ صاحب مرآۃ الاسرار بحوالہ سیرالاولیاء لکھتے ہیں کہ سلطان المشائخ نے آغاز جوانی میں تیس سال تک سخت مجاہدے کیے ہیں۔ اس کے بعد بھی اخیر عمر تک مجاہدوں کا سلسلہ رہا۔ اور باوجودیکہ فتوحات بکثرت آتی تھیں اور دنیاوی مال و متاع بے اندازہ تھا لیکن ذات پاک ان سب آلائشوں سے منزہ تھی۔ بڑھاپے میں گو اتنی

برس سے سن مبارک گذر چکا تھا لیکن نماز جماعت کے لیے بالائے بام سے نیچے تشریف لاتے۔
اور صوم دوام رکھتے اور افطار کے وقت ایک روٹی یا آدھی روٹی، کچھ ترکاری یا کسی قدر
چاول تناول فرماتے۔ پھر بڑے دسترخوان پر تشریف لاتے اور ہر شخص کو دست مبارک سے کچھ
نہ کچھ مرحمت فرماتے۔

افطار کے بعد جب آپ بالائے بام تشریف لے جاتے تو جو لوگ قدمبوس ہونا چاہتے یا شہر و
اطراف سے حاضر ہوتے مغرب و عشاء کی نماز کے درمیان موقع پاتے اور چند ساعت اُس گنجینۂ رشد
وہدایت کے شرف جمال و سعادت مجالست سے بہرہ اندوز ہوتے۔ اسکے بعد طرح طرح کے میوہ جات
تر و خشک لطیف و لذیذ سامنے لائے جاتے اور ان لوگوں کو تقسیم ہوتے۔ ہر ایک کی آپ دلداری
فرماتے اور بعض اوقات اُن کا ساتھ دینے کے لیے کچھ آپ بھی تناول فرما لیتے۔ اور خود ہر ایک کا
حال پوچھتے۔ اسکے بعد نماز عشاء کے لیے نیچے جماعت خانہ میں تشریف لاتے اور بعد فراغ پھر اوپر
تشریف لیجاتے اور ایک عرصہ تک مشغول بحق رہتے۔ پھر جب استراحت کے لیے چارپائی پر قدم
رکھتے تو آپ کے خادم خواجہ اقبال جنھیں پیار میں لالا کہا کرتے تھے تسبیح دست مبارک میں دیتے
اُس وقت سوائے امیر خسرو کے کسی کو سامنے جانے کی مجال نہ ہوتی۔ حضرت امیر خسرو طرح طرح
کی باتیں کرتے اور آپ اُن کی خاطر سے سر مبارک ہلاتے جاتے۔ اور کبھی کبھی خود پوچھتے کہ لے
ترک یہ کیا چیزیں ہیں۔ خسرو اس قدر ہمت پاکر خوب گل فشانی کرتے۔ اسی وقت خورد و قرابت
دار اور مولازادے جو محل میں ہوتے قدمبوسی کے لیے حاضر ہوتے۔

خفت خسرو مسکیں ازیں ہوس شبہا — کہ دیدہ بر کف پایت نہد بخواب شود

پس جب امیر خسرو اور خورد و قرابت دار باہر آجاتے تو خواجہ اقبال وضو کے لیے آفتابہ حاضر کرتے
اور خود باہر چلے جاتے۔ صاحب مرأۃ الاسرار فرماتے ہیں کہ "دراں محل بجز مشاہدۂ جمال حق
کسے دیگر نبودے۔ تمام شب چہ رازہا و چہ نیازہا و چہ ذوقہا با حق داشتے" چنانکہ این بیت
بہ زبان مبارک راندے۔

کے ہاتھ پر توبہ کرکے نفل نمازیں اور صوم دہر شروع کرتے اور شہر دہلی سے غیاث پور تک صوفیان
اہل صفا کے سوا کوئی دوسرا فرقہ نظر نہ آتا۔ مسلمان ایک دوسرے سے شرم کرتے اور اصلاً دنیا اور
عیش کا ذکر نہ کرتے۔

زیں فن مطلب بلند نامی — کاں ختم شدہ است بر نظامی

صاحب مرأۃ الاسرار کہتے ہیں کہ حضرت سلطان المشائخ نے اپنی وفات سے تین چار ماہ

قبل دس بزرگوں کو مثال اجازت و خرقہ خلافت عطا فرمایا۔ اور میر حسین کرمانی کو حکم دیا کہ فرامین خلافت پر اپنی مہریں ثبت کریں۔ اور تمام خلفا میں سے حضرت شیخ نصیر الدین محمود اودھی کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ اور ارشاد فرمایا کہ تم دہلی کی غمخواری کرو۔ بقول صاحب سیر العارفین جب آپ کا سن مبارک چورانوے سال اور آٹھ ماہ کا ہوا تو بیمار پڑے۔ چند ماہ بیمار رہے۔ مگر سید محمد کرمانی سیر الاولیا میں لکھتے ہیں کہ حضرت کی علالت چالیس روز سے زیادہ نہیں رہی۔ اور وہ بھی کل زمانہ تحیر و مشاہدۂ ذات مطلق میں گذرا۔ علالت کا آغاز یوں ہوا کہ جمعہ کے روز آپ پر حالت وجد طاری ہوئی۔ نمازیں پڑھتے اور سجدہ پر سجدہ فرماتے۔ اسی عالم تحیر میں بخار آگیا اور رقت طاری ہوئی۔ اور ہر روز چند مرتبہ بے خبری سی پیدا ہونے لگی۔ جب ہوش آتا تو استفسار فرماتے کہ کیا آج جمعہ ہے؟ میں نے نماز پڑھ لی ہے؟ لوگ کہتے کہ پڑھ لی ہے۔ آپ فرماتے کہ پھر پڑھ لوں۔ ایک ایک نماز مکرر ادا فرماتے اور یہ مصرعہ زبان مبارک پر لاتے۔

میرویم و میرویم و میرویم

حضرت امیر خسرو اس وقت نہیں تھے بادشاہ کے لشکر کے ساتھ کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ اگر وہ ہوتے تو نہ معلوم یہ حالت ان پر کس قدر شاق گذرتی۔ اسی عالم میں حضرت سلطان المشائخ نے تمام اقربا و خدمتگار اور مریدوں کو طلب فرمایا اور خواجہ اقبال کو حکم دیا کہ جو کچھ نقد و جنس ہو سب تقسیم کردو۔ ایک پیسہ بھی باقی نہ رہے۔ الغرض چالیسویں روز بعد طلوع آفتاب روز چہار شنبہ اٹھارویں ماہ ربیع الآخر ۷۲۵ھ (سات سو پچیس ہجری) شاہد حق میں جان تسلیم کی اور دہلی میں مدفون ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

نظام دو گیتی شہ ملک و ملین ۔۔۔ سراج دو عالم شدہ بالیقین

چو تاریخ فوتش بجستم ز غیب ۔۔۔ ندا داد ہاتف شہنشاہ دین

۷۲۵ھ

سفینۃ الاولیا میں ہے کہ گو آپ کے خلفا سب ہی ممتاز تھے لیکن ان چار کو سب پر فوقیت حاصل تھی حضرت امیر خسروؒ، حضرت شیخ نصیر الدین محمودؒ (چراغ دہلی)، حضرت برہان الدین غریبؒ، اور امیر حسن علاء سنجریؒ۔

آپ نے چونکہ عقد نہیں فرمایا تھا اس لیے کوئی اولاد ظاہری نہیں چھوڑی۔ مولانا عبدالرحمن چشتی مرآۃ الاسرار میں فرماتے ہیں کہ آپ کے روضہ متبرکہ کی خدمت چار فرقوں کے ذمہ ہے۔ ایک خواجہ محمد اور خواجہ موسیٰ بن حضرت شیخ بدر الدین اسحاق قدس سرہٗ کی اولاد، دوم فرزندان خواجہ

رفیع الدین ہارون اور خواجہ تقی الدین نوح جو آپ کے خواہر زادہ تھے۔ سوم خواجہ ابو بکر مصلادار کی اولاد۔ جنھیں قرابت قریبہ بھی حاصل تھی۔ چہارم فرزندان خواجہ مبشر جو آپ کے خدمتگار و محرم اسرار تھے۔

اب آپ کے چند کلمات طیبات افضل الفوائد اور فوائد الفواد سے تبرکاً و تیمناً ذیل میں درج کیے جاتے ہیں

کس نہ رسد بہ چارۂ غم جز بسعی این رسن	لفظ متین خواجہ را حبل متین گرفتہ ام
درگذرانداز کرم گفتہ، دگر و کردہ حسن	گفتۂ شیخ کردہ شد جمع امید آنکہ حق

(حسن سنجریؒ)

آپ کا ارشاد ہے کہ صوفی کے لیے چار چیزوں سے بچنا ضروری ہے اول دنیا و صحبت اغنیا۔ دوم ماسوی اللہ کی یاد اور اس کا تذکرہ۔ سوم غیر کی طرف نظر کرنا۔ چہارم دل کا میل۔ یعنی حب دنیا سے دل کو پاک و صاف رکھنا چاہیے۔ پھر آبدیدہ ہو کر فرمایا کیا ہی اچھا ہو اگر حجاب درمیان سے اٹھا دیں۔ بھید ظاہر کر دیں اور غیریت دور ہو جائے اور یہ آواز دیں کہ بی یبصر و بی یسمع و بی ینطق۔

ایک مرتبہ آپ نے زبان مبارک سے فرمایا کہ جب بندہ اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے اور اس سے تعلق پیدا کرتا ہے اور اسکی قربت میں مست ہو جاتا ہے تو اپنے نفس کو اور ماسوی اللہ کو بھول جاتا ہے۔ اس وقت اگر اس سے پوچھا جائے کہ تو کیا چاہتا ہے اور کہاں جا رہا ہے تو وہ اس سے زیادہ جواب نہیں دے سکتا کہ اللہ۔ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ گناہ سے ایک مرتبہ توبہ کی جاتی ہے گر طاعت سے ہزار مرتبہ۔ یعنی جس طاعت میں ریا کا میل ہو وہ گناہ سے بھی بدتر ہے۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ جو شخص کسی شیخ یا عالم (دین) کی بے عزتی کریگا وہ دنیا و آخرت میں منافق و لعنتی ہوگا۔ نعوذ باللہ منہا۔

ایک مرتبہ اعانت حقوق ہمسایہ کا ذکر تھا آپ نے فرمایا کہ جب ہمسایہ قرض مانگے تو اسے دو۔ اگر اسے کوئی ضرورت ہو تو پوری کرو۔ بیماری میں اسکی عیادت کرو۔ مصیبت میں غمخواری کرو۔ اور جب مر جائے تو اسکے جنازہ کی نماز پڑھو اور میت کے ساتھ جاؤ۔

آپ نے فرمایا شرط عیادت یہ ہے کہ تین دن بعد بیمار پرسی کو جائے اور بیٹھ کر نصیحت کرے کہ بیماری کفارۂ گناہاں ہے۔ جس سے اللہ جل شانہ محبت نہیں کرتا اسے بیمار نہیں ڈالتا۔ بیمار کو صدقہ دینے کی ترغیب دینی چاہیے یہ بھی کفارۂ گناہاں ہے۔

ایک مرتبہ عشق کے بارے میں گفتگو شروع ہوئی تو زبان مبارک سے یہ شعر فرمایا،

فلولاکم ماعرفنا الہوے　　　ولولا الہوے ما عرفناکم

یعنی اگر تم نہ ہوتے تو ہم عشق و محبت کو پہچانتے ہی نہیں، اور اگر عشق و محبت نہ ہوتی تو تمھیں بھی نہ پہچان سکتے۔ پھر غلبات شوق میں یہ رباعی زبان مبارک سے ارشاد فرمائی۔

گر عشق نہ بودے و غم عشق نہ بودے　　　چندیں سخن نغز کہ گفتے کہ شنیدے
ور باد نہ بودے سر زلفش کہ ربودے　　　رخسارۂ معشوق بہ عاشق کہ نمودے

پھر آبدیدہ ہو کر فرمایا کہ عشق کا سُرمہ ایسا ہے کہ جس آنکھ میں ڈالا جاتا ہے وہ عرش سے فرش تک سب کچھ دیکھتی ہے۔

عشق آئینہ است کاندر زنگے نیست　　　نامراداں را ازیں گل رنگے نیست

ایک مرتبہ شیخ برہان الدین غریبؒ نے پوچھا کہ محبت کی اصلیت کیا ہے۔ فرمایا کہ دوستی کی صفائی۔ محبان حق دنیا و آخرت کے حاصل کرنے میں اپنا شرف نہیں جانتے بلکہ وصول حق کو اپنا شرف سمجھتے ہیں۔

حضرت امیر خسروؒ نے پوچھا کہ محبت میں مصیبت کیوں ہوتی ہے۔ فرمایا اس لیے کہ ہر ایک کمینہ اسکا دعوے نہ کرے۔ پھر فرمایا کہ عشق میں صبر اس بات کا نام ہے کہ رنج و راحت دونوں حالتوں میں اُسے آرام رہے۔ صوفی صادق وہی ہے جو صفا و ہوا دونوں میں صوف پہنے۔ جفائے دنیا کا مزہ چکھے۔ تارک دنیا رہے۔ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ تمام چیزوں کی کنجی صبر ہے۔ ارادت میں صبر سے کام بنتا ہے۔ جب ارادت درست ہو جاتی ہے تو برکتوں کے دروازے کھل جاتے ہیں۔

ایک مرتبہ آپ نے آبدیدہ ہو کر فرمایا کہ اہل محبت ایسے لوگ ہیں کہ انکے اور حق کے مابین کوئی حجاب نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ وہ لوگ کیسے اچھے ہیں جو پہلے ہی روز باخبر ہو جاتے ہیں اور دوسرے تیسرے دن انکا نشان بھی نہیں رہتا۔ مگر کامل وہ ہے جو آغاز و انجام عشق میں تمام رہے اور ہل من مزید ہی پکارتا رہے۔ جو شخص راہ محبت و معرفت میں کامل ہے اُس سے ظاہر و باطن میں کوئی چیز پوشیدہ نہیں رہتی۔ آپ سے پوچھا گیا کہ لوگ اس مرتبہ پر کس طرح پہونچتے ہیں۔ فرمایا جب سب سے قطع تعلق کر لیتے ہیں اور صرف اللہ جل شانہ کے ہو رہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ جب محبوں کے دل میں نماز کے وقت دنیا کا خیال آئے تو از سر نو نماز پڑھتے ہیں اور اگر عاقبت کا خیال آجائے تو سجدۂ سہو بجا لاتے ہیں۔

ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ جو لوگ دوست کے عشق میں مستغرق ہیں وہ صبح سے شام تک بڑی آرزو سے بلا کے خواستگار رہتے ہیں۔ کیونکہ جو مصیبت دوست کی طرف سے ہوتی ہے وہ

مصیبت نہیں ہوتی بلکہ عین نعمت ہوتی ہے۔

ہر جا کہ بلائے تست بر جانم باد — چوں درد و بلائے تست بر جانم باد
گر بر سرِ عاشقاں بلاہا باشد — آنجملہ بلائے تست بر جانم باد

آپ نے فرمایا کہ اس راہ میں عاشق اُسی کو کہتے ہیں جسکی جو حالت حضوری میں ہو وہی غیبت میں ہو۔ ہر حال میں طالب وصال رہے۔ جو لوگ مرد کامل ہیں وہ خلقت میں رہ کر دوست کے ساتھ مشغول رہتے ہیں۔ پھر فرمایا کہ اس راہ میں خواجگی اور غلامی کی کوئی تمیز نہیں۔ جو عالم محبت میں راست آتا ہے اُسی کا کام بن جاتا ہے۔ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ عشق و عقل ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ علما اہل عقل ہیں اور درویش اہل عشق۔ ارشاد ہوا کہ جب تک اللہ جل شانہٗ کی محبت قلب کے غلاف میں ہوتی ہے تب تک گناہ کا صادر ہونا ممکن ہے لیکن جب قلب کے گرد و نواح میں آجاتی ہے تو پھر ممکن نہیں کہ گناہ صادر ہو۔

ایک مرتبہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ ایک بزرگ نے شیطان سے پوچھا کہ تیرے نزدیک کونسا کام افضل ہے؟ اُس نے کہا (۱) جھوٹی قسم (۲) زنا (۳) مومن سے شرارت کرنا۔

آپ نے فرمایا کہ صحبت کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ صحبت اگر رہے تو نیک لوگوں اور اولیاء اللہ کی

با بداں کم نشیں کہ صحبت بد — گرچہ پاکی ترا پلید کند
آفتابے بدیں بزرگی را — قطرۂ ابر ناپدید کند

آپ نے فرمایا کہ دانا وہی شخص ہے جو پیش آنے والے سفر یعنی موت کے لیے تیاری کرے اور اپنے ساتھ توشہ رکھے۔

ایک مرتبہ درویشوں کی دعا کے بارے میں گفتگو ہوئی۔ فرمایا درویشوں کے پاس آگ بھی ہے اور پانی بھی۔ یعنی رحم بھی ہے اور قہر بھی۔

ایک مرتبہ آرزوئے نفس کے بارے میں گفتگو ہوئی۔ آپ نے زبان مبارک سے فرمایا کہ حق تعالیٰ کے اولیا اور دوستوں نے سالہا سال نفس کی آرزو پوری نہیں کی اور اسے بری طرح مارا ہے۔

آپ نے فرمایا کہ طریقت میں عارف وہ شخص ہے جو ہر لحظہ عالم تفکر میں رہے اور آنے جانے والے لوگوں اور خلق کی اُسے خبر نہ ہو۔ اور عالم غیب سے ہر وقت اُس پر ایک خاص حالت طاری ہوتی رہے۔ آپ نے فرمایا کہ توحید کے معنی اللہ جل شانہٗ کو ایک کہنا ہے اور معرفت سے مراد اُسکی شناخت ہے۔ عارف ہمیشہ خاموش رہتا ہے اور صرف حسب ضرورت کلام کرتا ہے۔

فرمایا کہ عارف کے ستر مقام ہیں، اُن میں سے ایک اس جہان کی مرادوں کا نہ ملنا ہے۔

آپ نے فرمایا کہ جب انسان کو کوئی تکلیف پہونچے تو اُسے بد دعا نہ کرنی چاہیے تاکہ اللہ تعالیٰ اُس کا بدلہ لے۔

خرقۂ درویشی کے بارے میں ایک مرتبہ گفتگو ہوئی۔ آپ نے فرمایا کہ محض خرقہ قابل اعتبار نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو ساری دنیا خرقہ پہن لیتی۔ اعتبار اُس خرقہ پوش کا ہے جو خرقہ پہنکر اُسکا حق ادا کرے۔ پس اگر وہ کام میں کوتاہی کرے گا تو ماخوذ ہوگا۔ آپ نے فرمایا کہ ایک مرتبہ حضرت جنید قدس سرہٗ سے کہا گیا کہ اے پیر طریقت! کیا ہی اچھا ہو اگر آپ ہماری خاطر سے گدڑی پہن لیں۔ فرمایا اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ صرف گدڑی ہی سے کام چل جاتا ہے تو لوہے اور آگ کی بھی گدڑی پہن لیتا۔ لیکن لیس الاعتبار بالخرقہ۔

آپ نے فرمایا کہ مُریدوں کو جو نعمت حاصل ہوتی ہے وہ سب پیر کی برکت سے حاصل ہوتی ہے۔ پس جو کچھ پیر سے سُنے ہمہ تن گوش ہو کر سُنے اور اس پر عمل کرے تاکہ نعمت اُس سے ضائع نہ ہو جائے۔

ایک مرتبہ سماع اور اہل سماع کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی کہ ایک شخص نے آکر اطلاع دی کہ آپ کے کچھ یار جمع ہوئے ہیں اور بانسریاں بھی لائے ہیں۔ فرمایا میں نے تو منع کیا تھا کہ بانسریاں اور نیز اور حرام چیزیں جو ہیں نہ آنی چاہییں کیونکہ یہ سب کھیل تماشے ہیں۔ جب تالی بجانے کی ممانعت ہے تو بانسری کی منزد ہوگی۔ پھر فرمایا کہ اگر کوئی شخص کسی مقام سے گرے تو شروع میں گرے۔ اور اگر یہاں سے بھی گر گیا تو پھر اُسکا ٹھکانا نہیں۔ پھر فرمایا کہ جو اہل سماع اور صاحب درد ہیں اُنھیں قوال کے صرف ایک شعر پر رقت طاری ہو جاتی ہے اور جو لوگ درد و ذوق نہیں رکھتے اُنھیں خواہ کتنی ہی بانسریاں ہوں کچھ اثر نہیں ہوتا۔ پھر فرمایا کہ جب کبھی میں نے سماع سُنا مجھے خرقۂ شیخ کی قسم ان سب باتوں کو میں نے حضرت شیخ کے اوصاف پر محمول کیا۔ چنانچہ ایک مرتبہ قوالوں نے جب یہ شعر پڑھا

خرام بدیں صفت صبا دا — کز چشم بت رسد گزندے

یہ سُن کر مجھے حضرت شیخ قدس سرہٗ کے اوصاف حمیدہ اور اخلاق پسندیدہ یاد آگئے اور اسی شعر کی بار بار تکرار کرواتا رہا۔

آں مطرب از کجاست کہ برگفت نام دوست — تا جان و جامہ بدہم و کنم بتمام دوست

دل زندہ می شود بہ اُمید وفائے یار — جاں رقص می کند بہ سماع کلام دوست

ہر کو فتاد دست زشربت بجام دوست　　تا نغمِ صور باز نہ آید بہ خویشتن

ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ مومن کے دل کو ستانا اللہ تعالیٰ کو ستانا ہے۔ پس لے درویش مومن وہ شخص ہے کہ اگر وہ مشرق میں ہے اور مغرب میں ایک مومن کے پاؤں میں کانٹا چبھے تو اسکو یہاں درد محسوس ہو۔

آپ نے فرمایا کہ درویش کو پردہ پوش ہونا چاہیے۔ پردہ پوشی سب عبادتوں سے افضل ہے۔ اے درویش واضح رہنے کہ جہان میں کوئی شخص سعادت سے خالی نہیں۔ جو یہاں آیا ہے اُس میں کچھ نہ کچھ دینی یا دنیوی سعادت ضرور موجود ہے۔ لیکن خوش وقت وہ لوگ ہیں جن میں دونوں ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ انبیاء و اولیاء سے اگر سہواً خدمت بجالانے میں کوئی تقصیر ہو جاتی ہے تو اسکے کفارہ میں وہ بکثرت گریہ وزاری کرتے ہیں۔ پس لے درویش لوگوں کو ہر حالت میں خوف و اُمید رکھنی چاہیے اور خوف سے تو کسی حالت میں خالی نہیں رہنا چاہیے۔ اے درویش راہ سلوک میں کامل وہی مرد ہے کہ دوست کے عالم انوار سے جو کچھ اُس پر ظاہر ہو افشا نہ کرے۔ مرد وہی ہے جو ازل و ابد کے دریا پی کر بھی ھل من مزید ہی پکارتا رہے۔

آپ نے فرمایا کہ توبہ کرنے والا متقی کے برابر ہوتا ہے۔ جس نے گناہ اور نافرمانیاں کی ہوں اور اُن نافرمانیوں سے حظ اُٹھایا ہو جب وہ توبہ کرکے طاعت کرے گا تو اُسے طاعت میں بھی حظ آئے گا۔ ممکن ہے کہ راحت طاعت کی ایک چنگاری اُسکے نافرمانیوں کے سارے کھلیان کو جلادے۔

ایک مرتبہ تزکیۂ نفس کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی آپ نے فرمایا کہ مرد میں چار چیزوں سے کمال پیدا ہوتا ہے۔ کم کھانا۔ کم بولنا۔ لوگوں سے کم میل جول رکھنا کم سونا۔

آپ نے فرمایا کہ جب تک دل میں دنیا کی محبت رہے گی ورد و وظیفے کچھ فائدہ نہ دیں گے اسلیے دنیا ترک کر دینا چاہیے۔ پھر فرمایا کہ ترک دنیا سے یہ مراد نہیں ہے کہ انسان اپنے تئیں ننگا رکھے، لنگوٹا باندھ کر بیٹھ جائے۔ بلکہ لباس بھی پہنے اور کھائے بھی، لیکن جو کچھ اُسے ملے اُسکی طرف راغب نہ ہو اور اُس سے دل نہ لگائے۔ فرمایا کہ مرد کو ہمت بلند رکھنی چاہیے اور دنیا دی آلائشوں میں پھنسنا نہ چاہیے۔ حرص و شہوت نفس ترک کر دینی چاہیے۔

ہر لحظہ زشہوتے کہ داری برخیز　　تا بنشیند ہزار شاہ در پیش

جب کسی ادنیٰ چیز کو بندہ خدا کے واسطے چھوڑتا ہے تو اُس سے شریف تر چیز ضرور ملتی ہے۔ خدا کے لیے اگر ترک دنیا کریگا تو سمجھ لینا چاہیے کہ کیا کچھ ملیگا۔ آدمی کا حوصلہ وسیع ہونا چاہیے تاکہ اسرار الٰہی کے برداشت

کرنے کی قابلیت اُس میں پیدا ہو۔

آپ نے فرمایا کہ سالک جبتک سلوک میں ہے حصول کمال کا اُمیدوار رہتا ہے۔ بعدازاں فرمایا کہ ایک سالک ہوتا ہے ایک واقف اور ایک راجع۔ سالک کی طاعت میں جب فتور آتا ہے تو وقفہ پڑتا ہے اور ذوق رُک جاتا ہے، اسلیے چاہیے کہ فوراً توبہ کرلے۔ اگر توبہ نہ کریگا تو رجعت کا اندیشہ ہے۔ پھر فرمایا اس راہ کی لغزش سات قسم کی ہوتی ہے، اعراض، حجاب تفاصل، سلب مزید، سلب قدیم، تسلی اور عداوت۔ عاشق کو چاہیے کہ فوراً معافی مانگ لے، ورنہ اعراض حجاب سے بدل جائے گا وقس علی ہذا حتیٰ کہ محبت دشمنی سے بدل جائیگی نعوذ باللہ منہا۔ آپ نے فرمایا اول خطرہ دل میں پیدا ہوتا ہے۔ پھر عزیمت پھر فعل ہے۔ عوام سے جب تک ارتکاب فعل نہ ہو مواخذہ نہیں کیا جاتا، لیکن خواص سے خطرہ کا بھی مواخذہ کرتے ہیں۔ پس ضرور ہے کہ ہر حال میں اللہ کی طرف رجوع کرے۔ سب اُسی کے بنائے ہوئے ہیں۔ ہر حال میں اُسی کی پناہ ڈھونڈھنی چاہیے۔ آپ نے فرمایا زندگی اس کا نام ہے کہ درویش ذکر حق میں مشغول رہے۔ آپ نے فرمایا کہ مرد کے لیے کشف وکرامات بمنزلۂ حجاب ہیں۔ اگر کبھی اُن سے کچھ ظاہر ہو جاتا ہے تو سُکر کی وجہ سے۔

ایک روز صبر و رضا کے بارے میں گفتگو شروع ہوئی۔ آپ نے فرمایا کہ صبر اسکا نام ہے کہ جب بندہ کو کوئی خلاف طبع امر ناحق ہو تو اُسکی شکایت نہ کرے۔ اور رضا اس بات کا نام ہے کہ اگر مصیبت سے کسی طرح کی کراہیت نہ کرے اور ایسا معلوم ہو کہ گویا اُس پر کوئی مصیبت ہی نہیں نازل ہوئی۔ ایک مرتبہ ارشاد ہوا کہ دعا کے وقت نہ گناہوں کا خیال دل میں لانا چاہیے اور نہ عبادت و طاعت کا۔ گناہ کے خیال سے دعا کے ایقان میں سستی ہوتی ہے۔ اُسوقت صرف اللہ جل شانہٗ کی رحمت پر نظر رکھنی چاہیے اور یہ یقین رکھنا چاہیے کہ یہ دعا ضرور قبول ہو جائے گی۔

ایک بار اطوار کے بارے میں گفتگو ہوئی آپ نے فرمایا اطوار تین طرح کے ہوتے ہیں۔ حسی، عقلی، قدسی۔ حسی جیسے سونگھنا، کھانا وغیرہ۔ عقلی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک کسبی دوسرے بدیہی لیکن جو عالم قدس میں پہونچ چکا ہوتا ہے وہ کسبی کو بھی بدیہی جانتا ہے۔ فرمایا کہ روح جب طاقتور ہوتی ہے اور کمال کو پہونچ جاتی ہے تو قلب کو جذب کر لیتی ہے اور قلب جب قوی ہوتا ہے تو قالب کو جذب کرتا ہے۔ پس جو بات دل پر اثر کرتی ہے اُس کا اثر قالب پر بھی ہوتا ہے۔ آپ کا قول ہے کہ مومن کبھی ناپاک نہیں ہوتا۔ فرمایا کہ اصلی کام یاد حق ہے اور اسکے سوا جو کچھ ہے سب یاد حق کا مانع ہے۔ ایک مرتبہ فرمایا حق تعالیٰ پر بھروسہ کرلینا چاہیے اور اسکے سوا کسی سے اُمید نہ رکھنی چاہیے۔ پھر فرمایا کہ ایمان اُس وقت تک کامل نہیں ہوتا جب تک اُسکی نگاہ میں تمام

خلقت مجھ سے بھی کم حقیقت نہ معلوم ہو۔

ایک مرتبہ فرمایا کہ خلقت کی چار قسمیں ہیں۔ ایک وہ جنکا ظاہر آراستہ اور باطن خراب ہوتا ہے۔ دوسرے وہ جنکا ظاہر خراب اور باطن آراستہ ہوتا ہے۔ تیسرے وہ جنکا ظاہر و باطن دونوں خراب ہوتے ہیں۔ چوتھے وہ جنکے ظاہر و باطن دونوں آراستہ ہوتے ہیں۔ جن لوگوں کا ظاہر آراستہ اور باطن خراب ہوتا ہے وہ متعبد ہیں جو طاعت تو بہت کرتے ہیں مگر اُنکے دل دنیا میں مشغول ہوتے ہیں۔ جنکا ظاہر خراب و باطن آراستہ ہوتا ہے وہ مجذوب ہوتے ہیں۔ جنکا ظاہر و باطن دونوں خراب ہوتے ہیں وہ عالم (ظاہر) ہوتے ہیں۔ اور جنکا ظاہر و باطن دونوں آراستہ ہوتا ہے وہ (سچے) مشائخ ہوتے ہیں۔

آپ نے فرمایا کہ شعر ایک لطیف چیز ہے۔ لیکن جب تعریف میں کہا جائے اور کہیں پیش کیا جائے تو سخت بے لطف ہو جاتا ہے۔ اسی طرح علم بھی بہت شریف چیز ہے لیکن اُسے حاصل کرکے دَر دَر کا چکر لگایا جائے تو اسکی عزت جاتی رہتی ہے۔

ایک مرتبہ ارشاد ہوا کہ سعادت کے قفل کی کنجیاں کئی ایک ہیں لیکن یہ کوئی نہیں جانتا کہ کس کنجی سے کھلے گا۔ اگر ایک سے نہ کھلے تو اس اُمید میں کہ دوسری سے کھل جائے گا تمام کنجیوں سے کھولنا چاہیے۔

ایک مرتبہ فرمایا کہ جو شخص پیر کا ہاتھ پکڑتا ہے وہ گویا خدا سے عہد کرتا ہے۔ اُسے چاہیے کہ اپنے عہد پر ثابت قدم رہے ورنہ بیعت سے کیا فائدہ؟

ایک مرتبہ ارشاد ہوا کہ ولایت دو طرح کی ہے ایک ولایت ایمان دوسری ولایت احسان۔ ایمان کی ولایت ہر مومن کو حاصل ہے اللہ ولی الذین آمنوا۔ مگر ولایت احسان یہ ہے کہ کسی کو کشف و کرامت یا اور کوئی اعلیٰ مرتبہ حاصل ہو۔

عاشقا خیز و گام در رہ زن — عشق خواہی بہ عافیت آہ زن
جاں در انداز در او جاناں گیر — برتر از کائنات خرگہ زن
جاں بکف کردہ در سراچۂ عشق — لیس فی جبتی سوی اللہ زن
مصر خواہی چو یوسفِ کنعاں — خیمۂ اعتکاف در چہ زن

"عبداللہ"

(الناظر، جون ۱۹۲۵ء)

سقراط

(۱)

گرچہ ہر قرنے سخن آرے بود
لیک گفت سابقان یارے بود

لِکُلِّ قومٍ ھادٍ۔ کیا اس سے کوئی انکار کر سکتا ہے؟ ہرگز نہین۔ اس جواب سے میری ہمت بندھتی ہے کہ سطور ذیل مین یونان کے ہادیٔ اعظم کے کچھ حالات پیش کرون تاکہ اُس شخص کی اک دُھندلی سی تصویر آپ کے سامنے آجائے، جس کا تیئیس[۲۳] چوبیس[۲۴] سو سال سے دنیا مین ڈنکا بج رہا ہے، اور کلام ربانی کی حقانیت ہویدا ہو سکے۔

ابھی حضرت مسیح علیہ السلام کو ظاہر ہونے کے لیے چار سو انہتر سال سے کچھ زیادہ باقی تھے کہ یونان کے شہر ایتھنس (Athens) مین ایک بُت تراش سفرونسکوس (Sophroniscus) کے گھر مین ایک لڑکا پیدا ہوتا ہے جس کے شان مین ڈلفی (Delphi) کی زبان غیب یہ اشارہ کرتی ہے کہ اس سے زیادہ دانشمند یونان مین نہین پیدا ہوا۔ اس عجیب و غریب لڑکے کے بچپن کا حال پردۂ خفا مین ہے۔ صحیح طور پر یہ نہین کہا جا سکتا کہ اسکے اخلاقی اور ذہنی ترقی کے اسباب کیا ہوے۔

اسی گمنامی مین اُسے تقریباً چالیس سال گذر جاتے ہین کہ محاصرۂ پوٹیڈیا (Potidia) کا معرکہ پیش آتا ہے جسمین اُسکے جوہر کسی قدر ظاہر ہوتے ہین۔

سُقراط ظاہری شکل و صورت کے لحاظ سے کچھ وجیہہ نہ تھا۔ چھوٹا قد۔ موٹی گردن۔ جسم کسی قدر بھنی۔ آنکھین اُبھری ہوئی۔ ناک اوپر کو چپٹی دبی ہوئی اور نتھنے کشادہ۔ دہانہ بڑا۔ ہونٹھ بھدے۔ صورت دیکھنے سے ایک شہوت پرست احمق معلوم ہوتا تھا۔ مگر اندرونی صفات یہ بیان کیے گئے ہین۔ اسقدر

پرہیزگار تھا کہ بغیر عقل سے استخارہ کیے کوئی کام نہین کرتا تھا۔ اس قدر انصاف پسند تھا کہ کبھی کسی شخص کو نقصان نہین پہونچایا۔ اسقدر اعتدال پسند تھا کہ امر حق پر کبھی عیش و راحت کو ترجیح نہین دی۔ اسقدر دانشمند تھا کہ حق و باطل کی تمیز مین اُس نے کبھی غلطی نہ کی۔

یہ زمانہ یونان کے بڑے صاحب کمالون کا گذرا ہی۔ ۴۶۰ سنہ ق م و ۴۲۰ سنہ ق م مین نظم، تاریخ، سنگتراشی اور فن تعمیر مین ایسے ایسے لوگ گذرے ہین جو آج تک مسلم الثبوت اُستاد کیے جاتے ہین۔ سوفوکلیز (Sophocles) ۴۹۵ سنہ ق م مین پیدا ہوتا ہی۔ یوری پائیڈیز (Euripides) ۴۸۰ سنہ ق م مین پیدا ہوتا ہی۔ اور سقراط سے سات سال قبل تقریباً ۴۰۶ سنہ ق م مین دونون عالم جاودانی کا سفر اختیار کرتے ہین۔ فی ڈیاس (Phidias) یونان کا مشہور بت تراش ۴۳۲ سنہ ق م مین اس عالم سے رخصت ہوتا ہی۔ پیرکلیز (Pericles) مشہور مدبر و مقرر ۴۲۹ سنہ ق م مین وفات پاتا ہی۔ تھوسی ڈائیڈیز (Thucydides) مشہور مورخ ۴۷۱ سنہ ق م مین پیدا ہوتا ہی اور ۴۰۱ سنہ ق م و ۳۹۵ سنہ ق م کے مابین دنیا سے اُٹھ جاتا ہی۔ اقطینوس (Ictinus) اپنے مشہور پارتھینان (Parthenon) کے بت کو ۴۳۸ سنہ ق م مین تکمیل کو پہونچاتا ہی۔ غرض یہ ایسا زمانہ تھا جسمین سقراط پیدا ہوتا ہی اور اپنا بچپن اور جوانی بسر کرتا ہی۔ خود اتھینس اس وقت ہر قسم کے صاحبان فن کا اکھاڑہ بنا ہوا تھا۔ یہان رہنا ایک طرح کی تعلیم و تربیت گاہ مین رہنا تھا۔ سقراط خود کہتا ہی کہ اتھینس والے اپنی عقل اور قوت ذہنی کے لحاظ سے بہت مشہور تھے۔ ملکی حکومت کی باگ ایک انجمن کے ہاتھ مین تھی جسکی رکنیت اتھینس (Athens) کے ہر باشندے کو حاصل تھی۔ اور ارکین کا اس انجمن مین حاضر ہونا قانوناً لازم کر دیا گیا تھا۔ یہ حکومت نہ تو وکیلانہ تھی اور نہ کسی وزیر کے ہاتھ کوئی ذمہ داری کا کام تھا۔ سلطنت اتھینس (Athens) پر خود اُس شہر کے لوگ براہ راست حکومت کرتے تھے۔ ہر باشندہ شہر قانونی بحثین سنتا اور ملکی انتظامات مین دخل دیتا تھا۔ اور جنگ و صلح کے مسائل کے طے کرنے مین حصہ لیا کرتا تھا۔ فریقین مقدمہ کی بحثین سنا کرتا تھا جس سے اُن کی ذہانت اور نظر مین وسعت پیدا ہوتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہل اتھینس (Athens) کی جدت ذہن و ذکاوت کا معیار ایسا بلند ہو گیا کہ کسی دوسری سلطنت مین اُس کی نظیر نہین مل سکتی تھی۔

یہ وہ حالات ہین جنمین سقراط کی زندگی کے پچاس برس بسر ہوے۔ زینوفن (Xenophon)

کہتا ہے کہ وہ اکثر پراڈکیس (Prodicus) کی داستان ہرقل بیان کیا کرتا تھا اور حکمائے سلف جو علم کا اندوختہ چھوڑ گئے تھے وہ بھی اپنے دوستوں کے ہمراہ اوسکے مطالعہ مین منہمک رہا کرتا تھا حکمائے سبعہ کے مقولے مثلاً اعرف نفسک وغیرہ اوسکے ذہن مین جگہ حاصل کرتے جاتے تھے۔ اُسے ریاضی۔ طبیعات۔ حکمت۔ ہیئت اور ہندسہ پر خاصا عبور حاصل تھا۔ اپنے پیش رو حکما کے مسائل ہرکلیٹس (Heraclitus) پارمنی ڈیز (Parmenides) اور بالخصوص انکساگورس (Anaxagoras) کے علوم اُس کے خاص مطالعہ مین تھے۔ یہ نہین کہا جا سکتا کہ کسی کے سامنے سقراط نے زانوے شاگردی تہ کیا۔ ۴۳۱؁ قم و ۴۲۹؁ قم کے درمیانی زمانہ مین ہم اُس شخص کو پایڈیا (Potidaea) کے محاصرہ مین مصروف پاتے ہین۔ اور دیکھتے ہین کہ بھوک پیاس اور جاڑے کی تکلیف خاصکر تھریس (Thrace) کے جاڑے کے سخت مصائب برداشت کرنے مین سقراط کا کوئی مقابلہ نہین کرسکا۔ السی بایڈیز (Alcibiades) کی جان اُسی معرکہ مین نہایت بہادری کے ساتھ بچاتا ہے۔ اور جرات و بہادری کا انعام بھی اُسی کو دلواتا ہے۔ ۴۳۱؁ قم مین جنگ ہاے پیلوپنیسس (Peloponnisus) رونما ہوتی ہین اور ۴۲۴؁ قم مین معرکہ ڈلیوم (Dalium) مین ایتھنس (Athens) کو اہل تھیبا (Theba) کے ہاتھ سے ایک شکست فاش نصیب ہوتی ہے لیکن سقراط اور لاشیز (Laches) اور چند لوگ ایسے نظر آتے ہین جو ہمت نہین ہارتے۔ بن بعد افواج پیلوپنیس (Peloponnisus) کے مقابلہ مین میدان امفی پولس (Amphipolis) مین سقراط پھر شریک جنگ ہوتا ہے اور کارہاے نمایان کرتا ہے۔

جنگ امفی پولس (Amphipolis) کے بعد سوا برس تک سقراط گمنامی اور خاموشی مین بسر کرتا ہے۔ اور یہ نہین معلوم ہوتا کہ وہ کہان اور کس حال مین ہے۔ ۴۰۶؁ قم مین اہالی اتھینس (Athens) ولیسی ڈمونیون (Lacedemonian) مین بحری لڑائی آرگی نوسا (Arginusae) پر ہوتی ہے جسمین اول الذکر کو فتح ہوتی ہے۔ جنگ کے بعد، اتھینی (Athenian) سرداران فوج اپنے مقتولین کی لاشون کو لیجانے اور اپنے بیکار شدہ بعض چھوٹے جہازون کے لوگون کو بچانے سے قاصر رہ جاتے ہین اس سے اہل اتھینس کو غصہ آتا ہے، مردون کی رسمہاے بعد الموت بہت شان و شوکت سے ادا کی جاتی ہین۔ اور سرداران مذکور کو فوراً واپس طلب کیا جاتا ہے کہ اُن پر غفلت کا مقدمہ قائم کیا جائے۔

اُن کا یہ جواب کوئی تسلیم نہین کرتا کہ اُنھون نے اپنے ماتحت افسرون کو ضروری احکام دیدیے تھے لیکن ایسا طوفان آیا کہ اُن احکام کی تعمیل نہو سکی۔ انجمن مین بحث مباحثہ ملتوی ہو جاتا ہی۔ اور اس پر غور کیا جاتا ہی کہ اُن سردارون پر کس طرح مقدمہ چلایا جائے۔ اہل اتھنس (Athens) کی یہ راے ہوتی ہی کہ الزام اور جوابدہی دونون کو سُن کر فوراً سب کی راے لینا چاہیے تاکہ یہ آٹھون سردار سب چھوڑ دیے جائین یا سزا پائین۔ یہ رزولیوشن یہی نہین کہ بے انسانی پر مبنی تھا بلکہ خلاف قانون بھی تھا اس لیے کہ معمولی مقدمہ چلانے کے بجاے عوام کی راے لینا پسند کیا گیا تھا۔ اور اُس قانون کے خلاف تھا جسکے روسے ہر شخص کے متعلق علٰحدہ علٰحدہ تجویز صادر کرنی لازمی تھی۔ اس وقت سقراط بھی سنٹ (Senate) کا رکن تھا۔ اس سنٹ (Senate) مین پانچ سو اہل شہر تھے جو بذریعہ قرعہ اندازی ایک دن کے لے منتخب کیے گئے تھے۔ اور ہر روز ایک نیا میر مجلس مقرر ہوا کرتا تھا۔ چونکہ رزولیوشن خلاف قانون تھا اس لیے اگر کبھی میر مجلس نے مخالفت کی تو اُسے دھمکا کر چپ کر دیا گیا۔ لیکن سقراط ایسا نہ تھا کہ حق کی جانبداری مین کسی کی دھمکی مین آجاتا۔ اُس نے صاف کہدیا کہ مین قانون اور انصاف کی جانبداری مین خطرون کا مقابلہ کرنا اپنا فرض سمجھتا ہون۔ اور عوام الناس کی غیر منصفانہ تجویز مین اُن کا ہمزبان نہین ہو سکتا لیکن سقراط چونکہ صرف ایک ہی روز کے لیے میر مجلس ہوا تھا اس لیے اُس روز یہ کارروائی ملتوی کر دیگئی اور دوسرے روز ایک کمزور طبیعت شخص کو میر مجلس بنا کر سرداران فوج کے قتل کا حکم لے لیا گیا۔ اور اُنھین قتل کر دیا گیا۔

دو برس بعد ۴۰۵ ق م مین اہل اتھنس (Athens) کو لیسی ڈمونیون (Lacedemonian) فوج نے شکست دی اور شہر پر دشمنون کا قبضہ اور اتھنس (Athens) کے جمہوری نظام کا خاتمہ ہو گیا۔ اُس کے بجاے اسپارٹی جنرل لسانڈر (Lysander) کی ماتحتی مین تیس منتخب اشخاص کی حکومت قائم ہوئی۔ اور طرح طرح کے مظالم شروع ہوے۔ لوگون کو اختلاف راے اور دولت و حشمت کی وجہ سے بیدریغ قتل کیا جاتا تھا۔ ایک شخص مسمی لیان (Leon) کو بھی حکومت نے اسی غرض کے لیے طلب کیا۔ اور پانچ آدمیون کو جنمین ایک سقراط بھی تھا یہ حکم دیا کہ لیان (Leon) کو پکڑ لائین۔ چار آدمیون نے تعمیل کی مگر سقراط نے کسی خطرہ کی پروا نہ کی اور اپنے گھر چلا گیا۔ اس واقعہ کے متعلق وہ خود کہتا ہی کہ مین نے زبان سے نہین بلکہ اپنے فعل سے یہ دکھا دیا

کہ مجھے موت کی ذرہ برابر بھی پروا نہین۔ لیکن اِس کا مجھے بہت خیال ہے کہ میرے ہاتھ سے کوئی خطا سرزد نہو جائے۔" اِس حکم عدولی سے ناخوش ہوکر کری ٹیاس (Crileas) اور اُس کے شرکا حکومت نے اُسے طلب کر کے حکم دیا کہ ملک کے نوجوانون سے قطعاً باتین نہ کیا کرو ورنہ سزاے موت دی جائیگی۔

سقراط نے زان تھیپ (Xanthipe) کے ساتھ شادی کی تھی اِس کے تین لڑکے ہوے۔ لمپراکلیز (Lamprocles) سوفرانسکوس (Sophronisous) اور منکسی نوس (Menexenus)۔ زان تھیپ (Xanthipe) بڑی بدمزاج عورت تھی لیکن سقراط نہایت تحمل کے ساتھ اُس سے درگذر کرتا تھا مگر کچھ خوش نہ تھا۔ اُس کا قول تھا کہ "خدا نے مجھے لوگون سے محاسبہ کرنے کے لیے حکم فرمایا ہے۔ مین کسی طرح خاموش نہین رہ سکتا۔ کیونکہ اگر چپ رہون تو خدا کی نافرمانی کا مرتکب ہون گا"۔ یہ خیال اُسکے دل مین اِس قدر سختی سے جاگزین تھا کہ لوگون کی مخالفت اور نفرت کوئی شے اُسے اِس جادہ سے منحرف نہین کر سکتی تھی۔ یہ ہم نہین بتا سکتے کہ کس وقت سے اُس نے لوگون کا محاسبہ کرنا شروع کیا۔ اور اِس آلٰہی فرض کی انجام دہی اپنے سر لی۔ لیکن ۴۲۳ ق م مین اپنی وفات سے چوبیس سال قبل اُس کو بہ حیثیت نئے خیالات پیدا کرنے والے کے خاص شہرت حاصل ہو چکی تھی۔ اور یہی قیاس ہو سکتا ہے کہ اس سال کے قبل ہی سقراط نے اپنا آلٰہی فرض ادا کرنا شروع کر دیا ہو گا۔

محاصرۂ پالیڈیا (Polidea) ۴۳۲ ق م لغایتہ ۴۲۹ ق م سے پہلے خود اُس نے اپنا محاسبہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ اُس زمانہ مین سوفسطائیون کے تعلیمات کا بہت چرچا تھا۔ مگر اُس کی تعلیم اِس کے بھی خلاف تھی۔ اُس کی تعلیم کا یہ طریقہ تھا کہ وہ نہ تو کِسی سے کوئی اُجرت لیتا تھا اور نہ طلبا کو بٹھا کر سبق دیا کرتا تھا۔ اس کی تمام عمر احتساب مین گذری۔ جو کوئی اُس سے مخاطب ہوتا اُس سے فوراً سوالات کرنے اور محاسبہ کرنے کے لیے آمادہ ہو جاتا۔ کبھی وہ السی بائیڈیز (Alcibiades) اگارجیاس (Gorgeas) پروٹوگورس (Protogoras) سے باتین کرتا نظر آتا تھا۔ اور کبھی ایک معمولی مزدور سے۔ غرضکہ وہ ایسے مقامات پر نظر آیا کرتا تھا، جہان دیکھتا کہ لوگ بہت جمع ہوا کرتے ہین اور شہر سے بہت کم باہر جاتا۔ وہ کہتا ہے کہ "مین علم کا شائق ہون جو شہر ہی مین آدمیون سے مجھے مِل سکتا ہے۔ کھیت اور درخت مجھے کچھ نہین سکھا سکتے"۔ اُس نے اپنی تمام توجہ خداے بزرگ و برتر کی خدمت مین منہمک کر دی تھی۔

اور اپنے خانگی معاملات تک سے غافل تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ افلاس نے اُسے آگھیرا اور جس وقت اس مقدمہ کے زمانہ مین اُسے روپیہ کی ضرورت ہوئی تو ایک نقرئی سکہ مینا (معادل تقریباً ۱۱؎ سکہ عثمانیہ) سے زیادہ اُسکے پاس نہ تھا۔ افلاطون اپنے استاد کی ظاہری حالت کو بیان کرکے کہتا ہے۔

"مین نہین جانتا کہ تم مین سے کسی نے بھی ایسی ربانی صورتین دیکھی ہونگی، جو اُس کے اندر تھین مین نے انہین دیکھا ہے۔ وہ اس طرح حسین سونے کی طرح جگمگاتی ہوئی علوی الصفت عجیب و غریب ہین کہ جس طرح خدائی آواز کو سن کر لوگ اطاعت کے لیے جھک جاتے ہین، سقراط کے احکام کو بھی سُنکر جھک جاتے تھے"۔

کبھی کسی شخص نے اُسے شراب پیتے ہوئے نہین دیکھا۔ بڑے بڑے مصائب برداشت کرنیکی اُس مین غیر معمولی طاقت تھی۔ سخت سے سخت جاڑے مین بھی جب تمام عالم غلیظ کہرے سے گھرا ہوتا اور لوگ سمور پہنے ہوئے اچھی طرح اوڑھ لپیٹ کر نکلتے تھے، سقراط اپنے معمولی کپڑون مین نکلتا تھا۔ اور اس طرح چلتا تھا کہ گویا سردی کا کوئی اثر اُس پر نہین ہے۔ وہ ننگے پیر برف پر آہستہ آہستہ چلتا تھا۔ ایک مرتبہ لوگون نے دیکھا کہ ایک مقام پر کھڑا عالم فکر مین مستغرق ہے۔ دوپہر کو بھی اسی طرح نظر آیا۔ لوگ کہتے تھے کہ سقراط کو دیکھو صبح سے اسی طرح کھڑا سوچ رہا ہے۔ گرمی کا موسم تھا۔ رات ہوگئی۔ بعض لوگ اُس کے قریب آکر سوگئے۔ اُنھون نے دیکھا کہ سقراط اُسی طرح بُت بنا کھڑا ہوا ہے حتیٰ کہ تمام رات گذر گئی۔ اور جب آفتاب عالمتاب برآمد ہوا اُس وقت اُسے ہوش آیا! اُس کی مشکل حل ہوگئی اور اُس نے وہان سے جنبش کی! افلاطون جنگ ڈلیوم (Dalium) کی ہزیمت کے وقت سقراط کا استقلال اس طرح بیان کرتا ہے:۔

"سقراط کو اُس وقت دیکھنا چاہیے تھا جبکہ ہماری فوج جنگ ڈلیوم (Dalium) مین شکست کھا کر منتشر ہوگئی۔ یہ ایک دیکھنے کے قابل منظر تھا۔ مین اُس وقت رسالہ کے ساتھ تھا اور وہ پیدل تھا اور سرتاپا لوہے مین غرق تھا۔ جب ہماری فوج کو کامل شکست ہوئی تو سقراط اور لیشیز (Laches) دونون ساتھ ساتھ ہزیمت کرتے نظر آئے۔ مین اتفاق سے وہان آگیا اور اُن دونون کو دیکھ کر سلام کیا اور اُن کے ساتھ ہولیا۔ چونکہ مین گھوڑے پر سوار تھا اس لیے اپنی حالت کے متعلق زیادہ تردد مین نہ تھا۔ یہ موقع پائیڈیا (Potidia) کے میدان سے بھی زیادہ نازک تھا۔ ایسی حالت مین سقراط کے طور و انداز مین ایک ایسا

دلفریب منظر مجھے نظر آرہا تھا جو استقلال طبع اور جرأت میں لیشیز (Laches) سے بدرجہا زیادہ بلند مرتبہ معلوم ہوتا تھا۔ وہ ایک شاہانہ انداز سے طمانیت قلب کے ساتھ قدم اُٹھاتا جاتا اور ہر دو جانب دوست اور دشمن دونون پر اطمینان سے نگاہ ڈالتا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ دور سے دیکھکر لوگ یہ سمجھتے تھے کہ جو کوئی اسپر حملہ کا ارادہ کرے گا اُسے ایک سخت مقابلہ کرنا ہوگا۔ جو لوگ ہزیمت کے وقت منتشر ہو گئے تھے اُن کا دشمنون نے تعاقب کیا اور وہ قتل ہوے۔ لیکن یہ اور اُس کے ساتھی امن وامان کے ساتھ واپس آئے۔ جو لوگ سقراط کی طرح شکست کے وقت طور وانداز ظاہر کرتے ہین انھین لوگ ہاتھ لگاتے ہوے جھجکتے ہین۔"

اِس کے بعد افلاطون تمام بڑے بڑے لوگون کا نام لیکر کہتا ہو کہ اُن سے اور سقراط سے کوئی مقابلہ نہین ہو سکتا اِس مین ایک غیر معمولی شے تھی جو کسی مین نہ تھی۔ خود اُس کی ذات اور اُس کی تقریر اور مقولے ایسے نہ تھے کہ انسان سے اُن کا مقابلہ کیا جا سکے۔

(۲)

۳۹۹ ق م مین سقراط پر یہ مقدمہ قایم کیا گیا کہ شہر کے نوجوانون کو خراب کرتا اور ایتھنز (Athens) کے دیوتاؤن کو نہین مانتا ہو۔ پانسو ایک آدمیون کا جلسہ عدالت کے لیے بیٹھتا ہو اِس مین سے دوسو اکیاسی (۲۸۱) اُس کو مجرم قرار دیتے ہین اور دوسو بیس (۲۲۰) اُس کو بری کرتے ہین۔ کثرت رائے پر فیصلہ ہوتا ہو۔ اور سزاے موت سنائی جاتی ہو مگر ایک مذہبی رسم کی وجہ سے تعمیل مین تاخیر واقع ہوتی ہو اور تیس روز تک قید خانہ مین رہنا پڑتا ہو۔ اُس کے دوست احباب سب التجا کرتے ہین کہ بھاگ جائے۔ مگر وہ نہین سنتا اور جب موت کا وقت قریب آتا ہو تو خوشی خوشی زہر کا پیالہ ہاتھ مین لیکر پی جاتا ہو۔

ایتھنز (Athens) والون کی انجمن کے سامنے جو تقریر اُس نے اپنے بچاؤ مین کی ہے اُس مین کہا:-

"میرے دوستو اگر تم سمجھتے ہو کہ ایک شخص جس کی کچھ بھی قدر وقیمت ہو ایک کام مین ہاتھ ڈالتا اور پھر موت سے ڈرا جاتا ہو یا اِس خیال کے علاوہ کہ آیا وہ حق پر عامل ہو یا باطل پر کوئی اور خیال کرتا ہے تو میرے دوستو تم غلطی کرتے ہو۔ مین اپنا تمام وقت تمھارے بڑھون

اور جوانون کے پاس جانے اور انھین اس بات پر مائل کرنے کے لیے صرف کرتا ہون کہ وہ لوگ روحانی تکمیل کو اپنا مقصد خاص بنائین اور جب تک یہ مقصد حاصل نہ ہو جائے اپنے جسمون اور مال و دولت کی طرف توجہ نہ کرین۔ یہ بھی کہتا ہون کہ نیکی دولت کے ذریعہ سے نہین حاصل ہوتی بلکہ دولت اور تمام نعمتین جو انسان حاصل کرتا ہے نیکی سے پیدا ہوتی ہین۔"

کرائٹو (Crito) جب مجلس مین آکر بھاگ جانے کی راے دیتا ہے تو یہ جواب ملتا ہے:-

"ہماری رہنمائی عقل سے ہوا کرتی ہے اور عقل یہ کہتی ہے کہ ہمین صرف ایک سوال پر غور کرنا چاہیے کہ اگر مین بھاگ جاؤن تو آیا مین حق پر ہون گا یا باطل پر اور اگر ہم یہ دیکھین کہ بھاگنے مین غلطی اور باطل کا اتباع ہے تو ہمین موت کی کچھ پروا نہ کرنی چاہیے۔"

اُس زمانہ کے حالات وقت اور نیز اخلاقی حالت پر اگر صرف ایک سرسری نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ جو آئین لوگ قائم کرتے تھے وہ ویسی ہی ناقص ہوا کرتی تھین جیسے کہ خود وہ حالات ناقص اور اصلاح طلب تھے۔ ان حالات کی وجہ سے اُسے بےچینی سی پیدا ہوتی تھی اور ساتھ ہی ساتھ یہ خیال بھی لگا ہوا تھا کہ خداے جل وعلیٰ نے لوگون کی اصلاح کا فرض اُس کے سپرد کیا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ ان غلط کاریون اور رسوم پرستیون سے جن پر سوفسطائی اپنے نظام کی بنیاد قائم کرتے تھے، وہ رو براہ نہین ہو سکتے۔ باین ہمہ اصلاح کے فرض سے وہ کبھی نہین پیچھے رہا، گو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اُسے موت کا سامنا کرنا پڑا جس اصول پر اُس کا مسلۂ اصلاح مبنی تھا وہ صرف ایک جملہ مین ادا ہو سکتا ہے یعنی اُس حق پر جسکی رہنما عقل ہو وہ انسان کے خیالات کی بنیاد قایم کرنا چاہتا تھا اور جو اصلاحات کہ جذبات جوش و خروش اور عادت کے تابع ہون اُنھین وہ نیکی اور خیر کا باعث قرار نہین دیتا تھا۔ اُس کی پوری تعلیم یہ تھی کہ "علم ہی نیکی اور خیر ہے" پس اگر علم خیر محض ہے تو جہالت شر محض کہی جائے گی۔ وہ خود کہتا ہے کہ اگر نوجوانون کے خراب کرنے کے جرم کا وہ واقعی مرتکب ہوا ہے تو نادانستگی اور جہالت کیوجہ سے ہوگا جب میلیٹوس (Meletus) اس پر بھی نوجوانون کو خراب کرنے کا الزام لگاتا ہے تو خود وہین جواب دیتا ہے کہ میلیٹوس (Meletus) تم جھوٹ بولتے ہو۔ تم خوب جانتے ہو کہ یا تو مین نوجوانون کو خراب ہی نہین کرتا یا اگر کرتا ہون تو بلا وجہ اور اپنی جہالت اور لاعلمی کی وجہ سے کرتا ہون گا۔ اور جس وقت مجھے یہ معلوم ہو گا کہ مین ایک جرم کا ارتکاب کر رہا ہون تو فوراً اُسے ترک کر دون گا۔ جو آدمی حق کا شناسا ہے اُسے ہمیشہ حق بات کرنی چاہیے۔ اور جو اُسے نہین جانتا وہ اسکا

حاصل ہی نہین ہو سکتا جب کسی فائق ترین شے کو ہم دیکھین تو ہمین اس سے محبت کرنی چاہیے۔

سقراط اپنے الزام دینے والون کی دو نوعین قائم کرتا ہو۔ پہلی نوع وہ ہو جو اُسے سالہا سال سے بے وجہ الزام دیتے رہے۔ مثلاً ارسطوفونس (Aristophanes) جس نے ایک ڈراما "ابر" (Cloud) لکھ کر اُس کی ہنسی اُڑانے کی کوشش کی تھی اور دوسرے میلیٹوس (Meletus) اور اُس کے ساتھی۔ پہلے وہ پہلی نوع کے لوگون کا جواب دیتا ہو۔ یہ لوگ اسے سوفسطائی اور طبیعی ہونے کا الزام دیتے ہین۔ وہ ان دونون کی مخصوصہ صفتین بیان کرتا ہو اور کہتا ہو کہ ان دونون قسم کے حکما مین سے وہ ایک بھی نہین ہو۔ اُسے لوگ اس لیے ناپسند کرتے ہین۔ کہ اس نے لوگون کے محاسبہ کرنے کا کام اپنے ذمہ لے لیا ہو۔ وہ کہتا ہو کہ مین علم نہین رکھتا لیکن یہ جانتا ہون کہ علم نہین رکھتا۔ اُس سے علم حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوتا ہو۔ لیکن وہ جس کسی کو ٹٹولتا اور آزماتا ہو کہ اس سے کچھ علم کا پتہ چلے۔ یہی پاتا ہو کہ وہ بھی اس کی طرح علم سے معرّیٰ ہو بلکہ باوجود علم سے عاری ہونے کے سمجھتا ہو کہ علم سے بہرہ واقعی رکھتا ہو۔ دوسرون مین اور اپنے مین وہ صرف یہی فرق دیکھتا ہو کہ لوگ نہین جانتے اور جانتے ہین کہ خوب جانتے ہین۔ اور وہ خود کو نہین جانتا۔ مگر یہ ضرور جانتا ہو کہ نہین جانتا۔ اسی بنا پر وہ ڈلفی کی غیبی زبان کا لوگون سے ذکر کرتا ہو کہ اگر اُس زمانہ مین کوئی عقلمند آدمی ہو تو وہ سقراط ہی ہو۔ میلیٹوس (Meletus) کی زبان سے اُسے جھٹلا دیتا ہو۔ ایک شخص اُس سے یہ کہتا ہو کہ کیا اپنی جان کو ایک ایسی زندگی کی خاطر جیسی کہ تم بسر کر رہے ہو جوکھون مین ڈالنا اچھی بات ہو۔ سقراط جواب دیتا ہو کہ دنیاوی سرداران فوج نے لڑائی کے میدانون مین جہان اُس کی جگہ قائم کر دی اُسے اُس نے کبھی نہین چھوڑا۔ پھر کیا جس جگہ خدا نے اُسے مامور کیا ہو وہان سے وہ بھاگ جائے۔ یہ نہین ہو سکتا۔ اس لیے کبھی ایسی شرط کے ساتھ جس کے رُو سے وہ لوگون سے محاسبہ کرنے سے باز رہے۔ وہ اپنی برأت نہین قبول کرنا چاہتا تھا۔ اہل ایتھنس (Athenians) کو پھر تنبیہ کرتا ہو اور سمجھاتا ہو کہ اُن کو اُس سے ناراض نہ ہونا چاہیے۔ بلکہ خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اُس نے اُن لوگون کے بیدار کرنے کے لیے اُسے بھیجا ہو۔ اگر وہ لوگ اُسے قتل کر ڈالین گے۔ تو اُس کا جانشین نہ مل سکے گا۔

سقراط کی تمام عمر لوگون کی خدمت گذاری مین بسر ہوئی وہ امور ملکی مین سوائے ایک مرتبہ کے کبھی نہین پڑا۔ اگر پڑتا تو مدتون پہلے لوگ اُسے قتل کر چکے ہوتے۔ اور جو کام وہ کر رہا تھا ادھورا رہ جاتا۔ وہ

انجمن تحقیقات کے سامنے علی رؤس الاشہاد کہتا ہے کہ کہان ہین وہ نوجوان لڑکے جنھین مین نے خراب کیا ہے
کیون وہ جوان اور سمجھدار ہونے کے بعد اب آکر مجھے الزام نہین دیتے؛ اور اگر وہ خود نہین آنا چاہتے تو ان کے
رشتہ دار ہی آئین۔ مگر وہ بھی نہین آتے تو سمجھ لو اس کی وجہ یہ ہے کہ سقراط حق بات بول رہا ہے اور اس کا الزام دہندہ
اینی ٹوس (Anitus) دروغ گو ہے۔ وہ ججون سے رحم وکرم کی استدعا نہین کرتا کیونکہ اس مین
اتھنس (Athens) کی ذلت ہے، ججون نے قانون کے مطابق عمل کرنے کا عہد وپیمان کر لیا ہے پھر
اگر وہ اُن سے رحم وکرم کا خواستگار ہو تو گویا نقض عہد پر آمادہ کرنے کا مجرم قرار پائے گا۔ اُس پر بیدینی کا الزام لگایا
جا رہا ہے مگر وہ اپنے تئین بیدین نہین جانتا اور ان الفاظ کے ساتھ وہ اپنی ذات کو ججون اور خدا کے
سپرد کرتا ہے۔

اُس کے بعد جج آپس مین ووٹ لیتے ہین۔ ۲۸۱ ووٹ اسکے خلاف ہوتے ہین اور ۲۲۰ ووٹ
اُس کے موافق۔ میلیٹوس (Meletus) پھر ایک تقریر کرتا ہے جسمین سزائے موت کی تائید کرتا ہے
پھر سقراط ایک تقریر کرتا ہے جسمین سزائے موت کے بدل کا ذکر کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مین نے عوام الناس پر احسان
کیا ہے اور اولمپیا (Olympia) کے سورماؤن کی طرح مجھے بھی پرائے ٹینیم (Prytaneum)
مین بیت المال سے وظیفہ ملنا چاہیئے۔ اُسے یقین ہے کہ اُس نے کوئی خطا نہین کی وہ نہین کہہ سکتا کہ موت
اچھی چیز ہے یا بری۔ پھر جس شے کو وہ قطعی طور پر بُرا جانتا ہے، اسے کیون معاوضہ موت مین تجویز کرے۔ جرمانہ
ادا کرنا بُرائی مین داخل نہین ہے لیکن اُس کے پاس زر و مال نہین جو جرمانہ ادا کر سکے۔ شاید ایک مینا
(mina یعنی معہ ۱۱ روپے سکہ عثمانیہ) ہوگا، حاضر ہے۔ اُس کے دوست کہتے ہین کہ تیس مینا (۳۳۰ روپیہ)
تک دینا قبول کر لو اور وہ سب مل کر ادا کر دین گے۔ چنانچہ وہ اُن کی خواہش کے مطابق انجمن کے
سامنے تیس مینا پیش کرتا ہے۔ مگر اہل اتھنس (Athens) اس کے لیے سزائے موت
ہی تجویز کرتے ہین۔ جن لوگون نے اُس کے خلاف یہ تجویز کی اُن کو سخت ملامت کرتا ہے۔ اور پیشین گوئی کرتا ہے
کہ ایک بڑا سخت عذاب اُن پر نازل ہونے والا ہے اور جن لوگون نے اُسے بُری تجویز کیا تھا اُن سے کہتا ہے
کہ آپ سب لوگ ٹھہر جائین مین آپ سے باتین کرنا چاہتا ہون۔ اپنے حالات اور موت کے حالات اُن سے
بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "ایک نیک آدمی کو کوئی نقصان نہین پہونچ سکتا" اور ججون سے آخری استدعا
یہ کرتا ہے کہ، جس طرح اُس نے ان کے ساتھ محاسبہ کر کے پریشان کیا ہے اُسی طرح وہ بھی اس کے لڑکون کے ساتھ

برتاؤ کرین۔ اور اگر اس کو لڑکے زرومال کو خیر و صلاح پر ترجیح دین اور اپنے تئین بڑا آدمی سمجھین۔ درانحالیکہ وہ بڑی نہ ہون تو اُن کے ساتھ سختی کی جائے۔ وہ اپنے طرزِ عمل یعنی محاسبہ کی بابت بالکل افسوس ظاہر نہین کرتا۔ اور اہلِ ایتھنس (Athens) کے مقابلہ مین آستین چڑھا کر کھڑا ہوتا ہی۔ وہ جب اُن سے مخاطبت کرتا ہی تو ہر شخص سے فرداً فرداً اور من حیث المجموع ہر طرح خطاب کرتا ہی لیکن نہایت محبت اور تلطف سے۔ کسی سے اُس کا لڑائی جھگڑا نہین ہی۔ وہ اُن کی کوتاہیون اور قصورون پر اظہارِ افسوس کیئے بغیر نہین رہ سکتا۔ یہ بھی اس کے دردِ دل اور محبت کا تقاضا ہی جو ان کی اصلاح اور محاسبہ کے لیے آمادہ ہوتا ہی۔

فیصلہ مقدمہ کے بعد سقراط کو تیس روز تک محبس مین اس لیے انتظار کرنا پڑتا ہی کہ اہلِ ایتھنس (Athens) ہر سال ڈیلاس (Delas) مین جو اپالو (Appolo) کا بُت تھا اس کی خدمت مین ایک وفد بھیجا کرتے تھے۔ اِس وفد کی غیبت مین ایتھنس (Athens) مین کوئی شخص قتل نہین کیا جا سکتا تھا۔ یہ وفد ابھی روانہ ہوا تھا اور جب تک واپس نہ ہو جاتا سقراط کو سزائے موت نہین دی جا سکتی تھی۔ محبس مین جس استقلال کے ساتھ اپنے احباب کو پند و نصیحت مین اس نے وقت صرف کیا اس کی نظیر نہین مل سکتی۔ اُسی زمانہ مین ایک روز صبح تڑکے کرائیٹو (Crito) اس کے پاس پہونچتا ہی۔ سقراط ابھی تک سو رہا ہی۔ کرائیٹو معمولی اوقات سے کسی قدر قبل آیا ہی اور ایک ایسی خبر اپنے ساتھ لایا ہی جو سقراط سے زیادہ خود اُس کے لیے تکلیف دہ ہی۔ وہ خبر یہ ہی کہ جو جہاز وفد کو لیکر واپس آ رہا ہی وہ سونیوم (Sonium) تک پہونچ گیا ہی اور بہت جلد بندرگاہ پیریوس (Pereus ?) مین داخل ہونے والا ہی۔ اس کے دوسرے روز سقراط کو شربتِ مرگ پینا ہو گا۔ کرائیٹو پھر ایک مرتبہ اپنے عزیز دوست اور استاد کو بھاگ جانے پر آمادہ کرتا ہی اور کہتا ہی کہ یہ کام بہت آسانی سے ہو جائے گا۔ اور اُس کے دوستون کو بھی ضرر نہ پہونچے گا۔ اور اگر سقراط اس موقع سے فائدہ نہ اُٹھائے گا۔ تو گویا وہ اپنے دشمنون کی من مانی مراد پوری کرے گا۔ اور اپنی اولاد کو لاوارث چھوڑ جائے گا۔ اور اپنے دوستون کے لیے تضحیک و ذلت کا سبب ہو گا۔ سقراط جواب دیتا ہی کہ ہمیشہ عقل نے اُس کی رہنمونی کی ہی جس کے مقابلہ مین اُس نے عوام کی رائے کی کبھی پروا نہین کی۔ وہ اس کی پروا نہین کرتا کہ لوگ کیا کہین گے لیکن اُس کا اسے بہت خیال ہی کہ امرِ حق سے تجاوز نہ ہونے پائے۔ بس یہ سوال پیدا ہوتا ہی کہ اس طریقہ کا فرار امرِ حق پر مبنی ہو گا یا باطل پر۔ اور کرائیٹو (Crito) اور دیگر احباب جو سعادت کرینگے وہ حق کی معاونت کرینگے یا باطل کی اعیر

سقراط تفصیل کے ساتھ کرائیٹو سے گفتگو کرتا ہے۔ اور اپنے قدیم محاسبہ اور سوال و جواب کے طریقہ پر بحث کرکے اس نتیجہ پر پہونچتا ہے کہ اگر وہ مجلس سے فرار اختیار کرے گا تو ملک کو نقصان پہونچے گا۔ ایک ایسا شہر جس کے عام باشندے اپنی مرضی کے موافق عدالتی فیصلوں کو توڑ دیا کرین اور ان کی پروا نہ کیا کرین کبھی باقی نہین رہ سکتا۔ اس کی بربادی لازمی ہے۔ ممکن ہے کہ ایک شخص کو بلا وجہ حکم سزا دیا گیا ہو گو اس کے معنی یہ ہین کہ یا تو قوانین خود خراب ہین یا اُن کا استعمال خراب ہے۔ باین ہمہ کسی فرد واحد کو عدالت کے مقابلہ مین قانون اپنے ہاتھ مین لینا نہ چاہیے۔ ہر شخص کا یہ فرض ہے کہ اُس ملک کی خاطر جسمین وہ رہتا ہے اپنی انفرادی راے اور ذاتی مرضی کی پروا نہ کرے اور سب پرے اپنی ایک ذات کو قربان کردے ورنہ سلطنت قائم نہین رہ سکتی۔ ان سب باتون پر غور کرنے کے بعد سقراط اپنے دوستون کو سمجھاتا ہے کہ مجھے یہین رہنے اور مرنے دو۔ وہ ایک مظلوم کے مانند دنیا سے جائے گا اور دوسرے عالم مین اُس پر نوازشات ہون گے۔

جس روز وفد کا جہاز بندرگاہ پر پہونچتا ہے۔ فیڈو (Phaedo) اور تمام دیگر احباب دوسرے ہی دن صبح تڑکے سے سقراط کے پاس جاتے ہین۔ اُن کی روایت ہے کہ عمال مجلس یہین سقراط کے پاس پہونچاتے ہین جہان ابھی ابھی اُس کے پیرون سے بیڑیان دور کی گئی تھین اور اس کی بیوی زان تھیپ (Xanthippe) بیٹھی پاس رو رہی تھی۔ زان تھیپ کو وہان سے ہٹا دیتے ہین اور سقراط رنج و راحت کے باہمی تعلقات پر گفتگو کرتا ہے۔ رفتہ رفتہ خودکشی کا ذکر آتا ہے جسے سقراط سخت ناپسند کرتا ہے اور مبنی بر باطل ٹھہراتا ہے وہ کہتا ہے کہ ایک حکیم کو ہمیشہ موت سے محبت کرنا چاہیے۔ مگر خودکشی کرنا درست نہین۔ فلسفہ کے معنی در اصل مطالعہ احوال موت کے ہین۔ ایک فلسفی کی یہ خواہش ہونی چاہیے کہ جلد اس جسمانی قید سے نجات حاصل کرلے۔ اور اپنے مقصود یعنی اس علم کو حاصل کرے جو صرف موت کے بعد نصیب ہوتا ہے۔ جو لوگ موت سے ڈرتے ہین وہ حکمت و دانش سے محبت نہین رکھتے اپنے جسمون اور زر و مال اور عزت کو دوست رکھتے ہین۔ اُن مین اگر جرات آتی ہے تو ایک بد تر شے کے اندیشہ سے اور اعتدال و میانہ روی کو وہ اس لیے پسند کرتے ہین کہ بے اعتدالی بعض راحتون اور سامان عیش و نشاط سے روکتی رہتی ہے۔ ایسی صفت کو خیر یا نیکی کے نام سے موسوم نہین کرسکتے۔ یہ بالکل جھوٹی نیکی اور خلامانہ صفت ہے۔ حقیقی نیکی تزکیہ نفس مین مضمر ہے۔ جو لوگ تزکیہ نفس کرلیتے ہین وہ موت کے بعد

بڑے بڑے بزرگون کی صحبت مین پہونچ جاتے ہین۔ یہی وجہ ہی جو سقراط موت سے نہین گھبراتا۔ موت اور بقاے روح کے مسئلہ پر اچھی خاصی گفتگو ہوتی ہی جس کے آخر مین وہ کہتا ہی "آدمی کو چاہیے کہ بجائے جسم کے روح سے لگاؤ پیدا کرے اور موت کا غم نہ کرے کیونکہ موت اس بند سے خلاصی کا نام ہی" چونکہ وقت تنگ ہوتا جارہا تھا۔ اس لیے اس قدر تقریر کرکے خاموش ہوگیا۔ اور غسل کرنے کے لیے اُٹھا تاکہ موت کی تیاری کرے۔ کرائیٹو (Crito) اُستاد سے پوچھتا ہی کہ آپ کی آخری وصیت کیا ہی۔ اور تجہیز و تکفین کس طرح کرنی چاہیے۔ سقراط کہتا ہی کہ احباب کو اختیار ہی جس طرح چاہین اول منزل پہونچا دین۔ یہ کہکر کرائیٹو (Crito) کے ہمراہ غسل کے لیے جاتا ہی اور اپنے بال بچون سے رخصت ہوتا ہی۔ اُس کے بعد بہت کم گفتگو کی نوبت آتی ہی۔ زہر کا پیالہ لایا جاتا ہی اور سقراط اُسے نہایت اطمینان سے پی لیتا ہی۔ اور جلاد سے طالب ہدایت ہوتا ہی جلاد کہتا ہی کہ تھوڑا ٹہلو جب پیر بھاری ہونے لگین تو لیٹ جاؤ۔ سقراط اس کی تعمیل کرتا ہی اور جب اُس کے پیر بھاری ہونے لگتے ہین تو وہ لیٹ جاتا ہی۔ جلاد پیرون کو دباکر دیکھتا ہی کہ انمین کچھ حس باقی ہی یا نہین۔ اور سقراط سے حال پوچھتا ہی۔ سقراط کہتا ہی کہ کوئی حس نہین رہا۔ یہی بے حسی اوپر کی طرف بڑھتی چلی جاتی ہی نزع روح کے چند لمحہ قبل اُسے ایک بات یاد آتی ہی اور وہ منھ پر سے چادر ہٹاکر کرائیٹو (Crito) سے کہتا ہی کہ دیکھو اسیلی پیوس (Asclepius) کو میری طرف سے ایک مرغ دیدینا اُس کے بعد منھ بند کرلیتا ہی اور تشنج کے سی ایک کیفیت کے بعد روح پرواز کرجاتی ہی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُون۔

(۳)

سقراط کے پہلے جو حکما تھے وہ بالکل طبیعات اور مابعد الطبیعات کے دائرہ مین محدود رہا کرتے تھے۔ انھون نے بھی عالم کے معمہ کو حل کرنا چاہا اور اُس کی حقیقت معلوم کرنی چاہی تھی۔ اور اصول ہاے اولین مثلاً ہوا۔ آگ۔ پانی۔ کو دریافت کرنے اور حل کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ یہ سوال کیا کرتے تھے کہ اشیا کیونکر وجود مین آتی ہین۔ اور کیسے زندہ رہتی ہین۔ اُن مین فساد کیون پیدا ہوتا ہی۔ لیکن پانچوین صدی قبل مسیح مین لوگون کو اُن کی تعلیم سے اطمینان مفقود ہونے لگا۔ اس لیے لوگون نے اُن کی طرف سے بے اعتنائی شروع کردی۔ مثلاً اہل ایتھنس (Athens) کو جن امور کی ضرورت تھی وہ بجائے اسرار عالم کے افراد شخصی اور سوسائٹی سے تعلق رکھتے تھے۔ لوگ انصاف و ظلم۔ حق و باطل۔ خوب و زشت کے معنی مین بحث کرنے لگے تھے۔ اور پوچھتے تھے کہ انصاف، حق اور خوب سے کیا مراد ہی۔ ایک شے کو انصاف کے مطابق

کب کہتے ہین؟ درست اور اچھا کسے کہتے ہین؟ سقراط سے پہلے کے حکما ان سوالات کا جواب نہین دے سکتے تھے اُنھین معاملت انسانی سے تعلق نہین رہا تھا بلکہ محض طبیعات اور ما بعد الطبیعات مین انہماک رہا کرتا تھا۔ چونکہ لوگون کی طبیعت اب ادھر سے ہٹنے لگی تھی اور وہ اخلاقی اور سیاسی بحثون مین پڑنا چاہتے تھے۔ اور سوفسطائی اُن کا کسی قدر جواب دیتے اور ان بحثون پر گفتگو کرتے تھے۔ اس لیے اہل ایتھنس (Athenians) انھین تنخواہین دے دے کر بیرون مُلک سے بُلاتے اور نوکر رکھا کرتے تھے۔ مگر اس وقت ہمین سوفسطائیون کے فلسفہ کی تنقیح کرنی مطلوب نہین ہو۔ اس لیے اُن کی تعلیم کی بھلائی بُرائی کسی کا ذکر کرنا نہ چاہیے۔ صرف اتنا ضرور کہا جاتا ہو کہ جس اخلاق کی وہ تعلیم دیتے تھے وہ اُن پریشان خیالات اور متضاد تصورات اور بے جوڑ سیاسی مسائل پر مشتمل تھی جن کا ایتھنس (Athens) مین چرچا ہو رہا تھا۔ اور بہت سی معمولی معمولی غیر مربوط و پیچیدہ باتون کی تنقیح و تدقیق کی سخت ضرورت تھی کہ راہ کج سے لوگ راہ راست پر آسکین یہ ایسی شدید ضرورت تھی کہ اُس کو رفع کرنے کے لیے خدائے تعالیٰ نے سقراط کو بھیجا جس نے ہر ایک سے محاسبہ کرنا اور اُس کے خیال کی تنقیح کرنا اپنا فرض منصبی قرار دیا اور آخر عمر تک اسی کام مین منہمک رہا۔ اُس کا مقصد یہ تھا کہ لوگون کو حق بات کی تمیز حاصل ہو تاکہ اسی حق کی معیار پر تمدنی اور سیاسی قابلیت کو جانچا جا سکے اور ملک مین غلط اور باطل کو صحیح اور حق کے پردہ مین فروغ نہ حاصل ہو۔ سوفسطائیون کو افلاطون اُس شخص سے مطابقت دیتا ہو جس نے تجربہ سے ایک عظیم الشان اور خطرناک جانور کے مزاج اور ضرورتون کو سمجھ لیا ہو اور یہ جان لیا ہو کہ کس وقت اُس کے قریب جانا چاہیے۔ اور کس چیز سے اُسے غصہ آتا اور کس شے سے وہ راضی ہوتا ہو اور اُس کی مختلف آوازون کے کیا معنی ہین۔ اس علم کو حاصل کر کے وہ شخص یہ دعویٰ کرتا ہو کہ یہی حکمت اور دانش ہو۔ اور اُس کو ایک فن بنا کر تعلیم دینا شروع کرتا ہو۔ جس شے سے جانور راضی ہوتے ہین اُس کو وہ حق بتلاتا ہو اور جس سے وہ ناراض ہوتے ہین اُسے باطل قرار دیتا ہو۔ اور یہ بالکل نہین جانتا کہ اُس کی کون سی خواہش اور ضرورت واقعی درست ہو اور کون سی نا درست۔ اسی کی تعلیم کے لیے سقراط دنیا مین آتا ہو۔ سوفسطائیون کی طرح وہ بھی اخلاقی اور سیاسی مسائل سے بحث کرتا ہو۔ زینوفن (Xenophon) کہتا ہو کہ سقراط ہمیشہ ان امور پر گفتگو کیا کرتا تھا جو آدمیون سے متعلق ہوا کرتے تھے۔ وہ ہمیشہ پوچھتا رہتا تھا کہ زہد و تقویٰ کس کا نام ہو۔ رندی و خرابانی کسے کہتے ہین؟ شریفانہ بات سے کیا مراد ہو؟ کمینگی کسے کہتے ہین؟ انصاف کیا شے ہو؟ بے انصافی کسے کہتے ہین؟ اعتدال اور میانہ روی سے کیا مراد ہو؟ دیوانگی و جنون کیا

شے ہے؟ جرأت کیا ہے؟ بزدلی کیا ہے؟ ملک و ریاست کیا ہے؟ مدبّر کسے کہتے ہین؟ حکومت کس کا نام ہے؟
انسان کو حکومت کے قابل کون شے بناتی ہے؟ وغیرہ وغیرہ جو لوگ اِن سوالون کا جواب دے سکتے تھے
اُنھین وہ اچھے لوگ کہتا اور جو جواب نہ دے سکتے انھین کہتا کہ یہ غلامون سے بہتر نہین ہین۔ مختصر یہ کہ
حکماے متقدمین اشیاے فطرت سے انہماک رکھتے تھے۔ اور سقراط خود انسان سے گفتگو کرتا تھا جس شے کے متعلق
کہ سوفسطائی محض قاعدہ اور صورت بتا کر الگ ہو جاتے تھے۔ سقراط اس کی اصلاح کرنا چاہتا تھا جسے،
اس زمانہ مین لوگ علم کہا کرتے تھے۔ سقراط اس کی خرابیون اور لغویتون سے خوب واقف تھا وسیع المعنی
الفاظ مخصوص معنون مین لے جانے لگے تھے اور وسیع مفہوم کے لفظ کو ایسے الفاظ کے بجاے استعمال کیا
کرتے تھے جن کے معنی کا میدان تنگ ہوا کرتا تھا۔ فرد اور جنس کے لیے الفاظ مین تمیز باقی نہین رہی تھی۔
ارسطاطالیس کا بیان ہے کہ سقراط کی طرف دو شے منسوب کی جا سکتی ہین۔ ایک تو طریقہ استقرا دوسرے
اصطلاح عامہ کی تعریف۔ اس کے پہلے تک وہ الفاظ جو روزمرہ معمولی معمولی مفہوم کے لیے استعمال ہوتے
تھے واضح اور محدود معنی کے ساتھ مخصوص نہ تھے۔ جو شے اُن کے برسون کے جذبات شاعری اقتدار و طبائع
سے پیدا ہو گئی تھی اس کی اصلاح عقل مدرکہ نے اُس وقت تک نہین کی تھی۔ شعرا خود اپنے نظمون کی توضیح
نہین کر سکتے تھے۔ صاحبان فن یہ دعویٰ رکھتے تھے کہ چونکہ اُنھین فن کے متعلق کافی علم حاصل ہے۔ اس لیے
دیگر اہم امور مین بھی اُنھین واقفیت ہے۔ کوئی طبقہ ایسا نہ تھا جسکے لوگ یہ دعوی نہ کرتے ہون کہ ہمین خاصا علم
حاصل ہے۔ درانحالیکہ وہ بالکل جاہل ہوتے تھے اور سقراط کی تحدید و محاسبہ کو بے ضرورت موشگافی کہا
کرتے تھے۔ غرض کہ جن اصول پر سقراط اُن کی اصلاح کرنا چاہتا تھا وہ

(۱) ایسی حقانیت پر مشتمل تھی جنھین دانش و حکمت کے معیار پر جانچ لیا گیا ہو۔ اور عقل انھین قبول
کرتی ہو۔

(۲) جن کے معلوم کرنے کے لیے لوگون کے علوم کی تنقیح اور محاسبہ کی سخت ضرورت تھی۔

اس کا مقصد یہ تھا کہ لوگون کو ان کی جہالت کے جہل سے بیدار کیا جائے اور اُن کی خامیون کو
اُن کے سامنے اُنھین سے تسلیم کرا کے پیش کر دیا جائے۔

سقراط کی طبیعت مین جو سب سے زیادہ شے نمایان تھی وہ اُس کا سخت مذہبی میلان تھا۔ افلاطون کہتا
ہے کہ اس کی تمام خصوصیات طبع پر گہرا مذہبی رنگ غالب تھا۔ اُس کے نزدیک مذہب کا مفہوم محبت پرستی

یا دیوتاؤن کا سلسلہ نہین تھا۔ یونانی دیوتاؤن کے افسانون مین جولغو حکایتین ہین انھین وہ سخت ناپسند کرتا تھا۔ جس وقت لوگون نے اُسے یہ الزام دیا کہ اتھنس (Athens) کے دیوتاؤن کو وہ نہین مانتا تو گو اُس نے ملحد ہونے سے قطعی انکار کیا مگر اُن کے دیوتاؤن کو ماننے کا بھی اقرار کبھی نہین کیا۔ اس کے جواب الزام کے آخری الفاظ یہ تھے :-

"اہل اتھنس (Athens) مین خدا کو بیشک مانتا ہون اور اسی طرح مانا کرتا ہون جسطرح میرے الزام دینے والے اپنے دیوتاؤن کو مانا کرتے ہین اور تمھارے اور تمھارے خدا ہی کے سپرد مین اپنے معاملہ کو کرتا ہون۔ جو کچھ تمھارے اور میرے لیے سب سے بہتر ہو وہ تصفیہ کرو۔"

سقراط کا خدا وہی تھا جو افلاطون کا تھا۔ اس کی صفت خیر ہر اور وہ تمام خیر کا منبع ہر۔ وہ خدا جسے کسی نے نہین دیکھا۔ صرف خدا ہی کی ذات سب اشیار کی دانا بینا ہر۔ وہ خیر کی شر سے محافظت کرتا ہر۔ وہ انسانون پر اپنی مرضی لسانہ غیب کے ذریعہ ظاہر کرتا ہر۔ اُس کے احکام و قوانین سب سے بالاترین اور ہر طرح اُن کی اطاعت کرنی چاہیے۔

سقراط حکمت و دانش کی تلاش اس لیے کرتا ہر کہ خدا نے اُسے اس کام کے لیے مقرر کیا ہر۔ اس کام کو وہ ہمیشہ خدا کے کام کے نام سے یاد کرتا ہر جسے ہر خطرہ کا مقابلہ کرکے انجام دینا چاہیے۔ اور جس کی راہ سے اُسے پھیرنے والا نہ خوف ہو سکتا ہر اور نہ خطرہ۔ اہل اتھنس (Athens) کو وہ مخاطب کرکے کہتا ہر کہ مجھے تمھاری بڑی خاطر منظور رہی اور تم سے بڑی محبت کرتا ہون لیکن اطاعت خدا ہی کی کرون گا۔ تمھاری نہین اور اُسی اطاعت الٰہی مین اُس نے جان دے دی۔

سقراط یہ سمجھتا تھا کہ اُسے خدا کی طرف سے ایک قسم کا پیام ایک برہان ربانی کے ذریعہ پہونچتا رہتا ہر۔ اس برہان کو ایک جگہ وہ خدا کی آواز کہتا ہر جو بچپن سے اس وقت تک اس کے ساتھ ہر۔ اور ہمیشہ اُسے چھوٹی سی چھوٹی باتون مین بھی تنبیہ کرتی رہتی ہر۔ یہ آواز ہمیشہ امتناعی ہر اور بعض افعال سے باز رکھتی ہر یعنی جس شے کو خدا چاہتا ہر کہ یہ نہ کرے اُسی برہان کے ذریعہ سے منع کر دیتا ہر اور اگر یہ چاہتا ہر کہ یہ کرے تو اُس طرف سے خاموش رہتا ہر اور کوئی ممانعت نہین ہوتی یہ "برہان ربانی" اُسے لوگون سے محاسبہ کرنے سے منع نہین کرتی۔ اور وہ اس کام سے باز بھی نہین رہ سکتا تھا اس لیے کہ خداے جل و علیٰ کی حکم عدولی

ہوئی - زینوفن (Xenophon) کو اپنے اُستاد سے باطنی کچھ حصہ نہیں ملا تھا۔ اس لیے وہ اسے سمجھ نہ سکا اور اُس کی یہ تاویل کرنے لگا کہ قوت فیصلہ کو فی الفور کام مین لانے کی یہ ایک قوی استعداد تھی جو اشیاء کے علم پر مبنی اور تجربہ کی بنیاد پر پختہ ہوگئی تھی۔ اور بغیر آگاہی سلسلہ علت و معلول و اطلاع واسطہ درمیانی کے نتیجہ پر پہونچا دیا کرتی تھی لیکن افلاطون جیسے اُستاد سے باطنی دولت بھی ملی تھی خاموش رہتا ہے اور اُس کی تاویل کرنے سے گریز کرتا ہے۔

سقراط کہتا ہے کہ ہمین بدی کا عوض بدی سے نہیں کرنا چاہیے۔ اس کے ہمعصر اِس قسم کے خیالات کو حیرت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ یونانیون کا اخلاق یہ تھا کہ اپنے دوستون سے بھلائی کرو اور اپنے دشمنون کو نقصان پہونچاؤ۔

سقراط بدی کے عوض بدی کرنے کو نادرست کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے جب بدی کرنا بجائے خود درست نہیں تو کسی صورت مین اُسے درست نہیں کہہ سکتے۔ وہ اپنے اہل وطن سے کہتا ہے کہ:۔

"مین تمھین خدا کا گناہ کرنے سے باز رکھنے کی کوشش کرتا ہون۔ مجھے الزام مت لگاؤ۔ اور مین جو تمھارے لیے انعام الٰہی ہون مجھے رد مت کرو۔ اگر تم مجھے قتل کردو گے تو میرا جانشین آسانی سے نہ مل سکے گا۔ خدا نے تمھارے شہر مین مجھے بھیجا ہے۔ اگر مجھے خواہش نفسانی ہوتی جیسا کہ سب انسانون مین ہوا کرتی ہے تو مین اپنے ذاتی نفع و نقصان کے باتون کی طرف سے غفلت نہ کرتا۔ اور اپنے خانگی کامون کو اتنے سال تک برباد نہ ہونے دیتا۔ مجھے تمھارے کام نے ہمہ وقت مشغول رکھا ہے۔ مین تم مین سے ہر ایک کے پاس باپ یا بڑے بھائی کی طرح جاتا ہون۔ اور خیر و صلاح کی طرف مائل کرتا ہون۔ مجھے خدا کی طرف سے ایک بُرہان ربانی عطا ہوا ہے۔ اس خدا کے میلیٹوس (Meletus) تضحیک کرتا ہے۔ یہ بُرہان میرے ساتھ بچپن سے ہے۔ یہ ایک قسم کی آواز ہے جو مین سنتا ہون۔ اور کچھ مین اُس وقت کرتا ہون اگر نامناسب ہو تو اُس سے مجھے روک دیا کرتی ہے۔ لیکن کسی کام کے کرنے کا حکم نہیں دیتی۔ یہی آواز مجھے سیاست مین دخل دینے سے روکتی رہتی ہے۔ ایتھنس (Athens) والو گوش دل سے میرے حالات سُن لو تاکہ تمھین معلوم ہو جائے کہ کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو موت کا ڈر دلا کر باطل کے ارتکاب پر مجھے مائل کر سکے۔ مین مرجانا پسند کرون گا لیکن باطل پر مائل ہونا پسند

نہ کرونگا۔ وہ کہتا ہو کہ موت کوئی بری شے نہیں ہو بلکہ ایک طور پر دیکھیں تو اچھی شے ہو۔ موت کی حالت دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو ہستی بالکل معدوم ہو جائے گی۔ اور تمام احساسات باطل ہو جائینگے یا وہ ہو جیسا کہ عام طور پر لوگ یقین کرتے ہین کہ موت سے روح کا ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل ہونا مراد ہو۔ اگر موت سے تمام احساسات کا بطلان مراد ہو اور وہ اس نیند کے مانند ہو جو کسی خواب سے پریشان نہیں ہوتی تو یہ ایک عجیب نفع کی چیز ہو اگر کوئی کسی ایک رات کو کہے کہ مین اس شب کو اس طرح سویا کہ کوئی خواب تک نہین نظر آیا۔ اور اس شب کا مقابلہ اپنی زندگی کے دوسرے راتون سے کرے اور پھر اس سے پوچھا جائے کہ اس رات سے زیادہ پُر فرحت تم نے کون سا دن یا رات بسر کی ہو تو میرا خیال ہو کہ کیا راجہ اور کیا پرجا سب ہی ایسی رات یا اس قسم کی دوسری راتون کو آسانی سے شمار کر کے بتلائینگے۔ اگر یہی معنی موت کے ہین تو مین اُسے ایک نفع سمجھتا ہون۔ لیکن اگر موت کے معنی ایک مقام سے دوسرے مقام تک سفر کرنے کے ہین اور عام عقیدہ صحیح ہو کہ جسقدر لوگ آچکے ہین سب اس دوسرے مقام مین موجود ہین تو اس سے زیادہ بھلائی میرے لئے اور کیا ہو سکتی ہو مین ایسی موت دس مرتبہ مرنے کو تیار ہون جو مجھے وہان پہونچا دے جہان بڑے بڑے سب لوگ موجود ہین اور مین اُن سے ملاقات کر کے علم حاصل کر سکون۔ وہ کہتا ہو کہ اضداد اضداد سے پیدا ہوا کرتی ہین۔ اس لیے زندگی سے موت پیدا ہوتی ہو اور موت سے زندگی۔ ہمارا تمام علم اِن باتون کے ایک قسم کی یاد ہو جو کسی زمانہ ماسبق مین ہمین معلوم تھین۔ پس ہماری ارواح ضرور اجسام مین داخل ہونے سے پہلے زندہ رہی ہونگی۔ روح بہ سبب جسم کے کم فساد پذیر ہو۔ جسم بھی اگر اُسے حنوط کر کے رکھدیا جاے تو صدیون تک خراب نہین ہوتا۔ اور اُس کے بعض اجزا مثلاً استخوان قریب قریب ہمیشہ باقی رہا کرتے ہین۔ جب جسم کی یہ حالت ہو تو روح کیا موت کے بعد فنا ہو سکتی ہو۔ وہ ہرگز فنا نہین ہوتی۔ وہ اپنے سامعین سے مخاطب ہو کر کہتا ہو کہ آپ سب تصورات مجردہ کے وجود کے قائل ہین۔ سقراط کے خیال مین یہ تصورات مظاہر قدرت کے اسباب ہین۔ اشیاء جمیل کا سبب جمال ہو۔ اور اشیاء عظیم کا سبب عظمت ہو۔ وقس علیٰ ہذہ۔ جو تصورات ایک دوسرے کے متضاد ہین ایک ہی شخص مین وقت واحد مین موجود نہین رہ سکتے۔ اگر یہ کہا جائے

کہ سمیاس (Simmias) لمبا اور چھوٹا دونوں ہے اس لیے کہ وہ مجھے (یعنی خود سقراط سے) لمبا اور فیڈو (Pheado) سے چھوٹا ہے تو کہا جائے گا کہ یہ دونوں متضاد صفتیں بقابلہ جمع ہوئی ہیں۔ ایک کے مقابلہ میں وہ لمبا ہے اور دوسرے کے مقابلہ میں چھوٹا۔ چھوٹا اور لمبا دونوں ایک ہی کے مقابلہ میں کوئی نہیں ہو سکتا۔ اس نظریہ پر اگر مزید نظر ڈالی جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ ایک تصور یہی نہیں کہ اپنے متضاد تصور کے ساتھ رہنا پسند کرے گا۔ بلکہ جو اشیا متضاد تصور کے جزو لاینفک ہیں۔ اُن کے ساتھ بھی رہنا پسند نہیں کریگا۔ مثلاً سردی کا ضد گرمی ہے۔ سردی جس طرح گرمی کی برداشت نہیں کر سکتی۔ اسی طرح وہ آگ کی بھی برداشت نہیں کر سکتی جو حرارت کا جزو لاینفک ہے۔ ایک ہی شے میں حرارت و برودت دونوں ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتیں یہ حالت زندگی کی ہے جو موت کی ضد ہے۔ حیات و روح دونوں باہم جزو لاینفک ہیں پس روح اور موت کا ساتھ کہیں نہیں ہو سکتا اور روح کو کبھی موت نہیں آ سکتی۔ وہ لازوال ہے اس لیے غیر قابل فساد ہے جب ایک شخص مرجاتا ہے تو اس کی روح محفوظ ہو کر جسم سے منقطع ہو کر چلی جاتی ہے یہاں تک بیان کرکے پھر سقراط پوچھتا ہے کہ جب یہ تسلیم کر لیا گیا کہ روح جسم کے بعد بھی زندہ رہتی ہے تو اُس کی طرف سے غفلت کرنا کتنا خطرناک کام ہے ؎

روح را توحید اللہ خوشتر است — غیر ظاہر دست پائے دیگر است
روح وادے بدن بس کاروبار — مرغ باشد در قفس بس بیقرار
باش تا مرغ از قفس آید برون — تا بہ بینی ہفت چرخ اورا زبون

حامد علی
(نایب ناظم عدالت رایچور)

(الناظر، فروری ۱۹۲۴ء)

جمہوریتِ افلاطون

فلاسفۂ یونان کے سرتاج افلاطون کے یہ مکالمات جو جمہوریت کے نام سے موسوم ہیں، اُس کی تصانیف میں خاص طور پر ممتاز ہیں۔ ہمارے مکرم جناب مرزا محمد عسکری صاحب بی اے، سکرٹری انجمن اُردو لکھنؤ نے ان کو اردو کا لباس پہنانا شروع کیا ہے۔ اور نمونے کے طور پر کچھ اوراق ہمیں عنایت فرمائے ہیں۔ اگر یہ ترجمہ اہلِ نظر نے پسند کیا تو امید ہے کہ جلد کتابی صورت میں شایع کیا جا سکے گا۔

ایڈیٹر

مقالۂ اول

شریکِ مکالمہ :- سقراط (Socrates) گلوکان (Glaucon) پولیمار کوس (Polemarchus) اڈیمنٹوس (Adeimantus) کفالوس (Cephalus) تھراسیماکوس (Thrasymachus) کلائٹوفون (Cleitophon)

سقراط = س، گلوکان = گ، پولیمارکوس = پ، اڈیمنٹوس = ا، کفالوس = ک، تھراسیماکوس = ت، کلائٹوفون = کل

میں کل ارسطون (Ariston) کے بیٹے گلوکان کے ساتھ پیریوس[1] (Piraeus) گیا تھا کہ دیوی[2] کے مندر میں دعا مانگوں اور یہ بھی خواہش تھی کہ پھر وہ میلہ دیکھوں جو دیوی کے نام سے پہلی مرتبہ وہاں ہونے والا تھا۔ اہلِ ایتھنز (Athens) کے جلوس کو دیکھ کر میں بہت

۱؎ ایتھنز سے بہت قریب واقع ہے اور عرصہ قدیم سے یونان کا ایک مشہور بندرگاہ ہے۔ ایتھنز اور پیریوس کے درمیان دو لمبی لمبی دیواریں واقع تھیں جنکے نشانات اب بھی کچھ باقی ہیں۔ زمانۂ قدیم میں پیریوس یونان کے جمہوریت پسند لوگوں اور نیز غیر ملکی اشخاص کا ایک بڑا مرکز تھا۔ اب بھی یہ ایک مختصر سا بندرگاہ اور تجارت کی منڈی ہے۔

۲؎ یہ دیوی غالباً آرٹمس یا ڈاینا تھی جس کو اہلِ دیہات اور شکاری لوگ بہت مانتے تھے۔

خوش ہوا، مگر تھریس والوں کا جلوس بھی میرے نزدیک کچھ کم شاندار نہ تھا۔ ہم دونوں آدمی دیوی سے دعائیں مانگ کر اور میلہ کی سیر کرکے شہر کو واپس آنے کا ارادہ کر رہے تھے کہ پولیمارکوس، کفالوس کے بیٹے نے ہم کو دُور سے دیکھ لیا اور ایک آدمی دوڑایا اور ہم سے ٹھہرنے کو کہا۔ آدمی نے پیچھے سے آکر میرا جُبہ پکڑ لیا اور کہا کہ پولیمارکوس کہتے ہیں ذرا ٹھہر جایئے۔ میں نے پوچھا پولیمارکوس کہاں ہیں۔ آدمی نے اشارہ سے بتلایا کہ وہ پیچھے آرہے ہیں۔ ہم دونوں اُن کے انتظار میں ٹھہرے رہے یہاں تک کہ پولیمارکوس اور اُنکے ساتھ گلوکان کا بھائی اڈیمنطوس، اور نکیا (Adeimantus) کا بیٹا نکراتوس (Niceratus) اور چند اور لوگ بھی جو جلوس سے واپس آرہے تھے ہم تک پہونچ گئے۔

پولیمارکوس نے فوراً پوچھا "اگر میں غلطی نہیں کر رہا ہوں تو سقراط آپ کا ارادہ شہر کی واپسی کا ضرور ہے"۔

میں نے جواب دیا "تمھارا خیال غلط تو نہیں ہے"۔

اُنھوں نے کہا "ہمارے ساتھیوں کی کثرت کو کیا آپ نہیں دیکھتے؟"

میں نے کہا "بیشک مین دیکھتا ہوں"۔

انھوں نے کہا "تو پھر یا تو اپنے تئیں ہماری جماعت سے آپ قوی تر ثابت کیجیے، یا ہمارا کہنا آپ کو ماننا ہوگا"۔

میں نے جواب دیا "نہیں، ایک تیسری صورت بھی ممکن ہے یعنی ہم تم کو سمجھا بجھا کر راضی کرلیں"

انھوں نے کہا "یہ کیونکر ممکن ہے کہ ہم آپ کی کچھ نہ سنیں اور پھر بھی راضی ہو جائیں"۔

گلوکان نے کہا "بیشک یہ ممکن نہیں"۔

پولیمارکوس نے کہا "تو اب یقین کر لیجیے کہ ہم آپ کی اس معاملہ میں ایک نہ سنیں گے"۔

اڈیمنطوس نے کہا "کیا آپ کو نہیں معلوم کہ آج رات کو دیوی کے اعزاز میں گھوڑوں پر مشعل کی دوڑ ہوگی؟"

میں نے متعجب ہوکر پوچھا "گھوڑوں پر مشعل کی دوڑ ـــــــ یہ واقعی قابل دید ہوگی۔ کیا سوار لوگ اپنے ہاتھ میں مشعل لیں گے اور ایک دوسرے کو دیتے جائیں گے اور گھوڑا دوڑاتے جائیں گے؟ یہ نہیں تو پھر کیا ہوگا؟"

پولیمارکوس نے جواب دیا "آپ کا خیال صحیح ہے۔ اسکے علاوہ رات کو ایک قابل دید

سلیہ ہوگا۔ ہم سب کھانے سے فراغت کرکے اُسکو دیکھنے چلیں گے اور وہاں اکثر اپنے نوجوان دوستو سے ملیں گے اور مزے کی باتیں رہیں گی۔ اس لیے میں بامرار کہتا ہوں کہ آج رات کو آپ یہیں رہ جائیے اور ہماری اس درخواست کو نامنظور نہ فرمائیے۔"

گلوکان نے یہ سُن کر میری طرف دیکھا اور کہا "ایسی صورت میں ہمارا ٹھہرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔"

میں نے جواب دیا: "اگر تمھاری یہی رائے ہے تو کیا مضائقہ ہے۔"

اس قرارداد کے بعد ہم پولیمارکوس کے ساتھ اُنکے گھر گئے جہاں اُن کے دونوں بھائی لائیسیاس (Lysias) اور یوتھی ڈیموس (Euthydemus) اور تھراسیماکوس باشندۂ کلسیڈان (Chalcedon) اور کارمنٹی ڈیز (Charmantides) اور ارسطانیوس کالڑکا کلائٹوفون یہ سب لوگ موجود تھے۔ پولیمارکوس کے والد کفالوس سے بھی میری ملاقات ہوئی۔ میری رائے میں یہ بہت بوڑھے ہوگئے تھے اور میں نے اُنکو ایک عرصۂ دراز کے بعد دیکھا تھا۔ وہ ایک گدّے دار کرسی پر آرام سے بیٹھے تھے اور اُنکے سر پر ایک ہار لپٹا ہوا تھا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کچھ نذر دے کے فارغ ہوے تھے۔ اُنکے قریب ہر دو جانب بنچیں پڑی تھیں جن پر ہم لوگ بیٹھ گئے۔ کفالوس نے مجھ کو دیکھ کر دعا دی اور کہا۔

ک۔ "سقراط، پیریوس میں تو تم بھولے سے بھی نہیں آتے۔ تم کو چاہیے کہ جلد جلد ملا کرو۔ اگر مجھ میں شہر تک پیدل جانے کی قوت ہوتی تو تم کو تکلیف کرنے کی ضرورت نہ تھی میں تم سے اکثر ملتا رہتا۔ مگر حالت موجودہ میں تم کو آنا چاہیے۔ یقین جانو کہ جسمانی مسرتوں کے انحطاط سے حکیمانہ گفتگو اور مذاکرہ کا شوق مجھ کو اُسی نسبت سے اور بڑھ گیا ہے اور اب اُسی میں بہت مسرت حاصل ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے میں تم سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ ایک بے تکلف دوست کی طرح جلد جلد ملا کرو تاکہ ان نوجوانوں کو تمھاری صحبت اور گفتگو سے فائدہ اُٹھانے کا موقع حاصل ہو۔"

س۔ "سچ یہ ہے کہ مجھ کو خود معمر اشخاص سے باتیں کرنے میں بہت لطف آتا ہے، اس وجہ سے کہ جس شاہراہ پر وہ ہم سے پہلے جا چکتے ہیں اُس پر بہت ممکن ہے ہم کو بھی چلنا ہو، تو ہم کو چاہیے کہ اپنے پیشروؤں سے راستہ کی پوری کیفیت کہ آیا وہ آسان ہے

یا دشوار گذار اور آیا وہ ہموار ہے یا ناہموار اور خطرناک، وقتاً فوقتاً پوچھتے رہیں تاکہ ہماری معلومات اُسکے متعلق وسیع ہوتی جائیں اور چونکہ اب آپ عمر کے اُس حصہ پر پہونچ گئے ہیں جس کو ہمارے شاعر "آستانۂ عمر" سے تعبیر کرتے ہیں لہذا آپ سے بڑھ کر کون شخص اس رائے دینے کا مستحق اور موزوں ہو سکتا ہے۔ اچھا یہ فرمائیے کہ اس عمر میں زندگی آرام دہ ہے یا تکلیف دہ؟"

ک۔ "سقراط! میں اپنا ذاتی تجربہ تم سے ضرور بیان کروں گا۔ میں اور میری طرح کے بعض اور معمر اشخاص اکثر ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور تبادلۂ خیالات کرتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر اکثر ہم میں کے گذشتہ ایام جوانی کو یاد کر کے سخت افسوس کرتے ہیں۔ شباب کی عشقبازیاں، ناؤ نوش کی محفلیں، احباب کی دعوتیں اور جلسے اُنکو یاد آتے ہیں اور اُنکے دلوں پر سانپ لوٹ جاتا ہے۔ اُنکے نزدیک زمانۂ شباب گویا ایک حق تھا جس کا چھن جانا اُنکو سخت ناگوار ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے وہ کہتے ہیں کہ اُس وقت زندگی زندگی تھی اور اب موت سے بدتر ہے۔ بعض بوڑھوں کو یہ شکایت ہوتی ہے کہ چونکہ اُنکے جوان عزیز اُن کی کمزوریوں کا مضحکہ اُڑاتے ہیں اس وجہ سے بڑھاپا نہایت بری اور تکلیف دہ چیز ہے۔ لیکن میری ذاتی رائے یہ ہے کہ ایسے لوگ اپنے مزاج کی ناشگفتگی کا اصلی سبب نہیں سمجھتے۔ کیونکہ اگر اس کا سبب بڑھاپا ہوتا تو یہ شکایتیں مجھ کو اور کل لوگوں کو جو اس سن کو پہونچ گئے ہیں ضرور محسوس ہوتیں مگر امر واقعی یہ ہے کہ میں بہت سے ایسے کبیر السن اشخاص سے مل چکا ہوں جنھوں نے اپنے مزاج کی کیفیت اس سے بالکل مختلف بیان کی۔ مثلاً ایک مرتبہ (Sophocles) سفوکلیز[1] شاعر سے ایک مجمع میں جس میں میں بھی موجود تھا، کسی نے پوچھا "کہو سفوکلیز۔ عشقبازی کے اب بھی قائل ہو یا نہیں"۔ جواب دیا "بحمد اللہ مجھ کو اُس سے نجات مل گئی اور

---

[1] بہت بڑا شاعر اور ڈرامانگار۔ سقراط کا ہمعصر تھا، نہایت حسین، با اخلاق اور نیک مزاج شخص تھا۔ اُسکے سات ڈرامے اسوقت موجود ہیں۔ اپنے دونوں معاصروں اسقیلیوس (Aeschylus) اور یوری پیڈیز (Euripides) سے بہتر اور زیادہ مشہور ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اسٹیج کے تصویر دار پردے اُسی کی ایجاد ہیں۔

اب میری وہی حالت ہے جیسے کوئی شخص کسی دیوانے اور بے رحم آقا کے پنجے سے
نکل کے خوش ہو۔" میرے نزدیک سفوکلیز کا یہ مقولہ بالکل سچ ہے کیونکہ بلا شبہ بڑھاپے
میں عشق اور اسی قسم کے دوسرے جذبات سے نجات مل جاتی ہے اور دل کو سکون اور
اطمینان حاصل ہو جاتا ہے۔ جب بڑھاپے میں خواہشیں کم ہوتی ہیں اور اُن کا زور گھٹ
جاتا ہے اُس وقت سفوکلیز کے مقولہ کی صحت معلوم ہوتی ہے اور بے شک نظر آنے لگتا ہے
کہ کسی کو دیوانے اور ظالم مالکوں سے چھٹکارا مل گیا۔ مگر بڑھاپے کی شکایتوں اور نوجوان
اعزا کے طعنوں کا دوسرا سبب ہے جس کو سن سے کوئی تعلق نہیں بلکہ خود آدمی کے مزاج
سے تعلق ہے۔ اگر لوگوں کو اپنے دلوں پر قابو اور مزاجوں میں ہمواری ہو تو بڑھاپا بالذات
کوئی ناقابل برداشت چیز نہیں ہو سکتا۔ اور اگر ایسا نہیں ہے تو میرے نزدیک ایسے
آدمیوں کی جوانی بھی تکلیف سے خالی نہیں ہو سکتی۔"

[مجھ کو کفالوس کی یہ باتیں بہت پسند آئیں۔ اور اس خیال سے کہ وہ اپنے خیالات اور زیادہ
مشرح طور پر ظاہر کریں میں نے کہا]

س "مگر ممکن ہے اور لوگ اس معاملہ میں آپ کے ہم خیال نہ ہوں اور کہیں کہ آپ کی دولت نہ
کہ آپ کا مزاج آپ کو اس سن میں مطمئن رکھتا ہے۔ کیونکہ مشہور ہے کہ دولت سے بہت
سے اطمینان حاصل ہوتے ہیں۔"

ک۔ سچ ہے۔ اکثر لوگ میرے کہنے کا یقین نہیں کرتے اور میرے نزدیک اُن کا خیال بھی
کسی قدر ٹھیک ہے۔ نہ کہ اُس حد تک جیسا کہ وہ سمجھتے ہیں۔ مجھ کو اس موقع پر تھیمسٹاکلیز [۵۵]
(Themistocles) کا جواب یاد آ گیا جو ایک باشندۂ سریفوس (Seriphus)
کو اس نے دیا تھا جس نے تھیمسٹاکلیز سے طنز سے کہا کہ تمہاری شہرت تمہاری لیاقت کی

---

[۵۵] ۵۲۰ تا ۴۶۰ قبل مسیح۔ ایتھنز کا مشہور سیاست داں گذرا ہے۔ اس نے ایرانیوں کے مقابلہ میں یونان
کی طرف سے بڑی جد و جہد کی۔ اور جب ایرانی درۂ تھرماپلی (Thermopylae)
پار کر آئے اور قریب تھا کہ پورا ملک فتح کر لیں تو مشہور فیصلہ کن لڑائی سلامس
(Salamis) اسی شخص کی عقل اور جنگی تدابیر کی بدولت یونانیوں نے جیت لی جس سے ایرانیوں کی
عام ملک گیری کی ہوس کا خاتمہ ہو گیا۔ تھیمسٹاکلیز نہایت ہوشیار اور لائق جرنیل تھا اور اسی کی کوششوں سے یونان
ایرانیوں کی دست برد سے بچ گیا۔ مگر لالچی بھی مشہور تھا۔

وجہ سے نہیں بلکہ تمہارے مُلک کی وجہ سے ہے۔ جواب دیا" میں کبھی مشہور نہ ہوتا اگر میں سریفوس کا رہنے والا ہوتا مگر تم بھی کبھی مشہور نہ ہوتے اگر تم ایتھنز کے باشندے ہوتے" اسی طرح وہ لوگ، جو دولتمند نہیں ہیں اور بڑھاپے میں مزاج کے چڑچڑے ہو جاتے ہیں اُنکی نسبت صحیح طور پر کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح ممکن ہے کہ ایک نیک شخص بحالت افلاس بڑھاپے میں خوش اور مطمئن نہ رہ سکتا ہو اُسی طرح ایک شخص کو دولت کبھی بھی اطمینان اور سکون قلب نہیں بخش سکتی۔"

س۔ "اچھا یہ تو بتائیے، یہ آپ کی جائداد موروثی ہے یا کسوبہ؟"

ک۔ "سقراط۔ تم یہ پوچھتے ہو کہ میری جائداد میری ذاتی کوششوں سے حاصل کی ہوئی ہے یا بزرگوں سے وراثت میں ملی ہے۔ اسکی صورت یہ ہے کہ اپنی جائداد اور روپیہ پیسہ کے معاملات میں میں اپنے دادا اور اپنے باپ کے درمیان میں واقع ہوا ہوں۔ یعنی میرے دادا نے جنکا نام بھی وہی تھا جو میرا ہے، وہ کُل جائداد حاصل کی تھی جو اسوقت میرے پاس ہے اور اسکے سوا اور بھی ایک بڑی جائداد کے مالک تھے۔ مگر میرے والد نے جن کا نام لائیسانیاس (Lysanias) تھا، پوری جائداد کو تلف کر کے اس سے بھی بہت کم چھوڑا جو اسوقت میرے پاس موجود ہے۔ اب میری یہ خواہش اور تمنا ہے کہ اپنے بعد اپنے لڑکوں کے واسطے کم سے کم اُسی قدر چھوڑ جاؤں جو مجھ کو اپنے باپ سے وراثتہً ملا تھا اگر اُس سے زیادہ نہ چھوڑوں۔"

س۔ "یہ آخری سوال میں نے آپ سے اس وجہ سے پوچھا تھا کہ میرے نزدیک آپ روپیہ کے بہت زیادہ شایق نہیں معلوم ہوتے جیسا کہ اُن لوگوں کا حال ہوتا ہے جو جائداد کو خود نہیں پیدا کرتے۔ اور برعکس اسکے وہ لوگ جو اپنے قوت بازو سے حاصل کرتے ہیں اپنے کسوبات کے بہ نسبت اور لوگوں کے بہت زیادہ گرویدہ ہوتے ہیں۔ جس طرح شاعر اپنی تصانیف سے اور باپ اپنی اولاد سے اور لوگوں کی بہ نسبت زیادہ مانوس ہوتا ہے اُسی طرح کاسب زر اپنے روپیہ کو اوروں کی بہ نسبت زیادہ چاہتا ہے۔ روپیہ کے مفید ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ اس وجہ سے کہ وہ خود اُس کی کوششوں سے پیدا ہوا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ایسے اشخاص کی گفتگو دلچسپ نہیں ہوتی کیونکہ یہ موقع بے موقع اپنے محاصل کی تعریف کیا کرتے ہیں۔"

ک "یہ بالکل سچ ہے۔"

س "جی ہاں۔ اچھا ایک اور بات آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ دولت سے آپ کے نزدیک سب سے بڑا نفع کیا حاصل ہو سکتا ہے؟"

ک "میرے جواب سے ممکن ہے اکثر آدمی اتفاق نہ کریں مگر میں یہ ضرور کہوں گا کہ جب آدمی کو اپنی موت کا یقین ہو جاتا ہے تو وہ اُن چیزوں سے بہت خائف و مضطر ہونے لگتا ہے جن سے وہ پیشتر کبھی خائف اور مضطر نہ ہوتا تھا۔ اب تک وہ اس قسم کی باتوں کو مثلاً جو کوئی اس عالم میں کوئی گناہ کرے گا اُسکو دوسرے عالم میں اس کی پاداش میں ضرور سزا ملے گی، محض ڈھکوسلا سمجھتا تھا اور اُن پر ہنستا تھا۔ مگر اب اُسکے دل میں ایک قسم کا خوف پیدا ہوتا ہے کہ ممکن ہے یہ دیرینہ قصے سچ ہوں۔ اور یا تو بڑھاپے کی کمزوری سے یا اس وجہ سے کہ وہ عالم اُخروی کی سرحد سے قریب تر ہوتا جاتا ہے اُسکو یہ دیرینہ قصے ایک راز معلوم ہونے لگتے ہیں بلکہ ان رازوں کو وہ اچھی طرح سمجھنے لگتا ہے۔ ہر طور جو کچھ ہو موت کے قریب اُس کا دل خوف اور اضطراب سے پُر ہو جاتا ہے اور اب وہ اس پر غور کرنے لگتا ہے کہ آیا اُس نے کسی کے ساتھ کوئی ظلم تو نہیں کیا اور اگر اسکو معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے اپنی زندگی میں بہت سے مظالم کیے ہیں تو وہ بچوں کی طرح خوف کے مارے نیند میں چونک پڑتا ہے اور اُسکے سامنے ہر وقت نہایت متوحش تصورات رہنے لگتے ہیں۔ برخلاف اسکے اگر اس کا دل کسی گذشتہ ظلم کی یاد دلا کر اسکو ملامت نہیں کر سکتا تو اُسکے سامنے ہر وقت امید جلوہ افروز رہتی ہے جو بقول پنڈار[1] (Pindar) "بڑھاپے کی اصلی رفیق" ہے۔ دیکھو سقراط! پنڈار نے کیا خوب کہا ہے کسی شخص کے متعلق جس کی زندگی عدل اور برگزیدگی کے ساتھ بسر ہوئی تھی کہ

"خوشگوار اُمید اس کی ساتھی ہے جو اُس کے دل کو ہر وقت خوش رکھتی ہے
اور بڑھاپے کی اصلی رفیق ہے۔ اُمید ہی فانی انسان کی متغیر خواہشوں کو جادہ

---

[1] ۵۲۲ لغایہ ۴۴۳ قبل مسیح۔ یونان کا بہت مشہور اور عالی خاندان شاعر تھا۔ رزمیہ نظمیں لکھتا تھا۔ اسکی اکثر نظمیں جو بصورت غنوی ہیں، دیوتاؤں خاصکر اپالو (Apollo) کی تعریف میں ہیں (دیکھیے [illegible]) یا یونان کے بہادران قومی کا ذکر ان میں ہے۔ بعض مشہور خمریات اور تاج کی نظمیں ہیں۔ بعض مرثیے بھی ہیں مگر اکثر اب مفقود ہیں۔

استقامت بڑھتی ہے"۔

اس میں شک نہیں کہ اس مقولہ میں ایک معرفت چھپی ہوئی ہے اور اسی وجہ سے میری رائے میں دولت ایک بیش قیمت چیز ہے۔ ہر شخص کے واسطے نہ سہی مگر نیک لوگوں کے واسطے تو ضرور ہے کیونکہ دولت ہی کے ذریعہ سے ہم غیر ارادی فریب اور کذب تک بچ سکتے ہیں۔ اور اگر بالفرض ہم پر کسی دیوتا کی نذر یا کسی انسان کے قرض کا مطالبہ ہو تو دولت ہی کے بدولت ہم بلا کسی خوف کے اور نہایت اطمینان کے ساتھ سفر آخرت کی تیاری کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی دولت کے اچھے اچھے مصرف ممکن ہیں مگر میں نے سب کا موازنہ کر کے ایک ہوشیار اور عقلمند آدمی کے واسطے اسی کو دولت کا سب سے اچھا مصرف اور سب سے بڑی خدمت قرار دیا ہے"۔

س۔ "کفالوس! آپ نے جو کچھ کہا بہت خوب کہا، مگر یہ تو فرمائیے کہ صفت عدل سے، جس کا ذکر آپنے اپنی تقریر میں دو تین مرتبہ کیا، کیا مطلب ہے؟ کیا ہم اس کی تعریف یہ کریں کہ عدل صرف صدق اور واپسی حقوق کا نام ہے، یا یہ بھی ممکن ہے کہ اسی قسم کے افعال بعض وقت عدل اور بعض وقت ظلم کہے جا سکتے ہیں۔ مثلاً اس کو ہر شخص تسلیم کرے گا کہ اگر کوئی آدمی بحالت صحت عقل مہلک ہتھیار اپنے ایک دوست کے حوالہ کر دے اور پھر بحالت جنون انکو واپس مانگے، تو ظاہر ہے کہ یہ امانت ہرگز واپس نہ ملنا چاہیے اور اس دوست کو کوئی شخص عادل نہ کہیگا اگر وہ ان ہتھیاروں کو واپس دے یا مجنون سے یہ معاملہ من وعن بیان کرنے پر تیار ہو"۔

ک "تمہارا خیال بالکل صحیح ہے"۔

س۔ "تو پھر عدل کی تعریف محض سچ بولنا اور واپسی حق ہوئی"۔

پولیمارکوس نے شریک مکالمہ ہو کر کہا:۔

پ "نہیں یہ تعریف تو ضرور صحیح ہے، یا کم سے کم سایمانیڈیز[1] (Simonides) کا

---

[1] اس نام کے دو شاعر یونان میں گزرے ہیں۔ ایک ساتویں صدی اور دوسرا پانچویں اور چوتھی صدی قبل مسیح کا۔ یہاں ثانی الذکر سے مراد ہے جو کیوس کا رہنے والا بہت مشہور شاعر گزرا ہے۔ یہ تھیمسٹاکلیز اور ہیرو کا ہم وقت کا دوست اور معاصر تھا۔ اسکی عبارت نہایت رنگین، خیالات بلند اور مضمون عالی ہوتے ہیں۔ پنڈار کی طرح شاعری کی ہر صنف میں ید طولےٰ رکھتا تھا۔ اس زمانہ کے نکتہ رس اُس کا مقابلہ انگریزی شاعر ٹینیسن سے کرتے ہیں۔

وہ یہ قول ضرور ہے۔

ک :۔ اب میں بحث کو اس مقام پر چھوڑتا ہوں کیونکہ مجھ کو کچھ نذر وغیرہ دینا ہے :

س :۔ تو اب آپ کی جگہ پولیمارکوس داخل مباحثہ ہوتے ہیں ؟

ک ۔(مسکرا کر) "ہاں بیشک" [یہ کہہ کے وہ نذر دینے چلے گئے ۔ انکے جانے کے بعد میں نے پولیمارکوس سے مخاطب ہو کے پوچھا :۔ "اب وارثِ بحث تم ہوے، لھذا بتاؤ کہ سایمانیڈیز نے عدل کی صحیح تعریف کیا کی ہے ؟ :۔]

پ :۔ یہ کہ ہر شخص کو اُس کا حق دیا جائے ۔ اور میرے نزدیک بھی یہ تعریف صحیح ہے :

س :۔ اس میں شک نہیں کہ سایمانیڈیز کی تردید کوئی آسان بات نہیں ہے ۔ کیونکہ وہ ایک عقلمند اور ملہم شخص ہے، مگر ان الفاظ سے اُس کا اصلی مفہوم ممکن ہے تم سمجھ سکتے ہو، میری سمجھ میں تو نہیں آتا ۔ اس وجہ سے کہ مثال مذکورہ میں اُس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہو سکتا کہ اگر کوئی شخص کوئی چیز کسی دوسرے کے پاس امانتاً رکھوائے تو ذہن اُسکو صاحبِ امانت کو واپس کر دے گو کہ صاحبِ امانت مجنون ہو ۔ مگر پھر بھی وہ امانت صاحبِ امانت کو ملنا چاہیے ۔ کیا ایسا نہیں ہے ؟"

پ :۔ بیشک ایسا ہی ہے "۔

س :۔ مگر جبکہ حق مانگنے والا اپنے ہوش و حواس میں نہ ہو تو پھر وہ حق اُسکو کسی طرح نہ ملنا چاہیے :۔

پ :۔ "کبھی نہ ملنا چاہیے :"

س :۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ اس جملے سے کہ حقوق کی واپسی عدل ہے سایمانیڈیز کا کچھ اور مطلب ہے :"

پ :۔ "نہیں ۔ سایمانیڈیز کا یہ مطلب تو ضرور ہے ۔ کیونکہ اُس کا یہ بھی قول ہے کہ قرض جو ایک دوست دوسرے دوست کو دیتا ہے اُس کی غرض نفع ہوتی ہے نہ کہ نقصان :"

س :۔ "پہلے اس سے یہ مطلب ہوا کہ وہ شخص جو روپیہ جمع کرنے والے کو اُس کا روپیہ واپس دیتا ہے اُس کا حق نہیں دیتا ، اگر اس قسم کی واپسی ایک فریق کی جانب سے اور وہی دوسرے فریق کی جانب سے دوسرے کے لیے نقصان رساں ثابت ہو، اگرچہ فریقین باہم دوست بھی ہوں ۔ کیا تمھارے خیال کے مطابق سایمانیڈیز کا یہ مطلب نہیں ہے ؟ "

پ :۔ "بیشک یہی ہے :"

س :- "تو پھر ہم کو اپنے دشمنوں کو اُن کا حق بھی دینا ضروری ہے؟"

پ :- اس میں کیا شبہ ہے۔ ہم کو اُن کا حق دینا چاہیے۔ اور ظاہر ہے کہ دشمن کو دشمن کا حق ادا کرنا اُسکو نقصان پہونچانا ہے کیونکہ نقصان ہی فریقین کی مناسبت سے مناسب بھی ہے۔"

س :- "تو اس سے ثابت ہوا کہ سایانیڈیز نے مثل دیگر شاعروں کے انصاف کی تعریف مثل ایک چیستاں کے کی ہے۔ کیونکہ ظاہر ہے اُن کے نزدیک انصاف سے یہ مطلب ہوا کہ ہر شخص کو وہ چیز دی جائے جو حسب موقع ہو۔ اور اسی حسب موقع کو وہ واجبی یا حق سے تعبیر کرتے ہیں۔ اچھا، تو ایسی صورت میں تم کیا کہوگے کہ اگر کوئی شخص بعد تعریف مذکورہ بالا کے سایانیڈیز سے یہ سوال کرے کہ فرض کیجیے فن طب میں واجبی اور مناسب چیز کیا ہے اور اس کا حاصل کرنے والا کون ہے۔ تمہارے نزدیک اُن کا اس صورت میں کیا جواب ہوگا؟"

پ۔ ایسی صورت میں اُن کا یہ جواب ہوگا کہ بدن حاصل کرنے والا ہے اور ادویہ اور ماکولات ومشروبات اشیاے مناسب اور واجبی ہیں۔"

س :- "اور ایک دوسرے فن مثلاً طباخی میں سوال مذکورہ کا کیا جواب ہوگا؟"

پ :- تیار کھانے حاصل کرنے والے ہیں اور مصالحہ وغیرہ اشیاے مناسب و واجبی ہیں۔"

س :- بہت ٹھیک ہے۔ پس اسی طرح اُس فن میں جس کو ہم انصاف کہ سکتے ہیں اشیاے مناسب اور حاصل کرنے والے علی الترتیب کون ہیں؟"

پ :- جوابات مذکورہ بالا کی بنا پر نفع اور نقصان اشیاے مناسب ہیں اور دوست اور دشمن ان کے حاصل کرنے والے ہوے۔"

س :- تو انصاف سے سایانیڈیز کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ دوستوں کو نفع اور دشمنوں کو ہم نقصان پہونچائیں۔"

پ :- میرا بھی یہی خیال ہے۔"

س اب بیماری کی صورت میں کون دوست کو نفع اور دشمن کو نقصان پہونچا سکتا ہے۔ جہاں تک کہ صحت اور مرض کا تعلق ہے۔"

پ :- "طبیب۔"

س :- اور ایک سفر بحری میں کون دوستوں کو نفع اور دشمنوں کو نقصان پہونچا سکتا ہے، جہاں تک کہ بحری خطرات کا تعلق ہے۔"

پ :- "ناخدا"۔

س :- "اچھا تو کس معاملہ میں اور کس غرض سے ایک منصف آدمی اپنے دوستوں کو نفع اور دشمنوں کو نقصان بہتر طریقے سے پہونچا سکتا ہے؟"

پ :- "میرے نزدیک مثلاً لڑائی کے معاملات میں بحیثیت دوستوں کے معاون اور دشمنوں کے مخالف کے۔"

س بہت درست۔ تو اب اے میرے عزیز پولیمارکوس! تم کو اسکے تسلیم کرنے میں تو کوئی عذر نہ ہوگا کہ طبیب صحیح المزاج اشخاص کے لیے بیکار ہے۔

پ :- "بیشک۔"

س :- "اسی طرح جہاز راں خشکی کے رہنے والوں کے واسطے۔"

پ :- "جی اور کیا!"

س :- "تو پھر منصف آدمی بھی اُن لوگوں کے واسطے بیکار ٹھہرا جو برسرِ جنگ ہوں۔"

پ :- "اس کا تو میں قائل نہیں ہوں۔"

س :- "تو پھر انصاف بحالت امن بھی کارآمد ہوا؟"

پ :- "بیشک!"

س :- "یہی حالت فنِ زراعت کی بھی ہے۔"

پ :- "اس میں کیا شبہہ ہے۔"

س :- "یعنی وہ ایک ذریعہ محاصل زمین کے حاصل کرنے کا ہے۔"

پ :- "جی ہاں۔"

س :- "اسی طرح جوتے بنانے والے کا کام بھی مفید ہے؟"

پ :- "جی ہاں بیشک ہے۔"

س :- "یعنی وہ ایک ذریعہ جوتے حاصل کرنے کا ہے۔"

پ :- "کیا شک ہے۔"

س :- "پس تو اب تمھارے خیال کے مطابق انصاف بحالت امن کس چیز کے استعمال یا استحصال کا معاون ہے۔"

پ :- "معاہدوں کا۔"

س :- "اور معاہدوں سے تمھاری مراد شراکت ہے یا کچھ اور؟"

پ :- "البتہ شراکت ہے"

س :- "تو اس صورت میں فرض کرو ڈرافٹ[1] (draughts) کے کھیل میں ایک منصف آدمی یا ایک اچھا ڈرافٹ کا کھلاڑی ڈرافٹ کے کھیل کے لیے زیادہ موزوں شریک ہو سکتا ہے؟"

پ :- "ڈرافٹ کا کھلاڑی"

س :- "اسی طرح معماری اور سنگ تراشی کے کاموں میں کیا ایک منصف آدمی ایک معمار یا سنگ تراش سے بہتر شریک ہو سکتا ہے؟"

پ :- "ہرگز نہیں"

س :- "تو بتاؤ کہ پھر کس کام میں ایک منصف آدمی کو ہم ایک بین کار پر ترجیح دے سکتے ہیں جس طرح کہ بین نوازی میں بین کار کو منصف پر ترجیح دیتے ہیں؟"

پ :- "میرا خیال ہے کہ شراکتِ زر میں"

س :- "سوائے اسکے جبکہ شراکت کی غرض یہ ہو کہ روپیہ لگایا جائے - مثلاً چند شرکاء جب کوئی چیز فرض کیجیے گھوڑا مول لینا یا بیچنا چاہیں تو اس صورت میں میرے خیال میں ایک تاجرِ اسپ بہتر شریک ہو سکتا ہے - کیا ایسا نہیں ہے؟"

پ :- "جی ہاں ایسا ہی ہے"

س :- "پھر فرض کرو کہ ایک جہاز بیچا یا خریدا جائے تو اس صورت میں جہاز بنانے والا یا جہازراں بہتر شریک ہوگا"

پ :- "ایسا ہی تو معلوم ہوتا ہے"

س :- "جب اتنا معلوم ہو گیا، تو اب یہ بتاؤ کہ وہ موقع کب آئے گا جب سونے چاندی کے استعمال کی غرض سے ایک منصف شخص اور دوسرے آدمیوں سے زیادہ مفید شریک ثابت ہوگا؟"

پ - جب آپ اپنے روپے کو زیرِ امانت یعنی محفوظ رکھنا چاہتے ہیں"

س :- "یوں کہو جبکہ وہ غیر مصرف کر دیا جائے نہ کہ اس سے کوئی مصرف لیا جائے"

پ :- "جی ہاں اور کیا"

---

[1] غالباً اس سے وہی ڈرافٹ مراد ہے جو اس زمانہ میں رائج ہے - بہر طور انگریزی ترجمہ میں یہی لفظ استعمال کیا گیا ہے - واللہ اعلم اصل میں کون سا کھیل ہے -

س :- تو اسکے یہ معنی ہوے کہ انصاف کا تعلق از راہ مفید ہونے کے روپیہ کے ساتھ اُسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ روپیہ بیکار اور غیر مصرف کر دیا جائے۔"

پ :- "جی ہاں - بظاہر تو یہی نتیجہ نکلتا ہے۔"

س :- "بس اسی طرح جب تم ایک باغبانی قینچی اپنے پاس صرف رکھنا چاہتے ہو تو انصاف ایک مفید چیز ہے - عام اس سے کہ تم کسی کی شراکت کرو یا نہ کرو - مگر جب تم اُس قینچی کو استعمال میں لانا چاہو اُس وقت انصاف کی جگہ فن باغبانی نے لیا ہے۔"

پ :- "ظاہر ہے۔"

س :- "پھر یہ بھی ٹھیک ہوگا کہ جب تم ایک ڈھال یا ایک بین کو بلا استعمال کئے رکھنا چاہتے ہو، تب البتہ انصاف ایک مفید چیز ہے مگر جبکہ تم اُن دونوں چیزوں کے استعمال کے خواہشمند ہو تو تم کو سپاہی یا بین نواز کے فن کی ضرورت ہوگی۔"

پ :- "بیشک ہوگی۔"

س :- "اسی طرح اور چیزوں کا بھی حال ہوگا جس سے نتیجہ یہ نکلا کہ انصاف بیکار ہے جبکہ کسی چیز سے کام لیا جائے اور کار آمد ہے جبکہ کسی چیز سے کام نہ لیا جائے۔"

پ :- "ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔"

س :- "تب تو میرے عزیز دوست! انصاف کوئی قیمتی چیز نہ ہوا - جبکہ اُس کا استعمال صرف اشیاء کی بیکاری کی صورت میں ہو سکتا ہے - اچھا آؤ اب ہم اس بحث کا ایک دوسرا رخ اختیار کریں، —— فرض کرو ایک گھونسہ باز جو گھونسا مارنے میں کامل ہے، کیا گھونسوں سے بچنے میں کامل مہارت نہ رکھتا ہوگا؟"

پ :- "ضرور رکھتا ہوگا۔"

س :- "یا جو شخص کسی بیماری کے روکنے اور اُسکے حملوں کے دفع کرنے میں مہارت رکھتا ہو، کیا وہ دوسروں میں اسی بیماری کو پیدا نہ کر سکے گا؟"

پ :- "میرے نزدیک ضرور کر سکے گا۔"

س :- "بس اسی طرح کوئی شخص جو فوج کی حفاظت کرنا خوب جانتا ہو وہ یقیناً دشمن کی تدابیر جنگ اور دیگر رازوں کو بخوبی چُرا بھی سکتا ہے۔"

پ- "بیشک۔"

س- "یعنی جس چیز کی حفاظت میں اُسکو مہارت ہے اُسکے چُرانے میں بھی اُسکو مہارت ہے۔"

پ- "ایسا ہی تو معلوم ہوتا ہے۔"

س- "اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ اگر کوئی منصف شخص روپیہ کی حفاظت خوب کر سکتا ہے تو وہ اُسکو چرا بھی خوب سکتا ہے۔"

پ- "منطقی نتیجہ تو یہی نکلتا ہے۔"

س- "بس تو اب معلوم ہوتا ہے کہ منصف شخص ایک قسم کا چور ہے۔ اور یہ ایک مسئلہ ہے جس کو تم نے یقیناً ہومر[1] (Homer) سے سیکھا ہے۔ کیونکہ ہومر کے نزدیک آٹولیکوس[2] (Autolycus) جو اوڈیسیئس[3] (Odysseus) کا نانا تھا بہت اچھا شخص ہے صرف اس وجہ سے کہ وہ اور لوگوں سے زیادہ چوری اور دغابازی کے فن میں مشاق تھا۔ پس تمہارے اور ہومر اور سائمونیڈیز کے خیال کے مطابق انصاف ایک قسم کی چوری کا فن ہے جس کی غرض یہ ہے کہ دوستوں کی مدد کی جائے اور دشمنوں کو نقصان پہونچایا

---

[1] سب سے پہلا اور سب سے زیادہ مشہور یونانی شاعر گزرا ہے۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ حضرت مسیح سے ۱۲۰۰ برس پیشتر تھا۔ یونانی شاعری بلکہ تمام متمدن دنیا کی شاعری کا باپ مانا جاتا ہے اور اسی قدامت کی وجہ سے مختلف ممالک کے قدیم مشہور شاعروں کو اس سے مناسبت دیتے ہیں۔ مثلاً فردوسی ایران کا ہومر، چاسر انگلستان کا ہومر، والمیک ہندوستان کا ہومر کہلاتا ہے۔ اسکی مشہور تصانیف الیڈ (Iliad) اور اوڈیسی (Odyssey) ہیں۔

[2] یہ شخص قدیم الایام کا ایک ہیرو گزرا ہے۔ یہ اپنی چالاکی اور ہیرپھیر واسطے مشہور ہے۔ قصوں میں لکھا ہے کہ چوری خوب کرتا تھا اور جادو کے زور سے وہ اشیا اور خود بھی نظر سے غائب ہو جاتا تھا۔

[3] یہ بھی قدیم الایام کا ایک مشہور ہیرو ہے جس نے جنگ ٹرائے (Troy) میں بہت بڑا حصہ لیا تھا۔ اس کا نام یولیسیس (Eulysius) بھی ہے۔ جنگ مذکور میں اس کے کارنامے رستم کی لڑائی کی طرح مشہور ہیں۔ بعد فراغت جنگ یہ دس برس تک گھومتا رہا اور عجیب عجیب فوق العادت حرکات اس سے سرزد ہوئیں۔ جس کو ہومر نے اپنی مشہور کتاب اوڈیسی میں قلمبند کیا ہے۔

جائے۔ کیا یہ تمہارا مطلب نہیں تھا؟"

پ :" نہیں۔ یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔ مگر اتنے عرصہ کے سلسلۂ کلام کے بعد مجھ کو اپنے ابتدائی الفاظ یاد نہیں۔ بہرطور یہ میری رائے اب بھی ہے کہ دوستوں کی امداد اور دشمنوں کو نقصان پہونچانا انصاف ہے۔"

س :" اچھا اب یہ بتاؤ کہ کسی شخص کے دوستوں سے کیا وہ لوگ مراد لیے جائیں جو بظاہر اُسکو نیک معلوم ہوتے ہوں، یا وہ جو دراصل نیک ہوں گو بظاہر نہ معلوم ہوتے ہوں۔ اور دشمنوں کی بھی کیا اسی اصول پر تعریف کی جائے؟"

پ :" میں یہ ضرور کہوں گا کہ آدمی کو چاہیے کہ جس کسی کو نیک سمجھے اُس سے محبت کرے اور جس کسی کو بد سمجھے اُس سے نفرت کرے۔"

س :" کیا لوگ اس معاملہ میں غلطی نہیں کرتے اور نیکوں کو بد اور بدوں کو نیک اکثر اپنی غلطی سے تصور نہیں کرتے؟"

پ :" ضرور کرتے ہیں۔"

س :" تو ایسے لوگوں کے نزدیک نیک اُنکے دشمن اور بد اُنکے دوست ٹھہرے؟"

پ :" بیشک ایسا ہی ہوا۔"

س :" اور ظاہر ہے کہ ایسے اشخاص کو ایسے مواقع پر بدوں کی اعانت اور نیکوں کی نقصان رسانی عین انصاف ہے۔"

پ :" بظاہر تو ہے۔"

س :" مگر اس میں بھی کوئی کلام نہیں کہ نیک لوگ منصف ہوتے ہیں اور بے انصافی اُنکی فطرت سے دُور ہے۔"

پ :" بیشک۔"

س :" تو اب تمہارے مسئلہ کے مطابق کوئی شخص جو بے انصافی نہ کرے اُسکو نقصان پہونچانا عین انصاف ہے۔"

پ :" نہیں معاذاللہ! استغفراللہ! یہ آپ کیا کہتے ہیں۔ یہ تو بہت بُرا مسئلہ ہے۔"

س :" تب اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ غیر منصف کو نقصان پہونچانا اور منصف کی اعانت عین انصاف ہے۔"

پ :" البتہ یہ مسئلہ پہلے مسئلہ سے بہتر معلوم ہوتا ہے۔"

س :- "تو بالیمارکوس اس صورت میں نتیجہ یہ ہوگا کہ اُن معاملات میں جن میں لوگوں نے اپنے دوستوں اور دشمنوں کے انتخاب میں غلطی کی ہے اُن لوگوں کو جن کے حق میں غلطی کی گئی ہے اپنے دوستوں کو نقصان پہونچانا انصاف ہوگا کیونکہ اُنکے نزدیک وہ بد ہیں۔ اور اسی طرح اپنے دشمنوں کی اعانت کرنا بھی انصاف ہوگا کیونکہ اُنکے نزدیک وہ نیک ہیں۔ اور اب یہ ہمارا استدلال اُس چیز سے بالکل مغائر ہوگا جسکو ہم سایا نیڈیز کی طرف منسوب کرتے ہیں۔"

پ :- "نتیجہ تو یہ ضرور نکلتا ہے مگر اب مجھ کو اجازت دیجیے کہ دوست اور دشمن کی تعریف میں کچھ تغیر و تبدل کروں کیونکہ وہ غلط معلوم ہوتی ہے۔"

س :- "شوق سے کرو مگر یہ بتاؤ کہ تمہاری ابتدائی تعریف کیا تھی؟"

پ :- "یہ کہ دوست وہ ہے جو بظاہر نیک معلوم ہو۔"

س :- "اور اب دوست کی تعریف کیا کروگے؟"

پ :- "یہ کہ دوست وہ ہے جو نہ صرف بظاہر نیک ہو بلکہ دراصل بھی نیک ہو۔ اور وہ لوگ جو ظاہر میں نیک معلوم ہوتے ہیں مگر اصل میں نہیں ہیں وہ دراصل دوست نہیں ہیں بلکہ ظاہری سمجھے جا سکتے ہیں۔ علیٰ ہذا دشمن کی تعریف بھی اسی اصول پر ہوگی۔"

س :- "تو اس تعریف سے نیک آدمی یقیناً دوست ٹھہرا اور بد آدمی دشمن۔"

پ :- "جی ہاں۔"

س :- "اس جدید تعریف سے یہ بات لازم آئے گی کہ انصاف کی تصویر میں ایک اضافہ کرنا ہوگا جو پیشتر ضروری نہ تھا۔ یعنی تعریف اول کے بموجب انصاف ہم دوستوں کے ساتھ نیکی اور دشمنوں کے ساتھ برائی کو سمجھتے تھے۔ اور اب اس نئی تعریف کی رو سے تمہارے خیال کے بموجب یوں کہنا ہوگا "انصاف سے مطلب ہے دوستوں کے ساتھ نیکی کرنا اگر وہ نیک ہوں اور دشمنوں سے برائی کرنا اگر وہ بد ہوں۔"

پ :- "جی ہاں۔ جی ہاں۔ یہی میرا مطلب ہے جسکو آپ نے نہایت صحیح الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔"

س :- "اب میں تم سے یہ پوچھتا ہوں کہ کسی کو نقصان پہونچانا منصف آدمی کا کام ہے یا نہیں؟"

پ :- "بے شک ہے۔ یعنی جو لوگ بد ہیں اور دشمن بھی ہیں اُن کو نقصان پہونچانا منصف کا فرض ہے۔"

س :- "اب یہ بتاؤ کہ گھوڑے نقصان کی وجہ سے بہتر ہوتے ہیں یا بدتر؟"

پ۔ "بدتر"

س۔ "یعنی کتوں یا خود اپنی صنف گھوڑوں کی عمدگی کے مقابلہ میں ؟"

پ۔ "گھوڑوں کے مقابلہ میں"

س۔ "اسی طرح سے کتے نقصان اٹھا کر بمقابلہ عمدہ کتوں کے بدتر ہو جائیں گے نا ؟"

پ۔ "اس میں کیا شک ہے"

س۔ "اسی اصول کو مدنظر رکھ کر کیا ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ آدمی بھی نقصان اٹھا کر انسانی فضیلت کی ترازو میں ہلکا پڑ جاتا ہے"

پ "بیشک ہم کہہ سکتے ہیں"

س۔ "کیا انصاف ایک انسانی فضیلت نہیں ہے۔

پ "ضرور ہے"

سے تصور نہیں کرتے ؟"

پ۔ "ضرور کرتے ہیں"

س۔ "تو ایسے لوگوں کے نزدیک نیک انکے دشمن اور بد انکے دوست ٹھہرے ؟"

پ۔ "بیشک ایسا ہی ہوا"

س۔ "اور ظاہر ہے کہ ایسے اشخاص کو ایسے مواقع پر بدوں کی اعانت اور نیکوں کی نقصان رسانی عین انصاف ہے"

پ۔ "بظاہر تو ہے"

س۔ "مگر اس میں بھی کوئی کلام نہیں کہ نیک لوگ منصف ہوتے ہیں اور بے انصافی انکی فطرت سے دور ہے"

پ۔ "بیشک"

س۔ "تو اب تمھارے مسئلہ کے مطابق کوئی شخص جو بے انصافی نہ کرے اسکو نقصان پہونچانا عین انصاف ہے"

پ۔ "نہیں معاذاللہ! استغفراللہ! یہ آپ کیا کہتے ہیں۔ یہ تو بہت برا مسئلہ ہے" ہے

س۔ "تب اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ غیر منصف کو نقصان پہونچانا اور منصف کی اعانت عین انصاف

پ۔ "البتہ یہ مسئلہ پہلے مسئلہ سے بہتر معلوم ہوتا ہے۔"

س۔ "تو پالیمارکوس اس صورت میں نتیجہ یہ ہوگا کہ اُن معاملات میں جن میں لوگوں نے اپنے دوستوں اور دشمنوں کے انتخاب میں غلطی کی ہے اُن لوگوں کو جن کے حق میں غلطی کی گئی ہے اپنے دوستوں کو نقصان پہونچانا انصاف ہوگا کیونکہ اُنکے نزدیک وہ بد ہیں۔ اور اسی طرح اپنے دشمنوں کی اعانت کرنا بھی انصاف ہوگا کیونکہ اُنکے نزدیک وہ نیک ہیں۔ اور اب یہ ہمارا استدلال اُس چیز سے بالکل مغائر ہوگا جسکو ہم سایا نیڈیز کی طرف منسوب کرتے ہیں۔"

پ۔ "نتیجہ تو یہ ضرور نکلتا ہے مگر اب مجھ کو اجازت دیجیے کہ دوست اور دشمن کی تعریف میں کچھ تغیر تبدل کروں کیونکہ وہ غلط معلوم ہوتی ہے۔"

س۔ "شوق سے کرو مگر یہ بتاؤ کہ تمہاری ابتدائی تعریف کیا تھی؟"

پ۔ "یہ کہ دوست وہ ہے جو بظاہر نیک معلوم ہو۔"

س۔ "اور اب دوست کی تعریف کیا کروگے؟"

پ۔ "یہ کہ دوست وہ ہے جو نہ صرف بظاہر نیک ہو بلکہ دراصل بھی نیک ہو۔ اور وہ لوگ جو بظاہر میں نیک معلوم ہوتے ہیں، مگر اصل میں نہیں ہیں وہ دراصل دوست نہیں ہیں بلکہ ظاہری کہے جا سکتے ہیں۔ علیٰ ہذا دشمن کی تعریف بھی اسی اصول پر ہوگی۔"

س۔ "تو اس تعریف سے نیک آدمی یقیناً دوست ٹھہرا اور بد آدمی دشمن۔"

پ۔ "جی ہاں۔"

س۔ "اس جدید تعریف سے یہ بات لازم آئے گی کہ انصاف کی تصویر میں ایک اضافہ کرنا ہوگا جو پیشتر ضروری نہ تھا۔ یعنی تعریف اول کے بموجب انصاف ہم دوستوں کے ساتھ نیکی اور دشمنوں کے ساتھ برائی کو سمجھتے تھے۔ اور اب اس نئی تعریف کی رو سے تمہارے خیال کے بموجب یوں کہنا ہوگا "انصاف سے مطلب ہے دوستوں کے ساتھ نیکی کرنا اگر وہ نیک ہوں اور دشمنوں سے برائی کرنا اگر وہ بد ہوں۔"

پ۔ "جی ہاں۔ جی ہاں۔ یہی میرا مطلب ہے جسکو آپ نے نہایت صحیح الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔"

س۔ "اب میں تم سے یہ پوچھتا ہوں کہ کسی کو نقصان پہونچانا منصف آدمی کا کام ہے یا نہیں؟"

پ۔ "بے شک ہے۔ یعنی جو لوگ بد ہیں اور دشمن بھی ہیں اُن کو نقصان پہونچانا منصف کا فرض ہے۔"

س۔ "اب یہ بتاؤ کہ گھوڑے نقصان کی وجہ سے بہتر ہوتے ہیں یا بدتر؟"
پ۔ "بدتر"
س۔ "یعنی کتوں یا خود اپنی صنف، گھوڑوں کی عمدگی کے مقابلہ میں؟"
پ۔ "گھوڑوں کے مقابلہ میں"
س۔ "اسی طرح کتے نقصان اٹھا کر بمقابلہ عمدہ کتوں کے بدتر ہو جائیں گے نا؟"
پ۔ "اس میں کیا شک ہے"
س۔ "اسی اصول کو مدنظر رکھ کر کیا ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ آدمی بھی نقصان اٹھا کر انسانی فضیلت کی ترازو میں ہلکا پڑ جاتا ہے"
پ "بیشک ہم کہہ سکتے ہیں۔
س۔ "کیا انصاف ایک انسانی فضیلت نہیں ہے
پ "ضرور ہے۔
س "تو اس سے میرے دوست یہ نتیجہ نکلا کہ نقصان رسیدہ لوگ فضیلت انصاف میں ادنیٰ تر ہو جاتے ہیں"
پ "نتیجہ تو یہی نکلتا ہے"
س "کیا یہ ممکن ہے کہ ایک موسیقی داں اپنی موسیقی کے زور سے لوگوں کو بے سرا کر دے؟"
پ۔ "جی نہیں"
س۔ "اسی طرح گھوڑے کی سواری سکھلانے والے اپنے فن کے ذریعہ سے لوگوں کو برا سوار نہیں بنا سکتے"
پ۔ "جی نہیں"
س۔ "اگر ایسا ہے تو کیا ایک منصف اپنے انصاف کے ذریعہ سے لوگوں کو غیر منصف بنا سکتا ہے۔ یا بالفاظ دیگر کیا ایک نیک شخص اپنی نیکی کے ذریعہ سے لوگوں کو بد بنا سکتا ہے؟"
پ۔ "جی نہیں۔ یہ بالکل ناممکن ہے"
س۔ "تم سچ کہتے ہو۔ اس وجہ سے کہ ٹھنڈا کرنا برودت کی خاصیت ہے نہ کہ بالعکس حرارت کی"
پ۔ "جی ہاں اور کیا"

س۔ "اسی طرح مرطوب کرنا رطوبت کی خاصیت ہے نہ کہ بالعکس یبوست کی۔"

پ۔ "بیشک۔"

س۔ "تو نقصان پہونچانا بھی بدی کی خاصیت ہے نہ کہ بالعکس نیکی کی۔"

پ۔ "اس میں کیا کلام ہے۔"

س۔ "اچھا اب یہ بتاؤ کہ منصف نیک ہوتا ہے نہ؟"

پ۔ "جی ہاں ضرور۔"

س۔ "تو دوست کیا کسی مخلوق کو نقصان پہونچانا منصف کی نہیں بلکہ اُسکے عکس غیر منصف کی خاصیت ہوئی۔"

پ "آپ بالکل صحیح کہتے ہیں۔"

س۔ "ہماری اس پوری بحث کا یہ نتیجہ نکلا کہ اگر کوئی یہ کہے کہ ہر شخص کو اُسکا حق دینا انصاف ہے۔ اور انصاف سے اُس کا یہ مطلب ہو کہ دوستوں کو فائدہ اور دشمنوں کو نقصان ہونچایا جائے تو یہ دعویٰ غلط ہے۔ کیونکہ ہم ابھی دیکھ چکے کہ کسی کو بھی نقصان پہونچانا انصاف نہیں ہے۔"

پ۔ "میں تسلیم کرتا ہوں، کہ آپ کا استدلال بالکل صحیح ہے۔"

س۔ "تو اب مجھ کو اور تم کو بالاتفاق اُس شخص کی مخالفت کرنا ضروری ہے جو مسئلہ مذکورہ بالا کو سائمانیڈیز[1] یا بیاس[2] یا پٹاکوس[3] یا کسی دوسرے فلسفی کی طرف منسوب کرے۔"

پ۔ "بہت ٹھیک۔ میں مخالفت کے لیے تیار ہوں۔"

س۔ "پولیمارکوس! تم کو معلوم ہے کہ اس مسئلہ کا کہ "دوستوں کو فائدہ اور دشمنوں کو نقصان ہونچانا انصاف ہے۔" اصلی موجد میرے نزدیک کونسا شخص ہے؟"

پ "جی نہیں۔ ارشاد فرمایئے۔"

---

[1] دیکھو نوٹ صفحہ ا

[2] سات عقلاے یونان میں ہے۔ زمانہ تقریباً ۶۰۰ قبل مسیح۔

[3] یہ بھی سات عقلاے یونان میں ہے۔ قدیم شہر مٹیلین کا باشندہ اور شاعر سیفو کا ہمعصر تھا۔ بالآخر یہ مٹیلین کا بااختیار حاکم ہو گیا تھا۔ زمانہ تقریباً ۶۰۰ قبل مسیح۔

س میرے خیال میں اس کا اصلی موجد پیری اینڈر[1] یا پرڈیکاس[2] یا زرکسیز[3] یا اسمینیاس[4] باشندہ ایتھنز یا کوئی اور دولتمند شخص ہے جو اپنے تئیں بڑا صاحب اقتدار سمجھتا تھا۔

پ - "آپ کا خیال بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے۔"

س "اچھا تو چونکہ اب تک ہم انصاف کی صحیح تعریف تک نہیں پہونچے لہذا ہمکو دیکھنا چاہیے کہ کوئی دوسری تعریف کیا ہو سکتی ہے۔"

جب ہم دونوں آدمی بحث میں مشغول تھے ہم برابر یہ دیکھ رہے تھے کہ تھریسیماکوس[5] بار بار مباحثہ میں مزاحم ہوتا اور کوئی اعتراض کرنا چاہتا ہے مگر ہر دفعہ وہ لوگ جو قریب بیٹھے تھے اور بحث کو آخر تک سننا چاہتے تھے اُس کو روکتے تھے - جوں ہی میں نے مذکورہ بالا آخری کلمہ ختم کیا اور تھوڑی دیر کے لیے جلسہ میں ایک خاموشی سی ہو گئی - تھریسیماکوس سے ضبط نہ ہو سکا - اور اب وہ ہم پر مثل ایک وحشی جانور کے جھپٹ پڑا - گویا وہ ہم کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیگا - میں اور پولیمارکوس دونوں متعجب اور خوفزدہ ہو گئے اور تھریسیماکوس نے سخت غصہ کے لہجہ میں ہم دونوں کو مخاطب کر کے کہا تھا - "سقراط تم کو اور پولیمارکوس تم کو کیا خبط سوار ہو گیا ہے - اور کیا حماقت تمہاری اُس استمالت سے مترشح ہے جو اثنائے بحث میں تم نے برتی - اگر تم کو فی الحقیقت انصاف کی نوعیت سمجھنا ہے تو سوالات ہی پر اپنی بحث کو محدود نہ کرو اور اپنے جواب اور جواب الجواب میں مختلف الفاظ کے الٹ پھیر سے ایک قسم کی علمی پھینکیتی کا ہم لوگوں کو تماشہ نہ دکھاؤ - یاد رکھو کہ سوال کرنا جواب دینے سے زیادہ آسان ہے - جس طرح ہم سے سوال پوچھتے ہو ہم کو جواب بھی دو اور ہم کو بتاؤ کہ خود تمہارے نزدیک انصاف کیا چیز ہے - مگر ایک بات کا ضرور خیال رکھو کہ انصاف کی اس قسم کی تعریف نہ ہونا چاہیے کہ وہ ایک فرض ہے یا وہ فائدہ بخش یا نفع رساں ہو یا وہ حصول زر کے لیے مفید ہے یا وہ کسی مصلحت پر مبنی ہے - اور جو کچھ اسکی تعریف تم پیش کرو نہایت

---

[1] کارنتھ کا بااختیار بادشاہ تھا - زمانہ تقریباً ۶۰۰ ق م

[2] - اس نام کے دو بااثر اور زبردست یونانی بادشاہ گذرے ہیں - زمانہ پانچویں اور چوتھی صدی ق م -

[3] ایران کا زبردست اور مشہور تاجدار تھا - قدیم فارسی مورخ اسکو اسفندیار کہتے ہیں - یونانیوں کا سخت دشمن تھا - اس کا یونان کا حملہ مشہور ہے - بحری جنگ سلامس میں اس نے اپنی فوج اور جہازوں کی تباہی اپنی آنکھ سے دیکھی زمانہ ۴۸۵ تا ۴۶۵ ق م

[4] نامعلوم

[5] کلسیڈان کا ایک سفسطائی تھا - زمانہ تقریباً ۴۰۰ ق م - افلاطون نے اسکو اس مکالمہ میں اس مسئلہ کا حامی قرار دیا ہے کہ "قوت اصل حق ہے" جیسا کہ آگے ظاہر ہوگا -

صاف اور ٹھیک ٹھیک الفاظ میں کرو۔ کیونکہ میں تمہارے کسی جواب کو ہرگز قبول نہ کروں گا اگر اُس میں اس قسم کی لغویت ہوگی جو ہم ابھی سُن چکے ہیں۔"

جب ہم لوگ اس تقریر کو سُن چکے تو میں سخت متحیر ہوا اور خوف زدہ ہو کر مقرر کو دیکھنے لگا اور اگر میری آنکھ اُس پر پہلے نہ پڑ جاتی تو شاید خوف کے مارے میری گھگھی بندھ جاتی۔ اور میرے منہ سے کچھ نہ نکل سکتا[1]۔ مگر جس وقت وہ غصہ سے سخت مشتعل ہو رہا تھا، میں نے اُسکے چہرہ کو پہلے دیکھ لیا قبل اس کے کہ وہ مجھ کو دیکھے اور خوف سے تھرتھرائی ہوئی آواز میں میں نے جواب دیا۔

س۔ "تھراسیماکوس! اس قدر غصہ اور درشتی ہم پر نہ کرو۔ اگر مجھ سے اور پولیمارکوس سے بحث کے اثنا میں مسئلہ کے بیان کرنے میں غلطیاں ہوگئی ہیں تو یقین مانو کہ وہ غلطیاں بالارادہ نہ تھیں۔ اگر ہم ایک گم شدہ اشرفی کو ڈھونڈھنے نکلیں تو تلاش کے اثنا میں ہم ایک دوسرے کی ایسی استمالت ہرگز نہیں کر سکتے کہ نفس معاملہ میں ہم سے کسی قسم کی پہلوتہی ہو جائے اور گوہر مراد یعنی وہ اشرفی ہمارے ہاتھ سے جاتی رہے۔ پھر انصاف ایسی بیش بہا چیز، جو ایک سونے کے ٹکڑے سے کہیں زیادہ قیمتی ہے اُس کی جستجو میں ہم کیونکر ایسی کمزوری دکھلا سکتے ہیں جسکا الزام تم ہم پر عائد کرتے ہو۔ میرے عزیز دوست۔ تم کو اختیار ہے جو چاہو میری نسبت خیال کرو مگر میں تم سے صاف کہدوں، میرے نزدیک اس مسئلہ کا حل ہماری قوت سے باہر ہے۔ لہذا تم ایسے لائق شخص کو چاہیئے تھا کہ ہماری اس بے استطاعتی پر رحم کرتے نہ کہ غصہ۔"

تھراسیماکوس نے میری تقریر سن کر زور سے قہقہہ مارا اور کہنے لگا

ت۔ "او ہرکیولیز[2]! یہ سقراط کی بناوٹی عاجزی کی ایک مثال ہے۔ میں جانتا تھا کہ یہی پیش آئے گا اور لوگوں سے کہدیا تھا کہ تم خود کسی دوسرے کے سوال کا جواب دینے سے قطعاً انکار کروگے، اپنی لاعلمی ظاہر کروگے، غرضکہ مختلف حیلوں سے اُسکے جواب سے بچوگے۔"

س۔ "تھراسیماکوس۔ تمہاری عقل و ذہانت میں کسی کو کلام نہیں۔ مگر تم اگر کسی سے پوچھو

---

[1] یونانیوں کا اعتقاد تھا کہ بھیڑیے کی آنکھ میں ایک قسم کا مقناطیسی اثر ہوتا ہے۔ اگر وہ کسی آدمی کو پہلے دیکھ لے اور آدمی بعد کو اُسکو دیکھے تو آدمی گونگا ہو جاتا ہے۔ سقراط کا اشارہ اسی کی جانب ہے اور ورجل شاعر نے بھی اسکا ایک نظم میں ذکر کیا ہے۔

[2] ہرکیولیز قدیم الایام کا ایک بہت مشہور ہیرو گذرا ہے۔ یونانیوں کے نزدیک اس سے بڑھ کر کوئی شہزور اور بہادر نہیں تھا۔ اسکے بارہ معرکے یا کارنامے ہیں جو انگریزی میں 'لیبرز' کہلاتے ہیں۔ اسکی شہرت یونانیوں میں ایسی ہی تھی جیسی ایرانیوں میں رستم کی۔ "او ہرکیولیز" بطور قسم کے استعمال ہوا ہے جیسے "واللہ"۔

کہ نمبر ۱۲ کے اجزا کیا ہیں - اور ساتھ ہی یہ بھی کہدو کہ خبردار جواب میں نہ کہنا کہ نمبر ۱۲ نمبر ۶ کا دوگنا یا ۴ کا تگنا یا ۳ کا چوگنا یا ۲ کا چھ گنا ہے - اور اگر یہ مہمل جواب کوئی دیگا تو میں ہرگز قبول نہ کروں گا - تو تم بخوبی جان سکتے ہو کہ ایسے سوال کا جواب دینے کی کوئی بھی جرأت نہ کرے گا - مگر فرض کرو کہ مجیب تم سے یہ کہے کہ اپنا مطلب آپ براہ مہربانی صاف الفاظ میں بیان فرمایئے کیا یہ جوابات جو آپ نے خود رد کردیے ہیں اگر ان میں سے کسی کے دینے کی مجھکو اجازت نہیں ہے تو جناب پھر میں کیا کہوں - ان میں سے کوئی جواب اگر صحیح بھی ہے اور اُس کو پیش کرنے کی آپ مجھ کو اجازت نہیں دیتے تو کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ میرا جواب صحت سے دُور جا پڑے یا اس کے سوا آپ کا کچھ اور مطلب ہے؟ تو بتاؤ تم اس کا کیا جواب دو گے ؟"

ت :" کیا خوب ! کیا یہ دونوں صورتیں تمھارے نزدیک برابر ہیں ؟"

س :" میرے نزدیک تو کوئی فرق نہیں ہے - بالفرض اگر کوئی فرق ہو بھی تب بھی ان جوابوں میں سے کوئی جواب اگر مجیب کے نزدیک صحیح ہو تو کیا کسی کی ممانعت یا عدم ممانعت سے اُسکے اس فیصلۂ ذہنی پر اثر پڑے گا کہ فلاں جواب صحیح ہے لہذا میں اُسکو ضرور دوں گا ؟"

ت :" کیا اس گفتگو سے تمھارا یہ مطلب ہے کہ تم بھی ایسا کرنے والے ہو - اور کیا تم بھی اُن جوابوں میں سے جنکو میں نے رد کردیا ہے کوئی ایک جواب دو گے ؟"

س :" کوئی تعجب کی بات نہیں اگر میں ایسا کروں، اور بعد کامل غور و فکر کے مجھکو ایسا کرنا واجبی معلوم ہو "

ت :" تب بتاؤ مسئلۂ انصاف کے متعلق اگر میں ایک ایسا جواب پیش کردوں جو اُن سب سے علحدہ اور اُن سب سے بہتر ہو جن کو میں نے رد کردیا ہے تو تمھارے واسطے کونسی سزا تجویز کیجائے ؟"

س :" وہی سزا جسکا میرے نزدیک ایک جاہل مستحق ہے یعنی حصول معرفت بذریعہ ایک عالم کے. بس اسی سزا کا میں بھی جاہلوں کے ساتھ سزاوار ہوں "

ت :" سقراط ! تم بھی کس قدر بامذاق آدمی ہو - مگر علاوہ حصول معرفت کے تم کو کچھ دینا بھی ہوگا "

س :" میں ضرور دونگا مگر جب میرے پاس روپیہ ہوگا "

گ :" تمھارے پاس روپیہ ہے - تھریسیماکوس جہاں تک روپیہ کا تعلق ہے تم بحث کیے جاؤ - ہم سب سقراط کی طرف سے دینے کو تیار رہیں "

ت - "کیا خوب! تاکہ سقراط اپنی پرانی چال جواب سے بچنے اور دوسروں کی تقریر کاٹنے یا اُس پر اعتراض جمانے کی نہایت کامیابی سے جاری رکھیں۔"

س - "میرے عزیز دوست! یہ بتاؤ کہ کوئی شخص ایسی صورت میں کیونکر جواب دے سکتا ہے جب وہ اوّلاً صحیح جواب دینا نہ جانتا ہو اور اقبال بھی کرتا ہو کہ میں نہیں جانتا۔ اور ثانیاً اگر وہ کچھ جانتا بھی ہو اور کچھ کہنے کی جرأت بھی کرے تو تم ایسا قابل شخص اس پر قدغن کر دے۔ پس ایسی صورت میں مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ مقرر تم ہی بنو۔ کیونکہ نفس مسئلہ سے واقفیت کا تم کو دعویٰ ہے اور تقریر کے خواہشمند بھی تم ہو۔ لہٰذا میری اس گذارش کو نامنظور نہ کرو اور ہم سب کی معلومات اور معرفت میں اضافہ کرو۔"

میرے ساتھ گلوکان اور اور لوگوں نے بھی تھراسیماکوس سے اصرار کرنا شروع کیا اور کہا کہ تقریر آپ ہی شروع کیجیے۔ کیونکہ یہ معلوم ہو گیا کہ تھراسیماکوس خود تقریر کرنے کا اور اُسکے ذریعہ سے لوگوں کی تعریفیں حاصل کرنے کا مشتاق ہے۔ اس وجہ سے کہ وہ اپنے جواب کو جو اُس کے دل میں تھا اور اُس وقت تک ظاہر نہ کرتا تھا، انوکھا اور نہایت اعلیٰ درجہ کا خیال کرتا تھا مگر اس پر بھی اُس نے یہی کہا کہ سلسلۂ کلام میری طرف سے شروع ہو۔ بالآخر راضی ہو گیا اور کہنے لگا:-

ت - "یہ سقراط کی چالاکی ہے۔ کیونکہ وہ کسی کو معرفت دینا نہیں چاہتے، بلکہ خود لوگوں سے حاصل کرنا چاہتے ہیں، اور پھر بھی کسی کا احسان نہیں مانتے۔"

س - "تمہارا پہلا جملہ یعنی میں اور لوگوں سے حصول معرفت کا خواہشمند ہوں، ضرور صحیح ہے۔ دوسرا جملہ یعنی میں کسی کو اُسکی معرفت کے صلہ میں کچھ نہیں دیتا غلط ہے۔ کیونکہ جو کچھ میں دے سکتا ہوں ضرور دیتا ہوں۔ اور چونکہ میرے پاس روپیہ موجود نہیں ہے اس سے خراج تعریف دیتا ہوں۔ اور تم خود دیکھ لوگے کہ یہ میرا دعویٰ کس قدر صحیح ہے۔ کیونکہ تمہارے جواب کی، اگر وہ میرے نزدیک صحیح ہوا، میں دل سے تعریف کروں گا۔ اور مجھکو امید ہے کہ تمہارا جواب ضرور اعلیٰ درجے کا ہو گا۔"

ت - "اگر تم میرا جواب سننے کے اس قدر مشتاق ہو تو سنو۔ میری رائے میں انصاف صرف توی تر کے فائدہ کا نام ہے۔ اور کچھ نہیں۔ لو اب میری تعریفیں کرنا شروع کرو۔ کیا تم کو اس سے انکار ہے؟"

س "نہیں، مگر میں پہلے تمہارا مطلب اچھی طرح سمجھنا چاہتا ہوں جو اب تک میری سمجھ میں نہیں آیا۔ تم نے ابھی کہا کہ انصاف قوی تر کے فائدہ کا دوسرا نام ہے۔ تھراسیماکوس فدا را بتاؤ کہ اس تعریف سے تمہارا کیا مطلب ہے؟ یہ تو ہرگز ہو نہیں سکتا کہ پہلوان پالیڈیماس جو ہم سب سے زیادہ قوی ہے اگر اُس کے بدن کی قوت بڑھانے میں گائے کا گوشت اُسکو مفید پڑتا ہے تو ہم ایسے کمزور لوگوں کی قوت بڑھانے میں بھی کیا وہ مفید ہوگا، اور اس لیے کیا اُس کا استعمال ہمارے واسطے ترین انصاف ہوگا؟"

ت: "سقراط، تم غضب کرتے ہو۔ میرے مسئلہ کو تم بخوبی سمجھتے ہو، مگر جان بوجھ کر اُس سے اغماض کرتے ہو اور اُسکو ایسے الفاظ میں بیان کرتے ہو جس سے اُس پر اعتراض بہت آسانی سے وارد ہو سکتا ہے۔"

س۔ "نہیں ایسا تو نہیں ہے۔ مہربانی کر کے اپنا مطلب صاف طور پر بیان کرو۔"

ت۔ "کیا تم کو نہیں معلوم کہ بعض شہروں میں حکومت شخصی (فرد یا شخص کی حکومت) بعض میں جمہوری (جمہور یا عوام کی حکومت) اور بعض میں حکومت روسا (رئیسوں یا خواص کی حکومت) ہے؟"

س۔ "مجھکو خوب معلوم ہے۔"

ت۔ "تو پھر کیا ہر شہر میں قوت اعلیٰ یعنی حکومت اعلیٰ قوی تر کے ہاتھ میں نہیں ہوتی؟"

"بیشک ہوتی ہے۔"

"مزید براں ہر حکومت ایسے قوانین بناتی ہے جو اُسکے فوائد کے لیے موزوں ہوتے ہیں۔ جمہوری حکومت جمہوری قوانین، شخصی حکومت جابرانہ قوانین اور دیگر حکومتیں بھی اپنے فوائد کے لحاظ سے قوانین وضع کرتی ہیں۔ لہٰذا اس طرز عمل سے ہر حکومت اس امر کو تسلیم کر لیتی ہے کہ جو کچھ اُسکے فوائد کے مطابق ہے وہ اُسکی رعایا کے لیے بھی منصفانہ ہے۔ اسی لیے جو شخص اس اُصول سے انحراف کرتا ہے اُسکو وہ خلاف قانون اور خلاف انصاف قرار دے کر اُسکے لیے سزا تجویز کرتی ہے۔ اب حضور والا۔ میرا مطلب صاف ہو گیا۔ یعنی تمام اقسام کی حکومتوں میں جزو مشترک یعنی حکومت کا فائدہ انصاف کہلاتا ہے اور ظاہر ہے کہ حکومت ہی رعایا کے مقابلہ میں قوی تر ہے۔ لہٰذا صحیح نتیجہ یہ نکلا کہ قوی تر کا فائدہ ہر جگہ انصاف ہے۔"

س: "اب میں تمہارا مطلب سمجھا۔ اور اب یہ دیکھنا ہے کہ تمہارا دعوےٰ کہاں تک صحیح ہے اور کہاں تک غلط ہے۔ اس سے ایک بات ضرور صاف ہو گئی۔ یعنی یہ کہ تم خود اسکے قائل ہو کہ

انصاف ایک فائدہ ہے - حالانکہ اور لوگوں کو تم نے اس تعریف سے منع کیا تھا[1]، البتہ اس میں ایک اضافہ کر دیا یعنی اُسکو قوی تر کا فائدہ قرار دیا"

ت - "یہ سچ ہے مگر یہ تو ایک خفیف سا اضافہ ہے"

س - "یہی تو دیکھنا ہے کہ یہ ایک خفیف سا اضافہ ہے یا ایک اہم چیز ہے - اب ہم تمھاری دلیل کی صحت کو جانچیں گے - یہاں تک تو ہم دونوں اعتراف کرتے ہیں کہ انصاف فائدہ سے وابستہ ہے، مگر تم اس میں اتنا جزو اور بڑھا دیتے ہو کہ وہ قوی تر کا فائدہ ہے - اس میں مجھکو کلام ہے - اور اسی وجہ سے اس مسئلہ کی تحقیق لازم آئی"

ت "مہربانی کر کے ضرور کیجیے"

س "ضرور کی جائے گی - اچھا یہ بتاؤ تم اس امر کو مانتے ہو کہ حاکموں کی اطاعت کرنا انصاف ہے؟"

ت "میں مانتا ہوں"

س "کیا ہر طرز حکومت میں حکام غلطی کرنے کی قابلیت رکھتے ہیں یا وہ غلطی نہیں کر سکتے؟"

ت "وہ غلطیاں ضرور کر سکتے ہیں"

س "اسکے یہ معنی ہوے کہ وضع قوانین میں کبھی اُنکا کام صحیح اور کبھی غلط ہو سکتا ہے؟"

ت "اس میں کیا شک ہے؟"

س "اب 'صحیح' اور 'غلط' سے یہی مطلب ہے کہ جو اُنکے فوائد کے مطابق ہو اُسکو صحیح کہیں گے اور جو مخالف ہو اُسکو غلط - یا کچھ اور؟"

ت "یہی مطلب ہے جو تم نے بیان کیا"

س "اور تم اسکے بھی قائل ہو کہ جو کچھ حکام وضع کریں اُسکی اطاعت رعایا کا فرض ہے - کیونکہ یہی انصاف ہے؟"

ت "بے شک میں اس کا قائل ہوں"

س "تو اس استدلال کے بموجب صرف قوی تر کا فائدہ ہی انصاف نہیں ہے بلکہ اُسکے

---

[1] صفحہ ۱۲ - انناظرہ جولائی ۱۹۲۳ء۔

فائدہ کا خلاف یعنی اُس کا نقصان بھی انصاف ہے۔"

ت "یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

س "میں وہی کہتا ہوں جو تم کہتے ہو۔ اچھا اب ہم اس نکتہ کو ذرا غور سے دیکھیں، کیا یہ تم نے ابھی تسلیم نہیں کیا کہ جب حکام اپنی رعایا پر بعض احکام جاری کرتے ہیں تو وہ اپنے فائدہ کے لحاظ سے بعض اوقات غلطی کے مرتکب ہو سکتے ہیں۔ اور پھر یہ نہیں کہا کہ جو احکام رعایا کے واسطے جاری کیے جائیں اُنکی تعمیل رعایا کو کرنا عین انصاف ہے۔ کیا یہ تم کو تسلیم نہیں ہے؟"

ت "یہ تو تسلیم ہے۔"

س "تو یہ میں تم سے کہے دیتا ہوں کہ جب تک تم اسکے قائل ہو کر رعایا کو تعمیل احکام اپنے حکام کی ہر حالت میں انصاف ہے اُس وقت تک تم اسکے بھی ضرور قائل ہوئے کہ حکام (قوی تر) کے فائدہ کے خلاف (یعنی قوی تر کے نقصان کے) احکام کی تعمیل بھی ہر حالت میں انصاف ہے جبکہ حکام مذکور اپنے فائدہ کے خلاف بلا ارادہ احکام جاری کریں۔ پس اے نہایت عقلمند تھراسیماکوس! کیا تمھارے اس استدلال سے خود تمھارے کلیہ کے برعکس نتیجہ نہیں نکلا اور کیا یہ نہیں ثابت ہوا کہ ضعیف تر کے واسطے قوی تر کے فائدہ کے خلاف کام کرنا فرض ہو جاتا ہے؟"

ت "اس میں کوئی شک نہیں۔ یہ نتیجہ تو ضرور نکلا۔"

کلائیٹو فون نے اس موقع پر کہا "بیشک اگر تم سقراط کی طرف سے گواہی دو۔"

پ "نہیں۔ ہم کو گواہوں کی ضرورت نہیں۔ تھراسیماکوس کو تو خود اعتراف ہے کہ حکام بعض وقت اپنے فائدہ کے خلاف احکام جاری کرتے ہیں۔ نیز یہ کہ انکی رعایا کو ایسے احکام ماننا عین انصاف ہے۔"

کل "نہیں۔ تھراسیماکوس کا یہ قول ہے کہ حاکموں کے احکام کی تعمیل انصاف ہے۔"

پ "کلائٹوفون تم سچ کہتے ہو۔ اور یہ بھی تو ان کا قول ہے کہ قوی تر کا فائدہ انصاف ہے۔ اور جب یہ دونوں قضیے قائم ہو گئے تو تیسرا امر یہ تسلیم شدہ ہے کہ قوی تر (حاکم) ضعیف تر (رعایا) سے بعض اوقات ایسے احکام کی تعمیل کراتا ہے جو خود اُس کے فائدہ کے خلاف ہیں۔ تو نتیجہ ان سب باتوں کا یہ نکلا کہ قوی تر کا فائدہ اور نیز اُس کا نقصان دونوں انصاف ہیں۔"

کل یہ کہ اگر قوی تر کے فائدہ سے اُنکا (تھراسیماکس کا) مطلب ہے وہ چیز جسکو قوی تر اپنے واسطے مفید خیال کرے - اور اُنکا دعویٰ صرف اسی قدر ہے کہ ضعیف تر کو اسکی تعمیل ضرور کرنا چاہیے۔ اور یہی انصاف ہے"

پ "نہیں یہ تو اُنکے الفاظ نہیں تھے"

س "پولیمارکوس! اس بحث سے کوئی فائدہ نہیں - اگر تھراسیماکوس اپنے دعوے کو اب اُن الفاظ میں بیان کرنا پسند کرتے ہیں تو ہم کو کوئی اعتراض نہیں وہ شوق سے بیان کریں۔ تھراسیماکوس! کیا انصاف کی تعریف تم نے یہ کی تھی کہ جو چیز قوی تر اپنے فائدہ کے واسطے خیال کرے عام اس سے کہ وہ دراصل اُسکے فائدہ کی ہو یا نہ ہو اور کیا ہم اس ترمیم شدہ تعریف کو اب تمہارا دعوے خیال کریں؟"

ت "نہیں ہرگز نہیں - کیا تمہارے نزدیک ایسے آدمی کو جو غلطی کر رہا ہے غلطی کے ارتکاب کے وقت بھی میں قوی تر سمجھوں گا؟"

س "جب تم نے یہ تسلیم کر لیا کہ حکام غلطی کر سکتے ہیں تو میں یہی سمجھا"

ت "سقراط! تم الفاظ کے اُلٹ پھیر کے اُستاد ہو - بتاؤ کہ تم اس شخص کو جو کسی مریض کے علاج میں غلطی کرے، اُس غلطی کے اعتبار سے طبیب کہو گے؟ اسی طرح اُس شخص کو جو کسی حساب کتاب میں غلطی کرے اُس غلطی کے اعتبار سے محاسب کہو گے - گو کہ ہم سب عام بول چال میں کہتے ہیں کہ طبیب نے علاج میں یا محاسب نے حساب میں غلطی کی مگر میری رائے میں اِن دونوں صورتوں میں وہ شخص من حیث الفن غلطی نہیں کر سکتا - لہذا صحیح الفاظ میں، کیونکہ تم صحت الفاظ کے بڑے دلدادہ ہو، میں یوں کہوں گا کہ کوئی اہل فن غلطی کر نہیں سکتا - اس وجہ سے کہ غلطی بوجہ عدم علم کے ہوتی ہے - لہذا غلطی کا مرتکب اُس حد تک اہل فن ہی نہیں - پس کوئی شخص خواہ وہ اہل فن ہو یا فلسفی یا حاکم ہو غلطی نہیں کر سکتا جب تک وہ اہل فن یا فلسفی یا حاکم ہونے کا مدعی ہے - ہر چند کہ عام طور پر یہ ضرور کہا جائے گا کہ فلاں طبیب یا فلاں حاکم نے غلطی کی - اس معنی میں تم کو میرے گذشتہ جواب کو سمجھنا چاہیے تھا - ہر طور صحت الفاظ کے ساتھ وہ جواب یوں ہوگا کہ کوئی حاکم من حیث الحاکم غلطی نہیں کر سکتا - پس من حیث الحاکم وہ جو کچھ حکم دے گا اپنے فائدہ کے لیے دے گا اور اُسی کی تعمیل اُسکی رعایا پر فرض ہوگی - لہذا میں بجز

وہی کہوں گا کہ قوی تر کے فائدہ کے واسطے جو کچھ کیا جائے وہ انصاف ہے۔

س ”بہت معقول - تھراسیماکوس! کیا تم مجھ کو الفاظ کے الٹ پھیر کا اُستاد خیال کرتے ہو؟

بہت بڑا اُستاد“

س۔ ”کیا تم خیال کرتے ہو کہ میں تم سے سوال صرف اس نیت سے کرتا ہوں کہ تم بحث میں ایک مغلطہ میں پڑ جاؤ؟

ت۔ ”اس میں شبہ کیا ہے - بہر خدا سقراط تم کو اس چال سے بھی کوئی فائدہ نہ ہوگا - نہ تم مجھکو کسی خفیہ دھوکے سے مغلطہ میں ڈال سکتے ہو نہ کسی علانیہ دلیل سے معقول کر سکتے ہو“

س۔ ”میرے عزیز دوست - میرا ہرگز ایسا ارادہ نہیں ہے - خیر تاکہ پھر اس قسم کی غلط فہمی نہ واقع ہو مہربانی کرکے صاف طور پر یہ کہدو کہ تمہارے اس جملہ میں کہ ”ضعیف تر کے واسطے وہ چیز کرنا جو حاکم یا قوی تر کے فائدہ کی ہو عین انصاف ہے“ لفظ حاکم“ اور ”قوی تر“ تم معمولی اور عام فہم معنوں میں استعمال کرتے ہو یا اُن اصلی اور صحیح معنوں میں جن کا تم نے ابھی ذکر کیا؟“

ت۔ ”میں یہ لفظ بالکل اصلی اور صحیح معنوں میں استعمال کرتا ہوں - لہذا اب آپکے جتنا جی چاہے الفاظ کو اُلٹیے پلٹیے مجھ کو اسکی کچھ پرواہ نہ ہوگی“

س۔ ”کیا میں ایسا خبطی ہوں کہ شیر سے کھیلوں یا تھراسیماکوس اتنے بڑے حکیم سے الفاظ میں دھوکہ بازی کروں“

ت۔ ”ارادہ تو آپ کا ایسا ہی تھا، گو آپ کی حیلہ بازی چل نہ سکی“

س۔ ”اب مذاق موقوف کرو اور اتنا بتاؤ کہ اُس طبیب سے جس کو تم نے صحیح معنوں میں طبیب ٹھہرایا تھا، تمہاری مراد روپیہ پیدا کرنے والا ہے یا مریضوں کو صحت دینے والا؟“

ت ”مریضوں کو صحت دینے والا“

س۔ ”اور صحیح معنی میں جہازراں سے کیا مراد ہے - ملاح یا ملاحوں کا حاکم؟“

ت ”ملاحوں کا حاکم“

س۔ ”اس سے تو کوئی مطلب نہیں کہ وہ جہازراں جہاز پر بھی ہو کیونکہ وہ اپنی موجودگی جہاز سے نہیں بلکہ اس وجہ سے جہازراں کہلاتا ہے کہ وہ جہازرانی کا فن جانتا ہے اور ملاحوں پر حکومت رکھتا ہے۔

ت ": سچ ہے:"

س - "تو پھر ان میں سے ہر ایک شخص اپنا ذاتی فائدہ بھی رکھتا ہے یا نہیں؟"

ت - "بے شک رکھتا ہے"

س - اور انکے فن کی کیا یہ غرض نہیں ہے کہ وہ اپنے نفع کے جویا ہوں"

ت - بیشک ہے"

س - کیا مختلف فنوں کی کوئی اور غرض بھی ہو سکتی ہے سوائے اسکے کہ انہیں فنوں میں انتہائی کمال پیدا کیا جائے:

ت - اس سوال سے آپ کا کیا مطلب ہے؟

س - میرا یہ مطلب ہے کہ بالغرض اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ آیا جسم انسانی بحیثیت جسم کے کامل ہے یا اسکو کسی مزید چیز کی ضرورت ہے، تو میں یہ ضرور کہوں گا کہ اسکو ضرورت ہے - چنانچہ اسی اصول کی بنا پر فن طب کی ایجاد ہوئی، اسوجہ سے کہ چونکہ جسم انسانی ناقص ہے یعنے بحیثیت جسم وہ کافی و کامل نہیں ہے لہذا فن طب جو جسم انسانی کی بیرونی اغراض کو پورا کرتا ہے وجود میں آیا - مجھ کو امید ہے کہ اب میرا مطلب آپ کے ذہن نشین ہو گیا ہو گا -

ت - آپ کا خیال صحیح ہے -

س - تو اب یہ صورت ہوئی کہ کیا فن طب بالذات ناقص ہے یعنی وہ کسی مزید مدد کا خواستگار ہے یا نہیں - مثلاً آنکھ کا کام دیکھنا ہے اور کان کا سننا تو ان اعضا کو ایک ایسے فن کی یقینی ضرورت ہے جو انکی اغراض کی تحقیق کریں اور انکو نفع پہونچائیں - پس میں پوچھتا ہوں کہ کسی فن میں بحیثیتِ فن کوئی نقص ہے یا نہیں اس طرح کہ وہ اپنے اغراض کی ترقی اور فائدہ کے واسطے کسی دوسرے فن کا محتاج ہو اور یہ دوسرا فن اسی طرح کسی تیسرے فن کا محتاج الی غیر نہایہ - یا یہ صورت ہے کہ وہ فن اپنی اغراض کی آپ تحقیق کرتا ہے اور انکو فائدہ پہونچاتا ہے - یا کسی فن کے واسطے یہ بالکل غیر ضروری ہے کہ وہ اپنے نقائص اور انکے علاج کی تحقیق اور تلاش کرے کیونکہ اس میں کسی قسم کے نقائص ہیں ہی نہیں، نیز اس لیے کہ کسی فن کا من حیث، فن یہ کام نہیں ہے کہ وہ سوائے اپنے کسی دوسرے فن کے فوائد کی تلاش کرے اور خود وہ حقیقی معنوں میں ہر قسم کے نقائص اور معائب سے پاک ہے - اب اس سوال کو

جیسا کہ ہم سے آپ سے طے ہوا ہے الفاظ کے صحیح صحیح معنوں میں غور سے دیکھیے اور فرمایئے کہ ایسا ہے یا نہیں۔

ت۔ بظاہر تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔

س۔ تو اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ فن طب کو اپنے خاص فوائد یعنی فن طب کے فوائد کا خیال نہ رکھنا چاہیے بلکہ جسم انسانی کے فوائد کا خیال رکھنا چاہیے۔

ت۔ جی ہاں۔

س۔ اور فن شہسواری کو فن شہسواری کے فوائد کا خیال نہ رکھنا چاہیے بلکہ گھوڑوں کے فوائد کا اور اسی طرح کسی فن کو خود اپنے ذاتی فوائد کا خیال نہ رکھنا چاہیے (اس وجہ سے کہ وہ تو خود مکمل ہی ہے) بلکہ کسی شے کا جس سے کہ اُس فن کا تعلق ہے۔

ت۔ بظاہر تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔

س۔ تو اب آپ یقیناً اس بات کو تسلیم کریں گے کہ ہر فن اپنے موضوع سے یعنی اُس چیز سے کہ جس سے اُس کا تعلق ہوتا ہے قوی تر ہوتا ہے۔

تھراسیماکوس نے اس مسئلہ کو قبول کیا مگر کسی قدر پس و پیش کے ساتھ۔ اسکے بعد سقراط نے کہا کہ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ کوئی فن یا علم اپنے سے قوی تر کے فوائد کی تحقیق اور تلاش نہیں کرتا بلکہ اپنے موضوع کی جو اس سے ضعیف تر ہے۔

اس اصول کو بھی تھراسیماکوس نے نہایت دقت کے ساتھ بالآخر تسلیم کیا۔ جب یہ اصول تسلیم ہو گئے تو سقراط نے کہا کہ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ کوئی طبیب بحیثیت طبیب اپنے ذاتی فوائد کا خیال نہیں رکھتا بلکہ اپنے مریض کے فائدہ کا خیال رکھتا ہے۔ اس وجہ سے کہ ابھی ہم تسلیم کر چکے ہیں کہ ایک حقیقی طبیب جسم انسانی کا حکمران یعنی اس سے قوی تر ہے نہ کہ محض کسب زر کرنے والا۔

ت۔ البتہ یہ تسلیم ہے۔

س۔ اسی طرح ایک جہاز راں حقیقی معنوں میں ملاحوں کا حکمراں ہے نہ کہ خود ملاح ہے۔

ت۔ یہ بھی ٹھیک ہے۔

س۔ تو اس قسم کا جہاز راں خود جہاز راں کے فوائد کا جویا نہ ہوگا بلکہ ملاح کے جو اُس سے

ضعیف تر ہے۔

تھراسیماکوس نے اس کلیہ کو بھی جبراً و قہراً منظور کیا۔

س۔ پس اس سے یہ صاف نتیجہ نکلا کہ وہ لوگ جو حکومت کے منصب پر ہیں جہاں تک کہ اس حکومت کا تعلق ہے وہ اپنے ذاتی اغراض کا نہ تو خیال کرتے ہیں نہ اُن کے جویا ہیں بلکہ اپنے محکوموں کا کہ جن سے اُن کی حکومت کا تعلق ہے۔ اور اپنے ہر قول و فعل میں وہ ہمیشہ اُنھیں کے فوائد کا خیال رکھتے ہیں نیز یہ کہ کون چیز اُن کے واسطے اچھی اور مناسب ہے۔

جب بحث اس نوبت تک پہونچی اور ہر شخص کو ظاہر ہو گیا کہ عدل کی تعریف جو پیشتر کی گئی تھی اب بالکل برعکس ہو گئی تو تھراسیماکوس نے بجائے کوئی جواب دینے کے کہا

ت۔ سقراط یہ تو بتاؤ کہ تمھاری کوئی دایہ ہے یا نہیں ہے؟

س۔ اس سوال کا کیا موقع ہے۔ تم کو چاہیے کہ میرے سوال کا جواب دو، نہ کہ اس قسم کی مہمل اور فضول باتیں پوچھو"

"میں اس لیے پوچھتا ہوں کہ اگر تمھاری کوئی دایہ ہوتی تو وہ تمھاری صفائی کا خیال کرتی۔ تمھاری ناک جو بہہ رہی ہے اُسکو صاف کرتی اور شاید اسی بات کی وجہ سے تمھاری یہ حالت ہو گئی ہے کہ تم گلّہ اور گلّہ بان میں بھی کوئی فرق نہیں کر سکتے۔

س۔ یہ کیونکر؟

ت۔ یہ اس طور پر کہ تمھارا یہ خیال معلوم ہوتا ہے کہ چرواہے اور گلّہ بان اپنی بھیڑوں اور اپنے گلّوں کو کھلاتے پلاتے اور انکو موٹا تازہ کرتے ہیں اُنکی خبر گیری کرتے ہیں شاید کسی دوسری نظر سے سوائے اسکے کہ اُن سے وہ خود اور اُنکے مالک فائدہ اُٹھائیں۔ اسی طرح تمھارا یہ خیال بھی معلوم ہوتا ہے کہ ریاستوں کے مالک (مالک سے میرا مطلب اُن لوگوں سے ہے جو فی الحقیقت عنان حکومت اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں) اپنی رعایا کے ساتھ ایسے چرواہوں اور گلّہ بانوں سے شاید کچھ دوسرے انداز کا سلوک کرتے ہیں یا بہ الفاظ دیگر وہ رات دن کسی اور خیال میں رہتے ہیں بجز سوائے اسکے کہ وہ کیونکر اپنی رعایا سے متمتع ہوں، اور تم عدل و ظلم اور عادل و ظالم کے حقیقی مفہوم سے اتنے نا آشنا ہو کہ تم کو یہی نہیں معلوم کہ اول الذکر حقیقت میں دوسرے کے فائدہ کا نام ہے یعنی فائدہ قوی تر اور حاکم کا اور خود تمھارے نقصان کا نام ہے

جبکہ تم ماتحت اور غلام کی حیثیت رکھتے ہو اور آخرالذکر یعنی ظلم اسکے برعکس ہے یعنی اُس کی حکومت دراصل اُنھیں پر ہے جو سیدھے سادے اور منصف مزاج لوگ ہوتے ہیں اور اپنی سادگی سے اپنے حاکم کا جو اُن سے قوی تر ہوتا ہے کہنا مانتے ہیں اور اپنی خدمات سے اُسکی خوشی پوری کرتے ہیں اور اپنی ذاتی فوائد کی مطلق پرواہ نہیں کرتے - اے میرے بھولے دوست سقراط - تم ذیل کی مثالوں سے دریافت کرلوگے کہ ایک عادل ہر جگہ اور ہر موقع پر بمقابلہ ایک ظالم کے ہمیشہ خسارہ میں رہتا ہے - مثلاً فرض کرو کہ ایک عادل اور ایک ظالم کے ساتھ ایک مشارکت ہوتی ہے تو فسخ مشارکت پر عادل کو ظالم سے کبھی زیادہ حصہ نہیں ملتا بلکہ ہمیشہ کچھ کم ہی ملتا ہے - پھر معاملاتِ سیاسی میں تم دیکھوگے کہ ادائے محصول کے وقت عادل کو ہمیشہ ظالم سے کچھ زیادہ ہی دینا پڑتا ہے ہرچند کہ جائداد کی مقدار اور مالیت ایک ہی ہو اور حاصل کرتے وقت ظالم سب کچھ لے لیتا ہے اور بیچارہ عادل منہ دیکھ کے رہ جاتا ہے - پھر جب کبھی حکومت کا عہدہ اُن کو ملتا ہے تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس میں بھی عادل ہمیشہ نقصان میں رہتا ہے اُسکے ذاتی معاملات بوجہ اسکی عدمِ توجہ کے ابتر ہو جاتے ہیں اپنے سخت اصولوں کی پابندی کی وجہ سے سرکاری روپیہ سے وہ کوئی فائدہ نہیں حاصل کر سکتا - پھر ان سب پر طرہ یہ کہ اسکے دوست اور شناسا بھی اُس سے ناراض ہو جاتے ہیں جب کبھی وہ انصاف کے خلاف کوئی خدمت کرنے سے انکار کرتا ہے - ظالم کی حالت ہر چیز میں اسکے بالکل برعکس ہوتی ہے کیونکہ ظالم سے میری مراد وہی شخص ہے جو ایک بڑے پیمانہ پر حکومت کی قوت رکھتا ہو، تم کو اپنے خیال میں ہمیشہ ایسے ہی شخص کا تصور کرنا چاہیے - اگر یہ جانچنا تم کو منظور ہو کہ اپنے ذاتی مفاد کے لحاظ سے ظالم ہونا عادل ہونے سے کتنا اچھا ہے - یہ حقیقت نہایت آسانی سے تم پر واضح ہو جائیگی اگر تم اپنی توجہ ظلم کی اس کامل ترین صورت کی طرف مبذول کرو کہ جس میں ظالم تو ہمیشہ شادمان اور کامیاب، اور معمول جن پر ظلم ہوتا ہے اور جو بدلہ لینے کی طاقت نہیں رکھتے ہمیشہ دلریش اور ناکام رہتے ہیں - یہی صورت مطلق العنان حکومت کی ہے جس میں کہ چھوٹے پیمانہ پر نہیں، بلکہ بڑے اور اعلیٰ پیمانہ پر حکومت دوسروں کی جائداد کھلم کھلا یا خفیہ طریقہ سے ہضم کرتی چلی جاتی ہے اور اسکی مطلق پرواہ نہیں کرتی کہ وہ جائداد پبلک ہے یا پرائیوٹ اشخاص کی ہے، وہ دینی اغراض سے تعلق رکھتی ہے یا دنیاوی کاموں سے - وہ ایسے جرائم کا ارتکاب معمولاً کرتی رہتی ہے کہ جز

اگر کوئی شخص زنا بالجبر کرے اور گرفتار کر لیا جائے تو وہ سزا کا مستوجب اور ذلیل و خوار ہوتا ہے۔ اور جب وہی جرائم اشخاص سے سرزد ہوتے ہیں تو اس قسم کے مجرموں کو کبھی مذہب شکن کبھی انسانوں کے لے بھاگنے والے کبھی چور، قزاق، اور ڈاکو کہتے ہیں، مگر لطف یہ ہے کہ جب کوئی شخص اپنے ہم وطنوں کی جائداد کے علاوہ اُن کی ذات کا بھی مالک ہو جاتا ہے یعنی اُنکو غلام بنا لیتا ہے تو مذکورۂ بالا بُرے لقبوں کے بجائے ایسا شخص نہایت کامیاب اور خوش نصیب کہلاتا ہے۔ نہ صرف اپنے ہی شہر اور وطن کے آدمیوں کی زبان سے بلکہ تمام ایسے غیر لوگوں کی زبان سے بھی جو اُس کے ظلم کے کارنامے سنتے ہیں۔ تو اس سے ثابت ہوا کہ لوگ ظلم کو بُرا کہتے ہیں اس

وجہ سے کہ وہ اُسکے ارتکاب سے نہیں بلکہ اُسکے اعمال سے خائف ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے میرے عزیز دوست، ظلم اگر بڑے پیمانہ پر کیا جائے تو بمقابلہ عدل کے زیادہ قوی، زیادہ وسیع اور زیادہ شاندار چیز ہے، اور جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں عدل قوی تر کے فائدہ کا نام ہے اور ظلم ذاتی نفع اور فائدہ کی چیز ہے۔

مرزا محمد عسکری

(الناظر، جنوری ۱۹۲۶ء)

افلاطونِ الٰہی

ایک بڑے صاحب کشف و کرامات نے ایک مرتبہ اپنے مکاشفہ سے معلوم کیا کہ تمام
عالم افلاطون کے انوار سے مملو ہے ۔ اسی افلاطون کو افلاطون الٰہی کہتے ہیں، اس لیے کہ اس نے
فلسفۂ معرفتِ الٰہی جو اپنے اُستاد سقراط سے سیکھا تھا، اپنے شاگردوں کو تعلیم کیا ۔ یہ ایک یونانی
النسل حکیم شہر ایتھنیس کا رہنے والا تھا جو ۴۲۷ برس قبل حضرت مسیح علیہ السلام اس عالم میں آیا تھا،
اور عمر کی ۸۰ منزلیں طے کر کے ۳۴۷ ق م میں رہگرائے عالم جاودانی ہوا ۔ اُسکے باپ کا نام
ارسطون تھا، جو آلِ قدروس سے بیان کیا جاتا ہے، اور اُسکی ماں، کہا جاتا ہے کہ سولن کی
اولاد میں سے تھی ۔

ابتدائے عمر ہی سے افلاطون کو سقراط کی صحبت نصیب ہوئی ۔ دیو جانس لارطوس کا
بیان ہے کہ اُس کا نام پہلے ارسطاکلیز تھا، چونکہ اُسکے شانے بہت چوڑے تھے اس لیے افلاطون
نام پڑ گیا ۔ نیز پہلے یہ شعر بھی کہا کرتا تھا جسکا سارا دفتر سقراط کی صحبت ملنے کے بعد اس نے
نذرِ آتش کر دیا ۔ یعنی سقراط کے علم حقیقی کے سامنے اشعار اس قدر مبتذل نظر آئے کہ اسکی نظر سے
بالکل گر گئے، اور اُس نے خیال کیا کہ ایسی شے کا میری طرف منسوب ہونا درست نہیں ہے ۔

کہا جاتا ہے کہ سقراط کی وفات کے بعد دشمنوں کے ڈر سے یہ اور اسکے ہمراہ سقراط کے دوسرے
احباب نیز حکیم اقلیدس سب نے مگارا میں جا کر پناہ لی ۔ جب ادھیڑ عمر ہوئی تو ایک مقام
سنگی سوس کو انتخاب کر کے وہاں اپنا ایک آشرم قائم کیا اور فلسفۂ الٰہی کی تعلیم دینی شروع کی ۔
اس کی تعلیم بالکل سقراط کی تعلیم کا نقشِ ثانی تھی ۔ بلکہ کہا جاتا ہے کہ سقراط کے کلام کو سمجھنے کے لیے
یہ ضرور ہے کہ پہلے افلاطون کی کتابوں کا مطالعہ کیا جائے ۔ چنانچہ اس نے جو مکالمے لکھے ہیں وہ
دنیا کی عجیب کتابوں میں سے ہیں اور جو فلسفہ اُن میں بیان کیا ہے وہ ایک طرف انسان کے
ذہنیات سے بحث کرتا ہے اور دوسری طرف ایسے پُر اسرار مسئلے بیان کرتا ہے جو اہل تصوف

کے کلام سے مشابہت رکھتے ہیں۔ غرضکہ جس بیج کو سقراط نے بویا افلاطون نے اُسکی پرورش کی پھر اُس میں کونپلیں پھوٹیں اور ایک گھنا درخت بن گیا۔

اسکے شاعرانہ جذبات اور عالمگیر تخیل نے اسکے ذہنی استدلالات کو ایک بڑے دلچسپ پیرایۂ بیان میں ڈھالا ہے۔ اسکے ذہن میں سقراط کی یہ تعلیم اچھی طرح جم گئی تھی کہ حق اور بھلائی دنیا میں موجود ہے اور دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں۔ اس اثر نے اتنی ترقی کی کہ وہ خیر و صلاح کی وحدانیت کے خیال پر اور اس بات پر کہ اس سب کا انحصار علم پر ہے مضبوطی سے قائم ہو گیا اور تحقیق حق میں قدم آگے بڑھانا شروع کیا۔ حتیٰ کہ اس راہ میں خاص خاص اعمال خیر اور انفرادی نیکیوں کے خیال سے ترقی کرتا ہوا وہ عام نیکیوں کے تصور تک پہونچا۔ اور وہاں سے کلیات کی تہ اور کائناتِ عالم کی حقیقت اور علم کی وحدانیت اور وحدت وجود کے مسائل تک رہنمائی حاصل کی۔ مگر اُس نے اسی حد تک پہونچ کر قیام نہیں کیا اور کثرت فی الوحدت اور وحدت فی الکثرت کے تماشے بھی دیکھنے لگا۔

لیکن ان صوفیانہ ترقیات کے جد و جہد میں وہ تجربات انسانی کے واقعات کو فراموش نہیں کرتا رہا ہے۔ ایسے اخلاقی اوصاف میں جو ہر شخص کے مرکوز خاطر ہونی چاہییں وہ تصور وحدانیت و تصور خیر و تصور حق کو بھی جگہ دیتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اخلاق انسانی اور حکومت و سلطنت کے اصول و طرق کی تحقیقات میں بھی گامزن نظر آتا ہے۔ اسکی تحقیقات جس قدر ترقی کرتی جاتی تھی منطق اور نفسیات کے اصول ابتدائی واضح اور نمایاں ہوتے جاتے تھے اور ان حقائق کی بنیاد پڑتی نظر آتی تھی جنھیں اسکے شاگرد رشید ارسطا طالیس نے علوم کی شکل میں بہت کافی وضاحت اور تفصیل کے ساتھ بعد میں ترتیب دیا۔ افلاطون اگرچہ اصول ریاضیات کی بڑی قدر کرتا تھا مگر خود اُس نے ریاضی یا دیگر ایسے علوم کی ترقی کی طرف زیادہ میلان نہیں ظاہر کیا۔ اسی طرح وہ بقراط کے علم طب سے کافی ہمدردی رکھتا تھا مگر خود اس میدان میں نہیں آیا۔ ایسے ہی لیوسی پوس اور ڈیما کری ٹوس کے علوم کی طرف جو زمانہ حال کے طبعیات کے مقدمات و ابتدائی اصولوں پر مشتمل تھے اُس نے کوئی توجہ نہیں کی۔

افلاطون کے مکالمات کو اگر بغور دیکھا جائے تو یہ صاف مترشح ہوتا ہے کہ اس میں دو قسم کے جذبات کا اثر زیادہ ہے یعنی انسانی ترقی کا جذبہ اور ذہن انسانی کی قوت و برتری کا ایک غیر متزلزل

یقین - اسکی طرف مسئلۂ تصورات کو عموماً منسوب کیا گیا ہے لیکن وہ مسلسل ترقیِ ذہنی کا صرف ایک رُخ ہے جو اس فلسفہ پر جاکر منتہی ہوتی ہے جس میں ارادہ کی رہنمائی عقل کے ہاتھ میں دی گئی ہے۔ لیکن اشیاء فی الخارج سے جسقدر شروع ہی سے محققین یونان کو لگاؤ تھا اُسکا نقامنہ یہ ہوا - نیز خود افلاطون کی شاعرانہ اُفتادِ طبیعت کا یہ اثر ہوا کہ افلاطون کے تصورات میں جو حقیقی روحانیت تھی وہ کچھ عرصہ کے لیے پردہ کے پیچھے آگئی اور اس مقام پر آکر طبیعت رُک گئی جہاں پر کلیات جزئیات سے باقی فانی سے اور "بودنی" "شدنی" سے الگ نظر آیا کرتی ہیں اور جہاں کہ حقائق موجودات کے اصول ہائے اولیں عالم حقیقی سے باہم ایک دوسرے سے بے تعلق اور علیحدہ معلوم ہوتے ہیں - لیکن رفتہ رفتہ پردہ اُٹھتا گیا اور حواس ظاہری و باطنی اور نوامیس خاصہ اور مظہر قدرت اور قوائے متخیلہ اور عاملہ کا تصور زیادہ واضح اور صاف نظر آنے لگا تجربہ و تعمیم خیالات اور پیش بینی اور استنباط کی اصل حقیقت واضح ہونے لگی اور تجربۂ انسانی کی مدد سے تصورات و تخیلات کی تصدیق ہونے لگی اور عالم خیال کے گوہر شاہوار معقولوں میں اور اظہار خیالات کی دوسری صورتوں میں منسلک نظر آنے لگے - انھیں اثرات کا مدوجزر "مکالمات" میں صاف دکھائی دیتا ہے جسے تاریخ فلسفہ کا ایک رسالہ کہنا نازیبا نہ ہوگا - لیکن جو خیالات کہ مکالمات میں ظاہر کیے گئے ہیں وہ کہیں کہیں بے ربط سے نظر آتے ہیں اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ افلاطون نے اپنے فلسفہ کی کہیں ایک باقاعدہ مرتب شمال ترتیب دی ہو لیکن یہی سب اصول و خیالات ہیں جنھیں اسکے شاگرد ارسطاطالیس نے بعد میں زیادہ حکیمانہ و عالمانہ ترتیب کے ساتھ مرتب کرکے عالم کے سامنے پیش کیا ہے - معلوم ہوتا ہے کہ افلاطون اپنے اُستاد کی تعلیم اور مسائل وحدتِ وجود میں اسقدر ذہنی انہماک رکھتا تھا کہ کسی باقاعدہ علم کی تدوین کی طرف اُس نے توجہ نہیں کی اور اس کام کو اپنے بعد آنے والے حکماء کے سپرد کرتا گیا -

افلاطون کی تعلیم میں دو بہت زبردست قوتیں نظر آتی ہیں - ایک تو حق کی محبت اور دوسرے ترقیِ انسانی کا جوش و ولولہ - کتاب "جمہوریت" میں یہ دونوں جذبات یعنی ایک ذہنی دوسرا عملی ایک ہی جگہ سمو کر جمع کر دیے گئے ہیں - مسئلۂ تصورات جو اُسکی طرف منسوب ہے اسمیں بھی بہت کچھ عمر کی رفتار کے ساتھ تغیر نظر آتا ہے لیکن باوجود ان سب باتوں کے جو ایک خیال ہر جگہ موجود اور ہر جگہ غالب ہے وہ یہی ہے کہ عقل سب سے برتر، اعلیٰ و ارفع شے ہے اور خیر و حق دونوں ایک

ہی سے ہیں۔ اس اصولی خیال سے بہت سے خیالات و تصورات متفرع ہوتے گئے ہیں چنانچہ نفسیات، تعلیمات و اصلاح سیاسی کے اصول اِسی طریق پر پیدا ہوئے اور اسی آب و ہوا میں بڑھے اور بارور ہوئے ہیں۔ زمانۂ حال کے حکمائے مابعد الطبعیات بھی اسکے علو مرتبت و ذہنی مدارج و حقیقی تعلیمات سے اسقدر متاثر نظر آتے ہیں کہ ان میں کا ایک نامور شخص فیرپر کہتا ہے کہ اگر ہم حقائق فلسفیہ کے سمجھنے میں راہ صواب پر ہوں تو یہ سمجھنا چاہیے کہ ہم نے افلاطون کے مطلب کے سمجھنے میں غلطی نہیں کی ہے اور اگر ہم غلطی کرنے لگیں تو یہ سمجھنا چاہیے کہ ہم نے افلاطون کو صحیح طور سے اور اچھی طرح سمجھا ہی نہیں۔ اسکے شاگرد ارسطو کا اثر اسکے مدارس کے حدود سے باہر نکل کر بہت دور تک پہونچا ہے اسلیے اسے لوگ زیادہ جانتے ہیں۔ مگر وہ اپنے اُستاد کا کسقدر رہین منت ہے اسکا اندازہ بھی کسی نے کیا ہے؟

نیو، کرائی سیپوس اور اپیقیورس نے جسقدر علم افلاطون سے اخذ کیا ہے اُتنا خود انھیں بلاواسطہ نصیب ہوا۔ ابومارک اور رومی فرقہ اسٹوئک کے اخلاقی تصورات جنھوں نے زمانۂ جدید پر اسقدر اثر ڈالا ہے اگر افلاطون نہ ہوتا تو عالم میں نظر ہی نہ آتے۔ جدید فیثاغورثی مسائل دراصل جدید افلاطونی مسائل کی دوسری شکل ہیں جو زیادہ مرتب و مدون ہے۔ متشککین افلاطون کے ہی گڑھے ہوئے ہتھیار استعمال کرتے ہیں۔ مذہب عیسوی پر اسکا عظیم الشان اثر پڑا ہے۔ زمانۂ جدید میں جرمنی کے ایک مشہور شلیرمیگر نے دراصل فلسفۂ افلاطون ہی کی ناقدانہ تحصیل شروع کی اور اسکی ترجمانی اختیار کی تھی۔ اسکے بعد کارل ہرمان اور جوزف شوتے علَم ہاتھ میں لیا۔

افلاطون کا فلسفہ صوفیائے اسلام کے فلسفۂ وحدت وجود سے بہت مشابہ ہے، ذیل میں دونوں کی مثالیں دیکر اسے کسی قدر واضح کرنے کی کوشش کیجاتی ہے: افلاطون نے جن مسائل وحدت وجود کو مختصراً بیان کیا ہے صوفیائے اسلام اُنکو اشعار و امثال کے پردے میں بیان فرماتے ہیں۔

افلاطون اس مادی دُنیا سے بالاتر ایک دوسرا حقیقی عالم تصور کرتا ہے اور اُس عالم سے بھی ترقی کرکے عالم قدس میں جاتا ہے اور وہاں فانی فی اللہ ہوجاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خدا اور انسان، مادہ اور روح کے درمیان ایسی کوئی خلیج نہیں ہے جسے عبور نہ کیا جاسکے۔ تمام عالم میں ک ہی جلوہ نظر آتا ہے اور وحدت محض ہے اور اسکا اظہار صرف دیگر صفات کی نفی کرنے سے ہوتا ہے۔ صوفی اس خیال کو نور، محبت، شراب، حسن، سمندر وغیرہ کے استعارات استعمال کرکے واجب الوجود کے مفہوم کو ادا کرتے ہیں، مثلاً

نہ شرقیم نہ غربیم نہ برّیم نہ بحریم
نہ از کانِ طبیعیم نہ از افلاکِ گردانم
مکانم لامکاں باشد نشانم بے نشاں باشد
نہ تن باشد نہ جاں باشد کہ من از جانِ جانانم

(مولانا رومؒ)

دیگر

نہ چرخ فلک جملہ دراں ماہ فروشد
کشتیِ وجودم ہمہ در بحر نہاں شد
آں بحر کفے کرد وہر پارہ ازاں کف
نقشے ز فلاں آمد و جسمے ز فلاں شد
ہر پارہ کفِ جسم کزاں بحر نشاں یافت
در حال گذارید و دریں بحر رواں شد

(منہ)

دیگر

خورشید رخت چو گشت پیدا
ذراتِ دو کون شد ہویدا
ہر رخ تو چو سایہ افگند
زاں سایہ پدید گشت

(منہ)

دیگر

یک گوہرے چو بیضا جوشید و گشت دریا
کف کرد و کف زمیں شد وز دود او سما شد

(منہ)

دیگر

آں بود چہ بود عین آں موج
آں موج چہ بود عین دریا

(منہ)

(افلاطون کہتا ہے کہ عقل کلّی ذاتِ واحد کی سب سے پہلی مخلوق ہے۔ وہ عقل کلّی و عقل جزوی میں تمیز کرتا ہے۔ اسی خیال کی شرح ابن رشد نے کی ہے اور اسی کے متعلق یہ قول ہے کہ اول ما خلق اللہ العقل۔ پھر افلاطون کہتا ہے کہ عقل کُل سے روحِ کلّی پیدا ہوئی جو عام مدرکات اور عقل کُل کے ابین ایک ملانے والی زنجیر کی طرح ہے۔ اسکی دو خاصیتیں ہیں۔ ایک طرف تو عقل کلّی سے نیض حاصل کرتی ہے، دوسری طرف اُس فیض کو عالم مدرکات تک پہونچاتی ہے۔ اس روح کلّی کو اہل تصوف نفس کُل یا جان کُل کہتے ہیں ؎

جان اول مظہر درگاہ شد
جان جاں خود مظہر اللہ شد
بحث جاں اندر مقام دیگر است
بادۂ جاں را قوام دیگر است
جسم را نبود بجز جاں بہرۂ
جسم پیش بحر جاں چوں قطرۂ

حد جسمت بگذ و گز خود بیش نیست | جان تو تا آسماں جولاں کنیست
(منہ)

اسی خیال کو شہیدی نے نعت میں ادا کیا ہے:

اُدھر اللہ سے واصل اِدھر مخلوق سے شامل | خواص اُس برزخِ کبرےٰ میں تھا حرفِ مشدد کا

فلسفۂ افلاطون یہ صدا دیتا ہے کہ وحدتِ محض سے تعدد کا ظہور اس لیے ہوا کہ ہر کامل شئے ایک دوسری شئے کے پیدا کرنے کی خواہش رکھتی ہے۔ جو شئے واحد ہے وہ اثر پذیری ونقصان و کمی سے منزہ ہے۔ اسکے جوہر میں کوئی فرق نہیں آتا لیکن اُسکی قوت بہت زبردست ہوتی ہے اور جوش مارتی رہتی ہے۔ اُسکی مثال ایسی ہی ہے جیسے درخت کے اندر کا دودھ جو اُس کے ریشہ ریشہ میں دورہ کرتا رہتا ہے۔ وہ اس سورج کی کرن کے مشابہ ہے جو فضا کو منور کرتی ہے اور ہر شئے جس قدر قربت الٰہی میں ہے اُسی قدر خدائے عزوجل کا جلوہ اپنی ذات میں رکھتی ہے اور اسکی کوشش ہوتی ہے کہ اعلیٰ کی طرف ترقی کر کے اُس ذاتِ واحد کی طرف رجوع کرے جسکے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتی۔ دنیا اسی جد وجہد کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ اب ان خیالات کو اہلِ تصوف کے کلام میں ملاحظہ فرمایا جائے۔ مولانا رومؒ کہتے ہیں۔

حق گفتش اے مردِ زماں گنجے بدم من در نہاں | جستم کہ تا پیدا شود آں گنجِ احسان و عطا

ولہ

چوں روح در نظارہ فنا گشت ایں بگفت | نظارۂ جمالِ خدا جز خدا نہ کرد

ولہ

ما بفلک بودہ ایم یارِ ملک بودہ ایم | باز ہماں جا رویم خواجہ کہ آں شہر ماست

ولہ

من خانہ تہی کردم گز رخت بپردازم | من کاہم تا عشقت افزاید و افزوید
از بہر چنیں سودے جاں باختن اولےٰ تر | خامش کہ ہماں ارزد اے خواجہ کہ میجوید
جانم زپے عشقت شمس الحقِ تبریزی | بے پائے چو کشتیہا در بحر ہمی پوید

ولہ

پیش از اں کاندر جہاں باغ ورز و انگور بود | از شراب لایزالی جانِ ما مخمور بود
ما بہ بغدادِ ازل لاف انا الحق می زدیم | پیش ازاں کیں دار وگیر و نکتۂ منصور بود
پیش ازاں کایں نقشِ دل برآب وگل معمار شد | در خراباتِ حقایق عیش ما معمور بود

افلاطون اور اہل تصوف دونوں یہ کہتے ہیں کہ انسان کچھ نہ کچھ ضرور مختار ہے گو اُسکا اختیار نوامیس ازلی وابدی کے ماتحت ہے یعنی جہاں تک اسکا تعلق نفس کی اطاعت سے ہے وہ آزاد و مختار بالکل نہیں ہے مگر اُسے یہ اختیار حاصل ہے کہ جذبات کی پیروی نہ کرے بلکہ عقل کی پیروی کرے۔ چنانچہ مولانا رُوم کہتے ہیں

گویند عشق چیست بگو ترک اختیار　　　هر کو ز اختیار نہ رست اختیار نیست

رُوح کی دوزخ میں جسم کے اندر وہ فطرت کا ایک جزو ہے۔ حالت روحانی میں وہ عالم مثال میں ہے اُس نے اس عالم سفلی کی طرف بیشک ہبوط کیا ہے۔ لیکن عالم علوی کی طرف مراجعت کرنے کو اپنا فرض سمجھتی ہے۔ اس میں اگر کوئی کثافت یا نقصان پیدا ہوجاتا ہے تو صرف جسم کی صحبت اور اس عالم سفلی کے تعلق کی وجہ سے۔ اس کدورت وغبار کو پاک کرنے کے لیے ہر وقت وہ مضطرب رہتی ہے۔

اب اس بیسویں صدی میں فلسفہ کے بیان کے متعلق جو خاص طریقہ رائج ہے وہ زیادہ تر تاریخی پہلو لیے رہتا ہے۔ ادبی تنقید صرف اسی قدر رہ گئی ہے کہ حُسن وجمال کی مختلف شکلوں کو نظر کے سامنے عیاں کردیا جائے اور اُن مختلف طریقوں کو ظاہر کردیا جائے جن میں انسان کے مختلف خاندانوں اور مختلف زمانوں نے حُسن وجمال کے مسئلہ اور اصول کو حل کیا ہے۔ فلسفہ ان پیش کردہ حل و توضیحات کی صرف ایک تصویر ہے۔ علم مذہب بھی صرف ان خود بخود پیدا ہونیوالی کوششوں کی ایک تاریخ ہے تاکہ ایک مسئلۂ ربانی کی توضیح ہوسکے۔ تاریخ بھی اسی طرح ان تمام اشیا کے نظم کی ایک لازمی صورت ہے جو تغیر پذیر ہیں اور حیات مسلسل کے قوانین کے تحت واقع ہوا کرتی ہیں غرضکہ ایک نقاد کی نگاہ میں قوت ادراک اسی طرح نوع انسانی میں نشو ونما پاتی ہے جس طرح کہ فرد واحد میں۔ افلاطون کے زمانہ میں ہر شئے پر صفت "بودن" کے لحاظ سے غور کیا جاتا ہے لیکن اب صفت "شدن" زیادہ نظر میں رہتی ہے اور تمام علوم مثلاً فلسفہ، قانون، سیاسیات اور فنون و شاعری پر اسی نقطۂ نظر سے غور کیا جاتا ہے اور جو کچھ ہم فلسفہ کی تاریخ میں تلاش کرتے ہیں اُس میں خاص فلسفہ سے بہت کم اور تاریخ سے زیادہ بحث ہوتی ہے۔ فلسفۂ قدیم اپنے اندر ایک جامعیت رکھتا ہوا اور یہی جامعیت کو اگر ہم تلاش کریں گے تو ارسطو و افلاطون کی تصنیفات میں بدرجۂ اعلیٰ پائیں گے افلاطون نے مختلف کتابیں علوم فلسفہ وسیاسیات وغیرہ پر لکھی ہیں۔ ذیل میں ہم ان

کتابوں کے نام معہ کسی قدر صراحت مضمون کے ناظرین کی دلچسپی کے لیے درج کرتے ہیں:

اپالوجیا - یعنی اجوبات - ان میں سوال وجواب کا وہ طریقہ ہے جو سقراط کے ساتھ مخصوص ہے - تعلیمات سقراط کو اسکی اپنی شان میں دکھایا گیا ہے اور سوفسطائی طریقہ کی طرف سے لوگوں کی طبیعت ہٹانے کی کوشش کی گئی ہے - فلسفہ ونفسیات ومنطق کو جسکا بیج سقراط نے بویا تھا افلاطون نے ترقی دے کر برگ وباردار درخت بنا کر دکھایا ہے - اس رسالہ کے تین حصے ہیں (۱) حالات قبل الزام (۲) مابعد الزام وسزا (۳) بعد حکم سزا - اسکا ماحصل یہ ہے کہ موت کوئی بری شئے نہیں ہے - وہ یا تو ایک آرام کی لمبی نیند ہے یا ایک دوسرے ہی عالم میں منتقل ہو جانا ہے - ایک اچھے آدمی کو اس زندگی میں جانے کے بعد کوئی برائی نہیں پہونچ سکتی - مکالمات افلاطون میں اس حکیم کے فلسفہ کا غیر مرئی اور صوفیانہ رخ ہے - سقراط نے جن چیزوں کو اشارہ کے طور پر بیان کیا تھا افلاطون نے اسکو واضح کر دیا ہے - سقراط کی تعلیم سے یہ معلوم ہوا تھا کہ حق اور خیر دونوں کا وجود موجود ہے - لیکن اس نے یہ توضیح مزید کی کہ نیکی ایک واحد اور عالمگیر شے ہے اور اسکا انحصار علم شئے پر ہے - اس مسئلہ کی وہ خوب تحقیق کرتا ہے اور یہاں تک جستجو اور موشگافیاں کرتا چلا جاتا ہے کہ معمولی غور وخوض کرنے والوں کو بھی صرف ظلیوں کا علم ہی نہیں ہوتا بلکہ انکے اسباب ووجوہ بھی معلوم ہو جاتے ہیں اور اس راہ سے وہ ایک عام کلیہ تک پہونچ جاتے ہیں - اس راہ میں وہ خاص سے شروع کر کے عام نتیجہ پر پہونچتا ہے اور بالآخر یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ دنیا میں ایک ایسی شے بھی ہے جسے ایک عالمگیر نیکی یا خیر کلی کے نام سے یاد کر سکتے ہیں - ان مکالمات میں سقراط ہی کا فلسفہ نہیں ہے بلکہ افلاطون کے اپنے ذاتی خیالات بھی صاف نظر آتے ہیں - وہ افلاطون کے زمانہ کی ایک ذہنی وعلمی زندگی کی اعلیٰ درجہ کی تصویریں ہیں - مگر ان سب کی بنیاد وہی سقراطی تعلیم ہے - گو افلاطون کی اپنی موشگافیاں اور انکشافات بھی بہت ہیں اور بحثوں میں اخلاقی اور سیاسی، مابعد الطبیعی یا حکیمانہ اور صوفیانہ شاہ راہیں اختیار کی گئی ہیں - سقراط کہتا ہے کہ نیکی کی تعلیم دینا مشکل ہے - پروٹاگورس کہتا ہے کہ یہ ممکن ہے - ان دونوں کی بحثوں میں افلاطون باریک باریک امور کی طرف اشارہ کرتا ہوا اپنے خیالات کا بھی اظہار کرتا جاتا ہے - وہ کہتا ہے کہ خارجی اور ذہنی نقطہ ہائے نظر میں بڑا فرق ہے - نیز ایسے معیاروں میں جو محض ذہنی ہیں اور ان میں جو رسمی ہیں اور رواج پا چکے ہیں بڑا فرق ہے - آدمی میں پیدا ہوتے ہی تمام اشیاء کا علم موجود رہتا ہے - قدرت

کی یہ ایک دریعت ہے جسے وہ اپنے ساتھ رکھتا ہے۔ یہ علم وہ اپنے ساتھ لاتا ہے مگر یاد نہیں رکھتا یعنی یہ علم ایک خاموشی کی حالت میں زاویۂ خمول میں پڑا رہتا ہے۔ اور اگر اس سونے والے کو بیدار کیا گیا اور دوسرے امور کی مدد سے اس سے کام لیا گیا تو وہ پھر نظر کے سامنے آجاتا ہے اور یاد تازہ ہو جاتی ہے پس علوم انسانی کی ترقی کے لیے مجاہدہ کی ضرورت ہے۔ تقدس و پاکی کی صفت منصف مزاجی کی صفت کا ایک جزو ہے اور اس طرح حاصل ہوتی ہے کہ خدا کی عبادت نماز و قربانی کے ذریعہ کی جائے۔ مذہب و اخلاق میں کوئی تباین نہیں ہے بلکہ ایک طرح کی مواصلت ہے۔

مینو میں وہ بیان کرتا ہے کہ روح ایک ازلی و ابدی شے ہے ؎

روح ہمچوں صالح و تن ناقہ است   روح اندر وصل تن در فاقہ است

جسم را نبود بجز جاں بہرۂ   جسم پیش بحر جاں چوں قطرۂ

میل جاں اندر حیات و درحی است   زانکہ اندر لامکاں اصل وی است

(مولانا رومؒ)

اسی خیال کو فیڈو میں افلاطون ترقی دیتا ہے۔ موت سے مراد روح کی جسم سے علیحدگی ہے اور یہی شے ہے جسکی تمنا ایک فلسفی کیا کرتا ہے۔ اس لیے کہ جسم تفکر و تصور کی راہ میں حائل ہوتا ہے اور جسمانی خواہشات سے فلسفی کی دائمی جنگ رہتی ہے جو بالآخر موت کی مدد سے ختم ہوتی ہے۔

آزمودم مرگ من در زندگی است   چوں رہم زیں زندگی پایندگی است (منہ)

فیڈو میں افلاطون ترک دنیا کی تعلیم دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کسی مابعد الطبیعی تعلیم کی وجہ سے تجربۂ خارجی سے قطع نظر نہیں کرنا چاہیے۔ جس کا کام یہ ہے کہ ہم میں چھپے ہوئے علوم کی یاد تازہ کرے مگر حق کی تلاش میں منہمک رہ کر احساسات کے قبضۂ و تصرف سے آزادی حاصل کرنا چاہیے۔

مکالمات سمپوزیم و فیڈروس دونوں مسائل تصوف سے روشناس کرتے ہیں۔ اول الذکر متعلق روحانیات سے ہے اور افلاطون نے مسئلۂ عشق انسانی کو ان میں بیان کیا ہے۔ سارا عالم حسن و جمال سے وابستہ ہے۔ عشق و محبت ہی صرف ایک ایسی شے ہے جس کی طلب بغیر کسی مخصوص غرض کے کرنی چاہیے۔ دوسرا حسن و جمال خود اپنی جگہ پر مقصود بالذات شے ہے

عشق نبود عافیت ننگے بود　　عشقہائے گرپئے رنگے بود

عاشق اپنے "جزو ثانی" کی تلاش میں منہمک نہیں رہتا بلکہ حسن وجمال کی تلاش میں رہتا ہے۔ یہ تلاش حسن وجمال ہر شے میں ہوا کرتی ہے اسلیئے کہ ہر شے میں حسن وجمال ہے اور عشق موجود ہے ؎

حکمت حق در قضا و در قدر　　کردہ ما را عاشقان ہمدگر
لیک شمع عشق چوں آں شمع نیست　　روشن اندر روشن اندر روشنی است
بوئے آں دلبر چو پراں می شود　　آں زبانہا جملہ حیراں می شود

گارجیاس میں افلاطون انصاف کے ایک اعلیٰ و برتر شئے ہونے کے خیال کی تائید کرتا ہے اپنی جمہوریت میں ایک ذہنی سیاسی جماعت قائم کر کے وہ اس انصاف کی نوعیت کی تشریح کرتا ہے۔ گارجیاس میں یہ بحث ہے کہ خوشامد ایک قسم کی ایسی مسرت پہونچا کر جو بلا علم کے حاصل ہوتی ہے آدمی پر اپنا اثر ڈالتی ہے۔ طلاقت لسانی کوئی فن نہیں ہے۔ اور ترغیب ایک قسم کی پوشیدہ قوت کا نام ہے۔ پس وہ یہ نتیجہ استخراج کرتا ہے کہ:۔

(۱) ظالم آدمی اپنی خواہش پر نہیں بلکہ اپنی پسند پر عمل کرتا ہے۔

(۲) ظلم کرنا زیادہ برا ہے ظلم سہنا اتنا برا نہیں۔

(۳) مجرم کے لیے سزا پانا سزا سے بچ جانے سے بہتر ہے۔

(۴) علم معانی وبیان وبلاغت کا صرف فائدہ یہ ہے کہ دشمنوں کو سزا پانے سے محفوظ رکھے

رسالہ جمہوریت افلاطون کو پانچ حصوں میں منقسم کہا جا سکتا ہے۔ پہلے اس نے انصاف پر بحث کی ہے جو سب سے اہم مسئلہ ہے۔ پھر اُس نے ایک ایسی ریاست کا جو کامل کہی جاسکے چربہ کھینچا ہے۔ اسی میں انصاف کے حدود و تعریف بھی بیان کرتا ہے خواہ وہ حدود بہ تعلق نفس ریاست ہوں یا متعلق افراد ہوں جو اُس ریاست میں رہتے ہیں۔ پھر وہ اشتراکیت سے بحث کرتا ہے۔ اور اسپر اصرار کرتا ہے کہ صرف حکما کو بادشاہ بنایا جائے اور جو عمال وحاکمانِ وقت ہوں انہیں تہذیب اخلاق وحکمت کی تعلیم دینی چاہیے۔ اسکے بعد پھر وہ بیان کرتا ہے کہ ریاست وحکومت کا زوال کب اور کس طرح شروع ہوا کرتا ہے۔ اسکے اسباب کیا ہیں، اور خراب اور ظالمانہ حکومت کسے کہتے ہیں۔ افلاطون برے اور بھلے دونوں پہلو بیان کرنا چاہتا ہے تاکہ ایک کو حاصل کرنے کی اور دوسرے سے بچنے کی کوشش کی جائے۔ پھر وہ کچھ قواعد وضوابط نمونۃً بیان کرتا ہے

افلاطون کی تحریرات میں جو شئے عام طور پر نظر آتی ہے یعنی تصورِ اتحاد، اس سے یہ کتاب بھی خالی نہیں ہے - اور یہ اصول کہ دماغ کو جسم کے مقابلہ میں سیاسی برتری حاصل ہے صاف صاف عیاں معلوم ہوتا ہے -

منطقی مکالمات کے طور پر اس نے بعض رسالے لکھے ہیں - اُنکے نام یہ ہیں :-

یوتھی ڈیوس - پارمی نیڈیز - تھیٹی ٹوس - سوفسٹ - اسٹیٹس مین - فلی بوس - اول الذکر میں وہ سقراط کی زبانی یہ ثابت کرتا ہے کہ ایک فلسفہ کی ضرورت ہے اور سب سے بڑا فلسفہ حکمتِ سلطنت ہے - اسی سلسلہ میں وہ سوفسطائیوں کے خیالات کی ہنسی اُڑاتا ہے - ثانی الذکر میں ایسے صفات مثلاً انصاف - حسن وجمال یا خیر وخوبی کی تعریف بمقابلہ اول الذکر کے بدرجہا زیادہ ذہنی اور مجرد عن الخارج کی گئی ہے - اسکا خیال ہے کہ ایک اصول کو تسلیم کرنے کے بعد اُس سے جو نتائج مستنبط ومستخرج ہوتے ہیں اُن کا صرف استفراد کرنا ضروری نہیں ہے بلکہ اصول مذکور کو رد کرکے جو نتیجہ پیدا ہوتا ہے اُسے بھی دیکھنا چاہیے - اس میں زینو کے سلک پر تحقیق حق یا تکمیل مسلک مذکور کی کوشش کی گئی ہے - ثالث الذکر میں نفسیاتی خیالات کو بہت زیادہ واضح اور صاف صاف ادا کیا ہے اور فلسفہ میں ناقدانہ اور مؤرخانہ طریقہ بحث کو رواج دینا مقصود معلوم ہوتا ہے لیکن جو توازن کہ تجربہ، تصور اور انعکاس میں قائم رہنا چاہیے اُس سے سہو تجاوز نہیں کیا ہے - رابع الذکر میں پھر علم و وجود اشیا سے بحث کرتا ہے - سوفسطائی کی تعریف یہ کی ہے کہ وہ حقیقتِ اشیا کی غیر مشابہ تصویر کھینچا کرتا ہے اور مادیت اور تمثل میں مطابقت کرنے کی کوشش کرتا ہے -

افلاطون یہ پوچھتا ہے کہ آیا مختلف تصورات ایک سے دوسرے تک منتقل ہو سکتے ہیں، اور اگر یہ ممکن ہے تو کیا تمام تصورات بلا امتیاز منتقل ہو سکتے ہیں ؟ نیز کیا صرف بعض اقسام یا عنوانات میں یہ شکل ممکن ہے اور بعض میں نہیں ؟ - اس طرح وہ پانچ قسم کے عنوانات زیر بحث لاتا ہے - وجود - سکون - حرکت - جمع - فرق - وہ کہتا ہے کہ سکون و حرکت فی مابین غیر قابل انتقال ہیں لیکن جس قدر عمومیت اور کلیت فرق کو حاصل ہے اُسی قدر وجود کو بھی ہے اور ایجابی اور سلبی خصوصیتیں ہی نہیں کہ باہم موجود رہتی ہیں بلکہ انکے صدود بھی برابر برابر وسیع ہوتے ہیں - نفی - کذب ، و تردید باہم الگ الگ نہیں ہیں - ہر سلبی صفت کے ساتھ ایک ایجابی صفت کا ہونا بھی ضرور ہے - اور نفی حقیقی اور اثبات حقیقی دونوں لازم وملزوم اور متناسب

ہوا کرتے ہیں۔ خامس الذکر میں اُس نے سیاسیات پر زیادہ عالمانہ طریق سے بحث کی ہے۔
پہلے وہ بادشاہ کی تعریف کرتا ہے کہ وہ آدمیوں کا چرواہا ہے۔ پھر قانون اور حقیقتِ قانون سے بحث کرتا ہے اور طرزِ حکومت کی تقسیم اس طرح کرتا ہے کہ اس میں پہلی سے دوسری تقسیم اور پھر دوسری سے تیسری۔ علیٰ ہذا القیاس ایک دوسرے کی نسبت سے اچھے نمونہ کے مقابلہ میں بُرا نمونہ پیش کرتی ہے۔ وھو ہذا:۔ (۱) دستوری شاہی (۲) دستوری حکومت بعض (۳) تابع قانون عمومی حکومت۔ (۴) قانون شکن عمومی حکومت (۵) مخالف قانون حکومتِ بعض۔ (۶) جبریت۔

خامس الذکر میں وہ یہ بیان کرتا ہے کہ سب سے بڑی نیکی نہ تو مسرت میں ہے اور نہ علم میں۔ لیکن جہاں نیکی کا مستقر ہے وہ ایک ایسی ترکیب کا ظرف ہے جس میں ہر شے صحیح طور پر توازنِ مناسب کے ساتھ ملی جلی نظر آتی ہے۔ اس میں ایک خاص اثر حسن و جمال ہے۔ اسکا وجود حقیقی ہے فرضی نہیں۔ اس میں ذہانت، علم و حکمت، فن و اصابت رائے ہر شئے موجود ہے اور وہ ایک ایسی خالص و پاک نعمت ہے جس میں دُکھ اور درد کا کہیں نام نہیں۔

رسالہ طیموس میں وہ کہتا ہے کہ عالم چونکہ ایک جسم رکھتا ہے اسلیے اسکے وجود میں آنے کے لیے سبب کی ضرورت ہے اور اسکی ایک ابتدا (ازل) بھی ہے۔ اور اسکی ساخت ایک ایسے نمونہ پر کی گئی ہے جو ہمیشہ باقی رہتا ہے۔ اسکے بعد وہ یہ بیان کرتا ہے کہ تحقیق عالم میں ذہن انسانی کا حصہ اور تعلق کس قدر ہے۔ حاجت کے اثرات و نتائج کیا ہیں حقیقی نفسیات کے اصول کیا ہیں۔ اسکے بعد پھر وہ فن طب و تشخیص امراض پر بحث کرتا ہے۔

افلاطون نے اپنی عمر کے اخیر حصہ میں اس امر کی کوشش کی کہ قانون ملک کا ایک ضابطہ تیار کر کے چھوڑ جائے۔ اس لیے اس نے ایک ضابطۂ قوانین تیار کیا جسمیں ڈورڈی اور ایونی قوانین کے بین بین ایک راستہ اختیار کیا ہے۔ وہ تعلیم و شادی بیاہ کے قواعد بناتا ہے۔ بداعتقادی و لامذہبی یعنے خدا کو نہ ماننا، قادر مطلق سے انکار کرنا ایسے بدترین بداخلاقی سے بھرے ہوئے باطل خیالات کو قابل سزا قرار دیتا ہے۔ ان امور کو قابل سزا اور سخت سزا کے مستوجب خیال کرنے کی وجہ سے بعض لوگ کہنے لگے ہیں کہ افلاطون آخر عمر میں متعصب ہو گیا تھا۔ مگر جو لوگ کہ قید مذہب سے آزاد ہو کر مخش و خرافات کی قید میں گرفتار ہونا پسند کرتے ہیں اُنھیں کے اکثر ایسے خیالات ہیں۔

رواداری اور آزادی کے جو معنی آجکل لیے جا رہے ہیں یہ شاید افلاطون کے ذہن میں بھی نہیں تھے۔ یہ وہ شخص تھا جو سقراط کا شاگرد اور ارسطو کا اُستاد ہے۔ جس نے اپنے اُستاد سے علم ظاہر کے مقابلہ میں باطنی علم زیادہ حاصل کیا تھا اور کوشش کرتا تھا کہ علم ظاہری کی طرح اسے بھی منصۂ شہود پر لائے۔ جہاں صراحت سے بیان کر سکتا تھا وہاں اُس نے بہت صراحت سے کام لیا ہے اور جہاں اشاروں کی ضرورت تھی، اسلیے کہ عوام میں تحمل و برداشت کی قوت نہیں تھی، وہاں صرف اشاروں سے کام لیا ہے اور اپنی تحریروں کو مبہم اور مغلق رہنے دیا ہے۔ چونکہ تہذیب باطنی کا واسطہ تہذیب ظاہری ہوا کرتی ہے اور تہذیب ظاہری احکام شرع کی پابندی سے حاصل ہوتی ہے اسلیے اُسنے مقصد اولین تہذیب باطنی کا بالواسطہ حصول کیلیے آخر عمر میں تدوین احکام شرع ظاہری کو ضروری سمجھا اور تمام کوششوں کو چھوڑ کر اسی ایک دُھن میں آخر تک لگا رہا اور اپنے پیچھے ایک ایسی شرع چھوڑ گیا ہے جو اس کے علوے مرتبت اور اعلیٰ مدارج ذہنی و روحانی کی طرف دلالت کرتی ہے۔

اگر قرآن پاک کے اس ارشاد پر استدلال کیا جائے کہ لِکُلِّ قَوۡمٍ ہَادٍ ہر قوم میں ایک ایک ہدایت کرنے والا آیا ہے، تو ممکن ہے کہ سقراط اپنے زمانہ اور ملک کا پیغمبر ہو۔ جو آوازکہ ہر وقت اُسکے ساتھ رہا کرتی تھی وہ اور اس خیال کو تقویت دیتی ہے۔ اور اگر یہ صحیح ہے تو افلاطون اُسکا شاگرد رشید و خلیفۂ برحق تھا جسنے ایسے علوم کا نشر و اعلا کیا جنکا سرچشمہ نبوت میں نظر آتا ہے۔

واللہ اعلم بالصواب۔

حامد علیخاں

(الناظر، اکتوبر ۱۹۲۶ء)

ابن خلدون اور ان کا فلسفۂ تاریخ

محمد بن خلدون پہلے مصنف ہیں جنھوں نے تاریخ کو بذاتِ خود ایک خاص علم کا موضوع قرار دیا ہو اس لحاظ سے ان کو علم تاریخ کا بانی مبانی کہا جا سکتا ہو یا نہیں؟ یہ ایک ایسا سوال ہو کہ جس کے جواب میں اختلاف آرا کچھ بعید از قیاس نہیں۔ لیکن اُن کے مقدمہ کا کوئی منصف مزاج ناظر اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ وہ کوسے قبل کے تمام مصنفین میں سے بھی ایک ایسے مصنف ہیں جو اس اعزاز کے مستحق سمجھے جا سکتے ہیں۔

ان کے سوانح حیات کے لیے ہم ان کی خود نوشتہ سوانح عمری کے رہین منت ہیں لیکن یہ سوانح عمری ۱۳۹۴ء (۷۹۶ھ) یعنی وفات سے بارہ سال قبل پر ختم ہو گئی ہو۔ اس کی صحت اور راست گوئی میں کوئی شک نہیں کر سکتا۔ اور اُس کے ساتھ ہی اس میں ایک خوبی یہ بھی ہو کہ کافی مفصل ہو۔ لیکن بڑا نقص یہ ہو کہ اس سے نہ تو مصنف کے خیالات و معتقدات ہی واضح ہوتے ہیں نہ انکی روزمرہ زندگی اور اُن کے احوال ہی پر کچھ روشنی پڑتی ہو۔ بالفاظ دیگر اس میں کوئی ایسی خوبی نہیں جس کی ہم کو ابن خلدون ایسے مصنف سے امید ہو سکتی تھی۔

ابن خلدون ۱۳۳۲ء میں تونس میں پیدا ہوئے۔ وہ حضر موت کے ایک قدیم عرب قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے اور ایک ایسے خاندان سے تھے جسکا سپین پر بہت اثر پڑا۔ بنو امیہ کے زوال کے وقت یہ خاندان آکر شمالی افریقہ میں آباد ہوا تھا۔ ابن خلدون کو خاص اہتمام سے تعلیم دی گئی انھوں نے قرآن شریف کے علاوہ قدیم عربی نظم، حدیث، صرف و نحو، منطق، ریاضی، فقہ، دینیات اور فلسفہ میں مہارت پیدا کی۔ اسی وجہ سے وہ بہت عدیم الفرصت رہتے تھے اور ہمیشہ طلب علوم اور مطالعہ ادبیات میں منہمک نظر آتے تھے۔ بیس برس کی عمر میں وہ ابن اسحاق ثانی، سلطان تونس کے ہاں ملازم ہوئے۔ اسی وقت سے اُن کی سیاسی جد و جہد کا آغاز ہوتا ہو۔ صرف دو سال بعد وہ ابو عینان، سلطان فیض کے ہاں چلے آئے۔ ابو عینان کے وہ منظور نظر ہو گئے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ درباریوں نے ان کے

خلاف سازش کی اور آخر اُن کو بے عزت کرواکے قید مین ڈلوادیا۔ ۱۳۵۹ء مین ابو عینان نے انتقال کیا
ان کے جانشین ابو سالم نے ان کو رہا کرکے اپنا کاتب مقرر کیا۔ لیکن اس وقت وہ درباریون کے
محسود اور مبغوض رہے ابو سالم کی وفات کے بعد ان مین اور وزیر عمر مین ان بن ہوئی اور ان کو دربار
چھوڑکر اسپین جانا پڑا، یہان ابن الاحمر نے ان کو ہاتھون ہاتھ لیا، اور اگلے ہی سال ان کو سفیر مقرر کرکے
پیٹر، شاہ قستالا، کے پاس اشبیلیہ بھیجدیا۔

۱۳۶۵ء مین وہ اپنے ایک قدیم دوست ابن عبد اللہ کے وزیر اعظم مقرر ہوکر پھر افریقیہ آئے
لیکن یہ شخص عبد العباس، شاہ قسطنطین، کے خلاف ایک جنگ مین مقتول ہوا۔ اس کے بعد
ابن خلدون کی زندگی بہت خطرے مین گذری۔ کیونکہ وہ ایسی جگہ تھے جہان کے والی ہر وقت ایک
دوسرے کے خلاف آستینین چڑھائے رہتے تھے، ان کی جان بھی صرف بعض طاقتور اور خود مختار عربی
قبائل کے سردارون کی دوستی کی وجہ سے بچی رہی۔ ۱۳۷۰ء سے ۱۳۷۴ء تک وہ شاہ مراکش کے ملازم
رہے اور عرب قبائل کے ساتھ رسل و رسائل اور انصرام مہمات مین خصوصیت کے ساتھ مشغول رہے ۱۳۷۴ء
مین وہ دوبارہ اسپین گئے۔ لیکن جلد ہی وہان سے واپس آنے پر مجبور ہوے۔ اس کے بعد چار سال
اُنھون نے بالکل عزلت مین، گذار دیے "یہ تمام مدت ایک بڑے مگر ویران قلعہ مین مطالعہ مین صرف کی"
اسی عزلت مین اُنھون نے شہرۂ آفاق مقدمہ تیار کیا اور تاریخ عرب و بربر کی بنا ڈالی۔ مؤخر الاسم کو
جاری رکھنے کے لیے اُن کو بڑے بڑے کتبخانون کی ضرورت لاحق ہوئی اور اسی وجہ سے اُنھون نے
۱۳۷۸ء مین تونس کی طرف مراجعت کی۔

سلطان عبد العباس اور عامۃ الناس نے ان کا استقبال نہایت گرمجوشی سے کیا اور طلبہ
نے ان کو مجبور کیا کہ وہ ان کو تعلیم دین۔ لیکن درباریون مین سے ایک فرقہ جس کے سر عسکر مفتی اعظم
ابن عرفہ تھے، اُن کی اس مراجعت اور اس عزت و احترام کو اپنے لیے فال بد سمجھا چنانچہ ان لوگون نے
ریشہ دوانیان شروع کین۔ ابن خلدون اپنے خلاف آئے دن کی سازشون سے گھبرا گئے اور عہد کیا کہ
تاریخ بربرہ ختم کرنے کے بعد وہ حج کے لیے روانہ ہوجائین۔ چنانچہ اکتوبر ۱۳۸۲ء مین وہ اجازت
حاصل کرکے مصر کی طرف روانہ ہوئے اور نومبر مین اسکندریہ پہونچ گئے۔ اور صرف ایک ماہ قیام کرکے
قاہرہ کی طرف روانہ ہوگئے۔ ان کی شہرت تو چار دانگ عالم مین پھیل ہی چکی تھی اور اس وقت اتفاق سے

لے جانے والا کوئی کاروان بھی تیار نہ تھا۔ لہٰذا وہان کے سلطان نے ان کو مجبور کیا کہ وہ اپنا حج کا ارادہ فسخ کرکے قاہرہ مین پروفیسری قبول کرین۔ اُنھون نے سر تسلیم خم کیا اور وہین مستقل طور پر مقیم ہوگئے رفتہ رفتہ وہ قاضی القضاۃ کے عہدے تک ترقی کر گئے۔ اس عہدہ پر قوانین عدل وانصاف کی پابندی نے سرکاری آدمیون مین ان کے بہت سے دشمن پیدا کر دیے۔ اس کے علاوہ اُن پر ایک مصیبت یہ پڑی کہ جس جہاز مین اُن کا خاندان مراکش سے مصر جارہا تھا وہ ڈوب گیا اور دفعۃً بہ یک گردش چرخ نیلوفری" اپنی زر و دولت اور خوشی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اس صدمہ سے وہ بہت دلگیر ہوے۔ مگر سواے دعا کے اُن کے پاس بھی کوئی چارہ کار نہ تھا۔ ۱۳۸۷ء مین وہ حازم مکہ ہوے اور وہان سے قاہرہ آکر کچھ مدت تک تو تعلیم دیتے رہے اور مطالعہ مین مصروف رہے اور ۱۳۹۴ء مین خود نگاشتہ سوانح عمری لکھی جسمین اُس وقت تک کے حالات درج کیے۔ ۱۴۰۱ء مین وہ سلطان مصر کے ہمراہ سلطان تیمور کے خلاف ایک مہم مین شامل ہوکر شام گئے اور دمشق مین محصور ہوے۔ لیکن انھون نے اپنے آپ کو فاتح کے حوالہ کر دیا۔ تیمور نے ان کی بہت عزت وحرمت کی اور ان کی لیاقت وقابلیت کی قدر کی۔ ابن خلدون نے بھی اپنے آپ کو ایک وفادار اور لائق درباری ثابت کیا۔ تیمور ان کو ترکستان لے جانا چاہتا تھا مگر ان کا اصرار اس کے ارادہ پر غالب آیا اور یہ قاہرہ واپس چلے آئے۔ یہان دوبارہ قاضی القضاۃ مقرر کر دیے گئے۔ اور آخر چوہتر برس کی عمر مین ۱۴۰۶ء مین انتقال کیا۔

مذکورۂ بالا مختصر سی سوانحعمری سے بھی یہ بات واضح ہوجاتی ہو کہ ابن خلدون ایک عجیب وغریب آدمی تھے۔ ان کی تمام زندگی ایسے حالات مین گذری جو نہایت پیچیدہ تھے، ہر روز نئے نئے واقعات رونما ہوتے تھے، آے دن اِن کے خلاف سازشین ہوتی تھین جن جن حاکمون کے زیر سایہ وہ رہے وہ مستبد تھے اور اُن کے درباری کینے اور حاسد، ان تمام باتون کے باوصف انھون نے بہت سے مواقع پر کارہاے نمایان کیے ان کے اعدا ان کو اکثر نیچا دکھانے مین کامیاب ہوتے رہے مگر وہ بھی اپنی خداداد لیاقت کی وجہ جلد ہی اپنی اصلی حالت پر آجاتے تھے۔ نوجوانی اور بڑھاپے دونون حالتون مین اور زمانہ کے حادثات کے باوجود وہ بہت ذی اثر اور ممتاز رہے۔ کبھی انکی خوشامد کی جاتی تھی، کبھی ان کو دھمکایا جاتا تھا اور کبھی ان کی تعریف کی جاتی تھی۔ ہر حال مین اُن کا جوہر ذاتی اسیطرح ضوفگن رہا۔ وہ ایک ماہر سیاست دان، نکتہ فہم، دانا درباری اور سوسائٹی کے ایک درخشندہ رکن تھے۔ ان کی راے صائب اور اُن کی گفتگو پُر اثر

ہوتی تھی۔ ان کو ماحول کے مطابق اپنے آپ کو بدل لینے میں خاص ملکہ تھا۔ وہ مختلف النوع جگہوں پر کام کر سکتے تھے اور ہر ان علوم و فنون میں طاق تھے جن کو ان کے مسلمان ہمعصروں نے ترقی دی ان کی طبیعت میں بھی سازشیں کرنے اور کروانے کا مادہ موجود تھا۔ مگر وہ اپنے عالی رتبہ ہونے کی وجہ سے مجبور تھے۔ ان کی طبیعت بھی مستبدانہ حکومت کی طرف مائل تھی۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ وہ سیاسیات اور ادبیات میں شہرت کے خواہاں تھے۔ لیکن وہ اس الزام سے بری ہیں کہ اپنے اس مقصد میں کامیاب ہونے کے لیے انھوں نے اخلاقی قوانین کو پس پشت ڈال دیا یا فتنہ انگیز حرکتیں کیں۔ وہ ایک پکے مسلمان تھے۔

فلسفہ میں وہ کسی خاص مسلک سے تعلق نہ رکھتے تھے۔ چودھویں صدی سے قبل تمام اسلامی ممالک میں فلسفہ بہت بدنام ہو چکا تھا۔ اور جہاں کہیں قرآن شریف کا فیصلہ معاملات مذہبی میں ناطق سمجھا جاتا تھا، وہاں دینی تعصب اور جوش نے اصولی مسائل پر آزادانہ غور و فکر کو جڑ سے اکھیڑ پھینکا تھا۔ اس لحاظ سے ابن خلدون اپنے زمانہ کے عوام سے کچھ الگ نہ تھے عالم مافوق الاحساس کے مسائل میں ان کو عقل کی نسبت الہام پر زیادہ اعتماد تھا چنانچہ انھوں نے اپنے مقدمہ کی مکمل ایک فصل میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ فلسفہ کو غلطی سے علم کہا گیا ہے اور یہ کہ یہ نہ صرف اپنے دعادی کو ثابت ہی نہیں کر سکتا بلکہ مذہب کے خلاف ہونے کی وجہ سے ضرر رساں بھی ہے وہ صرف اس قدر تسلیم کرتے ہیں کہ تاریخ فلسفہ کا مطالعہ کچھ مفید ہو سکتا ہے کیونکہ اس سے ہماری فہم میں ترقی ہوتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس کا مطالعہ صرف ان لوگوں کو کرنا چاہیے جو علوم قرآن اور فقہ میں ماہر ہوں۔ تجربی علوم کی وہ بہت قدر کرتے تھے، آنحضرت صلعم کی تعلیمات کو بے حیل و حجت مانتے تھے اور مذہب اور مابعد الطبیعیات میں تمام عقلی مداخلت کو غلط یا منجر الی الغلط سمجھتے تھے۔ چونکہ ان کا تعلق کسی خاص فلسفہ سے نہ تھا اس لیے ان کو اس بات کا بھی خیال نہ آیا کہ وہ تاریخ کی توجیہ فلسفہ کی روشنی میں کریں اور قرآن شریف میں علم تاریخ کی بنا کے لیے کچھ مواد نہ تھا لہذا انھوں نے اپنے تمام تاریخی نظریوں کو براہ راست تاریخی واقعات سے مستنبط کیا ہے۔ اس باب میں ان کا علم نہایت وسیع، علمی مستحضر اور عالمانہ تحقیقات اور ذاتی تجربہ کا نتیجہ تھا۔ اس کے علاوہ ان کو معاشرتی مظاہر کی اصلیت اور ان کے مفہوم تک پہنچنے میں خاص مہارت تھی۔ اور نہایت ہی سہولت

لے ساتھ ان کے اسباب اور تعلقات کو معلوم کر لیتے تھے تعمیمات کرنے مین ان کو ید طولی حاصل تھا۔ اور
حقیقت یہ ہی کہ یہی خصوصیات ان کی تحقیقات مین کامیابی کا باعث ہوئین۔ اس مین ان کے
غور و فکر یا فلسفیانہ اصول کی جدت و عمدگی کو کچھ دخل نہین۔

ابن خلدون نے مختلف موضوعات پر طبع آزمائی کی ان کے بعض چھوٹے چھوٹے رسائل
تو اسی وقت مشہور ہوئے اور بعد مین غائب ہو گئے۔ ان کی تمام شہرت ان کے شاہکار "تاریخ"
اور خاصکر اس کے پہلے حصہ "مقدمہ" پر مبنی ہی۔ دوسرے حصہ مین عربون، شامیون، ایرانیون، اسرائیلیون،
قبطیون، یونانیون، رومیون اور ترکون کی تاریخ ہی۔ تیسرے اور آخری حصے مین بربرہ اور اردگرد کی
اقوام کا ذکر ہی۔ ان موخرالذکر دو حصون پر صرف معدودے چند ماہر ہی اپنی رائے ظاہر کر سکتے ہین۔
ان کا مصنف ان کی جدت، علم و نقد کے قوانین کی مطابقت اور ان کی قدر و قیمت کے لحاظ سے بہت
اعلی و ارفع سمجھتا تھا۔ لیکن اصلیت یہ ہی کہ وہ اس مین غلطی پر تھا۔ ڈوزی، دی سلین، اور عمری جیسے
لائق نقاد، جو تاریخ عالم، کے مطالعہ مین مصروف ہین، سب اس بات مین متفق ہین کہ ایک تاریخی تصنیف
کی حیثیت سے اس مین بہت نقص ہین۔ ان کی رائے ہی کہ اس کا طرز تحریر غیر واضح اور غیر محتاط ہی۔
واقعات کے بیان کرنے مین طول لاطائل دیا ہی اور اس کو بیکار اور فضول استدلالات سے ثقیل کر دیا ہی
مواد اور مضامین کی تقسیم اس ڈھنگ کی ہی کہ تکرار لازمی ہو گئی ہی۔ اور ان ماخذ کو جن کی سند کو قابل وثوق
قرار دیا ہی، اکثر غلط بیان کیا ہی۔ ممکن ہی کہ ان کی یہ رائے درست ہو۔ لیکن سوچنا یہ چاہیے کہ اگر ابن خلدون
کی تصنیف زمانہ حال کی ایک سائنٹفک تاریخ کی محک پر کامل العیار اترتی تو ان کا یہ کارنامہ معجزے
کم نہ ہوتا۔ ایک تاریخی تحقیق کی حیثیت سے ان کا کام پہلے ہی عقل کو حیران کیے دیتا ہی۔

اب ہم کو اپنی تمامتر توجہ مقدمہ کی طرف منعطف کرنی چاہیے۔ یہ بذات خود ایک مکمل کتاب ہے،
اور اسی کتاب کا ایک مختصر و مجمل حال اوراق آئندہ کا موضوع ہی۔

اس مین ایک دیباچہ ہی، ایک مقدمہ اور چھ فصلین۔

دیباچہ مین تصنیف کا موضوع تاریخ بتایا گیا ہی جو علم کی ایک نوع ہی جس کی ہر جگہ قدر کی جاتی ہی،
عام طور پر ترقی دی جاتی ہی اور بہت طرح مفید اور بکار آمد ہی۔ تاریخ کے متعلق کہا گیا ہی کہ بظاہر یہ ان تمام
واقعات کو بیان کرتی ہی جو اقوام کے تجربہ مین ہر زمانہ مین ظہور پذیر ہوتے ہین اور بہ باطن واقعات کا

مطالعہ اور ان کی تحقیق، انکے اسباب، معاشری مظاہر کے ظہور کے طریق پر ایک جامع، نافع اور مدلل بحث کرتی ہے۔ جب تاریخ ان دو صفات سے متصف ہو تو اس کا شمار علوم مین ہو سکتا ہے" ابن خلدون کی کوشش یہ تھی کہ کسی طرح تاریخ بھی اور علوم کے ہم رتبہ ہو جائے۔ ان کا خیال تھا اور صحیح خیال تھا کہ ان سے قبل کسی مصنف نے بالارادہ یا بسلسل کوشش اس مقصد کو حاصل کرنے کی نہین کی۔

مقدمہ مین مصنفین کے غیر ناقدانہ رویہ اور اس کے اسباب پر بحث کی ہے، شہادتون کے قبول کرنے مین ان کی عجلت اور بیان کردہ واقعات کی غیر کافی اور غلط توجیہات کی بہت سی مثالین پیش کی ہین۔ اسی سلسلہ مین مسعودی کے اس بیان پر بھی تنقید کی ہے کہ جہان اس نے حضرت موسیٰ کے زیر کمان اسرائیلیون کی تعداد کا ذکر کیا ہے۔ اور جس بناء پر اس تعداد کو ناقابل اعتبار ثابت کیا گیا ہے وہ تقریباً وہی ہین جو کولنسو نے زمانہ حال مین بیان کی ہین۔ مورخون کی غلطیون کے اسباب انھون نے یہ بیان کیے ہین کہ یہ لوگ زمانہ اور قرن کے فرق کو نظر انداز کر دیتے ہین۔ اور دو واقعات مین تشابہ کی وجہ سے نتیجہ اخذ کرنے مین جلدی کرتے ہین۔ اسکے علاوہ خود رائی اپنے اوپر یا دوسرون پر اعتماد کورانہ تقلید، اور تہذیب و تمدن کی ماہیت اور اس کے اثر کے متعلق قلت علم ان کو راہ گم کرنے مین مدد دیتے ہین۔ ان مین سے آخری سبب پر بحث کے دوران مین ابن خلدون نے اپنی اس تحقیق و تفحص اور اس کے متوقعہ نتائج کو "علم تمدن" کے نام سے موسوم کیا ہے یہی علم ان کے نزدیک تاریخ مین خطا و صواب کا معیار ہے۔

مقدمہ کی پہلی فصل مین ہیئت اجتماعی پر بالعموم اور اس سے متعلق نسل انسانی اور زمین کے ان حصص پر بحث ہے جنمین یہ آباد ہے۔ اس بحث کا پہلا مقدمہ یہ ہے کہ انسان بالطبع مدنی ہے۔ اس کا جسم، اس کی روح اور اس کی تمام خواہشات و احساسات کے عمل اور ترقی کے لیے لازمی ہے کہ ابنائے جنس مین تعاون اور رشتہ مواخات ہو۔ اور حیات عامہ اور حیات اجتماعی مین وہ ایک دوسرے کے شریک ہون۔ یہ حیات عامہ یا حیات اجتماعی بتدریج ترقی پذیر ہوتی ہے اور اس ترقی مین تہذیب یا تمدن کے درجات و مراتب سے گذرتی ہے۔ جسطرح علم ہندسہ کمیات پر، علم ہیئت اجسام فلکی پر، اور علم طب جسم انسانی پر بحث کرتے ہین اسی طرح یہ نیا علم یعنی علم تاریخ، تہذیب یا تمدن پر بحث کرتا ہے۔

اس کے بعد تاریخ اور تمدن کے اساس طبعی پر ایک طول طویل بحث ہے۔ اس مین ربع مسکون،

ہے کے حصص اُس کے بڑے بڑے حصون، بڑے بڑے دریاؤن، اور اس کی آب و ہوا کا ذکر ہے۔
آب و ہوا کے لحاظ سے اس کو سات منطقات پر تقسیم کیا ہو اور پھر ہر منطقہ کو دس حصون مین۔ ان حصون مین سے
ہر حصے کے باشندون کی تخصیص کی ہو۔ ان مین سے تین معتدل منطقات کو بہ تفصیل بیان کیا ہو اور ان کے
باشندون کی معاشری حالت اور ان کی تہذیب کے ممیزات پر بحث ہو۔ اسی بحث مین یہ بتایا گیا ہے کہ
نوع انسان کے جسمانی نفسیاتی اور اخلاقی خصوصیات پر آب و ہوا اور سردی گرمی کا بہت بڑا اثر ہوتا ہو مثلاً
حبشیون کی سیاہ رنگت اور اُن کے اوضاع واطوار کی تمام خصوصیات آب و ہوا ہی کا نتیجہ بتائی گئی ہین
اسی مین مصنف نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہو کہ زمین کی زرخیزی یا قحط وغیرہ کا آدمیون کی جسمی یا
نفسی حالت پر کیا اثر ہوتا ہو۔ اور اس طرح ہیئت اجتماعی مین کیا کیا تغیر و تبدل ہوتا ہو،

یہ فصل جاکر نبوت کی بحث پر ختم ہوتی ہو، اس مین غیر مرئی عالم، جس کے علم سے چند برگزیدگان
کو عوام کی تعلیم کے لیے ہرہ اندوز کیا گیا ہو، پر بحث ہو، اس بحث مین بھی بہت سی دلچسپ اور سبق آموز باتین ہین
اگرچہ بعض ناظرین کے نزدیک بحث بالکل بے محل و بے موقع ہو۔ مگر حضرات اس بات کو نظر انداز کردیتے
ہین کہ ایک سامی الاصل شخص کے لیے یہی نبوت تمام مذہبی معلومات کا سرچشمہ ہوتی ہو۔ لہذا اگر مذہب
تہذیب و تمدن کا ایک جزو لاینفک ہو تو یہ بحث بھی ناگزیر ہو۔

مقدمہ کی دوسری فصل مین خانہ بدوش اور نیم وحشی اقوام کی تہذیب کا ذکر ہو۔

ابن خلدون کا اصلی تبحر علم اسی فصل مین نظر آتا ہو۔ کیونکہ یہان انھون نے جو کچھ لکھا ہو وہ ذاتی
تجربہ اور نہایت ہی وسیع علم کی بنا پر لکھا ہو۔ سب سے پہلے انھون نے یہ ثابت کیا ہو کہ انسان کی تمام
رسوم اور اُس کے تمام تعینات اس کے کسب معاش کے طریقے پر منحصر ہین۔ چنانچہ انھون نے دکھایا ہو کہ
شروع شروع مین لوگ صرف ضروریات ہی پر قانع تھے مگر بعد مین وہ آہستہ آہستہ عیش پسند او عشرت خواہ
ہوتے گئے۔ ان کی اس ترقی کے تمام درجہ ماحول کے مطابق ہونے کے لحاظ سے بالکل فطری سے تھے۔
اسی واسطے اُن کے نزدیک عربون کی حالت بالکل طبعی ہو۔

اسی فصل مین انھون نے بدوی اور مدنی زندگی مین تعلق دکھانے کی بھی کوشش کی ہو۔ ان کا
عقیدہ ہو کہ مقدم الذکر زندگی موخر الذکر زندگی پر مقدم ہو، یہی گہوارہ تمدن کہی جاسکتی ہو، اسی سے
تمام شہر پیدا ہوتے اور پلتے ہین اور یہی اُن کو آباد کرتی ہو، وہ بادیہ نشینون کی اخلاقی حالت کو ان کی

خشونت مزاج کے باوجود شہر والون کی اخلاقی حالت پر ترجیح دیتے ہین۔ یہ لوگ خاصکر بہت باہمت ہوتے ہیں
اس کی وجہ یہ ہو کر وہ اپنی حرکات وسکنات مین آزاد ہوتے ہین۔ ان کے اوضاع واطوار اور نشست وبرخاست
کسی ہم جنس کے احکام کے تابع نہین ہوتے۔ اور اس طرح ان مین خود اعتمادی اور قوت حیات ہمیشہ
تازہ رہتی ہو۔

بادیہ کی حیات اجتماعی پر بحث کرتے کرتے وہ لکھتے ہین کہ عصبیت کی ضرورت سب سے زیادہ
اہل بادیہ کو ہوتی ہو اور یہ احساس عصبیت ان لوگون مین قوی ہوتا ہو جو آپسمین رشتہ دار ہون یا جنہین
اسی قسم کا کوئی اور مستحکم تعلق پایا جاتا ہو۔ یہی نیم وحشی اور اہل بادیہ اپنی صحت نسل پر بجا طور پر فخر
کرسکتے ہین۔ اس قسم کے قبائل کے لیے لازمی ہو کہ حکومت کا حق ایک قوی ترین خاندان کو ہو۔ اس
حق کا کسی غیر قبیلہ مین منتقل کرنا ہمیشہ مُہلک ہوتا ہو۔ ایسے ہی خاندانون مین جو ایک دوسرے کے
مشیر کار ہون اور جن مین رشتہ مواخات قائم ہو اصلی شرافت ونجابت پائی جاتی ہو اور خاندانون کی
شرافت محض برائے نام ہوتی ہو۔ ان کے لیے اس لفظ کا استعمال بطور استعارہ ہوتا ہو۔ شہر مین رہنے
والون مین کوئی خاندان ان معنون مین شریف نہین ہوتا۔ وہ نیک ذی اثر اور ذی عزت ہوتے ہین
مگر شریف نہین ہوتے۔ ایک خاندان کی شرافت صرف اسی پر مبنی نہین کہ وہ شریفون کے اخلاف ہین
بلکہ اصلی شریف وہ ہو جسمین شریفون کے اوصاف پائے جائین۔ یہودی دنیا بھر مین سب سے زیادہ
شریف خاندان کے اخلاف ہین اور وہ بجا طور پر اپنے بزرگون کی عظمت شان پر فخر کرسکتے ہین۔ مگر
اس وقت ان مین خاندانی شرافت مفقود ہو۔ ایک خاندان کی شرافت مشکل سے چار نسلون
تک باقی رہتی ہو، اور آج تک کوئی خاندان ایسا نہین ہوا جس نے اپنی شرافت کو چھ نسلون تک
قائم رکھا ہو۔ حکومت کرنے کی قابلیت صرف وہی لوگ رکھتے ہین جو نیک خصلتون اور نیک کامون
کی وجہ سے اپنے آپ کو دوسرون سے ممتاز کردین۔

اسکے بعد ابن خلدون بیان کرتے ہین کہ ان نیم وحشی خانہ بدوشون مین فتوحات کرنے کی
زیادہ قابلیت ہوتی ہو بشرطیکہ ان کے دل مین اپنے قبیلہ کی عظمت کا احساس ہو ان کے
مقاصد متحد ہون اور وہ حیوانی لذائذ یا غلامی کے ہاتھون تباہ نہ ہو چکے ہون۔ اپنے اس دعوے کے
ثبوت مین اُنھون نے آنحضرت صلعم، اور آپ کے خلفاء کے زیر حکومت عربون کے حیرت انگیز غلبہ و

تسلط کو مثال کے طور پر پیش کیا ہی۔ اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی لکھتے ہین کہ عرب میدانون بن رہنے والون پر تو مسلط ہو گئے، مگر بربرہ اور پہاڑی اقوام ان کے قابو مین آئین۔

عربون کی خرابیان اور اُن کے نقائص سے بھی وہ غافل نہ تھے۔ یہ بات اس عدیم المثال باب سے ظاہر ہوتی ہی جہان اُنھون نے اپنا یہ خیال ظاہر کیا ہی کہ عربون نے اپنے ہر مفتوحہ ملک کو تباہ و برباد کیا۔ اس باب کے کچھ حصہ کا ترجمہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ و ہو ہذا:۔

"خانہ بدوشانہ زندگی کی عادات و خصائل نے عربون کو ایک وحشی قوم بنا دیا ہی۔ ان کے اوضاع و اطوار کی خشونت ان کی طبیعت ثانیہ بن چکی ہی، اور اسی مین ان کو لطف بھی آتا ہی۔ کیونکہ اسی کی بدولت ان کو خود مختاری اور آزادی حاصل ہوتی ہی۔ اس قسم کی حالت تہذیب کے راستے مین بمنزلہ ایک سنگ گران کے ہی۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ نقل و حرکت کرنا اور صحرا کو قطع کرنا، ازل سے ان کا مشغلہ رہا ہی۔ خانہ بدوشانہ زندگی ترقی تہذیب کے لیے اسی قدر مضر ہی جسقدر کہ مدنی زندگی اس کے لیے مفید۔ اگر عربون کو اپنے چولھے کے لیے اینٹون کی ضرورت ہوتی ہی تو وہ ایک مکان کو گرا کر اینٹین مہیا کرتے ہیں۔ اگر ان کو خیمون کے لیے ڈنڈون کی حاجت ہوتی ہی تو وہ بلا تکلف ایک عمارت کی چھت کو گرا کر اسمین سے وہ ڈنڈے نکال لیتے ہین۔ ان کی بسر اوقات کا طریقہ ہی ایسا ہی کہ وہ مکانات تعمیر نہین کر سکتے، اور یہی عمارتین ہی تہذیب کا سنگ بنیاد ہوا کرتی ہین۔ اس کے علاوہ وہ استحصال بالجبر مال و دولت کو سلح ہاتھون سے چھیننا اور بغیر کسی حد یا اعتدال کے غصب و نہب ان کی گھٹی مین پڑا ہوا ہی۔ اگر ان کی آنکھ کسی اچھے گلّے یا نفیس سامان آرائش یا ایک کارآمد چیز پر پڑتی ہی تو وہ پھر اُن کی دست برد سے محفوظ نہین رہ سکتی۔ جب وہ ایک علاقہ کو فتح کر لیتے ہین یا ایک خاندان کی بنیاد رکھتے ہین تو اپنے جذبۂ غصب و نہب کی تشفی کے لیے تمام اُن قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہین جن کا مقصد یہ ہوتا ہی کہ وہ جان و مال کی حفاظت کرین۔ ان کی حکومت مین ہر چیز رو بہ تباہی ہوتی ہی۔ وہ تاجرون اور صناعون پر ناقابل برداشت بار ڈالتے ہین اور ان کو یہ خیال تک نہین آتا کہ یہ لوگ ان کی مدد کے مستحق ہین نہ کہ اس بار گران کے۔ یہی تجارت و صنعت مال و دولت کا ایک وسیلہ ہوا کرتی ہین۔ اگر دست کاری پر بیجا بار ڈالا جائے یا اس پر بندشین عائد کی جائین تو ان بن

نفع کی صورت نظر نہین آتی اور فائدہ کی امید نہین رہتی لہذا کوئی شخص اس پر محنت نہین کرتا
جب حالت یہان تک ردی ہو جاے تو نظام اجتماعی بگڑنا شروع ہو جاتا ہو اور تہذیب مین
ترقی معکوس ہونے لگتی ہو اس کے علاوہ عرب حکومت کے تمام وظائف کو پس پشت ڈالدیتے
ہین، وہ جرائم کو بند کرنے یا حفاظت معاملہ کی کوشش نہین کرتے۔ ان کی تمام تر کوشش یہ ہوتی
ہو کہ رعایا کا تمام روپیہ کھینچکر اپنے خزانون کو پر کرلین۔ اپنے اس مقصد کے حاصل کرنے مین وہ لوگ جبر و تشدد
سے بھی گریز نہین کرتے۔ اگر اسمین وہ کامیاب ہوگئے تو وہ بیفکر ہو جاتے ہین۔ وہ اپنی رعایا کی
امداد یا جرائم پیشہ لوگون کے استیصال سے سلطنت کا حسن انتظام کا خیال بھی اپنے دل مین
نہین لاتے۔ ایک رسم کے مطابق جو اُن مین پشتہا پشت سے متوارث چلی آرہی ہو وہ جسمانی سزا
کی جگہ جرمانون کو رواج دیتے ہین تاکہ اسطرح ان کی آمدنی بڑھ جائے۔ لیکن محض جرمانون سے
جرائم اور مجرمون کا استیصال نہین ہوسکتا۔ بلکہ برخلاف اس کے اس سے شریر النفس لوگون
کو اور جرأت ہوتی ہو۔ کیونکہ یہ لوگ اپنی کامیابی کی خاطر مالی نقصان کی پرواہ نہین کیا کرتے۔
ان حالات کے ہوتے ہوے یہ کہنا بیجا نہین کہ ایک عربی قبیلہ کی رعایا پر کوئی حاکم نہین ہوتا۔
اور رعایا کی یہ خودسری رعایا اور ملک کی خوشحالی دونون کے لیے یکسان مضر ہو......
شروع سے لیکر اس وقت تک عربون نے جس ملک کو فتح کیا اُن پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہو کہ وہان سے
تہذیب اور آبادی غائب ہو جاتی ہو۔ بلکہ اُن کی حالت یہان تک زدہ ہو جاتی ہو کہ اس سرزمین
کی خصوصیات ہی بدل جاتی ہین۔ یمن مین معدودے چند بڑے بڑے شہرون کے سوا آبادی کے
تمام مراکز اس وقت غیر آباد ہین۔ عراق کا بھی یہی حال ہو۔ ایرانی حکومت کے زمانے کے
باغات اس وقت جنگل ہین۔ شام اب تباہ حال ہو۔ اور شمالی افریقہ کے ممالک تا ایندم زبان
حال سے عربون کی لوٹ مار کا گلہ کر رہے ہین۔"

اگلے باب مین عربون کو غیر مستطیع، حاسد اور جھگڑالو کہا ہو۔ مصنف کے نزدیک یہی وجہ ہو کہ دنیا
کی تمام اقوام مین سب سے کم عصبیت اُن مین ہو۔ اور اسی لیے یہ لوگ اس قابل نہین کہ بڑی اور دیرپا سلطنت
قائم کرسکین۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ان کے ماندوبود کی سادگی، ان کے ارادون کی پختگی اور واجب الوجود
کی عزت ان کا طغراے امتیاز ہو۔ اس موخر الذکر خصوصیت کی وجہ سے وہ لوگ بہت جلد کسی رسول یا

دی لے عقائد کو قبول یا اُن کے مطابقت کرنے کی طرف مائل ہو جاتے ہین۔ اور اسی مذہبی جوش کی حالت مین وہ اس قابل ہوتے ہین کہ نئی سلطنتون کو قائم کرین یا موجودہ سلطنتون کو تباہ کرین لیکن اس سے اگلے باب مین ہم کو بتایا گیا ہو کہ یہ لوگ گو سلطنتین قائم کر سکتے تھے مگر ان کا برقرار رکھنا ان کے لیے دشوار تھا۔ جب کبھی وہ ایک سلطنت قائم کرنے مین کامیاب ہوتے بھی ہین تو ان کا فطری غرور۔ اور غیر مطیع رہنے کی عادت تو ترقی کر جاتی ہو اور جوش مذہبی یا تو کم ہو جاتا ہو یا بالکل مردہ ہو جاتا ہو۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہو کہ آئے دن ایک نہ ایک قبیلہ یا سردار حاکم اعلیٰ کی اطاعت سے مُنھ موڑ لیتا ہو اور پھر وہی نیم وحشی حالت عود کر آتی ہو۔

تیسری فصل مین ابن خلدون نے سلطنتون کے عروج انتظام اور اُن کے زوال کے متعلق بحث کی ہو۔ یہ فصل بہت لمبی ہو اور اس کا بڑا حصہ تاریخ کی نسبت سیاسیات سے زیادہ تعلق رکھتا ہو اس حصہ کو جو اس فصل کے درمیان مین ہو ایک اسلامی سلطنت کے نظام و انتظام، اسکے وظائف و طرق اور اس کے عہدون اور محکمہ جات پر ایک مستقل رسالہ فرض کیا جا سکتا ہو۔ یہ تمام بحث بہت دلچسپ اور معلومات سے پُر ہو لیکن اس وقت ہمارے موضوع سے باہر ہو۔ سطور آئندہ مین ہم مجملاً بیان کرینگے کہ مصنف کے خیال مین سلطنتین کس طرح قائم ہوتی ہین اور لٹ جاتی ہین اور کس طرح وہ طاقت حاصل کرتی ہین اور پھر اس کو کھو بیٹھتی ہین۔

ایک سلطنت کو حاصل کرنے مین عوام الناس کا جوش بہت بڑا عنصر ہو۔ جب ایک قبیلہ یا فوج کے افراد مین ایسا اتفاق ہو اور ان کے اغراض و مقاصد اور احساسات اسطرح متحد ہون کہ وہ ہر قسم کے خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہون اور ہر قسم کا ایثار کرنے پر راضی ہون تو ان کا ناظم نہایت آسانی کے ساتھ ایک سلطنت قائم کر سکتا ہو۔ لیکن اس قائد کو اپنے تابعین ہی کے جوش اور ہمدردی پر تکیہ نہ کرنا چاہیے۔ بلکہ اس کو چاہیے کہ اُن لوگون کو اپنے تابع بین اور اپنا مطیع رکھے جن کے جوش اور عقیدت کی وجہ سے اس کو سلطنت حاصل ہوئی ہو۔ وہ ایک دیرپا اور مستقل سلطنت صرف اسی وقت قائم کر سکتا ہو جب وہ انتظام اچھا رکھے عدل و انصاف اور امن و امان کو ترقی دے، عاقلانہ قوانین بنائے، ایک باقاعدہ عمدہ فوج کھڑی کرے اور اپنے اور اپنے خاندان کا رعایا کو گرویدہ بنائے۔ اسکے بعد مصنف نے بیان کیا ہو کہ چونکہ مذہب ہی صرف ایک ایسی قوت ہو جس کی بدولت سلطنت مین بغض و عداوت، لڑائی جھگڑے اور

رقابت کی جگہ دوستی، اتفاق، تعاون اور جوش کا دور دورہ ہوسکتا ہے۔ اس لیے ایک بڑی سلطنت کے
استحکام کے لیے اس سے بہتر کوئی اور بنیاد نہین ہوسکتی۔ لیکن جوش مذہبی اس وقت تک بیکار ہوتا ہے
جب تک کہ اس کا حلقہ اثر وسیع نہ ہو۔ اور جب تک کہ طاقتور گروہ اس کے سامنے سر تسلیم خم نہ کرے۔
خدائے تعالیٰ اصلاح کا کام صرف اُن لوگون کے سپرد کرتا ہے جو اس کے اہل ہوتے ہین یا جن پر اکثر انسان
ایمان نہ لائین وہ اس کے رسول نہین ہوسکتے۔ جمہور کا اجماع اور عملی کامیابی ایک ربانی صداقت
پر شاہد ہوا کرتی ہین۔ مصنف نے اپنے ان تمام دعاوی کی مثالین ان واقعات سے دی ہین جو شرقی
تواریخ مین مذکور ہین۔

اس کے بعد کے چند ابواب مین سلطنتون کے مدت قیام پر بحث کی ہے۔ اسمین یہ ثابت کیا ہے کہ
ان مین کسطرح وسعت حدود زوال کا باعث ہوتی ہے۔ اور یہ کہ ایک عالمگیر سلطنت قائم کرنے کی راہ مین
کس قدر مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔ مصنف کا خیال ہے کہ عربون کی فتوحات صرف اس وجہ سے دیرپا نہ
ہوسکین کہ ان کو سرانجام دینے مین کچھ دیر نہ لگی۔ ان کی تمام فتوحات اور ان کا زوال بقول شخصے

چون آب روان آمد و چون ریگ روان رفت

اور ان کی سلطنتون مین زوال صرف اس وجہ سے جلدی آگیا کہ ان کی حدود بہت وسیع ہوگئی تھین۔
مصنف کا عقیدہ ہے کہ مفتوحہ سلطنتون کی وسعت اور ان کی عمر فاتحین کی تعداد اور ان کی طاقت
کی نسبت سے ہونی چاہیے۔ جن ممالک مین متعدد قبائل آباد ہین ان مین فتوحات کی رفتار
سُست ہونی چاہیے۔ عراق اور شام آسانی کے ساتھ فتح ہوگئے اور مراکش مشکل سے اور آہستہ
آہستہ۔ بادشاہون کے استبداد اور عیش پرستی کی طرف میلان اور اس کی وجہ سے فساد اور تباہی
کے مُنہ مین جانے کو مصنف نے نہایت ہی خوبی سے بیان کیا ہے۔ اور ان تمام تعمیمات کے لیے شرق کی
تواریخ نے کافی مواد مہیا کیا۔

ابن خلدون کا عقیدہ ہے کہ ایک فرد بشر کی طرح ایک سلطنت مین بھی جان ہوتی ہے جو عموماً
انسان کی تین نسلون سے زیادہ باقی نہین رہتی۔ یا بالفاظ دیگر ایک سلطنت کی عمر ایک آدمی کی اوسط
عمر سے تین گنی، یعنی ایک سو بیس برس ہوتی ہے۔ اس مفروضہ اصول یا واقعہ کی تشریح و توجیہ اس طرح
کی ہے کہ ہر سلطنت کے لوگون مین پہلی نسل مین عصبیت اور خانہ بدوشون کی خشونت طبع بہت زیادہ ہوتی
ہے۔ دوسری نسل مین طاقت اور دولت کی وجہ سے عیش پرستی اور مدنی زندگی کی غلامانہ عادات ظاہر
ہوجاتی ہین اور تیسری نسل بادیہ نشینون کے تمام ممیزات خصوصی سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہے اور اس طرح وہ

سلطنت ایک بڑے حملہ آور کے حملوں کو روکنے کی تاب نہین لاسکتی۔ یہ تمام تعمیمات اور تشریحات ایک مشرقی ممالک کے تاریخی واقعات پر مبنی ہین۔ ان کا اطلاق مغرب کی سلطنتوں پر نہین کیا جا سکتا۔

اسی فصل مین ابن خلدون نے نہایت حیرت انگیز وضاحت کے ساتھ یہ دکھایا ہو کہ تاریخ مین تمام تغیر و تحرک مسلسل ہوتا ہو۔ ان کا عقیدہ ہو کہ ہر سلطنت پر کئی حالات گزرتے ہین اور اسمین مختلف قسم کا تغیر و تبدل ہوتا ہو اور اس تغیر و تبدل کا اثر سوسائٹی کے ہر عنصر اور اس نسل کے افراد کے معتقدات اور ان کے قول و فعل پر پڑتا ہو۔ وہ اس حقیقت سے آشنا معلوم ہوتے ہین کہ لوگون کا عام رویہ تاریخ کے اس زمانہ حیثیت اور تعلقات کے مطابق ہوتا ہو جسمین وہ اپنی زندگی بسر کرتے مین اس لحاظ سے وہ زمانہ وسطی کے عیسائی مورخین سے کئی درجہ بالاتر ہین۔ یہ مورخین بلا کسی استثنائے اس کلیہ سے ناواقف تھے کہ "زمانہ مختلف تغیرات کو اپنے جلو مین لیے ہوے آتا ہو"۔ لیکن ابن خلدون اس سے غافل نہ تھے۔ وہ بہ تکرار اور مختلف صورتون مین بیان کرتے ہین کہ تاریخ مسلسل ہو اور اسمین تمام ترترقی غیر مختتم اور لازمی ہو۔ جس طریقے سے انھون نے تہذیب کے تبدل پر اپنے خیالات ظاہر کیے ہین اس سے معلوم ہوتا ہو کہ وہ اپنے اس کلیہ کے مفہوم کو اچھی طرح سمجھ چکے تھے۔ ان صفحات کے پڑھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہو کہ ان کا مصنف ایک فلسفی ہو اور فلسفی بھی ایسا کہ جس کے مقابلے مین یورپ کے زمانہ وسطی کے تمام فلسفی مورخین مین سے فرد واحد بھی نہین نکل سکتا۔

اب ہم اپنی توجہ چوتھی فصل کی طرف متوجہ کرتے ہین۔ اس مین شہر وان انمین طریق بود و باش اور ایک مدنی اور مجتمع تہذیب پر بحث کی ہو۔

سب سے پہلے مصنف نے شہرون کے قیام اور ان کے برباد ہونے کا تعلق سلطنتون کے عروج و زوال سے دکھایا ہو۔ ان کے نزدیک پہلے سلطنتین قائم ہوتی ہین اور ابعاز ان شہرون کی بنیاد پڑتی ہو۔ یہ شہر اس سلطنت کے ساتھ ہی تباہ ہو سکتے ہین اور یہ بھی ہو سکتا ہو کہ ان کے بعد باقی رہین۔ پھر ان اسباب پر غور کیا ہو جو اس سلطنت کے قائم کرنے والون کو شہرون کی بنا ڈالنے پر مجبور کرتے ہین۔ اور ان حالات کو واضح کیا ہو جو شہرون کے جا و توع کے انتخاب مین زیادہ تر دخیل ہوتے ہین۔

اسی فصل مین ابن خلدون نے بیان کیا ہو کہ کم از کم وہ خود تو اپنے ہمعصرون کی فطنت اور انکے کارنامون کو بیان کرنے مین رنگ آمیزی نہین کرتے۔ وہ لکھتے ہین کہ ان لوگون کی عمارتین ایسی قوم کے شایان شان نہین جو اس قدر قوی اور دولتمند رہی ہو۔ یہ عمارتین ان لوگون کی عمارتون سے

کہیں فروتر ہیں جو اُن سے پہلے گذر چکے ہیں، ان کا خیال ہے کہ عربوں میں فن معماری اور دیگر فنون میں مہارت حاصل کرنے کی قابلیت ہی نہ تھی۔ وہ لوگ طبعاً عالیشان عمارتوں اور اور قسم کی نفاستوں کے خلاف ہیں۔ اُنکی تمام تعمیرات عموماً ٹھوس نہیں ہوتیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ اندلس میں مسلمانوں نے مُجملہ فنون کو ترقی دی، اس کی وجہ اُنھوں نے یہ بیان کی ہے کہ وہاں مسلمانوں کی تہذیب مسلسل رہی۔

آئندہ ابواب میں شہروں کا ارد گرد کے اضلاع پر اثر، ان کے خاص خاص خاندانوں کے مال و جاہ میں تعلق، ان کے اور اور لوگوں کی دولت اور اخلاق کے تعلقات، تمدن و فنون پر ان کے اثرات، اُن کے سیاسی اور معاشری تغیرات اور اُن کی تباہی پر بحث ہے۔

مقدمہ کی پانچویں فصل میں قوم کی حفاظت کے وسائل، اس کے ترفہ اور خوشحالی کے اسباب اور اسی کے متعلق تمام صنعتی، اقتصادی، طبعی اور تفریحی فنون کی ترقی پر بحث کی ہے۔ چھٹی فصل تو گویا تمام علوم کا دائرۃ المعارف ہے۔ یہ آخری فصلیں بھی گذشتہ فصلوں کی طرح کچھ دلآویز اور سبق آموز نہیں لیکن افسوس ہے کہ یہ ہمارے موضوع سے باہر ہیں۔ اگرچہ مصنف کے نقطہ نظر سے یہ بے موقع و بے محل نہیں۔ اور اسی لیے ان کو خارج کرنا خالی از نقصان نہیں۔

ابن خلدون کی اس تصنیف پر تنقید کرنا غیر ضروری ہے۔ جو جو غلطیاں یا نقائص اسمیں پائے جاتے ہیں ان کی وجہ یہ ہے کہ مصنف یورپ کی تاریخ اور وہاں کی تہذیب سے کماحقہ واقف نہ تھا۔ اگر ان کو قدیم اور عیسائی زمانہ کی تاریخ سے اتنی ہی واقفیت ہوتی جتنی کہ دنیائے اسلام سے تھی اور اگر وہ ان کے متعلق اسی قدر ژرف بینی اور آزادی کے ساتھ تعمیمات کرنیکے قابل ہوتے تو اس وقت دنیا کے تمام علم ادب میں کوئی کتاب انکی تصنیف کا مقابلہ نہ کر سکتی۔ ان تمام باتوں اور صفات کی عدم موجودگی میں بھی یہ کتاب اسقدر جید اور زبردست ہے کہ صرف اس کی وجہ سے مصنف کا نام اسوقت تک کندن کیطرح دمک رہا ہے۔

(ماخوذ) معتضد ولی الرحمن ایم اے

نوابِ اودھ

نواب سعادت علیخاں ۱۱۶۷ ہجری میں پیدا ہوئے۔ یہ نواب شجاع الدولہ کے بیٹے تھے۔ انکی والدہ قزلباش خاں آسید کی صاحبزادی تھیں۔ گنّا بیگم نام تھا۔ شعر خوب کہتی تھیں۔ نواب شجاع الدولہ سعادت علیخاں کو مرزا منگلو کہتے تھے۔ یمین الدولہ لیاقت وکاردانی اور فراست وہوشمندی کے جوہر خداداد رکھتے تھے۔ جب ذرا ہوش سنبھالا تو تفضل حسین خاں انکی اتالیقی پر مقرر ہوئے، مولوی عبدالحکیم پڑھانے پر اور مولوی سبحان مشیر خاص ہوئے۔ ان میں زیرکی اور دانائی کے آثار بچپن ہی سے نمایاں تھے۔ شجاع الدولہ بہو بیگم صاحبہ سے کہا کرتے تھے کہ بیگم، اگر منگلو کے سر پر تم ہاتھ رکھو گی تو تمہارے دوپٹہ کا پھریرا لگا رہیگا اور لشکر کا علم نربدا کے اُس پار گاڑے گا۔

عالم شباب میں مدارالدولہ نواب سید یوسف علیخاں بہادر صمصام جنگ کی دختر نواب افضل بیگم سے اکبرآباد میں بیاہے گئے۔ شجاع الدولہ کی زندگی سے یہ بانس بریلی میں حکومت کرتے تھے۔ جب نواب آصف الدولہ اودھ کے نواب ہوئے تو اُنھوں نے اپنے نائب مختارالدولہ نواب سید مرتضیٰ خاں مہیب جنگ کے کہنے سننے سے سعادت علیخاں کو لکھنؤ بلایا۔ یہ بلا عذر چلے آئے۔ نواب آصف الدولہ کو نسبت اور بھائیوں کے انکا بہت لحاظ اور پاس خاطر رہا۔ دربار آصفی کا حال دیکھ کر اپنا قیام بنارس میں مناسب جانا۔ تین لاکھ روپیہ سالانہ دربار لکھنؤ سے انکے خرچ کے لیے مقرر ہو گیا۔ اس رقم میں سعادت علیخاں نے اپنے داخل و مخارج کا انتظام اس حسن و خوبی سے کیا کہ چالیس لاکھ روپیہ اُنکے پاس جمع ہو گیا تھا۔ علاوہ زمینداری وغیرہ کے جسکی آمدنی بارہ ہزار روپیہ ماہوار تھی۔ نواب موصوف سحبان زمان اور ارسطوے روزگار تھے۔ اپنی فکر سے غافل نہ تھے۔ کلکتہ جا کر صاحبان کونسل سے دعویدار ریاست آبائی ہوئے۔ کونسل نے انکے دعوے کو تسلیم کیا اور کہا کہ وقت کا انتظار کریں۔ ایک دن فورٹ ولیم کے جنرل نے نواب مذکور سے شرط لگائی کہ اگر گھوڑے پر سوار ہو کر آپ قلعہ کی خندق پھاند جائیے تو قلعہ حاضر ہے۔ نواب مسبوق الذکر نے گھوڑے پر سوار ہو کر خیز کی تو ایک جست میں خندق کے پار تھے۔ حسب شرط نواب صاحب نے قلعہ کا دعوے کیا، بعد تنقیح جواب ملا کہ غیر کی جائداد پر شرط ناجائز ہے۔ لیکن آپ کی خاطر سے یہ دروازہ آپ کی

ملکیت قرار پائے متفل رہیگا - چنانچہ ایسا ہی ہوا - غرض نواب صاحب بنارس واپس آئے، اور
وقت کے منتظر رہے - جب نواب آصف الدولہ نے رحلت فرمائی اُنکا پسر خواندہ وزیر علیخاں مسند نشین
ہوا لیکن چند ماہ کے بعد معزول کیا گیا - نواب بہو بیگم صاحبہ کا شقہ خطاب مسند نشینی کے لیے نواب یمین الدولہ
کے پاس پہونچا، سرشتۂ وزیر علیخاں سے بیان کیا، اور شب کو چپکے سے پالکی میں لکھنؤ روانہ ہوئے - اتفاقاً
الہ آباد کے قریب پالکی کا بانس ٹوٹ گیا، نواب مضطرب ہو کر ایک درخت کے نیچے جا بیٹھے - ملازم فوراً
کسی گاؤں سے ایک پالکی خرید لایا - نواب نامدار اُسپر سوار ہو کر چلے تو لکھنؤ میں دم لیا - یہاں ناکہ پر سپاہیوں
نے روکا - نواب بہادر انگریزی پوشاک میں تھے - مثل انگریزوں کے سپاہیوں کو ڈانٹا - اُنھوں نے
کہا صاحب بہادر، ہم آپ کو نہ روکتے لیکن ہمیں یہ حکم ہے کہ نواب سعادت علیخاں کو جہاں دیکھنا گولی
مار دینا - الغرض سواری کا جلوس ناکہ پر تیار تھا، ارکانِ دولت استقبال کے لیے موجود تھے، نواب والا
جناب ہاتھی پر سوار ہوئے، خیرات کرتے داخل شہر ہوئے - بہو بیگم صاحبہ کو نذر دی، اُنھوں نے خلعت
دیا - بعد ازاں مسند وزارت پر جلوس فرمایا - ارکان سلطنت نے نذریں دیں - شلک سلامی کی چلی - شہر
میں منادی ہوئی - ایک سال عیش و عشرت میں بسر کیا مگر باطن میں دوست دشمن کو دیکھتے رہے - بعد
ایک سال کے انتظام ریاست میں مشغول ہوئے - ہر کارخانہ کے متعلق احکام جس طرح مناسب سمجھے جاری
کیے اور ایسے ہر شخص کو حکومت عملی سے علیحدہ کیا جسے اپنے اغراض و مقاصد میں مخل سمجھا -

نواب علامہ تفضل حسین خاں کو بعہدۂ سفارت کلکتہ ٹالا، نواب قاسم علیخاں کی مصاحبت کا خاتمہ
فربہی مفرط کے سبب ہوا، سرفراز الدولہ نائب تھے، اُگرامی محض اور پچیس ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ تھی انکو
نواب مذکور نے اپنی خواہش میں سمجھایا - بھلا تنک عماری میں یہ تن و توش کب سماتا ہے اور پھر طرہ یہ کہ ایک
ہاتھ میں چھاتا، دوسرے میں مورچھل، غرضکہ یہ عماری نائب صاحب کے لیے شکنجۂ عذاب سے کم نہ تھی
اس قدرت سے انکا ناک میں دم ہو گیا، دوپہر کو نائب صاحب سونے کے عادی تھے، وہی وقت سرکار
عالی نے حساب لینے کا رکھا - اس سے انکا دم ضیق میں ہو گیا، نیابت سے باز آئے - جب سر جان شور
نے جناب عالی سے نائب کے بارے میں کہا، تو نواب صاحب نے جواب دیا کہ سرفراز الدولہ جاہل محض
ہیں، آپ ہی فرمائیے کہ امور ملکی کیونکر انجام پائیں، اور جب میں خود ہی کار نیابت دیکھتا ہوں تو نائب
کی ضرورت ہی کیا ہے - یہ سُن کر لاٹ صاحب بھی قائل ہو گئے - انگریزی چھاؤنی دریا پار مقابل دولتخانہ
تھی - اور پل کے کنارے برگیڈیر کا بنگلہ تھا - ایکدن نواب یمین الدولہ ہوا کھانے چلے - سواری کا ڈنکا
ہوا - برگیڈیر کے تلنگے نے ڈنکے کو منع کیا - نواب موصوف نے واپس آکر شکایتی خط رزیڈنٹ اور

اور گورنر جنرل کو لکھا۔ وہاں سے جواب آیا کہ اگر ہماری فوج کے قریب رہنے سے حضور کو تکلیف ہوتی ہے تو چھاؤنی کے لیے دوسرا مقام تجویز فرمائیے۔ چنانچہ نواب صاحب نے سنڈیاؤں میں چھاؤنی کے لیے حکم دیا۔ جہاں سوائے ریگ دشت پانی کا نام نہ تھا

تقسیم خدمات اہلکاراں کی یہ صورت ہوئی کہ کوٹھے پنج محلہ وغیرہ کے غازی الدین حیدر کے اہتمام میں دیے، نظارت محلات جنرلی فوج اور نیابت بشورہ گورنر جنرل شمس الدولہ کے متعلق ہوئی۔ دفتر دیوانی نصیر الدولہ کو، اخبار ملکی، عماد الدولہ کو، خزانۂ عامرہ خاص و ملکی و مُہر خاص وغیرہ ظفر الدولہ کو، اخبار ڈیوڑھیات اور کوٹ گشتی شہر والے رتن چند کو، اخبار خفیہ پورن چند کو، سررشتۂ اصطباقی عمال والے بے سکہ والے کو بخشی گری تقسیم تنخواہ وگمہداشت نولازم والے مجلس والے کو، دیوانخانہ آبدارخانہ اور دواخانہ اشرف الدولہ کو، آبداری بڈھن خاں کو، اہتمام سواری اشرف علیخاں کو، داروغگی عمارت حاجی سیتا کو عطا ہوئی۔ خرچ چاہ پانی پر ایک انگریز ملازم تھا۔ مسکوٹو مہندس مقرر ہوا، ڈاکٹر لاہکیم علی شریف۔ حکیم مرزا علی علاج کے لیے، میاں گنگو خیاطی کے لیے۔ دو باورچی خانے مقرر ہوئے، ایک غلام علی کے دوسرا محمد روشن کے اہتمام میں۔ اور ایک خوانچہ اطعمۂ خاص کا متعلق تحسین علیخاں۔ اکثر علاقے سرکار سے عمال کو امانی دیے جاتے تھے۔ کسی کو چار یا پانچ لاکھ سے زیادہ کا علاقہ نہ دیا جاتا تھا۔ اس لیے کہ صاحب قوت نہ ہو جائیں۔ اور زیادہ علاقہ دینے سے احتمال روپیہ کے رہ جانے کا ہوتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ بہت کم علاقہ اجارہ دیا جاتا تھا اور وہ بھی بہت سے شرائط کے بعد تاکہ سرکار کا روپیہ علاقہ میں رہ نہ جائے اور باعث بربادی نہ ہو۔ بلکہ عمال سے اقرارنامہ لیا جاتا تھا کہ جس حیثیت آبادی سے علاقہ دیا گیا ہے اگر بروقت چھوڑنے کے کچھ فرق ہوگا تو قید سخت اور جرمانۂ سنگین ادا کیا جائیگا۔ فوج علاقہ میں ضرورت بھر رہتی تھی۔ عامل کو برطرفی اور بحالی کا اختیار نہ تھا۔ جب کوئی تعلقدار سرکشی سے لڑتا تھا، فوج مع فوج انگریزی مقابلہ کو جاتی تھی۔ عمال کی مجال نہ تھی کہ کسی تعلقدار سے بغیر حکم جناب عالی لڑسکیں۔ مالگذاری پوری وصول کیجاتی۔ مجال نہ تھی کہ کمی بیشی ہو جائے۔ جتنے امور مالی، ملکی، فوجی اور رعایائے شہر کے ہوتے تھے حتی الوسع آنکھ سے دیکھکر، اور کان سے سُن کر نواب صاحب مناسب حکم دیتے تھے۔ اہلکاروں کی قدرت نہ تھی کہ بے اطلاع حضور عالی کوئی امر بجالائیں۔ شہر سے کسی کے بس کی بات نہ تھی کہ بغیر چٹھی نکاسی حضور عالی کوئی باہر چلا جائے۔ منشی محمد بخش کو یہ خدمت سپرد تھی۔ اور حکم تھا کہ خبردار مسافر دس روپیہ سے زیادہ نہ لیجا سکے۔ اس انتظام اور اسکی تفتیش کے کام پر خفیہ نویس اور اخبار نویس مقرر تھے۔ ولیم ٹرن مینہ مراد آبادی نے چاہا کہ جو کچھ زر نقد جمع کیا ہے اُسے اپنے وطن روانہ کردیں۔ ولیے صاحب بہادر کے

آدمی تھے۔ انکو ارکانِ دولت عزرائیل سے کم نہ جانتے تھے۔ رائے مذکور نے پوشیدہ اچار اور مربے کے گھڑوں میں کئی ہزار اشرفیاں بھر کر اور خیموں میں سلوا کر جھکڑوں پر لاد کے روانہ کیں۔ ہرکاروں نے سرکارِ عالی مرتبت کو اطلاع دی۔ چنانچہ بہت بہت پوچھا گیا کہ یہ اشرفیاں کس کی ہیں، مگر کوئی مالک سامنے نہ آیا۔ لہٰذا بے تکلف داخلِ خزانہ میں داخل ہوئیں۔ بیس بہنگیاں اشرفیوں کی تھیں۔ نواب سعادت علیخاں اکثر رائے موصوف سے کہا کرتے کہ آپ سے اچھے اچار مربے اور خیمے کوئی نہیں بنوا سکتا۔ بلکہ کبھی کبھی رائے مذکور سے تقاضا کرتے کہ جیسے اچار مربے آپ نے اپنے گھر کے لیے بنوائے تھے ویسے ہی پھر کبھی میرے لیے بنوا دیجیے۔

نرخ غلہ کا جو انتظام نواب مذکور سے ظہور میں آیا، روئے زمین پر کبھی کسی دور سے نہ ہو سکا۔ انکے عہد سعادت مہد میں ایک بار کمی بارش کی وجہ سے غلہ گراں ہو گیا۔ اسپر نواب نے حکم جاری کیا کہ ملک کا غلہ باہر نہ جانے پائے۔ لیکن اس کارروائی سے بھی ارزانی نہ ہوئی۔ پھر حکم جاری کیا کہ سرکار کے ملک کا جتنا غلہ گنجوں میں ہے اور نیز وہ جو زمین کے نیچے کھتوں میں دفن ہے بلا تکلف آج فروخت کر ڈالا جائے۔ ابھی تک تو کسی سے کچھ مواخذہ نہیں ہے، لیکن اگر قلمروِ سرکار میں دفن رہا تو اُسکے مالکوں کو اُسکا محصول روزانہ ادا کرنا پڑیگا۔ تمام بقالوں اور تاجروں نے دفن شدہ غلہ کا حساب لا کے حاضر کیا۔ معلوم ہوا کہ اتنی مقدار میں اناج خود قلمروِ ذاتی میں موجود ہے کہ اگر تین سال تک گرانیِ غلہ رہے تب بھی کسی کو بار نہ ہوگا۔ یہ معلوم ہونے کے بعد نواب صاحب نے حکم نافذ فرمایا کہ تین سال تک اناج معمولی مروجہ نرخ پر فروخت کیا جائے۔ چنانچہ بلا تکلف روپیہ کا تیس سیر گیہوں بکنے لگا۔ ملحوظِ خاطر رہے کہ اُن دنوں بھیا نوے روپے کا سیر تھا۔

عہد سعادتی میں مرزا جہانگیر، مرزا عالیقدر، مرزا جعبہ شہزادگان تیموری لکھنؤ آئے۔ نواب الاشان نے استقبال کیا۔ شہزادہ عالیقدر کے ساتھ انگریزی کمپنی کے صوبہ دار مرزا جام بیگ جوانِ کشیدہ قامت اور خوش رُو تھے۔ نواب سعادت علیخاں نے وجاہت میں انکا مقابلہ اپنے رسالدار مرزا باقر بیگ خاں سے کیا، سب کی نظروں میں رسالدار کی شان و شوکت زیادہ معلوم ہوئی۔ نواب صاحب نے بڑے بہادر اور خوش رُو جوان نوکر رکھے تھے۔ محمد غلامی خاں ایسا بہادر اور دلیر تھا جسنے سانٹوں سے شیر کے انجر پنجر ڈھیلے کر دیے تھے۔ جناب عالی سب کے نزدیک صاحبِ عقل و دانش تھے اُنکا فعل حکمت سے خالی نہ تھا۔ وہ ہر سال موسم بہار میں شکار کھیلنے جاتے تھے۔ اس سفر سے فائدہ یہ تھا کہ مظلوم رعایا جو عمال کے ظلم سے نالاں اور شاکی ہوتی تھی اپنی داد کو پہونچتی تھی۔ تعلقہ دار بھی برابر حساب رہتے تھے اور ملک کی آبادی

اور غیر آبادی اور زمین کے بے کاشت و بیکار رہنے کا سبب معلوم ہو جاتا تھا۔ ایک مرتبہ سرکار شکار کھیلنے وغیرہ تشریف لے گئے۔ رزیڈنٹ بھی ہمراہ تھے۔ کئی سو ہاتھیوں کا حلقہ تھا کہ ایک شیر گھبرا کر رزیڈنٹ کے ہاتھی کے مقابل نکلا اور جست کرکے ہاتھی کی سونڈ سے لپٹ گیا۔ فیلبان نے گجباک ماری۔ ہاتھی نے ٹھوکر کھائی اُسکے جھٹکے سے رزیڈنٹ حوضے سے شیر کے سامنے گر پڑے۔ شیر چاہتا تھا کہ دبا بیٹھے کہ دفعتہً نواب بہادر نے اس پھرتی سے گولی ماری کہ شیر گر پڑا۔ صاحب اُٹھ کھڑے ہوئے۔

ایک مرتبہ نواب والاشان نے اپنے لڑکوں کو تعمیر عمارت کے واسطے روپیہ دیا۔ چنانچہ سب نے عمارتیں بنوائیں لیکن غازی الدین حیدر نے کوئی عمارت نہیں بنوائی۔ نواب موصوف نے ان سے پوچھا کہ بڑے مرزا تم نے کوئی عمارت نہیں بنوائی؟ اُنھوں نے عرض کیا کہ جو عمارتیں حضور تعمیر فرما رہے ہیں وہی میرے لیے کافی ہیں۔ اس جواب سے نواب عالیجناب سمجھ گئے کہ کاتب تقدیر نے میرے بعد فرمان تخت نشینی اسی دلاور کے نام لکھا ہے۔

جب نواب نے عارضۂ سرطان سے صحت پائی درگاہ حضرت عباس تشریف لے گئے اور شراب سے توبہ کی۔ اور پھر کبھی تا زیست نہ پی۔

قبل مسند نشینی سر جان شور اور نواب یمین الدولہ سے عہدنامہ جدید ہوا تھا اُس میں نصف ملک دینے کی شرط تھی۔ چنانچہ مسند نشیں ہونے کے بعد اُسکا تقاضہ ہوا۔ نواب صاحب نے عذر دفع ہنگامہ زیر طلبی پیش کیا اور چار سال اسی طرح ٹالے۔ میں اس مضمون میں تنصیف ملک کی بابت کچھ نہ لکھوں گا۔

نواب بہادر کو اس بات کا یقین تھا کہ شہر لکھنؤ کی آبادی طوائفوں کے باعث زیادہ ہے۔ اس لیے حکم دیا کہ کوئی طوائف لکھنؤ سے نہ نکلنے پائے۔ اس عہد میں لکھنؤ کی آبادی نے بڑی ترقی پائی۔ شہر کی آبادی تکیہ پیر بو علی شاہ سے بی بی پور تک تھی جنکے درمیان پانچ کوس سے کم فاصلہ نہ تھا اور عرض میں چار باغ سے بانس منڈی اور علی گنج تک پہونچ گئی تھی۔ اس طول و عرض کے اندر سیکڑوں محلے اور کٹرے آباد ہوگئے تھے۔ شہر میں اسباب امارت اس کثرت سے آیا اور اس خوبی کے ساتھ دوکانیں آراستہ ہوئیں کہ جن چیزوں کا آنکھوں سے دیکھنا مشکل تھا وہ ارزاں قیمت پر ہاتھ آنے لگیں۔ جناب عالی نے مال تجارت غلہ اور کرانہ کے محصول کا ایسا انتظام کیا کہ گنجوں کی جمع پہلے وقت سے چوگنی ہوگئی اور تاجروں کو بھی خاطر خواہ نفع حاصل ہونے لگا۔ روئے زمین کی ہر قسم کی جنس شہر لکھنؤ میں آسانی کے ساتھ میسر آنے لگی۔ سعادت علیخاں نے محلوں میں تھانے مقرر کیے جس سے چوری اور ڈکیتی میں بہت کمی ہوگئی اور سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ انکے سارے عہد میں شہر لکھنؤ کے اندر بیرونی لوگوں کا کوئی ڈاکہ یا شبخون نہیں پڑا۔ میاں فتو اس عہد کے نامی چور تھے۔ اپنے عہد میں عدالتیں مقرر فرمائیں۔ عدل و انصاف نے رونق پائی۔ ہفتہ میں ایک بار بنفس نفیس

مقدموں کا فیصلہ کرتے۔ ملک کے انتظامی معاملات اور خانگی ضرورتوں کی طرف بذاتِ خود توجہ کرتے کاغذات کے ملاحظہ اور احکام جاری کرنے وقت کرسی پر رونق بخش ہوتے۔ سننے سے کم رغبت تھی

ایک دن پرچہ کچہری کا ملاحظہ عالی میں گزرا تحریر تھا کہ "فلاں صاحب عدالت مثل بالایان چوبدار است، خود نمی خورد بہ دیگراں رامیخوراند"۔ تمام کاروبار وزارت منحصر پرچہ ہائے اخبار پر تھا۔ کیا مجال تھی کہ اخبار نویس یا ہرکارہ کچھ خبر خلاف تحریر کرتا۔ اگر کوئی بات خلاف ظہور میں آتی تو سزا پاتے۔ عدالتی کاغذات خطِ نستعلیق لکھے جاتے تھے اور اس ضرورت سے نہایت خوشخط اور خوشنویس متصدی اور منشی نوکر رکھے جاتے اور یہ انتظام تھا کہ غلط نگاری پر فی حرف پانچ روپیہ اور فی نقطہ ایک روپیہ جرمانہ لیا جاتا۔ ایک مرتبہ کسی نو ملازم منشی نے لفظ "نوع" کو "نو" لکھا، نواب صاحب کی نظر غلطی پر پڑی تو اُس پر تحریر فرمایا کہ "این منشی لفظ نوع بطریق نو نوشتہ یعنی خطا کردہ است لہٰذا پنجاہ روپیہ جرمانہ گیرند"۔ اعلیٰ درجہ کے اہلِ انشا میں مولوی تجمل تھے، انھوں نے فردِ حساب میں "اجناس" کو "اجناس" لکھ دیا۔ نواب مسبوق الذکر تو خود ہر صفحے پر نظر رکھتے تھے اُن کی نگاہ پڑ گئی۔ مولویوں کو جواب نہ بن پڑا کہاں تک ہوتا ہی کہ کچھ قاموس اور کچھ صراح سے "اجناس" کے معنی بتانے، کچھ قواعد نحو سے ترخیم میں لگ گئے۔ نواب صاحب نے سید انشا کو اشارہ کیا، انھوں نے مارے رباعیوں اور قطعوں کے اُلو کر دیا۔ ایک بار خود نواب وزیر کسی لفظ کا املا غلط لکھ گئے، منشی تھبولا ناتھ نے خود بدولت کی رہ تحریر لا کے پیش کی اور ادب سے عرض کیا کہ خانہ زاد کو اس لفظ کا صحیح املا آج معلوم ہوا مگر نواب موصوف نے دیکھتے ہی اپنے اوپر اس طریقہ سے جرمانہ کیا کہ پورے منشی خانہ کی تنخواہ دو چند کر دی۔

ایک مرتبہ نواب مذکور کا ایک لعل چوری گیا۔ مہینوں اُسکی تلاش رہی۔ لیکن سراغ نہ ملا۔ آخر ایک شب نواب نامدار نے فال دیکھنے کے لیے دیوان حافظ اُٹھایا اور خواجہ سرا کو حکم دیا کہ شمعدان لا۔ وہ شمع لیکر پاس کھڑا ہو گیا۔ اب دیوان جو کھولا تو یہ مصرعہ نکلا۔

"چہ دلاورست دزدے کہ بکف چراغ دارد"

حضور عالی نے اب جو نظر اُٹھا کے اُسکی صورت دیکھی تو چہرہ کہہ رہا تھا کہ میں ہی چور ہے۔ اور آخر اُسے وہ لعل اگلنا پڑا۔

ایک ضابطے نے عرضی اضافہ معاش کی گزرانی۔ نواب یمین الدولہ نے اُس پر دستخط کیے:

"گر زمیں را بہ آسماں دوزی   ندہندت زیادہ از روزی"

منشی صاحب والے قوم کا یستھ ایک مورخ اور نامی شاعر اس عہد کا تھا ایک عرضی سرکار عالی

دوسی - مرمند شت :-

ترک سے ایام ہولی میں کھو کیا کیجے ... جی میں آتا ہے کہ اس موت میں کنٹھی لیجے

گر تماشا کا تیتوں کا دیکھنا منظور ہو ... شاہ دو دن کے لیے ہمکو اجازت دیجے

حکم نواب صاحب :- "محتسب را درونِ خانہ چہ کار"

نواب سعادت علیخاں ہمیشہ بہو بیگم صاحبہ کی جاگیر اور دولت کی تاک میں رہے جب کبھی بیگم صاحبہ کی طبیعت کسلمند ہوتی، سیر و شکار کے پردے میں نواب صاحب فیض آباد کے قریب پہنچے کہ ایسا نہ ہو کہ بیگم صاحبہ کا چراغِ حیات گُل ہو جائے اور خواجہ سرا ذخیرہ خزانہ اور توشہ خانہ پر ہاتھ صاف کریں۔ ایک مرتبہ جناب عالی سلطان پور میں تشریف رکھتے تھے کہ وہاں بذریعہ پرچۂ اخبار بیگم صاحبہ کی علالت معلوم ہوئی بہت جلد داخل فیض آباد ہوئے۔ حاضر ہو کر نذر گزرانی اور سات مرتبہ تصدق ہو کر اپنی آنکھیں بیگم صاحبہ کے تلووں سے ملنے لگے کہ غلام کو انہیں قدموں کے دیکھنے کی تمنا تھی، اور درحقیقت پیروں کا ورم دیکھنا منظور تھا۔ انکے عہد میں پرچوں کی دھوم تھی۔ ہرکاروں کو حکم ناطق تھا کہ روبرو جا کر خبر زبانی عرض کریں۔ دن رات میں اختیار تھا جب چاہیں سوتے جاگتے عرض کریں۔ اس عہد میں ہرکاران اخبار کے بڑے کارخانے تھے۔ مشہور ہے کہ درگاہ حضرت عباس علیہ السلام کی مرمت دیکھنے نواب صاحب اکثر جایا کرتے تھے۔ جس وقت تک عمارت کو ملاحظہ فرماتے سب کاریگر ادب سے کھڑے رہتے، دیر تک کام کا ہرج ہوتا۔ لہذا سرکارِ عالی نے حکم دیا کہ "تقصیرِ کاریگراں معاف"۔

نواب سعادت علیخاں کو خبر پہونچی کہ نواب فیض اللہ خاں والی ریاست رامپور کے بیٹے مخالفت کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ لہذا نواب موصوف نے نصیر الدولہ بہادر اور مسٹر اسٹور کے ساتھ پانچ یا چھ ہزار فوج رامپور بھیجی اور حکم دیا کہ اُن صاحبزادوں کو لکھنؤ لے آئیں۔ یہ سپاہ رامپور کے قریب مقیم ہوئی۔ فیض اللہ خاں صاحب کے بیٹے نواب نصیر الدولہ کے پاس آئے۔ اُنھوں نے سب کو خلعت دیے۔ بعد ازاں صاحبزادگان لکھنؤ آئے۔ نواب سعادت علیخاں سے ملاقات ہوئی، جناب عالی نے سب کو خلعت، ہاتھی اور شمشیر عنایت کر کے لکھنؤ میں رہنے کے لیے حویلیاں دیدیں۔ یہ صاحبزادے ڈیڑھ برس تک لکھنؤ میں رہے۔ لارڈ ولزلی کے کہنے سے نواب مذکور نے ان صاحبزادوں کو رامپور جانے کی اجازت دیدی اور ہر ایک صاحبزادہ کو خلعت ہفت پارچہ، فیل اور شمشیر عنایت کی۔

نواب بہادر کو گھوڑوں کا بہت شوق تھا اور شہسواری میں یکتائے زمانہ تھے۔ خاصے کے سات ہزار گھوڑے گھوڑیاں رہتیں اور تینتیس سو روپیہ یومیہ کا خرچ معرفت رمضان علیخاں کے ہوتا تھا۔ ایران، ترکستان،

ترکستان، فرانس، انگلستان، اور ہندوستان کے نہایت عمدہ گھوڑے سرکاری اصطبل میں موجود تھے۔ اور قسم قسم کے بچھیرے پیدا کرائے جاتے تھے۔ اُن کے لیے ولایت کی گھانس بوائی جاتی تھی۔ خانہ زاد بچھیروں کو دانہ دودھ میں بھگو کر دیا جاتا اور بجائے پانی کے دودھ پلایا جاتا تھا۔ ایسے نایاب اور نازپروردہ گھوڑے کسی ریاست کو نصیب نہ تھے اور نہ اُس وقت تک نصیب ہوئے۔ ساتھ ہی اسکے سرکارِ عالی نے بہت سے اونٹ بھینسے جمع کیے تھے، اور گجراتی بیل دکن سے منگوائے تھے۔ اس شوق کے علاوہ کبوتروں سے بھی شوق تھا۔ اور مینڈھوں اور مرغوں کی لڑائی کے بڑے دلدادہ تھے۔ جنرل مارٹن سے بازی بدکے مرغ لڑاتے تھے۔ بٹیر بازی بھی لکھنؤ میں اُنھیں کے عہد سے شروع ہوئی۔ پہلے پنجابی یہاں بٹیر لڑانے آئے تھے۔

ایک دن سرکاری اصطبل میں ایک گدھا بچھیروں کا دانہ کھا رہا تھا کہ اتفاقاً نواب موصوف کی نظر پڑ گئی، فوراً اُسکی گرفتاری کا حکم دیا اور چند مادیانوں پر چھوڑ دیا گیا جس سے متعدد خچر پیدا ہوئے۔ نواب عالیجناب کی جزرسی کی انتہا یہ ہے کہ اصطبل اور فیل خانہ کا آخور تک ضایع نہ ہونے پاتا۔ وہ دانے اور بھیلے کی بچت اور جانوروں کے راتب میں کام آتا تھا۔

نواب یمین الدولہ نے اپنی خوش سلیقگی سے تیرہ یا چودہ کروڑ روپیہ نقد جمع کیا تھا۔ اسپر بھی جو شوق تعمیرِ مکانات شہر جدید پر اُٹھا، ملازمین مرشدزادوں کو تعمیرِ مکانات کے لیے عنایت فرمایا، لاکھوں کی تعداد میں تھا۔ اخراجات جناب عالی اور تنخواہ مرشدزادوں کی مشتہر تھی انگریز جو صاحب تھے اُنکے ہزاروں روپے تھے۔ اور جو صاحب المال یا اہل سپاہ وغیرہ دکن سے یا کوئی صاحب لیاقت یا عالی خاندان تباہ و پریشان ہو کر آیا اور چند روز سلام کیا، تو از روے اخبار یا کسی کے وسیلے سے، بعد دریافت حقیقت حال اُسکی پرورش ہو جاتی تھی، ٹھہرے کا کام نہیں جاتا تھا۔ مرزا محمد حسین قتیل لکھنؤ آئے، نواب بہادر نے اُنکو طلب کیا۔ قتیل نے عرض کیا کہ اگر حسب ذیل امور منظور فرمائیے تو حاضر خدمت ہوں (۱) مدار یہ حقہ سے طبیعت بہت مانوس ہے اور اُس سے ہر دم شغل رہتا ہے (۲) دستار سے طبیعت اُلجھتی ہے، کلاہِ سادہ مطبوعِ طبع ہے (۳) جو علم حاصل کیا ہے اُسکی تعظیم و تکریم کا امیدوار ہوں۔ مندرجہ بالا امور کو سنکر سرکارِ عالی نے بے تکلف آنے کی اجازت دی مگر تعظیم کو کس پردے میں بجا لائے کہ جس وقت مرزا قتیل کے دروازہ پر پہونچ جانے کی خبر ہوئی پہلے سے اُٹھکر ٹہلنا شروع کیا۔ جس وقت مرزا نے دروازے میں قدم رکھا پہلے کھڑے کھڑے ملاقات ہوئی، بعد اسکے بیٹھے۔ باقی رہا حقہ، اُسکی طرف نواب صاحب نے آپ توجہ نہیں فرمائی اور قتیل نے بھی دم نہیں مارا، وہی

نکا وسادہ، دو زیبا سرتھی۔

عہد سعادتی میں ملک کی آمدنی ۱۵۷۶۱۱۰۰ روپیہ سالانہ تھی علاوہ ترقی جملہ گنجیات کے

اس عہد میں لکھنؤ میں بادشاہ گنج اور بہت سے بازار مشہور تھے، مستاجری جملہ گنجیات کی چار پانچ لاکھ روپیہ
تک پہنچی نوّے لاکھ روپیہ سال کا خرچ ریاست تھا۔ چھتیس ہزار سوار اور پیادے فوج میں تھے ساڑھے
لاکھ روپیہ سالانہ فوج کی تنخواہ تھی جو ہر چوتھے مہینے نقد خزانے سے ملتی تھی۔
دو کروڑ روپیہ نقد ہر وقت فوج کے خزانے میں جمع رہتا تھا۔ ہر محکمہ اور کام کی بڑی احتیاط سے نگرانی
رکھی جاتی تھی۔ جس کمرے میں حضور عالی کاغذات ملاحظہ کرتے تھے اُسکے ایک طرف طوائفوں اور
رقاصوں کی چوکی جمع رہتی تھی۔ اُن بیبیوں اور نواب کے درمیان ایک دروازہ شیشے کے
کواڑوں کا حائل تھا۔ جب وقت نواب کا دل ملاحظۂ کاغذات سے اُکتا جاتا تو کرسی سے اُٹھکر
شیشوں میں سے نظارہ بازی کرتے اور رقص وغیرہ کا تماشا دیکھتے۔ دو سو بہشتی اور تین سو گھڑے
والے صبح و شام سڑکوں پر چھڑکاؤ کے واسطے مقرر تھے۔ اور کئی سو سونے چاندی کی نفیس لالٹینیں
بنوائیں جو رات کے وقت نواب صاحب کی سواری کے ساتھ رہتی تھیں، اور ان میں موی شمعیں روشن ہوتی تھیں۔

عہد سعادتی میں حسب ذیل عمارات، باغ اور گنج وغیرہ بنے: — کربلائے تال کٹورہ،
کربلائے حاجی سیتا، درگاہ حضرت عباس، فاطمین اور اسکے سامنے دالی مسجد، مقبرۂ جناب عالیہ،
امام باڑہ مرزا اسکندر شکوہ بہادر تیموری، کوٹھی موسیٰ باغ، بیلی گارد، کنکروالی کوٹھی، جلو خانہ، خورشید منزل،
گول دروازہ، لال بارہ دری، کوٹھی حیات بخش، نور بخش، فرح بخش، دلارام، موتی محل، ٹیڑھی کوٹھی،
کلاں کوٹھی، چوپڑ کا اصطبل، کوٹھی دلکشا، دمنہ محمد باغ، خورشید باغ، خاص بازار، صبا بازار، سعادت گنج،
رکاب گنج، معقول گنج، مولوی گنج، گولا گنج، جنگلی گنج، رستوگی ٹولہ وغیرہ۔ علاوہ اسکے مرشد زادوں
کو زمین اور تعمیر عمارت کے بلئے روپیہ بھی عنایت کیا، کہ حسب دلخواہ عمارت بنالیں۔ جتنے رسالدار،
امراء، ملازمین خاص تھے اُنکو بھی حکم دیا کہ تم سب بھی اپنے حسب دلخواہ مکان بنوا کر رہو۔ غرضکہ لاکھ
روپیے کی عالیشان عمارت موسیٰ باغ سے بی بی پور تک بنوائی۔ فی الحقیقت نواب سعادت علیخاں
نے اودھ کو ہندوستان کا باغ بنا دیا تھا۔

نواب والا جاہ کو مرزا جعفر کا رزیڈنٹ کو ورغلانا ناگوار تھا مگر باوجود ان شرارتوں کے مرزا جعفر کے ساتھ
نواب ذالاشان نے مراعات سے چشم پوشی نہیں کی۔ لڑکیوں کی شادی میں دیدہ و دانستہ اغماض کیں
نواب صاحب اور کسی رزیڈنٹ سے جیسا کہ چاہیے کبھی موافقت نہ رہی، ہمیشہ چلی کٹی چلا کی۔ نواب

رزیڈنٹ کی اس قدر منزلت سمجھتے تھے کہ وہ سرکار انگریزی کی طرف سے فقط اخبار خیر و عافیت کے دریافت کرنے کے لیے مامور ہیں، اور طرفین کے خطوط و کاغذات کا پہونچانا اُن سے متعلق ہے اُن کو کسی دوسرے کام میں اُنکو دخل دینا، اختلاط نہیں؟ اور رزیڈنٹ اسکے خلاف اپنے آپ کو تصور کرتے تھے۔ رزیڈنٹ کرنل بیلی کی مدت قیام ۹ برس میں جو گزرا، ظاہر ہے کہ ہر امر جزو کُل میں بہت سے امور خلاف رزیڈنٹ کی خود رائی و سینہ زوری سے عمل میں آئے اور نواب انکی مخالفت سے بہت تنگ ہوے تھے بلکہ تنگ اخبار میں ان سب خرابیوں کا حال و رعب رزیڈنٹ کی شرارت اور تحکم صاحب کا خوب لکھا گیا تھا۔ جس سے سراسر الزام کرنل بیلی پر آتا ہے اور نواب یمین الدولہ حق بجانب نظر آتے ہیں۔ جتنے امور خلاف قانون و خلاف مزاج رزیڈنٹ بیلی سے سرزد ہوئے تھے اُن میں سے ایک سو چودہ نمبر بقید تاریخ و حوالہ مقدمہ تلمبند فرمائے تھے اور یہ سب محول لارڈ صاحب کی رونق افروزی پر تھا، مگر تقدیر نے نہ چاہا، زندگی نے وفا نہ کی، اجل نے مہلت نہ دی۔

اوقاتِ نواب صاحب :-

قبل از طلوع آفتاب محلسرا سے انگریزی پوشاک پہنے برآمد ہوتے۔ سیاہ مخملی ٹوپی رونق بخش سر، ولایتی زیب کمر، بیٹے مرشد زادوں، دامادوں اور امرائے خاص کا سلام لیتے۔ نواب شمس الدولہ اور نواب نصیر الدولہ اہلکار سلطنت تھے، لہذا سلام کر کے اپنے فرائض انجام دینے چلے جاتے۔ نواب صاحب ہوا خوری اکثر کوٹھی دلکشا، یا موسیٰ باغ یا دریا پار تک کرتے، اور بعد دو گھنٹے کے واپس آتے۔ سواری کا طریقہ یہ ہوتا کہ کبھی گھوڑے پر کبھی ہاتھی پر سوار ہوتے۔ جلوس سواری مع ڈنکہ آگے ہوتا، دیگر حاضرین اپنے اپنے ہاتھیوں پر سوار ہوتے۔ جب حضور گھوڑے پر سوار ہوتے فقط دو خاص بردار یا دو چوبدار داہنے بائیں تھوڑے فاصلے پر ہوتے، یا مرزا کریم بیگ یا محمد غلامی خاں خانہ زادان حضور کی پر سوار لباس انگریزی میں آگے ہوتے، یا چند شکاری کُتے یا باز بردار وغیرہ کچھ فاصلہ سے پیشرو۔ جلو میں انگریز مصاحبان خاص ہوتے۔ راہ میں اکثر مسافر یا داد خواہ عرضی و استغاثہ دیتے۔ جب در دولت پر واپسی ہوتی تو اکثر مسل نگاہداشت سواران جدید کی ہوتی۔ اسوقت رمضان علیخاں اور اشرف علیخاں حاضر رہتے۔ بعض دن حضور عالی شمس الدولہ یا نصیرالدولہ کو مسل دیکھنے کا حکم دیتے۔ ہر دو ڈیوڑھی کی بیس باکیس سو آدمی ہر فرقے کا حاضر رہتا۔ از انجملہ دو سو کئی سوار بھی ہوتے تھے۔ بس صبح کی سواری کا دربار ہو چکا۔ امرا یا معززین در دولت سے رخصت ہو جاتے۔ نو بجے صبح چاء پانی ہوتا۔ کرسی نشین امراء و مقربان خاص، مثل صمصام الدولہ، مرزا جو، مرزا محمد تقی خاں شاعر ہجلوی

کرسی پر بیٹھتے۔ اور منگو ڈوہندس، ڈاکٹر لا وغیرہ کرسی پر سامنے بیٹھتے بس کرسی خاص میر انشا اللہ خاں،
میر ابو القاسم خاں وغیرہ۔ اُس وقت مجرئی، معززین، خواجہ سرا ارباب سلام ہوتے۔ عرض بیگی
سامنے کھڑا ہو کر سب کو بدفعات سلام کراتا۔ باہر برآمدے میں انگریزی بینڈ بجتا جس کسی سے نواب صاحب
مخاطب ہوتے، گفتگو عاقلانہ اور باوقار ہوتی۔ دس بجے کے بعد چائے پانی برخاست ہوجاتا۔ ہر
شنبہ کو رزیڈنٹ کی چائے پانی میں صحبت ہوتی۔ جتنے انگریز چھاؤنی سے ساتھ آتے بالکی پر سوار
زیر کوٹھی اُترتے۔ ہر ایک کا حقہ بیچوان میں ہوتا۔ حقّے کی آواز سے کمرہ گونج جاتا۔ بعد چائے نوشی
ایک کمرے میں خلوتِ خاص ہوتی۔ سوائے نواب اور رزیڈنٹ کے کوئی نہ ہوتا۔ اُس وقت بالمشافہ
طرفین میں گفتگو ہوتی۔ ہر سہ شنبہ کو نواب صاحب کا چائے پانی رزیڈنٹ کی کوٹھی یا خیمہ میں ہوتا۔
دس بجے کے بعد خاصہ تناول فرماتے۔ اُس وقت مقربانِ بارگاہ یا اردلی خاص اور کبھی نواب جلال الدولہ
یا نواب رکن الدولہ شریکِ خاصہ ہوتے۔ گیارہ بجے کے بعد خاصہ سے فرصت ہوتی اور نواب صاحب
محلسرا میں تشریف لیجاتے اور کوچ پر استراحت فرماکر حقہ میل فرماتے۔ جب بارہ بجتے، نواب بیدار
کاغذات ملاحظہ فرماتے۔ نواب نصیر الدولہ بند لفافہ کاغذ میز پر رکھکر چلے آتے۔ نواب شمس الدولہ
اپنے کاغذات کے لفافے میز پر رکھکر علیحدہ کمرے میں تا اختتام ملاحظہ کاغذات حاضر رہتے۔
حکیم مہدی علیخاں، راجہ دیا کرشن، رائے رتن چند، رائے صاحب رام، منشی رونق علی، منشی وارث علی
اور معزز منشی اپنا اپنا لفافہ میز پر رکھکر ہر ایک اپنے مقام پر علیحدہ بیٹھتا۔ جسے بضرورت تحقیق طلب
فرمایا، فوراً حاضر ہوا۔ جب لفافہ کو ملاحظہ فرما چکتے دستخط کرکے میز پر یا پہلوے میز میں پھینکدیتے۔
جس کاغذ کو حضورِ اقدس طشتِ آب میں ڈال دیتے ناخواندہ کہار اُسی وقت کاغذ کو پانی میں
خوب مل کر کنارے رکھتا۔ ایک شخص پڑھا لکھا اس کاغذ کی خدمت کے لیے جاہل بنکر ملازم ہوا
نواب صاحب نے اُسکی آزمائش اس طرح کی کہ ایک فرد کاغذ پڑھ کر پھینکدی اور اُس آدمی سے
کہا کہ وہ فرد اُٹھالا۔ اُس نے فرد کو دیکھ کر اُسکی پشت پانی سیدھی کرکے حاضر کی۔ نواب سمجھ گئے کہ
یہ پڑھا لکھا ہے۔ لہذا نوکری سے برطرف۔ غرضکہ پہر بھر کامل سب کاغذات کو ملاحظہ فرماکر دستخط
فرماتے۔ جب نواب صاحب اُٹھ جاتے، چار متصدی حاضر ہوتے۔ سب کاغذات جمع کرکے
جنکے نام دستخط ہوتے جدا کرکے ہر دفتر میں اُسی وقت بھیجوا دیتے، اور اُسی دن دفتر اجراء سے
سب احکام جاری ہوجاتے۔ چونکہ جاڑے کے موسم میں دن چھوٹا ہوتا ہے، لہذا جو کاغذ دیکھنے
سے رہ جاتا رات کو ملاحظہ ہوتا۔ اخبار بلا قید گزرتا۔ مہر خاص کے وقت ظفر الدولہ حاضر ہوکر

سامنے حضور کے مُہر کر کے صندوقچہ مُہر لیجاتے۔ پرچۂ پیام یا محبت نامہ رزیڈنٹ کا مرزا جعفر لایا کرتے
تھے۔ ایک دن نواب اعلیٰ نے ازراہِ عتاب فرمایا اگر کرنیل بیلی میرے سامنے بات نہیں کر سکتا، یہ بزرگ کرتے تو
تم ہو۔ اُس دن سے منشی میر حسید رجانے لگے۔ جواب تحریر کرنا اُسی دن جانا تھا۔ نواب بہادر کی طرف سے
مولوی سبحان واسطۂ رسالت ہوتے تھے۔ رزیڈنسی سے بعد تنقیح [illegible] و مشورہ جواب جایا کرتا۔ شام
کے وقت نواب موصوف گاڑی یا تامجان پر سوار ہوتے، جوڑی کی راس خود لیتے۔ اردلی خاص میں
راجہ بختاور سنگھ ہوتے اور سواری کے جلوس میں سوار ہوتے۔ نواب مذکور کبھی کسی گنج کی طرف نکل جاتے
اور بغرض پرورش رعایا نرخ غلّہ خود پوچھتے۔ اس سے بقال بھی ڈرتے رہتے کہ کم و زیادہ فروخت
نہ کریں۔ سال بھر میں دو ضیافتیں رزیڈنٹ کی کوٹھی میں ہوتیں، ایک سالگرہ شاہ لندن کے وقت دوسری بڑے
دن کو۔ ان ضیافتوں میں نواب صاحب کا ساٹھ ستر ہزار روپیہ صرف ہوتا۔ علی قدر حال کشتیاں مرشد
زادوں اور دامادوں کو ملتیں، امراء کو گوٹے کے ہار اور عطر وغیرہ۔

نواب صاحب کے عہد میں موسیقی پر اوس پڑ گئی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ خود حضور کو اس سے دلچسپی
نہ تھی لیکن پھر بھی اس فن کے کئی کاملین لکھنؤ میں موجود تھے۔ مثلاً میر امیر علی سوزخوان، ان کو علم موسیقی میں
مرتبۂ کمال حاصل تھا، دو سو روپیہ ماہوار سرکار عالی نے مقرر کر دیا تھا اور پانچ سو روپیہ کا خلعت بھی
دیا تھا۔ مہاراج پرکاش ناچنے میں بے مثل تھا، تماشے اور کوڑی پر رقص کرتا تھا، کوئی دقیقہ علم موسیقی
کا اُس سے فروگذاشت نہیں ہوتا تھا۔ نواب کا ملازم تھا۔ مسماۃ ڈامری ناچ میں بہت نامور تھی۔
کریلا بھانڈ بھی اسی عہد میں تھا۔ مرادی گویے کا لڑکا خوب گاتا تھا، مرنے سے چند گھنٹے قبل نواب نے
اُس کا گانا سنا تھا اور انعام بھی عطا فرمایا تھا۔ اگرچہ نواب گورنر جنرل نے بعہد نواب ناظم الملک مرزا سعادت علی خاں
بہادر نصیر جنگ کو اختیار ریاست سپرد کر دیا تھا، پھر بھی خود اختیار ریاست نہ رکھنے سے مجبور تھے۔ معاملات [illegible]
لی جاتی تھی۔ نواب مذکور ہنر آشنا، علم دوست، مستقل مزاج، بیدار مغز، بہادر اور بڑے وضعدار تھے، سمجھدار، ہنرمندوں
کے قدردان، پڑھے لکھوں کی عزت کرنے والے تھے۔ بڑے منکسر مزاج، نہایت شاد و بذلہ سنج تھے۔ اور فنون
سپہ گری میں کامل، تیر اندازی میں شاطر، بندوق و شمشیر زنی میں برق دم تھے۔ ہر امر میں سلیقہ اور نفاست
کے پابند تھے۔ عمارات، ورزش اور سیر و شکار سے شوق تھا۔ انگریزی لباس سے بھی شوق تھا۔ بلکہ
اکثر انگریزی لہجہ میں گفتگو کرتے تھے۔ اپنے اوقات کے بڑے پابند تھے۔ جاہلوں سے نفرت تھی۔
نواب بڑے سیر چشم تھے۔ تیرہ یا چودہ کروڑ نقد جمع کیا تھا، لیکن اکثر فرمایا کرتے تھے کہ وقت پڑے پر
صرف ایک وقت کی نانِ جو کے لیے کافی ہو گا۔ نواب کی دولتمندی کا ہندوستان بھر میں جواب نہ تھا

عبارت مقفیٰ اور مسجع لکھتے تھے۔ انشا پردازی میں بے نظیر تھے۔ تحریر نہایت نستعلیق ہوتی تھی۔ وہ خطِ شکستہ خوب لکھتے تھے۔ کاغذات نگہداشت خود ملاحظہ فرماتے۔ ابتدائے مسند نشینی سے انتقال تک نواب کا کوئی دن ملاحظۂ کاغذات سے خالی نہیں گیا۔ ایسی غائر نظر سے کاغذات ملاحظہ فرماتے کہ نگاہ میں فرق آ گیا تھا۔ جس امر میں قانون اور قاعدہ جاری کیا آخر عمر تک بخوبی انجام کو پہنچایا۔ اپنے عزم میں مستقل تھے اور کسی مشکل اور دقت سے جو اُنکو پیش آتی ڈرتے نہ تھے۔ مُلک کی ترقی اور رعایا کی خوشحالی کا بہت خیال تھا۔ اپنی طبیعت پر بڑا قابو رکھتے تھے۔ سوائے خاص محل کے کوئی دوسرا محل ممتاز نہ تھا جسکا خرچ یا جاگیر مقرر کی جاتی۔ ایک لاکھ کئی ہزار روپیہ کی جاگیر نواب گنج میں خاص محل کے لیے تھی۔ اِس عہدِ دولت میں ملازم جدید کے واسطے کوئی جائداد فوتی تجویز نہیں ہوتی تھی۔ اِنکے عہد میں کوئی اندرونی اور بیرونی فساد نہیں ہوا۔ یہ پہلے شخص تھے جنھوں نے محفوظ[1] خزانہ قائم کیا۔ شملہ حضور کی ایجاد ہے۔ لکھنؤ میں اربعین تک عزاداری کی رسم انھیں کے زمانہ کی نکالی ہوئی ہے۔ سعدی کی گلستاں کے اس درجہ شایق تھے کہ ہر وقت اپنے سرہانے رکھتے۔ اِنکے بعد سے واجد علیشاہ تک ایسا بیدار مغز، عالی فہم، اور عقیل کوئی فرماں روا نہیں گزرا۔ نواب کی طبیعت میں رعیت پروری بہت تھی۔ اُنکے طرزِ عمل اور اُنکی پالیسی میں ایک ایسی مضطربانہ ہوشیاری اور پُراسرار بیقراری نظر آتی ہے کہ چاہے عوام کو پتہ نہ چلے مگر صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئی بڑا کام کرنے والے تھے اور اُنکے تیور بہت ہی پُرمعنی تھے۔ مُلک کا انتظام اُنھوں نے غیر معمولی ہوشیاری اور خوبی و شایستگی سے کیا۔ اور اس میں ذرا شک نہیں کہ اگر اُنکو آخر عمر تک پورا اطمینان نصیب ہو جاتا تو تمام گذشتہ بدنظمیاں اور خرابیاں دُور ہو جاتیں۔ اور وہ مُلک کی پوری پوری اصلاح کر لے جاتے۔ لیکن خرابی یہ ہوئی کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ اُنکے تعلقات اچھے نہیں رہے۔ انھوں نے جو جو اصلاحیں کیں بہت کچھ قابلِ تعریف ہیں۔ اُنکی کارروائیاں دیکھ کے ذی ہوش اور منصف مزاج لوگ اُنکی لیاقت اور خوش تدبیری کے قائل ہو گئے۔ اُن کے دربار میں باکمالوں اور قابلِ قدر لوگوں کا اتنا بڑا مجمع ہو گیا تھا کہ اُسوقت ہندوستان کے اور کسی دربار میں ایسے صاحبانِ کمال نہ نظر آ سکتے تھے۔ ایسے لوگ اکثر اُس جگہ جمع ہوا کرتے ہیں جہاں کے رئیس معمول سے زیادہ فیاضی ظاہر کرتے ہوں۔ سعادت علیخاں، جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں جُزرس تھے، مگر اس کفایت شعاری کے ساتھ یہ صفت تھی کہ اُنکی ذاتی قابلیت دوسرے باکمالوں کی لیاقت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جاتی تھی اور

---

[1] ایسا خزانہ جو ضرورت کے وقت کام آ سکے۔

اسی بات نے اُنکے ہاتھوں سے لایق لوگوں کی بڑی بڑی قدریں کرائیں۔ اور لکھنؤ پہلے سے زیادہ اہل کمال کا مرجع بن گیا۔ جو قابل آدمی جہاں ہوتا سعادت علی خاں کی قدردانی کی شہرت سنتے ہی اپنے وطن کو خیرباد کہکے لکھنؤ کا رُخ کرتا۔ اور یہاں آکر ایسا آرام پاتا کہ پھر کبھی وطن کا نام نہ لیتا۔

انشا، محمد تقی خاں، قتیل، ناسخ اس عہد کے نامی شاعر تھے۔ سید انشا نے نواب صاحب کے حکم سے لطائف السعادت، بحر السعادت، مثنوی شکار نامہ۔ اور دریائے لطافت لکھی۔ یہ کتاب زباندانی کا ہرا بھرا گلدستہ، محاورات کا لہلہاتا ہوا باغ، اصطلاحات کا خزانہ، ادبی نکات کا گنجینہ تیرہویں صدی کے شہرۂ آفاق شاعر اور زبردست ادیب سید انشا کا وہ قابل قدر کارنامہ ہے جسنے اردو کو معراج کمال پر پہونچا دیا اور سب سے پہلے فارسی اور عربی کی قید سے آزاد کرنے کو اس کی صرف و نحو کی داغ بیل ڈالی تھی۔ اس کتاب میں صرف و نحو، منطق، بیان، معانی، عروض سب کچھ موجود ہے مگر شوخ مزاج مصنف نے ہر علم کو مزاح و تمسخر کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ اردو زبان انکے احسان سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی۔

افسوس نواب سعادت علیخاں کو زہر دیکر دشمنوں نے زمین کا پیوند کردیا۔ زباں زد خلائق ہے کہ جب میت کو قبر میں اُتارا تو دشمنوں نے کہا کہ آج عقل کی کنجی زمین میں دفن ہوئی۔ میں اس مضمون میں زہر دینے کی کیفیت نہیں لکھوں گا۔

سید اسرار حسین خاں طباطبائی

(الناظر، دسمبر ۱۹۲۹ء)

واجد علی شاہ

(از خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنوی)

ماہ صفر کی ۲۷ تاریخ ۱۲۶۳ھ مطابق ۱۸۴۷ء سر شام سلطان عالم محمد واجد علی شاہ بہادر کی تاجپوشی اور تخت نشینی کا غلغلہ تمام شہر میں ہے۔ آدمی پر آدمی ٹوٹا پڑتا ہے۔ پلٹنیں سلامی کو پرا جمائے کھڑی ہیں۔ کارچوبی خوشنما وردیاں پہنے ہوئے سوار ٹہل رہے ہیں۔ رسالہ داروں کے نئے ٹھاٹھ ہیں۔ در دولت سے گلستان ارم اور کوٹھی فرح بخش تک روشنی کے ٹھاٹھر لگے ہیں۔ ہر برج پر تماشی کی جھنڈیاں غضب ہیں۔ خاص بازار سے رمنے تک میلہ لگا ہے۔ روندا پھر رہی ہے۔ تماشائیوں کا سڑک پر ہجوم ہے۔ انتہائی روشنی سے دیوالی کی رات معلوم ہوتی ہے۔ دریا میں چراغوں کی روشنی کے عکس سے پانی میں آگ لگی ہوئی ہے۔ دریا میں بجرے سجے ہوئے کھڑے ہیں۔ شاہ اون کے بادبان جھوٹے ہوئے ہیں۔ مچھلے والے بجرے پر ڈنکا ترم بج رہا ہے۔ انگلشی ڈانڈوں سے طبل ترم بجا رہے ہیں۔ باغ گلستانِ ارم رشک بہشت بنا ہوا ہے۔ کوٹھی فرح بخش دلھن کی طرح سجی ہوئی ہے۔ لوگ آپس میں طرح طرح کی باتیں کر رہے ہیں۔ غربی اور شرقی دونوں پھاٹک رمنے کے بند ہیں (اتنے میں مہاراجہ بالکرشن کی سواری آئی، پھاٹک کھلا) روش پر نواب امین الدولہ ٹہل رہے ہیں۔ فتح الدولہ اور عنایت علی رسالدار کو اپنے ہمراہ لیکر بارہ دری کی طرف سے کھڑکی سے گلستانِ ارم میں چلے آئے۔ مہاراجہ بالکرشن نے فرمانِ جلوس سنایا۔ دوسری طرف مصلح السلطان اہتمام الدولہ حیدر حسین خاں شرف الدولہ غلام رضا خاں۔ مرزا وصی علی خاں۔ حفیظ الدولہ مولوی میر باقر علی۔ سفیر شاہی کھڑے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد سواری کی آمد آمد کا غل ہوا۔ چوبدار مرد ہے، پکار رہے ہیں "سواری ہے بادشاہِ عالم کی نگاہ روبرو" چاروں طرف سے ہٹو بچو کی آواز آرہی ہے۔ کرنل رچمنڈ رزیڈنٹ بہادر خفا ہو رہے ہیں کہ کیوں اتنا غل مچایا ہے، آہستہ بولو، آہستہ بولو۔ اس شور وغل میں

سُنتا کون ہے۔ آخر چیرا اسی سے ولایتی لیکر کمر میں لگائی اور صاحب بہادر بھی قرینے سے کھڑے ہوگئے۔ جب سواری کا بوجھ زینے پر چڑھنے لگا۔ ہمراہیوں کی کثرت سے آہنی جنگلا جو زینے کی کروٹ میں لگا تھا، ٹوٹ کر نیچے آرہا۔

بادشاہ کی سواری بارہ دری کے کمرے میں داخل ہوئی۔ بڑے صاحب سے ہاتھ ملا!

بادشاہ کے مقرب خاص امیر الدولہ میر مہدی علی خاں سونے کا خاصدان ہاتھ میں لیے کھڑے ہیں۔ نواب علی نقی خاں تسبیح ہاتھ میں لیے وظیفہ پڑھتے ہوئے چلے آتے ہیں۔ سیف الدولہ علی حسین خاں داروغۂ دیوان خانہ صحن میں کھڑے ہیں۔ بادشاہ تختِ رواں پر سوار رہے۔ بارہ دری کے کمرہ خاص میں جا کر دوگانۂ شکرانہ ادا کیا۔ عبائے خاص زیبِ دوش ہے۔ سیف ایرانی ہاتھ میں ہے۔ گلے میں موتیوں کا مالا پڑا ہے، کمر سے پٹکا بندھا ہے۔ مشروع کا پائجامہ بڑے پائینچے کا پہنے ہوئے، سرخ کشمیری شال کی قبا زیبِ جسم ہے، دوپلی نگے دار کامدانی کی لیس دار ٹوپی زیبِ سر ہے۔ زلفیں چھٹی ہوئیں، گھیتلا جوتا کامدار زیبِ پا ہے۔ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے زینے سے تختِ شاہی پر جلوس فرمایا۔ نواب امجد الدولہ نے چھوٹی رکابی کشتی جس پر تاج شاہی رکھا تھا، پیش کی۔ ابھی بادشاہ تخت پر کھڑے تھے کہ جناب مجتہد العصر نے تاج شاہی بسم اللہ کہہ کر زیبِ سر کیا۔ ایک طرف بڑے صاحب بھی تاج میں ہاتھ لگائے ہوئے ہیں۔ باآواز بلند کہا "واجد علی شاہ بادشاہ اودھ ہوئے"۔ پھر بادشاہ تخت رواں پر چار زانو ہو بیٹھے۔ تخت کے اوپر ایک کارچوبی مسند تھا بھی کھنچا ہے جس کی ڈوریاں ریشمی ہیں۔ اور کھمبے سونے چاندی کے ہیں۔ اسکے نیچے چتر مرصع خواص لیے کھڑا ہے۔ پشت پر دو چنور بردار کھڑے ہیں (یہ وہی تخت و تاج و چتر ہے جو غازی الدین حیدر بادشاہ کے وقت میں دو کروڑ روپیہ میں تیار ہوا تھا) پہلے نواب نے نذر پیش کی۔ پھر شہزادوں نے نذریں دیں۔ بڑے صاحب زیرِ تخت کرسی پر بیٹھے اور سب صاحب لوگ کھڑے رہے۔ ملازموں نے باادب سلام کرکے نذریں پیش کیں۔ تمام رجواڑوں کی طرف سے نذریں گزریں۔ نذر کی اشرفیاں وزیر کی تحویل میں جمع ہوئیں۔ بادشاہ نے پہلے نام سادات حسینی کے دستخط فرمائے۔ مبارک سلامت کا غل ہوا۔ کئی ہزار طبلوں پر چوب پڑنے لگی، اونچے سُروں میں شہنائی بجائی گئی۔ نوبت کے ٹھاٹ جھنڈے سنہری روپہلی ہوا پر اُڑے، دو پٹوں پر کامدار جھنڈیاں بنی ہوئی، پلکے کی تیلی، اطلس کی گوٹ

کناتیاں لگائے ہوئے، کمر لچکتی ہوئی۔ سردی کا زمانہ ہے۔ سرخ، سبز کار چوبی دوشالے۔ جہاں ذرا کھسک گئے، کانوں کی بجلیاں تڑپنے لگیں۔ انگا بھاؤ بتا کے ناز سے پھرنا، راگنی کا ساز کے پیٹ سے نکلنا، تان کا ٹوٹنا، عجب لطف دکھا رہا ہے۔ سرمئی پشوازیں بہار دکھا رہی ہیں۔ ڈھاڑی، دلکش انداز سے ساز بجا رہے ہیں، کلاونت، پربین، کندھوں پر اچھے اچھے ..... رکھے کھڑے ہیں، اشارہ ہوا اور بیٹھ گئے۔ ٹپہ، غزل، ٹھمری، ترانہ، خیال اڑا رہے ہیں۔ آوازوں میں سمندر کا پاٹ ہے۔ چینی لوگ مزے سے جلترنگ بجا رہے ہیں۔ فرنگی ارگن بجا رہے ہیں۔ کہیں باجہ بجتا ہے۔ اہل دربار کو خلعت ملے۔ نمک خواروں نے مزے لوٹے۔ فرمانِ خاقانی جاری ہوئے۔ سلامی کی توپیں شہر کے چاروں ناکوں پر چھوڑی گئیں۔ ڈھنڈورا پٹا "خدا کا ملک بادشاہ کا۔ آج سے اودھ کے بادشاہ سلطانِ عالم محمد واجد علی شاہ بہادر ہوئے۔ جو کوئی عدول حکمی کرے گا سخت سزا پائے گا۔" پھر تخت سے اتر کر تختِ رواں پر سوار ہوئے۔ ایک طرف بڑے صاحب ایک طرف چھوٹے صاحب ہم رکاب ہوئے۔ روشن چوکی والے شادیانہ بجاتے ہوئے ساتھ ساتھ ہوئے۔ کمپنی بہادر کی طرف سے فوج واسطے حفاظت کے آئی۔ نواب امین الدولہ مع اہل عملہ رخصت ہوئے۔ چھاؤنی سے پانچ کمپنیاں واسطے انتظام کے آئیں۔ حضور کی سواری محلسرا میں اتری۔ جرنیل مرزا سکندر بخت بھائی کو نذر دے کر بہت آبدیدہ ہوئے۔ بادشاہ بیگم، نواب ملکہ کشور فخر الزمانی، نواب تاج آرا بیگم والدہ بادشاہ نے بلائیں لیں، بیسیوں صدقے اترنے لگے۔ محلسرا کے تمام عملے نے نذریں دیں۔ اتنے میں ابرِ رحمت گھر کر آیا اور کچھ ترشح ہونے لگا۔ صبح کو نواب امین الدولہ سعید الدولہ اہلِ دربار منتظر تھے کہ حضور تشریف لائے۔ پھر وہی جشن وہی جلسے ہونے لگے۔ انعام اکرام تقسیم ہوا۔ کچھ دنوں بعد نواب امین الدولہ معزول ہو گئے۔

۵/اگست ۱۸۴۷ء کو نواب علی نقی خاں بہادر کی سفارشیں پہنچیں۔ بادشاہ نے طلب فرمایا۔ حاضر ہوئے۔ سلام کیا۔ نذر دی۔ انتیس ۲۹ پارچے کا خلعتِ وزارت مرحمت ہوا۔ "رکن رکین خلافت جہانداری اعتضاد سلطنت و شہریاری امیر الامرا مدار المہام وزیر الممالک معتمد الخاقان تلمیذ السلطان سیف مسلول رمح مصقول معرکہ دشمن کاہی ساعد ساعد یکرنگی و صفا مفتاح مناہج صداقت و وفا مرید مرشد پرست اخلاص گزین خانہ زاد عقیدت سرشت صفوۃ آمین مختار ذی اقتدار یار وفادار سپہ سالار رستم ہند مدار الدولہ منتظم الملک نواب علی نقی خاں بہادر سہراب جنگ فدوی خاص جاں نثار ابو المنصور ناصر الدین سکندر جاہ سلطانِ عالم واجد علی شاہ بادشاہ اودھ خلد اللہ ملکہٗ و سلطنتہٗ" خطاب ملا۔

پچیس ہزار روپیہ تنخواہ مقرر ہوئی۔ انھوں نے دست بستہ عرض کی کہ فیض آباد کا داروغۂ عدالت (جج) حفیظ اللہ فرنگی محل کا مولوی بے قصور محض وزیر سابق کے عتاب میں آگیا ہے، میری دوستی کے سلسلے میں خانہ نشیں ہے، مروت سے بعید ہے کہ میں خلعت وزارت پہن لوں اور وہ محروم رہ جائے۔ حکم ہوا اچھا اُسکو بھی پیش کرنا۔ دوسرے روز مولوی صاحب طلب ہوئے۔ اُنکے گھر میں تیسرا فاقہ تھا، کہ شاہی چوبدار نے آکر سلام کیا۔ اور کہا کہ آپ کو وزیر اعظم نے یاد فرمایا ہے۔ یہ اسکو امداد غیبی سمجھ کر حاضر آستانۂ عالی ہوئے۔ دربار لگا ہوا ہے۔ وزیر علی نقی خاں دست چپ کرسی پر جلوہ فرما ہیں۔ شہزادے داہنی طرف کرسی پر جلوہ افروز ہیں اکابر سلطنت، رفقاء مصاحبین اپنے اپنے مراتب سے بیٹھے ہیں۔ کہ ڈیوڑھی سے چوبدار نے آواز دی "بادشاہ عالمیاں، مولوی حفیظ اللہ حاضر ہے۔ نگہ روبرو" اسی طرح ڈیوڑھی سے دربار تک دو طرفہ چوبدار کھڑے ہوئے آواز کے بعد دیگرے لگا رہے ہیں۔ کہ پردے کو خبر ہوگئی۔ اُس نے دست بستہ عرض کیا "مولوی حفیظ اللہ حاضر ہے"۔ بادشاہ نے اشارۂ ابروسے اجازت حضوری دی۔ مولوی حفیظ اللہ لال پردہ کے پاس کھڑے تھے۔ داروغۂ ڈیوڑھی نے حکم دیا جانے دو۔ پردہ اُٹھتے ہی اندر کا اکھاڑا نظر آیا۔ یہاں سے جھک جھک کر برابر سلام کرتے ہوئے جا رہے ہیں۔ بادشاہ کے سامنے داہنے ہاتھ پر پانچ اشرفیاں (جو کسی مہاجن سے سودی لائے تھے) رکھ کر، اور بایاں ہاتھ نیچے رکھ کر نذر دکھائی۔ بادشاہ نے صرف ہاتھ رکھ دیا۔ نذر قبول ہوگئی۔ ہفت پارچہ خلعت ملا اور دو سو روپیہ ماہوار تنخواہ سابق پر بحال ہوئے۔ خلعت میں جیغہ، گوشوارہ، دوشالہ، رومال، تھان کمخواب، پٹکا، تسبیح مہنگے کی مرحمت ہوئی۔ رخصت ہو کر گھر آئے، وزیر نے سرکاری ہاتھی پر سوار کر کے بھیجا۔ گھر پر آکے ایک ہزار روپیہ مہاجن سے اور سودی لیا۔ شام کو مردے، چوبدار، شاہی عملہ کے لوگ انعام کے لیے حاضر ہوئے۔ بمشکل تمام پانچ سو روپیہ انعام دے کر جان بچائی۔ لوگوں نے کہا یہ مولوی صاحب ہیں جو کچھ دیں تبرک سمجھ کر لے لو۔ دوسرے روز واجب العرض پیش کی کہ بخشی گری یہ بکام بعینہٖ بحال رکھے جو منظور ہوگئی۔ مولوی صاحب اپنے سابقہ عہدہ پر ممتاز ہو کر فیض آباد گئے۔ اسی طرح آ جینگی کا جشن مہینوں رہا۔ رفیق خاص خواجہ اسد علی خاں تخلص کو خلعت سرفرازی عطا ہوا۔ مصاحبین خاص میں اسم ہوگیا۔ پانچ سو روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی۔ آفتاب الدولہ مہرالملک خواجہ اسد علی خاں بہادر شمس جنگ کا خطاب ملا۔ خدمت دیوان خانہ تفویض ہوئی۔ مہاراجہ بالکرشن کو شیر الدولہ خطاب ملا۔ خدمت دیوانی حاصل ہوئی۔ حیدر حسین کو اہتمام الدولہ خطاب ہوا۔ دیوان عام کے

مہتمم ہوئے - بشیر الدولہ، گلبن الدولہ، زینت الدولہ، احسن الدولہ، فیروز الدولہ خواجہ سرا نواب
ناظر محلات شاہی مقرر ہوئے - حاجی شریف ترک سواران خاص اور کئی بٹالین کے رسالدار
ہوئے - ثابت الدولہ، وہاج الدولہ ملازمت سے موقوف ہوگئے لیکن شاہی وظیفہ جاری رہا -
شاہان اودھ کے عہد میں بلکہ تمام ہندوستان کے راجہ مہاراجہ بادشاہوں کے زمانے میں یہ بات تھی کہ
جب کوئی شخص بادشاہ کے دربار میں پیش ہوا اور اُسکی نذر بادشاہ نے قبول فرمائی، سمجھ لینا چاہیئے
کہ اُسکو ملازمت سرکاری ضرور ملیگی - یا کسی کو بادشاہ نے خطاب مرحمت فرمایا، تو خطاب کے
ساتھ ہی ساتھ معقول تنخواہ ضرور مقرر کی جائیگی - جس میں عزت و آبرو کے ساتھ بسر کر سکے - اور یہ
تنخواہ پشت در پشت چلی آتی تھی - تمام اودھ کی سلطنت میں ایک آدمی بھی ایسا نہ تھا جسکو خطاب
ملا ہو اور شاہی وظیفہ نہ مقرر ہوا ہو - آخری شاہ اودھ کے دربار میں تو تمام ہندوستان کے چیدہ
لوگ مصاحبوں میں ملازم تھے - ایک سے ایک بڑھ کر شاعر، مولوی، دانا، حکیم -

اسی زمانہ میں جناب عالی کا مزاج کچھ ناساز ہوگیا - کچھ دنوں کے بعد الحمد للہ صحت حاصل
ہوئی - ہزاروں صدقے اُترے، تیل ماش بڑے تزک و احتشام سے آئے - منتیں مرادیں پوری
ہوئیں - غسل صحت کی تیاری ہونے لگی - حکم ہوا کہ جلد سامان کیا جائے - سلطان عالم حضرت عباس
کی درگاہ تشریف لے جائیں گے - جلو خانے میں سب موجود ہوں - مجرئی بھی سب حاضر ہوں - چوک
میں آئینہ بندی ہونے لگی - تاریخ معینہ پر بادشاہ حمام میں تشریف لیگئے - نہا دھو کر جامہ خانہ میں رونق
افروز ہوئے - پوشاک کی کشتیاں آئیں، لباس فاخرہ زیب جسم فرمایا اور ہوادار پر سوار ہوکر باہر تشریف
لائے - عماری دار ہاتھی پر سوار ہوئے - جھنڈیاں تمامی کی جھک گئیں - سلامی کی توپیں چھوٹیں شہر
میں سواری کی دھوم تھی - در دولت سے درگاہ تک تھالی پھینکو تو سر ہی سر جائے - سواری بہت
قرینے سے نکلی - آگے آگے تمام فوج، اُسکے بعد جلوس میں برق دم پلٹنیں، سواروں کے پرے دور سے
غل ہوگیا نواب ڈنکا آیا، دیکھنا ماہی مراتب آپہونچا - اتنے میں بیرق اور پرچم دکھائی دیا -
نشان و علم نظر آئے - آگے آگے سقے چھڑکاؤ کرتے ہوئے، مشکوں میں گلاب اور کیوڑہ بھرے ہوئے،
تمامی کی لنگیاں باندھے ہوئے - دو تین سو شتر سوار زرتار شملے باندھے ہوئے پھندے دار ٹوپیاں طاؤس کی طرح،
مست سانڈنیاں جھلاوے، ایک ایک منزل کے دھاوے کی - بانداز چوبدار روشن چوکی والے شہنائی
نواز جلودار غنچہ رو، گلفام دہنے بائیں چنور ہلاتے ہوئے، چہرہ پر سورج مکھی لگائے ہوئے - صید و شکار
کا سامان - قراول غضب کے شکاری ہیں، عقاب تیز پر - خالی بوچے اور ہوادار، زرق برق نالکیاں نفیس پالکیاں
انگریزی باجے بجتے ہوئے جا رہے ہیں - اتنے میں جلوس خاص آیا - برچھے والے برق انداز بھالے

والے خاص بردار کندھوں پر خاصیاں رکھے ہوئے۔ گھڑی ساز مرصع کار۔ نقیب آواز لگائے ہوئے باادب ملاحظہ دولت و اقبال کی ترقی۔ ساتھ میں ہاتھیوں کے غول مخملی کارچوبی جھولیں پڑی ہوئیں۔ ریشمی رسّے، طلائی مرصع کا زنگٹ۔ مستکوں پر چاند سورج لگے ہوئے، دانتوں پر چوڑی چڑھی ہوئی، فیلبان بھی نکھرے ہوئے، سر پر چیرے باندھے ہوئے، طرّے اور گوشوارے لٹکتے ہوئے، گنگا جمنی گجباگیں لیے ہوئے، جن پر بادشاہ کے عزیز قریب جلوہ افگن۔ بیچ میں بادشاہ سلامت، ادھر ادھر تمام دولتخواہ ارکان دولت ہمراہی میں اشرفیاں، روپے لٹاتے ہوئے۔ اس شان و شوکت سے سواری درگاہ میں داخل ہوئی۔ پہلے انگلی اٹھا کے زیارت پڑھی، پھر ضریح مبارک آنکھوں سے مَس کی۔ دو ہزار روپیہ کی نذر چڑھائی۔ اسی شان و شوکت سے واپس آئے۔ دروازے درگاہ تک جانے میں لاکھوں روپیہ تقسیم ہوگیا۔ اسی طرح رات دن جلسے رہتے تھے۔ لوگ اس آرزو میں رہتے تھے کہ ایک مرتبہ بادشاہ ہمارا سلام لے لیں، پھر دولت کی کچھ پروا نہیں ہے۔ جس کا سلام قبول ہوگیا، مالا مال کر دیا۔ خلعت دیا تو زر بھی دیا۔ خطاب دیا تو تنخواہ بھی کر دی۔ اس داد و دہش کا یہ فیض تھا کہ لکھنؤ میں مینہ برس رہا تھا۔ الماس علی خاں خواجہ سرا نواب ناظر کے چیلے فتح علی خاں وحید بخش کی فقط سیر شب ماہ میں لاکھ روپے کا تار بقیش کترا جاتا تھا، عبیر کی طرح اڑایا جاتا تھا، جس کی سپردن چاندنی صبح کو ہتر انی چُن لے جاتی تھی۔

(الناظر، اگست ۱۹۳۴ء)

قالوا انا للہ و انا الیہ راجعون

اتنا نظر کا حصہ مضامین چھپ چکا تھا جب یہ الم انگیں خبر آئی کہ مسلمانان ہندوستان کے سب
بڑے رہنما حضرت نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین نے ۲۶ر جنوری کو اپنے وطن
امروہہ میں انتقال فرمایا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

یوں تو حضور ممدوح کی صحت کئی سال سے جواب دے چکی تھی جس کی بنا پر میدان عمل سے
کنارہ کشی اختیار فرمانے اور امروہہ کی مستقل اقامت اور گوشہ گزینی نے گویا یاد قومی کو اب سے پیشتر
ہی بے سر کر دیا تھا اور ہمارے شیرازۂ قومی میں جو پراگندگی آج نمایاں ہے اسکی بڑی وجہ یہی تھی۔
لیکن جب تک سانس باقی تھی آس بھی لگی ہوئی تھی۔ اب کہ داعی اجل نے اس تبرک سے بھی قوم
کو محروم کر دیا ہے دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جل شانہٗ مرحوم کی روح پاک کو اپنے جوار رحمت میں جگہ
عطا فرمائیں اور ہم برگشتہ بختان ہند کی رہنمائی کے لیے کسی ایسے بزرگ قوم کو مامور فرمائیں جو
نواب وقار الملک مرحوم کے نعم البدل ثابت ہوں۔ آمین یارب العالمین۔۔

نواب مشتاق حسین کی زندگی پر مفصل تبصرہ کا تو یہ وقت نہیں ہے لیکن مرحوم کی اُن نمایاں
اور ممتاز خصوصیات کا اعادہ بے موقع نہ ہوگا جو اُن کو سالارِ قوم بنانے کا ذریعہ ہوئی تھیں اور وہ
حسب ذیل تھیں

(۱) وہ دین دار، متقی اور عبادت گزار تھے

(۲) وہ خدا اور صرف خدا کا خوف کرتے تھے

(۳) وہ اسلام اور مسلمانوں کے مخلص خادم اور بہی خواہ تھے۔

(۴) وہ دل کے سخی اور صحیح معنوں میں ایثار کے عادی تھے

(۵) وہ ارادہ کے مستقل اور ذاتی اغراض سے بے لوث تھے

(۶) وہ باتیں کم اور کام زیادہ کرتے تھے۔

(۷) وہ منکسر، متواضع اور بردبار تھے

(۸) وہ سادہ زندگی بسر کرتے تھے اور اسراف سے ہمیشہ پرہیز کرتے تھے

(۹) وہ صلح پسند تھے مگر راستبازی سے کبھی منھ نہیں موڑتے تھے

(۱۰) وہ حق گو تھے لیکن دل آزاری سے احتراز کرتے تھے

(۱۱) وہ جفاکش اور محنتی تھے۔

(۱۲) وہ جو کہتے اُس پر عمل بھی کرتے تھے۔

نواب صاحب کثیر الاولاد نہیں تھے مگر اُن کے پسماندگاں کی تعداد بریں سبب زیادہ ہو گئی کہ ریاست حیدر آباد سے جو گراں قدر وظیفہ ان کو ملتا تھا اُس کا بیشتر حصہ دوسروں کے لیے مستقلاً وقف تھا اور جن لوگوں کی یہی ایک آمدنی تھی ظاہر ہے کہ دفعتہً اس سلسلے کے منقطع ہونے سے اُنھیں کس قدر پریشانی کا سامنا ہوگا۔ مرحوم کے جانشین اور اعزا کے ساتھ ساتھ ان بیچاروں کی مصیبت کا خیال اور بھی اذیت دہ ہے

ارحم الراحمین انھیں توفیق صبر و تحمل عطا کریں اور دیگر وابستگانِ مرحوم کی کارستانی فرمائیں۔ آمین۔

(الناظر، جون ۱۹۱۷ء)

بھارت سپوت

مادر ہند کے مایۂ صد ناز فرزند، ہندوستانیوں کے مخلص ترین دوست، نوعِ آزادی کے نہایت درجہ بیباک حامی اور دورِ حاضرہ کے سب سے بڑے رہنما، موہن داس کرم چند گاندھی کے نام نامی سے اس عظیم الشان جزیرہ نما کا بچہ بچہ واقف ہے۔ یہ کتاب اُنھیں کے مختصر سوانحی حالات کا مرقع ہے۔ اسکے مطالعے سے اُردو خواں اصحاب کو اُنکے ابتدائی حالات، اخلاق و عادات، اور عقائد و خیالات کا کچھ اندازہ ہو سکے گا، اور ساتھ ہی ساتھ جنوبی افریقہ میں اُنکے مشہور و معروف "خاموش مقابلہ" کی کیفیت بھی معلوم ہو جائیگی۔ جسکے بعد اُنکی تحریک ستیاگرہ یا عدم تعاون و نافرمانیٔ قانون وغیرہ کی اصل حقیقت کو جاننا اور اُنکے مقصدِ حیات کو اچھی طرح سمجھنا ممکن ہو جائے گا۔

غالباً یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ گوتم بدھ، رامچندر اور سری کرشن کے بعد اس وقت تک سرزمین ہند سے کوئی ایسا فرزند نہیں پیدا ہوا جو اہل ہند کی اس درجہ عظمت و عقیدت کا مرکز بنا ہو جیسے کہ اسوقت مہاتما گاندھی ہیں۔ اور اس بیان میں ذرا بھی مبالغہ نہیں کہ خاک پاک ہندوستان کے کسی باشندہ کو یہ منزلت پہلے نصیب نہیں ہوئی کہ وہ دنیا کے اعاظم رجال کے مقابلہ میں "سب سے بڑا شخص" کہا جائے۔ اسی طرح یہ امر بھی بالکل مسلّم ہے کہ ہندوستان کے موجودہ دورِ ارتقا میں کسی بڑے سے بڑے والیٔ ملک، دولتمند سے دولتمند تاجر، فاضل سے فاضل حکیم، عالم، شاعر یا

ماہر فنونِ لطیفہ اور مشہور سے مشہور مدبر، اخبار نویس، مصنف یا خطیب کو ہندوستانیوں کے تمام طبقات کے اندر یہ ہر دلعزیزی اور رسوخ حاصل نہ ہوا جو اسوقت گاندھی جی کا مخصوص امتیاز ہے گذشتہ ایک سال کے اندر انگلستان کا کوئی ممتاز اخبار یا رسالہ ایسا نہیں جس میں مسٹر گاندھی اور اُنکی تحریک ترک موالات پر ایک سے زائد مضامین نہ نکلے ہوں - خود ہندوستان میں تو اُنکا ذکر وائسرائے سے لیکر پانچ برس کے بچہ کی زبان تک پر رہتا ہے حتیٰ کہ بمبئی کا مشہور انگلو انڈین اخبار ایڈوکیٹ آف انڈیا گھبراکر لکھتا ہے کہ خدارا لوگ اب اس ذکر کو چھوڑ دیں - اہل ہند کی زندگی کا کوئی شعبہ اور اس ملک کی کثیر النوع و مختلف المذہب آبادی کا کوئی طبقہ ایسا نہیں بتایا جاسکتا جو مہاتما گاندھی کی شخصیت سے متاثر نہ ہوا ہو - انڈین نیشنل کانگریس جو ہندوستان کی سب سے بڑی قومی مجلس تھی، ستمبر ۱۹۲۰ء میں اُنکی تابع فرمان بن چکی تھی - آل انڈیا مسلم لیگ بھی جو عرصہ سے کانگریس کی رفیق کار بنی ہوئی تھی اُنکے قدموں پر نثار ہونے کو تیار ہوگئی - سنٹرل خلافت کمیٹی بمبئی تو گویا اُنکی پروردہ آغوش ہے - علیگڈھ، بنارس، دیوبند اور لکھنؤ ہر جگہ اُنکی "جے" منائی جاتی ہے - ہندو سبھانے بہت کچھ پہلو تہی کرنے کے بعد بالآخر سال رواں میں گاندھی کیمپ ہی کو اپنا جائے پناہ قرار دیا - سکھ لیگ نے "اہنسا" کے حق میں ووٹ دیتے ہی سیکڑوں اکالیوں کو ننکانہ کے گردوارہ میں دار فنا تک پہونچا دیا - بمبئی کے پارسیوں نے تلک سوراج فنڈ کے لیے گاندھی کی جھولی میں لاکھوں روپیہ بھردیا - برہما والے الگ بگڑے بیٹھے ہیں بات بات پر بائیکاٹ اور ہڑتال کرتے ہیں - غرضکہ مملکتِ ہند کے اس سرے سے اُس سرے تک نظر دوڑائیے، تو خدا کے بعد بس گاندھی ہی گاندھی دکھائی دیں گے - ایسے شخص کے حالاتِ زندگی کا مطالعہ جسقدر ضروری ہے اُسکے متعلق اب کچھ کہنا فضول ہوگا - ذیل میں اجمالاً کچھ حالات بھارت سپوت سے اخذ کرکے درج کیے جاتے ہیں :-

۲ - اکتوبر ۱۸۶۹ء کو ریاست پوربندر (کاٹھیاوار) میں ہندوستان کے اس نامور سپوت نے جنم لیا - جہاں اُنکے باپ اور دادا دونوں دیوان کے معزز عہدہ پر مامور رہے تھے - ابتدائی تعلیم یہیں شروع ہوئی - پھر اپنے والد ماجد کے ساتھ راجکوٹ میں جاکر رہے اور وہیں کاٹھیاوار

ہائی اسکول سے ۱۸ سال کی عمر میں میٹرکولیشن کی ڈگری حاصل کی۔ جسکے بعد ایک عزیز کے مشورہ سے ولایت جاکر بیرسٹری کی سند لی۔

گاندھی کے والدین وشنو دھرم کے پیرو اور نیکی، استبازی و راسخ الاعتقادی میں ممتاز تھے۔ چنانچہ ہونہار فرزند میں بھی یہ اعلیٰ صفات شروع ہی سے نمودار تھیں۔ گو مغربی تعلیم کے زہریلے اثرات برابر اپنا کام کرتے اور قدم قدم پر اُسکے دامن سلامت روی کو گھسیٹتے رہے لیکن بالآخر گاندھی کی فطرت پاکیزہ اور ناقابل فتح جراتِ اخلاقی کو اسکے مقابلہ میں پوری کامیابی ہوئی چنانچہ قیام لندن ہی کے زمانہ میں گاندھی نے انگریزی سوسائٹی کی فریب کاریوں اور مغربی تہذیب کی طلسم سازیوں کا جال توڑ کر بھگوت گیتا کے سایۂ عاطفت میں پناہ لی جسکی اعلیٰ روحانی تعلیمات نے اُنکے قوائے باطنی کو تجلیات سے آراستہ اور اخلاق ظاہر کو پاکیزگیوں سے پیراستہ کر دیا۔

انگلستان سے واپسی کے بعد ڈیڑھ سال تک گاندھی بمبئی ہائیکورٹ میں وکالت کرتے رہے۔ تا آنکہ پریٹوریہ (جنوبی افریقہ) کے ایک ہندوستانی سوداگر کے مقدمہ میں وکیل ہو کر اُنکو افریقہ جانا پڑا۔ افریقہ میں گورے آبادکاروں کا سلوک ہندوستانیوں کے ساتھ حد درجہ حقارت آمیز و ناقابل برداشت تھا جسکا تلخ تجربہ گاندھی کو اپنے چند روزہ قیام میں برابر ہوتا رہا۔ اور عین اُس زمانہ میں جبکہ وہ مقدمہ سے فراغت پاکر وطن کی طرف مراجعت کرنیوالے تھے ایک مقامی اخبار میں اُنھوں نے پڑھا کہ وہاں کی پارلیمنٹ میں ایک مسودہ قانون اس غرض سے پیش کیا جانیوالا ہے کہ ہندوستانیوں کو ووٹ دینے کا جو حق حاصل ہے وہ زائل ہو جائے۔ جسکے بعد اسی قسم کے دیگر قوانین پیش ہونگے۔ گاندھی نے وہاں کے سربرآوردہ ہندوستانیوں کو خطرات سے آگاہ کرکے باہم متحد ہو کر پوری مستعدی کے ساتھ اُنکا مقابلہ کرنے کا مشورہ دیا! اور بالآخر اُنکے اصرار کی بنا پر اپنا عزم سفر ترک کیا۔ قیام وطن کی لذتوں کے ساتھ ہی اُنھوں نے اپنی شخصی ترقیات کے خواب اور ذاتی راحتوں کے سامان کو کمال ایثار سے خیرباد کہکر نٹال کی سوپریم کورٹ کے وکلاء میں اپنا نام درج کرا لیا۔ اور اپنے ابنائے وطن کو گورے آبادکاروں کے مظالم سے نجات دلانے کے لیے جماعت کی تنظیم اور ہر قسم کی اجتماعی و آئینی جد و جہد میں ہمہ تن منہمک ہو گئے۔

سنہ ۱۸۹۶ء میں وہ اپنے اہل و عیال کو لانے کی غرض سے ہندوستان واپس آئے اور کچھ دور ٹھہر کر اپنی بیوی بچوں سمیت واپس گئے۔ مگر اس مختصر قیام کے زمانہ میں جو یہاں کے مختلف جلسوں میں اُنھوں نے اُن تمام حق تلفیوں، حقارتوں اور ستمگاریوں کی پُر درد داستان بیان کی جنکے جنوبی افریقہ کے بدنصیب ہندوستانی ایک مدتِ دراز سے شکار ہو رہے تھے تو ریوٹر علیہ الرحمۃ کی عنایت و مستعدی کے بدولت انکی اطلاع افریقہ کے گورے آبادکاروں کو گاندھی کی واپسی سے پہلے ہی پہونچ رہی جسنے اُنکے دلوں میں گاندھی کے خلاف بے انتہا غیظ و غضب پیدا کر دیا۔ چنانچہ جب گاندھی اپنے اہل و عیال سمیت بندرگاہ میں داخل ہوئے تو ایک پُر شور ہجوم کی وجہ سے اُنھیں سخت دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔

سنہ ۱۸۹۹ء میں انگریزوں اور بوئروں کی لڑائی کے موقعہ پر گاندھی نے یہ سوچ کر کہ اس نازک موقعہ پر اگر ہندوستانی حکومت کی امداد کریں گے تو اُنکے حقوق کا آیندہ پورا لحاظ کیا جائیگا افریقہ کے ہندوستانیوں کو والنٹیر (رہنما کار) بننے کی ترغیب دلائی اور اگرچہ دو دفعہ اُن کی درخواست خدمت و اعانت مسترد کی گئی تاہم تیسری دفعہ جبکہ انگریزی حکومت کو جنگ میں کافی نقصان ہوا ہندی باشندوں کی خدمات قبول کر لی گئیں۔ (جو لوگ مہاتما گاندھی کی اس روش پر نکتہ چینی کرتے رہے ہیں کہ اُنھوں نے گذشتہ محاربۂ یورپ کے دوران میں، مسٹر لائڈ جارج وزیر اعظم انگلستان اور وائسرائے ہند کی اپیل اور جنگی کانفرنس منعقدۂ دہلی کی قراردادوں کے بموجب والنٹیروں کی بھرتی کیلیے امکانی کوشش کی، اُنپر عیاں ہو جانا چاہیے کہ اس خدمت و اعانت کی اصلی غایت کیا تھی)

خاتمہ جنگ پر گاندھی نے یہ خیال کیا کہ حکومت برطانیہ کی فتح نے ہندوستانیوں کی مشکلات کا بھی خاتمہ کر دیا اور وہ ہندوستان واپس چلے آئے۔ لیکن ٹرانسوال کی جدید حکومت نے ہندوستانیوں کے ساتھ بہتر سلوک کرنے کے بجائے ایک نیا ایشیائی محکمہ قائم کیا جسکے ذریعے نہایت فطانت و عیاری کے ساتھ ہندوستانیوں کو افریقہ سے خارج کر دینے کی تدبیر سوچی گئی گاندھی پھر افریقہ واپس پہونچے جہاں وکالت شروع کرنے کے ساتھ ہی اُنھوں نے سنہ ۱۹۰۳ء میں انڈین اوپینین نامی ایک اخبار نکالا جو انگریزی، تامل، گجراتی اور ہندوستانی چار زبانوں میں شایع

ہوتا تھا۔ دوسرے سال اُنھوں نے فینکس کی پہاڑی پر اپنے آشرم کی بنیاد ڈالی جہاں وہ رسکن کے اعلیٰ تخیل کی متابعت میں تمام لذات و مرغوبات کو ترک کرکے نہایت سادہ زندگی بسر کرتے اور ہر قسم کی تپسیا (ریاضت) میں مصروف رہتے۔

سنہ ۱۹۰۶ء میں ٹرانسوال کی حکومت نے یہ ذلت آفریں قانون بنانا چاہا کہ جن ایشیائی مزدوران کی میعادِ اجارہ ختم ہو چکی ہو وہ انگوٹھے کے نشان دیکر از سر نو اپنے نام درج رجسٹر کرائیں۔ اور گاندھی اور اُنکے رفقا، کی تمام کوششوں کے باوجود قانونی کونسل نے اُسے منظور کر لیا۔ البتہ عورتیں اسکے دستبرد سے بچ گئیں۔ چنانچہ گاندھی کی رہنمائی میں ہندوستانیوں نے اس قانون کی مدافعت کیلئے "خاموش مقابلہ" شروع کیا۔ اور کچھ ہی روز کے اندر افریقہ کے جیلخانے

مظلوم ہندوستانیوں سے پُر ہو گئے۔ خود گاندھی کو بھی دو سال کی سزا دی گئی۔ آخرکار حکومت نے اپنی اخلاقی شکست تسلیم کی اور سمجھوتہ کر لیا۔ اس سمجھوتہ کے رو سے ہندوستانیوں نے از خود اپنے نام درج رجسٹر کرائے مگر حکومت نے اپنے عہد و پیمان کے مطابق قانون کو منسوخ نہ کیا۔ جسکی بنا پر دوبارہ اسی روحانی جنگ کی بنیاد ڈالی گئی۔ اسکے "خاموش مقابلہ" نے بہت طول کھینچا۔ ہزاروں ہندوستانی پھر جیلخانوں میں جا بسے اور سخت سے سخت مظالم نہایت مردانہ ہمت و جوش کے ساتھ برداشت کرتے رہے۔ گاندھی کو بھی دوبارہ جیلخانے جانا پڑا، جہاں سے مخلصی پانے کے بعد اُنھوں نے دو وفد تیار کیے۔ ایک خود اُنکی سرکردگی میں انگلستان گیا اور دوسرا مسٹر پولک کی نمائندگی میں ہندوستان آیا۔ انگلستان کے وفد کا تو اس سے زیادہ کچھ نتیجہ نہیں نکلا کہ ارکین حکومت برطانیہ نے ٹرانسوال کے ذمہ دار وزراء کو جو اُس زمانہ میں وہاں موجود تھے مناسب تصفیہ پر آمادہ کرنے کی ناکامیاب کوشش کی، لیکن ہندوستان میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک آگ لگ گئی اور اہل ہند کو پہلی دفعہ اُن ذلت بار حالات کا صحیح احساس پیدا ہوا۔ جن میں اُنکے جنوبی افریقہ کے ہموطن عرصہ سے مبتلا تھے۔ اُدھر خود افریقہ میں یہ صورت پیش آئی کہ ایک طرف گورے آبادکاروں کی ایک کمیٹی سر ولیم ہاسکن کے تحت میں ہندوستانیوں کی حمایت و امداد کیلئے قائم ہو گئی اور دوسری طرف عمال حکومت نے اہل وطن کو پکڑ پکڑ کر جلا وطن کرنا شروع کیا۔ ابتداءً اُنھیں نٹال کے

حدود سے خارج کرنے کی کوشش کی گئی مگر اس میں کامیابی نہ ہوئی کیونکہ انھیں باہر چھوڑ کر آیئوالے
واپس نہ آنے پاتے تھے کہ یہ اُن سے بھی بیشتر آموجود ہوتے۔ آخر انھوں نے ایک جماعت کو جہاز
میں بھر کر ہندوستان روانہ کر دیا۔ مگر یہاں سے یہ لوگ اپنے ہموطنوں کی دعاؤں کو ساتھ لیے ہوئے
پھر لوٹ گئے۔ ان جلا وطنوں کے خلاف حکومت ہند نے جب وزراء برطانیہ کو توجہ دلائی تو بالآخر
اسکا سلسلہ رُک گیا۔

جب ۱۹۱۰ء میں جنوبی افریقہ کی مختلف ریاستوں نے باہمی اتحاد کرکے "یونین گورنمنٹ"
قائم کی، تو حکومت برطانیہ نے پھر تحریک کی کہ جو قانون ان سب مصائب کی بنیاد ہے اُسے منسوخ
کر دیا جائے۔ چنانچہ بعد رد و قدح بسیار اس بات پر ہندوستانیوں سے سمجھوتا ہوا کہ ۱۹۱۱ء میں
ایک طمانیت بخش قانون جاری کر دیا جائیگا۔ اسی سال مارچ میں مسٹر گوکھلے آنجہانی کی تحریک پر

امپیریل لیجسلیٹو کونسل نے اجارہ دار مزدوران کے سلسلہ کو منسوخ کرنے کی تجویز منظور کی گر حکومت
افریقہ نے معاہدہ کے مطابق قانون میں جو ترمیم کی ہندوستانیوں کی اُس سے تشفی نہ ہوئی۔ لہذا
گاندھی کی دعوت پر مسٹر گوکھلے جنوبی افریقہ گئے اور بحث و مباحثہ کے بعد یونین گورنمنٹ کے وزراء نے
خاطر خواہ بندوبست، اور علی الخصوص تین پونڈ والے ٹیکس کو منسوخ کرنے کا وعدہ کیا لیکن

وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہو جائے

۱۹۱۳ء میں جب نیا قانون "یونین گورنمنٹ" کے رو برو پیش ہوا تو ہندوستانیوں نے جانا کہ اُن کے
مرض کی دوا یہ بھی نہیں ہے۔ اس زمانہ میں ایک تازہ اور غیر معمولی پیچیدگی یہ پیدا ہو گئی کہ متحدہ ریاستوں
کی عدالت نے ایک مقدمہ میں یہ فیصلہ کیا کہ قانون ریاست کے مطابق وہ کلیہ نکاح منسوخ و کالعدم
ہیں جو ہندوستان میں ہوئے ہوں۔ پس اب دوبارہ جو خاموش مقابلہ شروع ہوا تو ایکی عورتیں بھی
مردوں کے دوش بدوش اس جنگ میں شریک ہو گئیں۔ جسکی بنا پر یہ روحانی محاربہ تاریخ میں ہمیشہ
یادگار رہیگا۔

اس محاربہ کی داستان اتنی پُر اثر اور سبق آموز ہے کہ بغیر تمام و کمال پڑھے ہوئے محض اجمالی
تذکرہ سے ناظرین کی تشفی نہ ہوگی، اسلیے بخوفِ طوالت نظر انداز کرنا پڑتی ہے، اور ناظرین سے

بجا نی ہے کہ بھارت بیوت کا ایک نسخہ منگا کر اپنے مشتعل شدہ شوق کو پورا کریں۔ بہر حال اس جنگ میں جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کو نہایت شاندار فتح حاصل ہوئی۔ جسکے بعد گاندھی کو افریقہ میں مزید قیام کرنے کی ضرورت باقی نہ رہی اور وہ ہندوستان واپس چلے آئے۔ یہاں آکر جو کارہائے نمایاں انھوں نے انجام دیے ہیں اُنکی مفصل روداد ابھی حوالۂ قلم نہیں کیجا سکتی، گو بھارت بیوت میں اشارۃً چمپارن وکھیرا کے واقعات اور ۱۹۱۹ء کی ستیاگرہ کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ یہ حالات کافی صراحت وتفصیل کے ساتھ اُسوقت خوب بیان ہوسکیں گے جبکہ عدم تعاون کی عظیم الشان روحانی جنگ کا فتح ونصرت پر خاتمہ ہوگا۔

کاونٹ ٹالسٹائے نے جو روس کے ایک مشہور فلسفی اور نامور مصلح تھے، اپنی وفات سے کچھ دنوں پیشتر زار روس کے پاس ایک پیام بھیجا تھا جسمیں آنیوالی مہیب لڑائیوں کا خاکہ ایک عجیب انداز میں کھینچا گیا تھا۔ اگر اُنکے اُس پیام کو ایک نہایت ہی اعلیٰ درجہ کی پیشین گوئی کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کیونکہ جتنی باتیں اُنھوں نے مجازاً بیان کی تھیں تقریباً وہ سب گزشتہ سالوں میں جزوی اختلافات کے ساتھ حقیقت بنکر رونما ہوتی رہی ہیں۔ اس پیام میں اُنھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ جنگ وجدال کے اختتام پر جب دنیا کی تنظیم جدید ہوگی تو یورپ کے موجودہ معتقدات فنا ہو جائیں گے اور اُنکے بجائے اُلوہیت باری تعالیٰ کا عقیدہ از سرِ نو اور بالکل نئی شان کے ساتھ اشاعت پذیر ہوگا۔ اور مصلح وامن کی یہ روح تازہ کسی تاجدار و سپہ سالار یا مدبر کے ذریعہ سے نہیں بلکہ ایک مسیحا نفس اہل قلم کے واسطے سے پھونکی جائیگی۔ جو اسوقت (ترسیل پیام کے وقت) بھی دنیا میں موجود ہے گو عام طور پر لوگوں کی نگاہوں سے چھپا ہوا ہے۔

عدم تعاون کی لڑائی کو جو لوگ محض ایک قسم کا طریق حقوق طلبی جانتے ہوں اُنسے یہاں بحث نہیں۔ البتہ جو یہ یقین کرتے ہیں کہ اس محاربہ سے دنیا کے تمدن کا کوئی گہرا تعلق ہے وہ اس نتیجہ پر غالباً بآسانی پہونچ جائیں گے کہ اگر کاونٹ ٹالسٹائے کی پیشین گوئی کا آخری جزو بھی امر واقعہ کی صورت اختیار کرنیوالا ہے تو یقیناً عدم تعاون کا بانی وموجد ہی دراصل وہ شخص ہوسکتا ہے جو مغربی تہذیب اور معتقدات اہل یورپ دونوں کو ایک ہی معرکہ میں فنا کرکے دنیا کو پائدار صلح اور پاکیزہ مذہبی

تخیل سے بہرہ اندوز ہونے کی دعوت دیگا۔

بھارت سپوت کی تحریر دلکش، ترتیب موزوں اور عنوانات پسندیدہ ہیں۔ کتابت صحیح، کاغذ عمدہ اور طباعت صاف ہے۔ شروع میں ایک عکسی تصویر لگائی گئی ہے جسمیں مہاتما گاندھی جی اور اُنکی اہلیہ محترمہ استادہ نظر آتی ہیں۔ مگر سرورق اور پنڈت موتی لعل نہرو صاحب کی ایک صفحہ کی تمہید کو سیسہ کے حروف سے چھاپکر ناشرین نے خواہ مخواہ کتاب کے حسنِ ظاہری کو برباد کر دیا۔

آخر میں ایک بہت ہی قابل افسوس و ملامت واقعہ کا ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے جسکی وجہ سے کتاب اگرچہ نہیں مگر ناشرین و مرتبِ کتاب دونوں صد درجہ سزاوارِ سرزنش قرار پاتے ہیں۔ مدراس کی گنیش کمپنی نے جو قومی و سیاسی ادبیات کی اشاعت میں ممتاز ہے سنہ ۱۷ء میں مہاتما گاندھی کی تقریروں اور تحریروں کا ایک مجموعہ انگریزی میں شایع کیا تھا جسکا پورا نام Mahatma Gandhi His life writings & Speeches ہے۔

یہ کتاب اس قدر مقبول ہوئی کہ سنہ ۱۹ء میں دوسرا اور سنہ رواں میں تیسرا اڈیشن شایع ہوا۔ آخری طبع کا ایک نسخہ سامنے رکھا ہے اور اُسکے مطالعہ نے یہ حقیقت منکشف کر دی کہ بھارت سپوت تمامتر اسی مجموعہ کے ابتدائی حصہ کا ترجمہ ہے جسمیں مہاتما جی کی سوانحعمری لکھی گئی ہے۔ پنڈت موتی لعل نہرو صاحب نے اپنے تمہیدی الفاظ میں تحریر فرمایا ہے کہ

"مجھے اس بات سے بہت خوشی ہوئی کہ ایک مسلمان نوجوان نے ایک ہندو بزرگ کی سوانحعمری مرتب کی۔"

اس جملہ سے اور نیز اس بات سے کہ ایک طرف بھارت سپوت کے سرورق پر سب سے پہلی سطر میں لکھا ہوا ہے "جملہ حقوق محفوظ" اور دوسری طرف ساری کتاب میں کہیں اشارۃً بھی اس امر کا اعتراف نہیں پایا جاتا کہ یہ گنیش کمپنی کی شایع کردہ انگریزی کتاب کے ایک جزو کا ترجمہ ہے۔ صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ سید امتیاز علی تاج اڈیٹر رسالہ کہکشاں لاہور (خلف جناب مولوی ممتاز علی صاحب مالک و منیجر اخبار تہذیب النسواں لاہور) جنکے سر پر اس کتاب کی ترتیب کا سہرا باندھا گیا ہے، بیباک

گویا ذکر کرانا چاہتے ہیں کہ یہ سوانحمری واقعۃً انھیں کی مرتب کردہ ہے۔ بیشک اصل انگریزی کتاب میں یہ سُرخیاں نہیں ہیں اور عبارت میں بھی کہیں کہیں اضافہ، اختصار اور تغیر کے آثار پائے جاتے ہیں۔ بلکہ یہ کتاب چونکہ دوسرے ایڈیشن کے بعد ترجمہ کی گئی ہے، اسلیے جدید الطبع ایڈیشن کے مقابلہ میں نامکمل بھی ہے۔ لیکن کیا ان تغیراتِ خفیف کی وجہ سے اصل مصنف کی کوششوں پر پانی پھیرنا اور اُسکے حقوق کا تلف ہونا ممکن ہے؟ دار الاشاعت پنجاب لاہور کو جسکی طرف سے یہ کتاب غالباً شایع ہوئی ہے شاید یہ محسوس نہیں ہوا کہ جس محترم بزرگ کی یہ سوانحمری ہے اُسکی تمام خصوصیات میں ممتاز ترین صفت حق و راستی کی پابندی ہے۔ کم سے کم ایسے شخص کی سوانحمری شایع کرنیوالے کے اخلاق تو اس قسم کی سقاہتوں سے پاک ہونا چاہیے تھے۔ ایک مسلمان شخص کے لیے یہ حرکت نہایت نازیبا اور قطعاً ناقابل معافی ہے۔ کیونکہ مہاتما گاندھی کا یہ احسان عظیم مسلمان کبھی فراموش نہیں کر سکتے کہ اُنھوں نے مسئلۂ خلافت کو ہمارے حسب دلخواہ طے کرانے کی غرض سے اپنی اور ساری ہندو قوم کی اجتماعی قوتوں کو سینہ سپر کر دیا ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار

(الناظر، نومبر ۱۹۲۱ء) **ابوسلیمان**

جلیل قدوائی (علیگ)

بی اماں

ناز ہے قدرتِ صانع کو تری ہستی پر
رشک کرتا ہے ترے سوز پہ اعجازِ شرر

جس پہ قربان ہوں سو نازِ زیست عدم تیرا ہے
جس پہ چلتا ہے جہاں نقشِ قدم تیرا ہے

تیری تعمیر میں سرمایۂ غیرت پنہاں
تیری فطرت میں اک احساسِ حمیت پنہاں

درسِ ایثار کچھ اس طرح پڑھایا تو نے
ایک عالم کو رہِ حق پہ لگایا تو نے

زندگی تیری صداقت کا اک افسانہ ہے
جو نہ سمجھے تری دعوت کو وہ دیوانہ ہے

ہر روشِ دہر کی پیغامِ اجل دیتی ہے
پر تری زیست یہ تعلیمِ عمل دیتی ہے

زندگی نذرِ رہِ ملتِ بیضا کر دے
ذرۂ خاک کو ہمدوشِ ثریا کر دے

آنکھ نے چوٹ ہے گو نشترِ غم کی کھائی
دیدۂ دل نہیں شرمندۂ نابینائی

نورِ حق دیکھتا ہوں خاک میں تیری مستور
جس کے ہر لمعہ میں ہو جائے فنا شعلۂ طور

خاک میں ہمتِ پرواز ابھی باقی ہے
اڑ کے ہر بار سوئے عرشِ بریں جاتی ہے

ذرے جب شدتِ انوار سے تھراتے ہیں
دامنِ جنتِ پیمبرؐ سے لپٹ جاتے ہیں

(الناظر، جنوری ۱۹۲۵ء)

حسین شریفِ مکہ

دو سال ہوئے جب مکہ معظمہ (زاد اللہ شرفہا) حاضر ہونے کا شرف میرے نصیب میں آیا۔ تو شریف حسین سابق ملک الحجاز کے حالات سے آگاہ ہونے اور اُن سے متعدد ملاقاتیں کرکے اُنکی ذہنیت کا کسی قدر اندازہ کرنے کا مجھے موقع ملا۔

لکھنؤ سے روانگی کے وقت تک اُن خبروں کی بنا پر جو کہ اخبارات کے ذریعے سالہائے ماسبق میں وصول ہوئی تھیں شریف حسین کی طرف سے میرے دل میں ناگواری اور ناراضی کے جو خیالات جاگزیں تھے، قطعاً ارادہ نہ تھا کہ میں شریف صاحب سے ملوں گا۔ اسی لیے جب جناب مولانا عبد الباری صاحب فرنگی محلی نے جنکے تعلقات شریف مذکور سے عالم آشکارا ہیں، ایک تعارفی تحریر دینے کا از خود ارادہ ظاہر فرمایا تو میں نے اُسے قبول نہ کیا، اور اُن سے صاف عرض کردیا کہ میں شریف سے ملنا نہیں چاہتا۔

مکہ معظمہ حاضر ہونے کے بعد مجھے دو قسم کے لوگوں سے سابقہ پڑا۔ ایک وہ لوگ تھے جو شریف حسین سے دلی نفرت رکھتے تھے اور شریف صاحب کی جملہ کارروائیوں کو بعینہٖ اُسی نقطۂ نظر سے دیکھتے تھے جس سے ہم لوگ ہندوستان میں دیکھنے کے عادی ہوگئے تھے۔ دوسرے وہ لوگ تھے جو شریف صاحب کو اعلیٰ درجہ کا مدبّر خیال کرتے تھے۔ خصوصاً حجاج کے معاملات میں شریف صاحب کا طرزِ عمل ایسا بتایا گیا کہ مجھ کو اپنے ہمخیال دوستوں کی تمام باتوں کے باوجود یہ خیال پیدا ہوگیا کہ جنگ کے دوران میں شریف صاحب نے دھوکا کھاکر، یا ذاتی اغراض سے متاثر ہوکر جو کچھ کارروائی کی، اُسکے بعد شاید اُنکی آنکھیں کھل گئیں اور اب وہ حجاز کو غیر اسلامی تسلط سے ہر طرح آزاد رکھ کر ایک پائدار و مستحکم عربی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔

بیس سال سے زیادہ زمانہ گذرا کہ جب علامہ جلال الدین سیوطی کی مشہور تصنیف تاریخ الخلفا کا انگریزی ترجمہ میرے مطالعہ میں تھا۔ اُس میں ایک مقام پر ایک حدیث قدسی درج تھی جس کا مفہوم یہ تھا کہ ملتِ محمدیہ کی بربادی کا سبب ترکی قوم ہوگی۔ میں تاریخ یا حدیث کا طالب علم نہ تھا جو اس روایت کی جانچ کرتا۔ مگر یہ ایک واقعہ ہے کہ میرے دل میں اُسی وقت سے یہ خیال جاگزیں ہوگیا کہ جمیع ممالک عربیہ کو ایک عربی تاجدار کے اقتدار میں رہنا چاہیے۔ اور یہ امر بطور ایک عقیدہ کے میرے ذہن میں راسخ ہوگیا تھا کہ صرف ایک مستحکم عربی سلطنت ہی ملت محمدیہ کے بقا و تحفظ کا ذریعہ ہوسکتی ہے۔ گذشتہ جنگ نے جب عرب کے تمام اجزا کو ترکی حکومت سے جدا کردیا تو اگرچہ ترکی حکومت کی بربادی کا مجھے حد درجہ غم تھا، مگر ساتھ ہی میرے دل میں وقتاً فوقتاً یہ خیال ضرور پیدا ہوتا تھا کہ عربی حکومت کے قیام کا جو خواب میں عرصہ سے دیکھ رہا ہوں، اُسکی تعبیر اب رونما ہونیوالی ہے۔

اسلام کی عظمت کی طرف سے میرے دل میں ایک لمحہ کے لیے کبھی مایوسی پیدا نہیں ہوئی چنانچہ انھیں اوراق میں سنہ ۲۰ء کے نہایت تیرہ و تار زمانہ میں میں اپنے اس عقیدہ کو نہایت وضاحت و صراحت سے ظاہر کرتا رہا ہوں۔

ان خیالات کی بنا پر شریف حسین کے متعلق جو حالات میں نے سُنے اُنکی وجہ سے بجائے اسکے کہ میری نفرت و ناراضی میں اضافہ ہوتا، میرے دل میں شریف صاحب کی ذات سے اچھی امیدیں پیدا ہونے لگیں۔ اور جب میں مدینۂ منورہ کی زیارت سے مشرف ہوکر واپس آیا اور حج سے فراغت پائی تو میں نے ارادہ کیا کہ میں شریف صاحب سے ملوں۔ حجاج و زائرین کی تکالیف جو میرے مشاہدہ میں آئی تھیں بیان کروں اور اُنکو رفع کرنے پر متوجہ کروں اور ساتھ ہی اُنکے دلی ارادوں کا حتی المقدور پتہ لگاؤں۔ اور اگر واقعۃً وہ ملک عرب میں ایک مستحکم و پائدار حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں تو میں ہندوستان واپس جاکر اہل ہند کو یہ خوشخبری سناؤں کہ جزیرۃ العرب کے متعلق اُن کا جو مطمح نظر ہے اُسکی تکمیل کا سامان شریف حسین کررہے ہیں جسکے بعد مجھے یقین واثق تھا کہ کم سے کم ہماری خلافت کمیٹی کے تعلقات حکومت حجاز کے ساتھ نہایت دوستانہ ہوجائیں گے۔

شریف حسین کے جو حالات مجھے معلوم ہوئے اُنکا اجمالی تذکرہ یہاں نامناسب نہ ہوگا۔ شریف حسین نہایت فطین ہیں اپنے عنفوانِ شباب ہی میں جب سے ہاتھ پاؤں نکالے تو اُس زمانہ کے شریف کو جو اُنکے چچا ہوتے تھے اس اندیشہ سے کہ باد

اسکی وجہ سے کوئی فتنہ اُٹھ کھڑا ہو حسین کو قسطنطنیہ بھیجدیا جہاں وہ بڑی قدر و منزلت سے بطور شاہی مہمان کے رہا۔
اسکی فطانت کا اندازہ صرف اس واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ جس زمانہ میں سلطان عبدالحمید خاں اور نوجوان ترکوں کے درمیان سخت کشاکش ہو رہی تھی تو یہ شخص جہاں ایک طرف سلطان ممدوح کا منظور نظر اور معتمد الیہ تھا وہیں انجمن اتحاد و ترقی کا ایک سرگرم اور با اثر رکن بھی تھا۔ پھر جب قسطنطنیہ سے وہ شریفِ مکہ بنا کر بھیجا جانے لگا تو سلطان عبدالحمید خاں نے جنکی ذہانت اور تدبر کا تمام اسلامی دنیا پر سکہ بیٹھا ہوا ہے اپنی نظر بندی کے مقام سے حکومتِ قسطنطنیہ کے ارباب حل و عقد کے پاس یہ پیام بھیجا کہ تم لوگوں نے حسین کو شریفِ مکہ بنا کر بھیجا تو ہے، مگر تم کو سمجھ لینا چاہیے کہ تم نے صوبجات عرب کو اپنے ہاتھ سے کھو دیا۔ زمانۂ حال کے واقعات سے ہر شخص نتیجہ نکال سکتا ہے کہ سلطان عبدالحمید خاں کا یہ خیال کس قدر صحیح ثابت ہوا۔
مکہ معظمہ میں آنے کے بعد حسین نے ابتداءً ایسی پاکیزہ زندگی بسر کی کہ تمام اہل مکہ پر اُسکی دھاک بندھ گئی۔ اُسکے زہد و ورع کو دیکھ کر لوگ سمجھتے تھے کہ سلف صالحین کے زمانہ کا کوئی شخص اس عہد میں پیدا ہو گیا ہے۔ اُس زمانہ میں مکہ معظمہ میں ایک ترکی گورنر رہا کرتا تھا۔ جب لڑائی چھڑی اور شریف حسین نے انگریزوں سے خفیہ مراسلت شروع کی تو ترکی گورنر کو لوگوں نے اطلاع دی گورنر نے ایکبار جبکہ دونوں مسجد الحرام میں موجود تھے حسین سے کہا کہ آپ انگریزوں سے ساز کر رہے ہیں تو شریف صاحب نے قطعاً اس سے انکار کیا اور اُسکے مزید اطمینان کے لیے ملتزم شریف (در کعبہ) پر کھڑے ہو کر کعبۃ اللہ شریف کی قسم کھائی اور اُسے یقین دلایا کہ حسین ترکی حکومت کا دل سے وفادار ہے، اور یہ جو کچھ اُسکے متعلق کہا جاتا ہے اسکی کچھ اصلیت نہیں، بلکہ محض اُسکے دشمنوں کی افترا پردازی ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد جب انگریزوں سے تمام بخت وپز ہو چکی اور حسین نے اعلانِ بغاوت کا ارادہ کیا تو اُس سے چند روز قبل پھر خبر رسانوں کے اطلاع دینے کی بنا پر ترکی گورنر نے حسین کو حرم شریف ہی میں ٹوکا۔ اِسکی دفعہ حسین نے اپنی معصومیت کا اطمینان دلانے کے لیے خانۂ کعبہ کو کھلوایا اور اندر جا کر ترکوں کے ساتھ وفاداری کا حلف لیا۔ جسکے بعد ترکی گورنر کو حسین کی طرف سے کوئی اندیشہ نہ رہا، اور وہ موسم گرما بسر کرنے کے لیے طائف شریف چلا گیا۔ اور بیخبری میں حسین نے بغاوت کر کے ایک طرف مکہ معظمہ کی مختصر سی ترکی فوج کو اور دوسری طرف طائف شریف میں گورنر اور اسکی فوج کو

گھیر لیا۔ مکہ معظمہ کی ترکی فوج کو جس شقاوت اور سنگدلی سے حسین نے ذبح کرایا ہے اُسکا بیان تو اسقدر دردناک ہے کہ اُن واقعات کو سنکر سخت سے سخت دل والے انسان کے بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ جنگ کے ابتدائی زمانہ کی باتیں ہیں۔ جنگ کے دوران میں اس نے انگریزوں سے بے حساب روپیہ حاصل کیا اور بدوؤں اور اپنے ہواخواہوں کو بے دریغ اشرفیاں دیتا رہا۔ جنگ کے بعد اُس نے حکومت کا نظم و نسق اس طرح کیا کہ ایک متمدن حکومت کے طرز پر جملہ محکہ جاتِ حکومت قائم کیے اور اُن پر اپنے خاص چیلوں کو مقرر کیا۔ اس طریقہ پر ظاہر میں اگرچہ ہر شعبۂ حکومت بجائے خود موجود ہے مگر دراصل کسی کو ذرہ برابر کوئی اختیار نہیں۔ تمام وزراء اور بڑے بڑے عمال صرف نام کے لیے ہیں۔ اُنکی اصلی خدمت صرف حسین کے دربار کی حاضری اور اُسکے ہر حکم کی بجا آوری ہے۔ کام سارا اُس نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔

اسّی سال کے قریب حسین کی عمر ہے۔ مگر جس مستعدی سے وہ کام کرتا ہے ایک نوجوان سے بھی اُسکی توقع نہیں کی جاسکتی۔ نصف شب کے بعد اُٹھتا ہے۔ کبھی تہجد کے وقت طواف کرتے دکھائی دیتا ہے، اور کبھی اول وقت جماعتِ شافعی کے ساتھ نماز میں شریک نظر آتا ہے، کبھی تبدیل لباس کر کے شہر کا گشت لگاتا ہے، صبح کو آٹھ بجے قصر الملوکی میں آتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں شاہی دفتر ہے۔ جملہ وزراء اور ارکینِ سلطنت حاضر رہتے ہیں۔ اور ۸ بجے صبح سے ۸ بجے شب تک حسین یہیں بیٹھکر تمام امور سلطنت انجام دیتا ہے۔ وہ اپنے اخبار القبلہ کا خود ایڈیٹر ہے۔ اخبار پر بس ایڈیٹر کا نام لکھا رہتا ہے وہ محض دنیا کے دکھانے کے لیے ہے ورنہ اُسکی حیثیت ایک محرر یا کاتب سے زیادہ نہیں۔ تمام اخبارات پڑھوا کر خود سنتا ہے اور ہر قسم کے مضامین خود ہی لکھوا دیتا ہے۔

محاصل کی توفیر کے لیے ہر وقت نت نئے طریقے نکالتا رہتا ہے۔ جدہ کے چنگی خانہ کی آمدنی ترکی عہد حکومت میں کبھی ایک لاکھ پاؤنڈ سے زائد نہیں ہوئی اب اسکی بدولت پانچ لاکھ پاؤنڈ سے بڑھ گئی ہے۔ مکہ معظمہ کے اندر پہلے کسی قسم کے محاصل نہ تھے، مگر اب آئے دن نئے نئے ناموں اور حیلوں سے محصول عائد کیے جاتے ہیں۔

شریف نے ایک دوکان کھول رکھی ہے جو شہر بھر سے ارزاں نرخ پر اشیا فروخت کرتی ہے

جسکی وجہ سے ہر وقت دوکان پر ایک میلہ لگا رہتا ہے۔ حتیٰ کہ کوئی شریف انسان جسے اپنی آبرو عزیز ہو وہاں نہیں جا سکتا۔ ارزاں نرخ پر فروخت کرنے کی وجہ سے عوام الناس میں یہ دوکان جہان ت ہر دلعزیز ہے وہاں شہر کے تاجروں کو اس سے سخت نقصان ہے۔ اور پھر اس دوکان کے عاملین کو نہایت وسیع اختیارات دیدیے گئے ہیں کہ جس تاجر کا جو مال جب چاہیں بغیر اُس سے معاملہ کیے ہوئے، بغیر قیمت ادا کیے براہِ راست جدہ کے محصول خانہ سے لے لے، اور پھر سال دو سال میں جب چاہے اور جس شرح سے چاہے اُس مال کی قیمت ادا کر دے۔

ابتدا میں اہل مکہ پر کسی قسم کا جبر نہیں کیا جاتا تھا۔ مگر اب جیسے جیسے زمانہ گذرتا جاتا ہے سختی بڑھتی جاتی ہے۔ جب کسی سے ناراض ہوتا ہے فوراً گبوہ (بندی خانہ) میں ڈالدیتا ہے۔ یہ گبوہ مکانوں کے نیچے تہ خانوں کی صورت میں ہیں، جہاں نہ ہوا کا گذر ہے نہ روشنی کا۔ گبوہ میں بند کرنے کے لیے نہ کسی پر مقدمہ چلایا جاتا ہے نہ کوئی عدالتی کارروائی ہوتی ہے۔ نہ حکومت کی طرف سے قیدی کو خوراک ملتی ہے۔ یا تو اُسکے اعزا و احباب کھانا بھیجیں یا مخیر لوگ ترس کھا کر خوراک کا انتظام کریں۔

پھر جس دوکاندار سے ناخوش ہوے اور مکہ معظمہ میں زیادہ تر دوکاندار ہی ہیں فوراً اُسکی دوکان پر قفل لگوا دیا۔ اب نہ وہ بیچارہ تجارت کر سکتا ہے۔ نہ اپنا مال اُٹھا لیجا سکتا ہے۔ اور پھر یہ بھی کسی کو معلوم نہیں ہوتا کہ قصور کیا ہے اور تعطل کی میعاد کتنی ہے۔

نہر زبیدہ کی صفائی کے لیے چندہ سے جو رقم کثیر فراہم ہوتی ہے اُسکو حسین نے اپنی تجارت میں لگا دیا ہے اور دو تجارتی جہاز خرید لیے ہیں جو ساحل عرب کے مختلف چھوٹے چھوٹے بندرگاہوں کے درمیان مالِ تجارت اور مسافروں کو لاتے لیجاتے ہیں۔

غرضکہ ہر طرح پر باشندگان حجاز کو لوٹ کر حسین اپنا گھر بھر رہا ہے۔ اور جو کام کرنا چاہتا ہے اُسکے کرڈالنے میں اُسے ذرا باک نہیں ہوتا۔ ساتھ ہی اپنا ظاہری تقدس بنائے رہتا ہے، بات بات پر قرآن و حدیث نوک زباں ہے۔ اور جب کوئی بیرونی شخص آتا ہے تو اُس سے خود ہی درخواست کرتا ہے کہ اگر شہر میں کوئی بات خلافِ شریعت دیکھو تو اُس سے مجھے مطلع کرکے داخل حسنات ہو۔ باہر والوں کو اس طرح اپنی چرب زبانی سے اپنا گرویدہ بنا لیتا ہے اور موقع پڑے تو دو چار کو

سزائیں دیکر اپنی نیک نیتی اور خواہش اصلاح کا بھی یقین دلا دیتا ہے۔
بدوؤں کے جتنے بڑے بڑے قبائل ہیں اُنکے سرداروں کو روپیہ دیکر اور شہر میں بظاہر اپنا مقرب مہمان اور حقیقتاً اپنا قیدی بنا کر اپنے قابو میں رکھتا ہے۔ اور تھوڑی سی فوج اور پولیس کے ذریعہ ایسی دھاک بٹھا رکھی ہے کہ کوئی شخص چوں نہیں کر سکتا۔

حجاج پر پہلے کسی قسم کا محصول نہ تھا۔ اس نے بھی بظاہر میں حجاج پر کوئی محصول نہیں باندھا لیکن تمام مطوفین کو اپنے قابو میں کرکے اونٹوں کے متعلق جملہ انتظامات اپنے تحت میں کر لیے ہیں اور اونٹ کے کرایہ میں کثیر اضافہ کر دیا ہے۔ اس طریقہ پر باہر کے آنے والے حجاج سے تقریباً ۱۰ عـہ فی کس حکومت کو مل جاتا ہے۔ اسکے علاوہ اگر کوئی حاجی مرجائے تو اُسکا کل سامان بیت المال میں داخل کرا لیا جاتا ہے۔ اب اگر اُسکا کوئی وارث موجود ہے اور وہ اُس مال کو واپس لینا چاہے تو اول تو یہ کوئی آسان کام نہیں، دوسرے جب اُسکو واپس ملتا ہے تو مختلف رسومات کے نام سے ایک حصہ اُس کا خزانہ سرکاری میں داخل کرا لیا جاتا ہے۔ اور اگر کوئی وارث نہ کھڑا ہوا یا پوری کوشش واپسی کی نہ کرسکا تو پھر سب کا سب مال ہضم ہوجاتا ہے۔
انگریزوں کا بظاہر دوست ہے مگر اُنکو بھی دن رات پریشان رکھتا ہے اور چاہتا ہے کہ اُسکی مرضی کے مطابق چلیں۔ عربی زبان کی تحریر و تقریر دونوں میں اس درجہ کمال حاصل ہے کہ جب اُسکی کوئی تحریر یا تقریر سند کے طور پر پیش کیجاتی ہے تو ہمیشہ اُسکے نئے معنے بتا کر اپنا مطلب پورا کر لیتا ہے۔
ایک سال حجاج کی خدمت کے بہانہ سے انگریزوں نے ایک فوجی اسپتال بھیجا۔ حسین نے جملہ مطوفوں کو بلا کر حکم دے دیا کہ اگر کسی مطوف کا کوئی حاجی اس اسپتال میں جائیگا تو اُسکی جان کی خیر نہیں۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ سرکاری اسپتال خالی پڑا رہا اور دوسرے سال انگریزوں کو اسپتال بھیجنے کی جرأت نہ ہوئی۔
پھر انگریزوں نے اپنا ایک نائب قنصل (کپتان محبب خاں سرحدی) مکہ معظمہ میں رکھنا چاہا۔ ان صاحب نے ہندوستانی حجاج کے معاملات میں مداخلت کرنا چاہی تو ایک طرف تو اُسنے انکے اوپر جاسوسوں کا ایسا سخت پہرہ بٹھایا کہ اہل مکہ میں سے کسی کو ان سے ملنے کی ہمت نہ ہوتی

تھی۔ حرم شریف تک میں لوگ اُن سے چِپٹے چَھلکے رہتے تھے، اور دوسری طرف مطوفین کو اشارہ کر دیا کہ ذرا کسی معاملہ میں یہ دخل دیں اور فوراً انکی خدمت کر دی جائے۔ چند ہی ماہ کے بعد جناب خاں صاحب بہادر کو اپنی آبرو لیکر ہندوستان بھاگ جانے میں ہی اپنی خیریت نظر آئی اور اس طرح مکہ معظمہ کے نائب قنصل یا نمایندۂ حکومت برطانیہ کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہوگیا۔

دربار میں حسین جس وقت بیٹھتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت فاروق اعظمؓ کا دربار ہے۔ دروازہ پر ایک پہرہ دار ضرور کھڑا رہتا ہے مگر وہ صرف نمائش مطوت کے لیے ہے۔ اُسکو کسی کے روکنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ ہر شخص بغیر کسی روک ٹوک کے حسین کے پاس جاسکتا ہے اور حسین سے اپنا مطلب و مدعا بیان کر سکتا ہے۔ دربار کے کمرہ میں بھی سوائے سادگی کے کوئی بات قابل لحاظ نہیں معلوم ہوتی عام شرفائے مکہ کی مجلسوں یا ملاقات کے کمروں کی طرح چاروں طرف یہاں بھی اونچے اونچے کوچ بچھے ہوئے ہیں۔ ایک دریچہ کے پاس حسین اپنے سادہ لباس میں جو عام شرفائے مکہ سے صرف حریر کی عدم موجودگی کی وجہ سے ممتاز ہے بیٹھا رہتا ہے۔ پاس ہی قلمدان رکھا رہتا ہے۔ لوگ آتے رہتے ہیں اور یا سیدی یا سیدی کہکر ہاتھ کو بوسہ دیتے اور سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ علما اور معززین کو حسین اشارہ سے یا اِجلس کہکر کوچوں پر بٹھا دیتا ہے باقی لوگ کھڑے کھڑے جو کچھ کہنا ہوتا ہے کہتے ہیں اور جواب پاکر رخصت ہو جاتے ہیں۔ جب ذرا ملاقاتیوں کا ہجوم کم ہو جاتا ہے تو خدام و پیشکاران دربار کاغذات لاتے ہیں اور حسین اپنے قلم سے سب پر احکام لکھتا ہے۔ صبح سے ظہر تک ملاقاتیوں اور کاغذات دونوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ دربار کے کمرہ کے متصل ایک کمرہ ہے جس میں سے ہو کر لوگ دربار میں آتے ہیں۔ یہیں چند سیہ فام غلام کمر میں سُنہرے روپہلے اور رنگا رنگ جمنی قبضوں اور رنگ برنگ مخملی میانوں کے پیش قبض (خنجر) لگائے اور حریر کے لمبے لمبے جُبّے پہنے ہوئے حاضر رہتے ہیں۔ جب حسین کو ضرورت ہوتی ہے فوراً آہستہ سے تالی بجاتا ہے اور اُن میں سے کوئی ایک اندر آکر حکم سُن لیتا ہے اور فوراً ہی تعمیل ارشاد کے لیے بھاگتا ہے۔

حسین کے دربار میں آنے سے پہلے لوگ اسی کمرہ میں بیٹھ کر حسین کی آمد کا انتظار کرتے ہیں۔ میں جب پہلی مرتبہ گیا تو ہجوم بہت زیادہ تھا۔ ملاقاتوں کا سلسلہ ختم ہی نہیں ہوتا تھا۔ یہ خیال کر کے کہ اس ہجوم میں کوئی اطمینانی ملاقات نہیں ہو سکتی، واپس چلا آیا۔ دوبارہ گیا تو ہجوم میں کمی

تھی، پھر بھی اتنا مجمع تھا کہ جب میں دربار کے کمرہ میں داخل ہوا تو حسین کے سامنے بدوؤں کی ایک ٹولی کی ٹولی کھڑی تھی۔ ایک عہدہ دار کے اشارہ کرنے پر میں ایک کوچ پر جاکر بیٹھ گیا۔ جب سب بدو سامنے سے رخصت ہو گئے تو میں پاس گیا۔ شریف نے اپنے قریب کے ایک کوچ پر بٹھا لیا۔ میں نے ٹوٹی پھوٹی عربی میں کہا کہ میں آپ سے اپنا مدعا بیان کرنے کے لیے تھوڑا مخصوص وقت چاہتا ہوں اور ایک ترجمان ——— فوراً تالی بجی، ایک غلام آیا اور اسکے ہمراہ میں روانہ کیا گیا۔ اُس نے لیجا کر مجھے صدر المطوفین سے ملایا جنھوں نے ایک ترجمان (مطوف) کے ذریعہ پہلے تو مجھ سے دیر تک میری ملاقات کا مقصد دریافت کیا۔ مگر جب میں نے اپنا مقصد بالوضاحت ظاہر نہ کیا تو پھر مجھ کو مشورہ دیا کہ دار القضا میں جاکر عبد اللہ سراج قاضی القضاۃ سے لوں۔ صدر المطوفین

کے انداز و گفتگو سے مجھ کو یہ محسوس ہوا کہ وہ ڈرتے ہیں کہ مجھ کو اپنے مطوف سے کچھ تکلیف پہونچی ہے اور اسکی شکایت حکومت سے کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے اُنکو یقین دلایا کہ میرے تعلقات اپنے مطوف عبد القادر سکندر، اور اُنکے بیٹوں سے بہت اچھے ہیں اور مجھ کو اُنکے متعلق کچھ نہیں کہنا ہے۔ مگر غالباً اُنھوں نے اسکو باور نہیں کیا اور اسلیے مجھ کو ٹالنا چاہا۔ جب بعض احباب سے ذکر آیا تو اُنھوں نے میرے خیال سے اتفاق کیا اور اُنکے مشورہ سے میں فواد خطیب وزیر خارجہ سے ملا اور اُن سے کہا کہ میں شریف صاحب سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ فواد خطیب انگریزی جانتے ہیں اسلیے اُن سے ملاقات میں بہت آسانی ہوئی۔ وہ بہت اخلاق سے ملے۔ میرے کھدر کے لباس کو دیکھ کر اپنی پسندیدگی و مسرت کا اظہار کیا۔ اور ہندوستان کے حالات پر دیر تک گفتگو کرتے رہے اور وعدہ کیا کہ میں آپ کی ملاقات صاحب جلالۃ الملک سے جلد کرا دوں گا۔ مگر اسکے بعد بھی کئی دن تک شریف صاحب سے ملاقات نہ ہو سکی۔ کیونکہ غلاف کعبہ کے ساتھ مصر سے جو قافلہ آتا تھا اُسکی واپسی کے باعث معاملات کسی قدر پیچیدہ ہو رہے تھے اور شریف صاحب بہت مصروف تھے۔ اسی اثناء میں ایک دن کے لیے اُنکو جدہ جانا پڑا۔ میرے لیے یہ موقع اچھا تھا کہ میں اسی بہانے متعدد بار وزارت خارجہ میں گیا اور ہر دفعہ گھنٹہ آدھ گھنٹہ وہاں ٹھہرا۔ اور اس اثنا میں نہ صرف فواد خطیب سے اطمینانی گفتگوئیں ہو سکیں بلکہ متعدد دوسرے ارکین حکومت سے ملنے، اُنکی بات چیت سننے اور آپس کے طور طریقوں کو دیکھنے کا بھی موقع ملا۔

بالآخر کئی دن کے بعد شریف صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ایک ملوف ترجمانی کر رہا تھا۔ معمولی مزاج پرسی اور رسمی باتوں کے بعد جب میں نے اصل مدعا پر گفتگو شروع کی تو مجھے جلد محسوس ہوا کہ جو کچھ میں کہتا ہوں مترجم صاحب اُسکا آٹھواں حصہ بیان کرتے ہیں اور سات حصے غائب کر دیتے ہیں۔ اور خود شریف صاحب میرے ہر ایک جملہ کے جواب میں تقریباً پانچ سات منٹ گفتگو فرماتے ہیں۔ اور اُس میں جیسا کہ مجھ سے دوستوں نے کہا تھا زیادہ حصہ قرآن و حدیث کے حوالوں کا ہوتا ہے۔ میں نے یہ خیال کرکے کہ حجاج کی تکالیف کے متعلق جو کچھ مجھ کو کہنا ہے وہ اس ملوف ترجمان کی معرفت شریف تک نہیں پہونچ سکتا، نصف گھنٹہ کی ملاقات کے بعد یہ کہا کہ بہتر ہوگا کہ جو کچھ اس بارہ میں مجھے کہنا ہے اُسکی تحریری یادداشت میں آپ کو دیدوں اور کوئی ایسا مترجم تلاش کروں جو پوری طرح حق ترجمانی ادا کر سکے۔ شریف صاحب نے اسکو پسند کیا اور کہا کہ پھر جب چاہو آؤ اور جس مترجم کو مناسب سمجھو ساتھ لاؤ۔

(الناظر، جون ۱۹۲۵ء)

حسین شریف مکہ

میں نے اپنے خیالات قلمبند کر کے ایک کرمفرما کے واسطہ سے عربی میں ترجمہ کرالئے اور اُنھیں سے عبد النبی کشمیری کا پتہ حاصل کیا۔ جنکو آیندہ ترجمان بنانا منظور تھا۔ تلاش کر کے عبد النبی سے ملا تو اُنھوں نے کہا کہ اگر حکومت کی طرف سے طلبی ہو تو میں حاضر ہو جاؤنگا ورنہ اندیشہ ہے کہ مجھے نقصان پہونچ جائے گا۔ چنانچہ میں نے فواد خطیب سے مل کر پھر ملاقات کا وقت مقرر کرایا، اور اُنھوں نے میرے سامنے ایک شخص کو ہدایت بھی کردی کہ عبد النبی کشمیری کو ترجمانی کی غرض سے بلا رکھنا۔ میں وقت مقررہ پر پہونچا تو فوراً شریف صاحب کے پاس بٹھا دیا گیا۔ عبد النبی نہیں آئے تھے لہذا اُن کے لیے فواد خطیب نے ایک آدمی روانہ کیا۔ شریف صاحب اسوقت فارغ تھے اور ترجمان کے انتظار میں دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔ جب عبد النبی آئے، تو میں جس کوچ پر بیٹھا تھا شریف صاحب خود اپنے مقام سے اُٹھ کر وہیں میرے پاس آکر بیٹھ گئے۔ اور ایک کرسی منگا کر عبد النبی کو قریب ہی بٹھا لیا۔ مگر جب میں نے اپنی یادداشت دینا چاہی تو شریف صاحب نے مجھ سے کہا کہ جو شکایت ہو زبانی کہو تاکہ اُسکا تدارک کیا جائے۔ میں نے ہر چند چاہا کہ شریف صاحب کی سمجھ میں یہ بات آ جائے کہ میں اپنی کوئی ذاتی شکایت نہیں بیان کرنا چاہتا بلکہ عام طور پر حجاج کو جو تکالیف ہیں اُن کو قلمبند کر دیا ہے تاکہ مناسب توجہ سے رفع ہو جائیں۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ شخص جسکے تدبر و دانشمندی کی دھاک بندھی ہوئی تھی، تھوڑی دیر کے لیے لایعقل محض ہو گیا تھا کہ اُسکی سمجھ میں اتنی سی بات نہیں آئی۔ کچھ دیر تک ردو قدح کے بعد ناچار میں نے عنان گفتگو دوسرے مباحث کی طرف پھیری اور خود حکومتِ ہاشمیہ کے حالات اور ارادوں کے متعلق سوالات شروع کر دیئے۔ ...ہر گیا تھا، شریف صاحب کے سمند زبان و عقل میں سمندر کی سی روانی پیدا ہو گئی۔ میرے ایک ...

جملہ کے جواب میں وہ مسلسل دیر تک تقریر کرتے رہتے۔ اس اثنا میں میرٹھ کے شیخ علاء الدین کو لیکر
فواد خطیب بھی آ گئے۔ شریف صاحب نے اُن سے کچھ باتیں کیں، کچھ مجھ سے۔ جب دیر بہت
ہوئی تو فواد خطیب نے مجھے اشارہ کیا اور میں نے اُٹھنا چاہا، مگر شریف صاحب نے سلسلۂ گفتگو شروع
کر دیا اور مجھ کو رُکنا پڑا۔ یہاں تک کہ فواد خطیب نے تنگ آ کر شیخ علاء الدین کو توجہ دلائی
اور اُنھوں نے مجھ سے اُردو میں کہا کہ بادشاہوں کے یہاں اتنی دیر نہیں بیٹھتے۔ میں نے پھر
اُٹھنا چاہا مگر شریف صاحب نے پھر سلسلۂ سخن شروع کر دیا اور مجھے روکا۔ فواد خطیب اور علاء الدین
تو رخصت ہو گئے مگر ہماری گفتگو کا سلسلہ ختم نہ ہوا تا آنکہ اثنائے گفتگو میں ایک موقع پر میری زبان
سے یہ جملہ نکل گیا کہ "آپ عالم الغیب تو نہیں کہ جو کچھ ہونا ہو اُس سب کا علم آپ کو ضرور ہو جائے۔ مترجم
بیچارہ تھر تھرا کر گفتگو کرتا تھا اور جگہ جگہ جب شریف صاحب رعایا کے ساتھ اپنے حسنِ سلوک اور
حجاج کی خدماتِ عظیمہ کا ذکر کرتے اور اُس سے تصدیق کرنا چاہتے تو وہ غریب دیر تک اُنکی تائید
کرتا رہتا، مگر جیسے ہی میری زبان سے یہ جملہ نکلا اور اُس نے رُک رُک کر اپنے الفاظ میں ادا
کیا، شریف صاحب کا رنگ رخ متغیر ہو گیا۔ غصہ سے مُنہ تمتما اُٹھا اور کھڑے ہو گئے۔ اُن کے
کھڑے ہو جانے کی وجہ سے میں اور عبد النبی بھی کھڑے ہو گئے۔ کھڑے ہی کھڑے شریف صاحب نے
نہایت غصہ کی حالت میں اور کسی قدر بلند آواز سے کہا "میں اخبار نویسوں سے نہیں ڈرتا، آپ کو
اختیار ہے جو چاہیے لکھیے۔ میں کسی کی پروا نہیں کرتا۔" میں نے کوئی جملہ ایسا نہ کہا تھا جس سے
یہ سمجھتا کہ یہ میرے تہدید آمیز فقرہ کا جواب ہے۔ اسلیے یہ خیال کر کے کہ غصہ نے شریف صاحب کی
عقل میں فتور پیدا کر دیا ہے، مناسب سمجھا کہ ملاقات ختم کر دی جائے۔ اور بغیر ان باتوں کا کچھ
جواب دیے فوراً ہی یہ ذکر چھیڑ دیا کہ میرے جانے کا وقت قریب ہے، جہاز آنے والا ہے ٹکٹ کا انتظام
کر لیا گیا ہے لہذا ایک اونٹ کا حکم دیدیا جائے۔ اس ذکر سے شریف صاحب کا مزاج کسی قدر اعتدال
پر آ گیا اور اُنھوں نے عبد النبی سے کہا کہ اِنکو یقین دلا دو کہ جیسے ہی جہاز بندرگاہ جدہ میں
لنگر انداز ہو گا مجھے اطلاع مل جائے گی اور میں سواری کا بندوبست کر دوں گا۔ اور میرے مزید
اطمینان یا اپنے خلوص کا اظہار کرنے کے لیے یہ بھی اضافہ کیا کہ ان کا جہاز ہرگز نہ چھوٹنے پائے گا
میں اسکی پوری ذمہ داری لیتا ہوں۔

ملاقات ختم کر کے جب میں نیچے کے کمرہ میں فواد خطیب کے پاس آیا تو اُنھوں نے بہت شکایت کی کہ آپ نے آج سارا وقت لے لیا جس سے ہمارے تمام ضروری کام رہ گئے۔ میں نے اپنی معذوری ظاہر کر کے اُن سے شکایت کی کہ میری روانگی کے لیے اونٹ کا انتظام تو شریف صاحب نے کیا ہی نہیں۔ فواد خطیب نے وعدہ کیا کہ میں خود صاحب الجلالۃ الہاشمیہ سے اس اس بارے میں گفتگو کر کے انتظام کرادوں گا۔

دوسرے دن جب فواد خطیب سے ملا تو اُنھوں نے کہا کہ میرے ذکر کرنے سے پیشتر ہی صاحب الجلالۃ الہاشمیہ نے خود آپ کے قصد روانگی کا حال بیان کیا، اور مجھ سے فرمایا ہے کہ اگر وقت تنگ ہو گا تو میں اپنا موٹر دیدوں گا وہ اُس میں بیٹھ کر دو گھنٹے میں جدہ پہونچ سکتے ہیں۔ میں نے فواد خطیب سے کہا کہ میں ایک غریب آدمی ہوں موٹر کی سواری کی حیثیت اور عادت نہیں۔ اسکے علاوہ میرے ساتھ وزنی سامان مثل آب زمزم وغیرہ کے ہے۔ بغیر اونٹ کے کام نہیں چلیگا۔ ورنہ ممکن تھا کہ جس طرح میں آیا تھا اُسی طرح ایک رات میں گدھے کی سواری پر واپس چلا جاتا۔ اور اسکے لیے حکومت کی اجازت بھی نہ درکار ہوتی۔ فواد خطیب نے اطمینان دلایا کہ اونٹ ملجائیگا جب جہاز جدہ پہونچ گیا تو میں نے پھر فواد خطیب اور شریف صاحب سے مل کر اونٹ کے لیے کہا، مگر دونوں صاحبوں نے اپنا وعدۂ سابقہ بھلا دیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ وہ جہاز مجھے نہ مل سکا۔

ایک دوست سے جب موٹر کے وعدہ کا ذکر کیا گیا تو اُنھوں نے ازراہ محبت مجھے مشورہ دیا کہ میں فوراً چپکے سے جدہ چلا جاؤں۔ کیونکہ شریف بڑا ہی سفاک و ناپاک ہے وہ اپنے موٹر پر سوار کرا کے یہاں سے بھیجے گا اور راستہ میں مروا ڈالے گا۔ میں نے اُن سے عرض کیا کہ اس سے بڑھ کر میری کیا خوش قسمتی ہوگی کہ سرزمین مقدسۂ حجاز پر درجۂ شہادت حاصل ہو۔ لیکن اگر وقت نہیں آیا ہے تو شریف کی شرارت سے انشاءاللہ محفوظ رہوں گا۔ میرے دوست کا اندیشہ غلط ثابت ہوا، اور شریف صاحب نے ایک حقیر شخص پر دستِ ستم دراز کرنے کا ارادہ ہی نہ کیا۔

شریف صاحب سے جو بات چیت ہوئی، اور حج کے بعد مکہ معظمہ و جدہ میں تقریباً چھ ہفتے کے قیام میں جو حالات میرے علم میں آئے اُن سب نے مجھ کو یقین دلا دیا کہ میرے اُن دوستوں کی رائے جو شریف سے حد درجہ بیزار تھے، حرف بحرف صحیح ہے۔ اور جو کچھ حسن ظن بعض دوسرے احباب کی رایوں کو سنکر میرے دل میں پیدا ہوا تھا وہ یکسر رخصت ہو گیا۔

شریف حسین کی گفتگو کا ماحصل یہ تھا کہ ترکی حکومت کے ارکانِ حل وعقد چونکہ لامذہب ہیں اس لیے وہ کسی مسلمان کی ہمدردی و اعانت کے مستحق نہ تھے اور ہندوستان کے مسلمانوں نے ترکوں کی امداد میں جو روپیہ صرف کیا ہے، یہی نہیں کہ وہ قطعاً رائیگاں گیا، بلکہ اُنھیں کسی قسم کے ثواب کے بجائے خدا کے یہاں روزِ حشر میں اسکی جوابدہی کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

مسلمانانِ ہند ترکوں کی تو باوجود لامذہب ہونے کے اعانت اور امداد کرتے ہیں مگر حجازیوں کی کچھ مدد نہیں کرتے جو دنیا میں سب سے بہتر مسلمان ہیں اور جنکی خدمت و اعانت کا اُنکو ثواب ملنا یقینی ہے۔

حجاز میں شریعت اسلامیہ کا پورا احترام کیا جاتا ہے۔ ہم لوگ حجاج کو خدا کا مہمانِ عزیز سمجھتے، اُن کو اپنے سر آنکھوں پر بٹھاتے اور اُنکی خدمت کو اپنے لیے باعثِ سعادت جانتے ہیں۔

مجھے خدا کے سوا کسی کا نہ ڈر ہے نہ بھروسہ۔ میں نہ انگریزوں سے ڈرتا ہوں نہ اہلِ ہند کی مخالفت کی پروا کرتا ہوں۔ بلکہ جس بات کو حق سمجھتا ہوں اُسی پر قائم ہوں۔

میرے پاس ظاہری قوت اگرچہ نہیں ہے مگر جس خدا نے اصحاب فیل کے مقابلہ میں "ابابیلوں" کو بھیجا تھا وہ میرا مددگار ہے اور اُسی کی مدد میری قوت ہے۔

میں اپنے ملک میں عدل و انصاف کرتا ہوں، غریبوں اور لاچاروں کی مدد کرتا ہوں، اور بڑوں کو چھوٹوں پر ظلم نہیں کرنے دیتا اور ہر وقت شریعتِ اسلامیہ کے احکام کی تعمیل و ترویج میں کوشش کرتا رہتا ہوں۔ خدا اور رسول کے احکام کے خلاف میں اُن ترکوں سے کیسے اتحاد کر سکتا ہوں جنکی حکومت میں عورتوں کا دخل ہے اور جو مذہب کو چھوڑ چکے ہیں۔ (اس موقع پر شریف نے اپنے وزیر اعظم قاضی القضاۃ عبداللہ سراج کے پاس سے انگورہ کی مجلس ملیہ کا ایک عکسی فوٹو منگا کر مجھے اُن عورتوں کی تصویریں دکھائیں جو مجلس انگورہ کی رکن اور حکومت انگورہ میں فرائض عہدہ پر ممتاز ہیں) اور مجھ سے ہنس کر کہا کہ آپ ان لوگوں سے اتحاد کرنے کی جو دعوت دیتے ہیں میں اُسکو کیونکر قبول کر سکتا ہوں؟

میں نے خدا کے فضل سے اپنے ملک کو ترکوں کے ظالمانہ پنجہ سے نکال لیا ہے اور میں اُسکی آزادی کو برقرار رکھنے کے لیے اپنی جان تک قربان کر دوں گا۔ حسین کی جان خدا، اُسکے رسول اور اس ملک کے لیے وقف ہے۔

آپ لوگوں کو اگر اسلام سے محبت اور خدا کا خوف ہے تو آپ کو چاہیے کہ حجاز کی خدمت کریں اور اپنے روپے سے یہاں کے لوگوں کی غریبی اور پریشانی کو رفع کریں۔ میں نے سنا ہے کہ آپ کے بعض قومی لیڈر یہاں آنے کا ارادہ رکھتے ہیں، میں اُنکے لیے چشم براہ ہوں۔ وہ آئیں اور دیکھیں کہ حسین اسلام اور مسلمانوں کی کیسی خدمت کرتا ہے۔

حجاج کے متعلق میں نے تمام انتظامات اپنے ہاتھ میں رکھے ہیں۔ ذرا ذرا سی بات کی مجھ کو خبر ہوتی رہتی ہے۔ اور میں ہر چھوٹی سی چھوٹی بے عنوانی کا تدارک کرتا رہتا ہوں۔ آپ کو اگر کچھ تکلیف ہوئی ہو یا کسی سے کچھ شکایت ہو تو مجھ سے کہیے اور اُس شخص کو پیش کیجیے، میں اُسکو سزا دوں گا۔

میں نے سنا ہے کہ کھنڈوانی (بمبئی کے ایک تاجر جو جدہ اور مکہ معظمہ کے درمیان موٹر رائج کرنا چاہتے تھے اور جنکو شریف صاحب کی عنایت سے بہت نقصان کے بعد اس خیال سے دستبردار ہونا پڑا) نے ہندوستان میں لوگوں سے کہا ہے کہ میں کافر ہوں، دائرۂ اسلام سے خارج ہوں، وہ جھوٹا ہے بے ایمان ہے، دغاباز ہے اور خباثت سے اُسکا نفس لبریز ہے (شریف حسین کا جوش و خروش اور طلاقتِ لسانی کہاں سے لاؤں جو اُنکے اس حصہ تقریر کو بیان کرسکوں) شریف صاحب نے جو باتیں خود نہیں کہیں وہ فواد خطیب نے مختلف صحبتوں میں ظاہر کیں۔ جس سے مجھپر روشن ہو گیا کہ وفد خلافت کے لیے وہ کیوں چشم براہ ہیں۔ یہ سنکر کہ اہل ہند نے تیس لاکھ روپیہ ترکوں کو بھیجا، شریف حسین کے مُنہ میں پانی بھر آیا اور اس نے خیال کیا کہ اہل ہند کو بیوقوف بنا کر کسی صورت سے روپیہ حاصل کرنا چاہیے۔ چنانچہ فواد خطیب نے ایک دن مجھ سے یہ بھی کہا کہ ہمارے پاس کافی فوج اور اعلیٰ درجہ کے سردار جمع ہیں مگر روپیہ کی کمی کی وجہ سے ہم کچھ نہیں کرسکتے، اگر اہل ہند ہمکو دس ہزار پاونڈ ماہوار ہم پہونچاتے رہیں جس سے کافی سامان حرب مہیا کیا جاسکے تو ہم تھوڑے ہی دنوں میں شام کو فرانسیسیوں سے اور عراق و فلسطین کو انگریزوں سے خالی کرالیں اور سارے عرب کو ایک متحد حکومت کے تحت لے آئیں۔ اس قسم کے چکموں سے شریف حسین اور اُنکے حواریوں کا خیال تھا کہ مسلمانانِ ہند کو لوٹنے کا خوب موقع ملے گا۔

شریف حسین نے اگرچہ پوری احتیاط برتی مگر فواد خطیب نے کبھی اس بات کے اظہار میں کوتاہی نہ کی کہ ہم انگریزوں سے دلی نفرت رکھتے ہیں اور ہر ممکن طریقہ پر اُنکو زک دیکر تمام عرب کو

خالی کرانا چاہتے ہیں۔

فواد خطیب، مصر میں تاریخ کے معلم رہ چکے ہیں، اسلیے تاریخی حوالوں سے اُنکی گفتگو لبریز رہتی تھی۔ اور اُنھوں نے مختلف تاریخی شہادتوں سے مجھے یہ باور کرانا چاہا کہ ترکوں نے تمام عربی حکومتوں کو برباد کیا۔ اور کبھی اتحاد اسلام کی پروا نہ کی۔ بلکہ ہمیشہ اپنے ذاتی مفاد و ترقی کو پیش نظر رکھا اور اس بنا پر ترکوں اور عربوں کے درمیان کبھی اتحاد نہیں ہو سکتا۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ عربوں کی ایک مستحکم حکومت جب قائم ہو جائے تو ترکی حکومت کے ساتھ دوستانہ رابطہ قائم کرلیا جائے۔

میرے اس سوال کے جواب میں کہ عرب کی مختلف چھوٹی چھوٹی حکومتوں کے اتحاد باہمی کی کیا صورت ہوگی؟ فواد خطیب نے کہا کہ جس وقت عراق، فلسطین اور شام ملک الحجاز کے قبضہ میں آجائیں گے اُسوقت بقیہ چھوٹی چھوٹی ریاستیں بھی ہمارے تحت میں رہنا قبول کرلیں گی اور نہ قبول کرینگی تو ہم اُنکو اپنی قوت سے رام کرلیں گے۔ شریف حسین اور اُنکے وزیر خارجہ نے جو کچھ کہا تھا اُسکی صداقت پر اگرچہ ایک لمحہ کے لیے مجھے اعتماد نہیں ہوا اور میں برابر سمجھتا رہا کہ یہ سب شاعری ہے۔ مگر زیادہ مدت نہ گزرنے پائی کہ اُن کا کذب عالم آشکارا ہوگیا۔ سلطان نجد کی چھوٹی سی ریاست کے مقابلہ میں اُنکے سپاہی اور ماہران فن حرب جنکی تعریف میں خطیب صاحب نے اپنی ساری خطابت صرف کردی تھی ایک مورچہ پر بھی نہ ٹھہر سکے۔ فرانس اور برطانیہ کا مقابلہ تو کیا خاک کرتے۔

دراصل شریف حسین نے اس راز کو سمجھ لیا تھا کہ برطانیہ یا فرانس کوئی براہ راست حجاز پر حملہ آور نہ ہوں گے۔ اسلیے وہ اپنی انتہائی کمزوری کے باوجود ان حکومتوں کے مقابلہ میں اپنے تئیں ایک حد تک محفوظ سمجھتا تھا۔ اور بعض مواقع پر دلیر اور اُنکے قابو سے باہر ہو جاتا تھا۔

اسی سال حج کے ختم ہونے پر ایک واقعہ پیش آیا۔ شام کا ایک تاجر حجاج کو جدہ سے عراق لیجانے کے لیے دو جہاز لے کر آیا اور دوسری کمپنیوں کے مقابلہ میں کم کرایہ کا اعلان کرکے اُس نے اپنے دونوں جہازوں کو بھر لیا۔ شریف کی طرف سے جو صاحب جدہ کے قائم مقام یا گورنر ہیں وہی ٹرنر مارسین اور نمازی کمپنیوں کے ایجنٹ ہیں۔ اُن کا اس میں خسارہ تھا لہذا اُنھوں نے شریف صاحب کو ٹیلیفون پر اطلاع دی اور اس معاملہ میں اعانت چاہی۔ شریف صاحب فوراً موٹر پر جدہ پہونچے اور کشتی پر سوار ہو کر اُن جہازوں پر گئے۔ اور تمام مسافروں کو جہازوں پرسے اُتروا دیا۔ اور کپتان کو بھی سخت سست کہا۔ مگر اس نے کچھ پروا نہ کی اور ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

اسکے بعد ساحل پر واپس آکر حسین نے اُس تاجر کو گرفتار کرایا اور حراست میں لے لیا۔ جب فرانسیسی قنصل کو اس واقعہ کی اطلاع پہونچی تو اُس نے برطانوی قنصل کو درمیان میں ڈالا۔ برطانوی قنصل نے شریف صاحب کو بہت سمجھایا اور ڈرایا کہ آپ اپنے لیے کانٹے بو رہے ہیں فرانس سے اُلجھنا اچھا نہیں۔ تو حسین نے بیباکانہ جواب دیا کہ حسبی اللہ ونعم الوکیل۔ اور بڑی گفت و شنید کے بعد اُس تاجر کو رہا کیا۔ مگر اُسے اپنے جہاز خالی واپس لیجانا پڑے۔ اسی طرح بے ٹکٹ والے ہندوستانیوں کی جب کثیر تعداد جدہ میں جمع ہوگئی تو اُس نے جہازی کمپنیوں کو مجبور کیا کہ دس فیصدی بے ٹکٹ والوں کو مفت لیجائیں۔ کمپنیوں نے انکار کیا تو اُسنے فوراً دھمکی دی کہ ہم اپنے بندرگاہوں میں تمہارے جہازوں کا داخلہ بند کردیں گے۔ آخر کمپنی والوں نے برطانوی قنصل سے اعانت طلب کی اور حکومت ہند کو مجبوراً بین الاقوامی قانون جہازرانی کے علی الرغم کمپنیوں کو اجازت دینا پڑی کہ جتنے مسافروں کو چڑھانے کی اُنکو اجازت ہے اُتنے تو ٹکٹ والے چڑھائیں اور اُنکے علاوہ دس فیصدی کے حساب سے بے ٹکٹ والے مسافروں کو سوار کریں۔

شریف حسین نے جو باتیں کہیں اور جس قدر دعاوی کیے اگر واقعی حالات سے اُن کی تصدیق ہو سکتی تو یقیناً شریف کے متعلق بالکل دوسری ہی رائے کا اظہار ممکن ہوتا۔ مگر افسوس ہے کہ شریف کا قول و عمل بالکل متضاد تھا۔

سب سے پہلے شریف کی مذہبیت اور اسلامیت کو دیکھا جائے۔ اُسکا راتوں کو اُٹھکر کعبہ شریف کے گرد طواف کرنا، اول وقت میں نماز فجر ادا کرنا، خلاف شرع لباس اور سامان آرائش سے احتراز کرنا اور ترکوں کی لامذہبیت پر اعتراض کرنا اگر مذہبیت کی علامت ہے تو کیا ترکی گورنر کے سامنے حرم محترم میں خلیفہ کی وفاداری کے حلف لیکر پھر خلیفہ سے بغاوت کرنا، ترکوں کو بلد الامین کے اندر اور مسجد الحرام میں ذبح کرانا، مسجد الحرام کے حجروں پر جنگی زمین مسلمہ طور پر حرم محترم میں داخل ہے مالکانہ قبضہ و تصرف کرنا، اُنکے بیع و شرا اور اُنکے کرایہ پر چلانے کو جائز رکھنا، ملک الحجاز ہونے کے باوجود، اپنے اونٹ اور مکانات کو کرایہ پر چلانا، تجارتی کاروبار کرنا، نہر زبیدہ کے چندہ کو ذاتی کاروبار میں لگانا، غیر مسلموں کو مکہ معظمہ اور حرم محترم میں داخل کرنا، (برطانوی اسپتال کے عملہ کو سیر کی غرض سے مکہ معظمہ آنے کی اجازت دیگئی تھی) اور عراق، فلسطین و شام کو غیر مسلموں کے اقتدار میں دیدینا وغیرہ بھی مذہبیت و اسلامیت کی نشانیاں کہی جا سکتی ہیں؟

اب ملک عرب سے محبت وہمدردی کے دعاوی کو دیکھنا چاہیے ۔ عرب کو ترکوں کی غلامی سے آزاد کر کے ایک عرب بادشاہت قائم کرنا یقیناً حب وطن اور قومی دردمندی کہی جا سکتی ہے لیکن بادشاہ وقت کا غریب بدوؤں کی واحد تجارت یعنی حجاج کے اونٹوں کے کرایہ میں سے نصف سے زائد (چودہ میں سے نوگنی) بطور حق حکومت لے لینا (جنگی کے محصول میں بچاس لاکھ سے کم کے بجائے پانچ لاکھ پاؤنڈ) اضافہ کرنا، نئے محصول جاری کرنا، شہر کے دوکانداروں کو شاہی تجارت کے مقابلہ کی زد میں لا کر تباہ کرنا، سیکڑوں برس کے رائج الوقت سکوں کو یکقلم منسوخ کر دینا اور اُن کا بدل نہ دینا، ایک پیسہ سے چھوٹے تانبہ کے سکہ کو چاندی کی دوانی کے مساوی قیمت پر چلانا، کیا یہ سب باتیں بھی وطن اور اہل وطن سے ہمدردی و دلسوزی کا نتیجہ ہیں؟

اس سے بھی بڑھیے اور رعایا کے تحفظ حقوق، اور اُس کے ساتھ عدل وانصاف کے دعاوی کو دیکھیے ۔ بے شبہ عدالتوں میں باقاعدہ مقدمات فیصل ہونا، چور کو قطع ید کی نہیں تو تازیانہ کی سزا، شہر میں اور جدہ اور مکہ کی درمیانی شاہراہ پر قیام امن اور عام ملکی نظم ونسق سے ایک حد تک رعایا کے حقوق کا تحفظ بھی ہوتا ہے اور اُنکے ساتھ عدل وانصاف بھی کیا جاتا ہے۔ پر کیا دوکانوں میں بے سبب قفل لگوا دینا، بغیر کسی عدالتی کارروائی کے محض شاہی ناخوشی کے باعث لوگوں کو حبوہ (قید خانہ) میں ڈال دینا، تاجروں اور دوکانداروں کا مال بغیر قیمت دیے اور معاملہ کیے اُٹھا لینا اور صرف کر ڈالنا، لوگوں سے اُنکی مرضی کے مطابق نہیں بلکہ حسب تشخیص خود چندہ وصول کرنا (جیسا کہ مسجد الاقصیٰ کی مرمت کے لیے ہماری موجودگی میں واقع ہوا) چندہ دینے میں عذر کرنے والوں کو ملک سے اخراج کی دھمکی (یہ بھی ہماری موجودگی کا واقعہ ہے) سکہ کی تبدیلی کے احکام سے ناراضی کی پاداش میں معززین کو تازیانوں سے پٹوانا اور اُن سے سڑکوں پر ذلیل کام لینا وغیرہ بھی تحفظ حقوق اور عدل وانصاف میں داخل ہے؟

یہ بھی نہ سہی زائرین وحجاج کی خدمت کی سعادت تو حاصل تھی ۔ اس سے انکار کرنا انصاف اور صداقت کا خون کرنا ہے کہ زمانۂ سابق کے مقابلہ میں حاجیوں کے متعلق جو انتظامات شریف حسین نے کیے اُن میں بہت کچھ تنظیم وباقاعدگی تھی مگر کیا حجاج کی جیب پر سوا سو سے زائد گنی بار ڈالدینا، محض قرنطینہ کی فیس کو مبنی بر حق قرار دینے کے لیے انھیں ایک شبانہ روز تک ایک ایسے جزیرہ میں مقید رکھنا جہاں نہ بارش اور دھوپ سے پناہ ملنے کے لیے کافی مکانات ہوں،

(الناظر، جولائی ۱۹۲۵ء)

مقدس ڈاکو

(۱)

مولانا محمد علی صاحب نے اپنے اخبار ہمدرد میں جسکی عنانِ ادارت اب ملا بھی اُن ہی کے ہاتھ میں ہے خواجہ حسن نظامی دہلوی، خواہرزادہ حضرت محبوب الٰہیؒ، و فرزند دلبند حضرت مولا علی کرم اللہ وجہہ و نبیسہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و نبیرۂ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کو حال ہی میں یہ نہایت ہی معنی خیز لقب عطا فرمایا ہے۔

اگست سنہ ۱۸ء میں جب مولانا ظفر علیخاں صاحب دوبارہ حیدرآباد میں بلائے گئے اور حضور نظام کے لطف و اکرام سے سرفراز ہوئے، تو جن لوگوں کو اُن سے اختلاف تھا، یا یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ جو لوگ اُن کو اس منزلت سے گرانا چاہتے تھے، اُنھوں نے حکومت ہند کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس سازش میں حیدرآباد کے کون کون لوگ شریک تھے، اس پر بحث کرنا یہاں مقصود نہیں ہے۔ البتہ دو اشخاص کے کارنامے اسوقت پبلک کے سامنے ہیں۔ شیخ ضیاء الحق صاحب ایڈیٹر نے جنکو خواجہ صاحب نے اب اپنے تبلیغی اخبار منادی میں "مہذب ڈاکو" کا لقب دیا ہے اور جنکی پمفلٹ بازی کبھی خاص شہرت رکھتی تھی خواجہ صاحب کو جو غالباً اُنکے پرانے رفیق کار تھے، اپنے خاص ذرائع معلومات کی بنا پر یہ اطلاع بہم پہونچائی کہ ظفر علیخاں صاحب حضور نظام کو پان اسلامزم (ہمدردیِ اسلام) کا سبق پڑھا رہے ہیں، اور خواجہ صاحب نے چیف کمشنر دہلی کو جاکر باضابطہ اس حادثۂ عظیم کی خبر پہونچائی۔ چیف کمشنر صاحب نے حکومتِ پنجاب اور حکومت ہند کو اطلاع دی اور نتیجہ یہ نکلا کہ چند روز میں مولوی ظفر علیخاں صاحب کو مع اُنکے صاحبزادہ عزیزی اختر علیخاں کے حیدرآباد چھوڑنا پڑا۔ اور حضور نظام کے متعلق حکومتِ ہند کا جو رویہ آج بتایا جاتا ہے، اگر اس میں کوئی واقعیت ہے تو ایک انگریزی اخبار کے

مطابق وہ پان اسلامزم بھی انکی فہرست الزامات میں داخل ہے جس کا سبق مہذب اور مقدس ڈاکوؤں کی شہادتوں کے بموجب ظفر علی خاں صاحب نے انکو پڑھایا تھا۔

خواجہ حسن نظامی صاحب سے ہمیں پہلی بار سنہ ۱۹۰۳ء میں شناسائی حاصل کرنے کا موقع ملا اُسوقت تک خواجہ صاحب صرف ابن آدم تھے، خواہرزادہ، فرزند دلبند، نبیرہ وغیرہ کی خصوصیات کا اضافہ بعد میں ہوا ہے۔

الناظر کے اجراء کے بعد نظام المشائخ کے مدیر اعلیٰ اور حلقہ المشائخ کے بانی کی حیثیت میں جب خواجہ صاحب نمودار ہوئے تو فروری کے الناظر میں نظرے خوش گذرے، کے تحت حسب ذیل خیالات کا اظہار کیا گیا :-

"لیکن باوجود اُس حسن عقیدت کے (صوفیائے کرام اور اُن کے روحانی مشن کے ساتھ، نہ کہ خواہرزادہ حضرت محبوب الہیؒ کے ساتھ) ہم نظام المشائخ کے مدیر اعلیٰ کی روش کو اُس وقعت سے نہیں دیکھتے جسکے وہ غلطی سے مستحق بتائے جاتے ہیں اور جسکی وہ بحالت موجودہ اُمید کر سکتے ہیں

- - - - - - - - - -

ایک ایسے زمانہ میں جبکہ تار اور ڈاک کی بدولت رسل و رسائل اس قدر آسان نہ تھے عمدہ پختہ سڑکوں، تیز رَو ریلوں اور دخانی جہازوں کی وجہ سے نقل و حرکت کے ذرائع اس درجہ سہل الحصول نہ تھے اور دنیا کی تین چوتھائی آبادی حالانکہ اُسوقت یقیناً مشرب صوفیا سے نا بلد محض تھی، صوفیائے کرام کی باطنی و اشراقی قوتیں دنیائے اسلام میں نوربیزی و ضیا گستری اور خیالات باطلہ و عقائد ناقصہ کی اصلاح و درستی کرنے سے عاری نہ تھیں، لیکن مقام تعجب ہے کہ آج ان آسانیوں کے باوجود اور فرقہ اہل باطن کے خود ساختہ نائبوں کے دعوے کے بموجب دنیا کی آبادی میں تین چوتھائی حصہ صوفی مشرب لوگوں کا ہوتے ہوئے بھی محض ابلہ فریبی اور مغربی تقلید کے خیال سے علم تصوف کی درسگاہیں قائم کرنے اور صوفیوں کی اصلاح کرنے اور اگر سارے عالم کو نہیں تو تمام مشرقی ممالک کے مسلمانوں کو مشرب صوفیانہ کی دعوت دینے اور انکو ایک محیط جہالت و توہم میں غرق کرنے کی کوشش میں ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگایا جاتا ہے اور زمانہ حال کی تمام علمی تمدنی

اور سیاسی ایجادات اس غایت تظلم و تعدی کے لیے صرف ہو رہی ہیں۔
خواجہ صاحب کے کارخانۂ تجارت کے بارے میں سطور بالا لکھنے کے بعد اسی سلسلہ میں مولانا محمد علی سے یوں شکوہ کیا گیا تھا:-

"قوم کے وہ برگزیدہ نفوس جو اپنی فطری سعادت اور ملکوتی نقاہت کے باعث اس قسم کی نیرنگیوں اور بازیگریوں کی اصلیت سے بیخبر رہتے ہیں انکا تو ذکر نہیں، لیکن افسوس معلوم ہوتا ہے ان حضرات پر جو اپنی عالی دماغی و روشن ضمیری سے ان شعبدوں اور ڈھکوسلوں کے پیچ در پیچ اسرار سے واقفیت رکھتے اور علمی تجربوں اور چشم دید واقعات کے بدولت اُن کی حالت و حیثیت کا صحیح اندازہ کرنے کے باوجود محض ہر دلعزیزی قائم رکھنے کی خواہش یا اخلاقی جرأت کے فقدان سے واقعات کے چہرے پر وہ اُٹھانے اور حقیقتِ راز کا افسانہ سنانے کی ہمت نہیں رکھتے۔

ہمعصر کامریڈ نے اپنی ۱۳- جنوری کی اشاعت میں ایک دعوے باطلہ کی تردید کرتے ہوئے اس قسم کے لوگوں کے ساتھ جو سلوک کیا ہے اُس سے ہمیں اتفاق کلی نہیں۔ ہمارے خیال میں ایسے موقعوں پر بزرگان ملت کا سکوت کرنا یا "دہن سگ بہ لقمہ دوختہ بہ" کی قدیم ہدایت پر کاربند ہونا حالات موجودہ کے لحاظ سے کبھی مناسب نہیں۔ خصوصاً اس لیے کہ آجکل کے ذہین، طباع اور پڑھے لکھے عیار "الخاموشی نیم رضا" کا مفہوم خوب سمجھتے ہیں اور بڑے ناموں کی پرستش کرنے والوں کو اس طریقہ پر فوائد بیجا حاصل کرنے میں جو ید طولیٰ حاصل ہے اُس سے ملک و قوم کو سخت خمیازہ بھگتنا پڑا ہے اور پڑے گا۔"

ایک سال بعد جب خواجہ صاحب نے میرٹھ سے اخبار توحید جاری کیا تو مئی سنہ ۱۳ء کے الناظر میں اسکے متعلق یہ عرض کیا گیا:-

"... اگر توحید کا ظاہری لباس تصوف کی باطنی تعلیم کے لیے مفید و کارآمد ہو سکتا تو مسلمانان ہند کے حق میں یہ اخبار ضرور نزول رحمت کا باعث ہوتا لیکن جب اہل باطن ظاہری تصنعات سے آراستہ ہو کر نمود و نمائش کو اکتساب برکت کا ذریعہ قرار دیں اور یخادعون اللہ والذین آمنوا وما یخدعون الا انفسہم وما یشعرون کی دل ہلا دینے والی آواز پر کان نہ دھریں تو ظاہر ہے کہ مذہب اور اہل مذہب کے حق میں نتیجہ کبھی مفید نہیں ہو سکتا۔

ہم جانتے ہیں کہ ہماری آواز ان معاملات میں نہایت مدھم ہوتی ہے لیکن پھر بھی جب کبھی ہمیں موقع ملے ہم اس بارے میں اپنی رائے کا اظہار آزادی کے ساتھ کرتے رہیں گے اس لیے کہ مسلمانوں کی موجودہ ذلیل اور پست حالت کا ذمہ وار زیادہ تر وہی گروہ ہے جو انانیت وخودی کی مئے دو آتشہ کا متوالا بن کر خدا اور رسول کے ارشاد و تعلیم کو پس پشت ڈالنے اور مذہب کے ظاہری لباس سے آراستہ ہو کر سادہ لوح حلقہ بگوشان مذہب کی آنکھوں کو خیرہ کرنے میں ید طولےٰ رکھتا ہے۔

افسوس ہے کہ یہ خاکی نژاد انسان جسکی تخلیق میں ایک ناقابل شمار حصہ وقت سے زیادہ اور ایک قطرۂ ناپاک کے سوا صرف نہیں ہوا ہے کتنی جلد اپنے نفس کا بندہ بن جاتا ہے۔ طرح طرح کی نیرنگیوں اور شعبدہ بازیوں سے اُس خالقِ ذوالجلال کی بیشمار مخلوق کو مصیبتوں میں پھنساتا ہے جسکی قدرت وطاقت کا اندازہ بھی امکان بشری سے خارج ہے اور پھر اپنی وقتی اور عارضی کامیابیوں سے یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ اُس بصیر وعلیم کو بھی دھوکے میں ڈال دیا ہے اور اُسوقت کو یاد کر کے نہیں لرزتا جبکہ یہ سراب، یہ بُلبلا، یہ دھوکے کا طلسم باقی نہ رہے گا اور دلوں کے اندر کے راز طشت از بام کر دیے جائیں گے۔

ٹٹولتے ہیں یہاں حال کو شہ گوشہ دل
یہاں نہیں ہے حکایت سے اور قیل سے کام (ظفر)

ہمارے متعلق توحید کے پہلے ہی پرچہ میں یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ "ہم درویشوں کی ہستی کو ریاکاری کی ہستی قرار دیتے ہیں"۔ اور اگر مذکور الصدر خیالات کا مفہوم یا جو کچھ ہم نے اس مسئلہ پر فروری ۱۹۲۸ء کے الناظر میں نظام المشائخ پر ریویو کرتے ہوئے لکھا تھا اُسکا نشا و مطلب توحید کے لطباع ایڈیٹر کی رائے میں اسی قدر ہے تو ہم کو اُن سے شکایت نہیں ہو سکتی۔ البتہ ہم دوسروں کی خدمت میں یہ عرض کر دینا مناسب سمجھتے ہیں کہ ہم اُن لوگوں کی ہستی کو ریاکاری کی ہستی نہیں قرار دیتے جو واقعی درویش ہوں، مگر وہ لوگ جو خود پرستی وخود نمائی کے سکہ ہائے مقلوب کا تبادلہ عقیدت وارادت سے کرنا چاہیں اور مذہب ایسی مہتم بالشان چیز کو اپنے مفروضہ کشف وکرامات سے بازیچۂ اطفال بنائیں اُنکے سامنے سر تسلیم و نیاز جھکانا البتہ ہمارے مذہب میں ایک گناہ عظیم

ضرورت ہے۔ اور خواہ ہر دلعزیز بننے کی ہمیں کیسی ہی سخت خواہش و ضرورت کیوں نہ ہو لیکن
ہم اپنی فطرت سے مجبور ہیں کہ امید و بیم کی کوئی حالت ہمیں اس معاملہ میں شکست نہیں دے سکتی۔
سنہ ۱۹۱۶ء اور سنہ ۱۹۲۰ء میں بوہرہ فرقہ کے مشہور پیشوا ملا طاہر سیف الدین صاحب
...... کی ایک تصنیف کی بدولت خواجہ صاحب اور اُن جیسے دوسرے مقدس اور مہذب
ڈاکوؤں نے خوب داد قزاقی دی اور بمبئی کے احمقوں کی زر پاشی نے ملک میں ایک طوفان بے تمیزی
بپا کر دیا تو تنگ آ کر ہمیں فروری سنہ ۱۹۲۰ء کے النّاظر میں سطور ذیل لکھنا پڑیں:-

ریل، ڈاک، تار، مطبع اور اخبارات بے شبہ تمدن جدید کے بہترین ثمرات میں سے ہیں لیکن اس قوم
کی قسمت کو کیا کہیے جسکے افراد ان نفع بخش اور راحت دہ چیزوں کو بھی شرارت اور
نفسانیت کا آلہ بنا لیں۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ کم و بیش ایک سال سے مسلمانوں کی ایک
جماعت انہیں تمدن پرور آلات کے ذریعہ افراد قوم کے دلوں میں کدورت و نفرت کے جذبات
مشتعل کرنے میں مصروف ہے اور اگرچہ ہم نہیں چاہتے تھے کہ اس بحث میں ہم کسی قسم کا حصہ لیں
لیکن وقت، روپیہ اور قوتوں کے بیجا اسراف کے ساتھ ساتھ جب ہم محسوس کرتے ہیں کہ اس جنگ
زرگری کی بدولت کثیر افراد قوم کے اخلاق بھی برباد ہو رہے ہیں تو ہم معاف کیے جائیں اگر ہم
خاموشی کو گناہ سمجھ کر چند سطور تحریر کریں۔

ابتدا اسکی یوں ہوئی کہ ایک صاحب محمد اسمٰعیل سریا والے جنکے دل میں غالباً اسلام اور مسلمانوں
کا درد تمام قوم سے زیادہ ہے، ایک طولانی تحریر بعض اخبارات میں اس مضمون کی شائع کرائی
کہ بمبئی میں جو داؤدی بوہروں کے ایک سرغنہ ملا طاہر سیف الدین صاحب ہیں اُنھوں نے
"ضوء نور المبین" کے نام سے ایک کتاب عربی زبان میں تصنیف فرمائی ہے اور اُس میں خدا
اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی نعوذ باللہ توہین کی اور تمام فرق اسلام کے خلاف سخت زہر
اُگلا ہے۔ قومی اخبارات و رسائل عموماً نکالے تو اس دعوے کے ساتھ جاتے ہیں کہ اُنکے ذریعے
قوم و ملک کی خدمت منظور ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ بعض مستثنیات کو چھوڑ کر ایک بڑا حصہ اخبارات
و رسائل کا محض اُن لوگوں کے ہاتھوں میں ہے جو حصول معاش کی تمام کوششوں میں ناکام رہنے
کے بعد اس غریب پرور دروازہ پر آ بیٹھتے اور اپنی تن آسانیوں کی خاطر ملک و ملت کا نام
لیکر بد اخلاقیوں کا ارتکاب کرتے رہتے ہیں، مذہبی مناظروں اور سیاسی مجادلوں کی گرم بازاری

میں تو خیر انھیں اصحاب کا بڑا حصہ تھا ہی مگر اب روز بروز نئے نئے دروازے اِن بندگانِ غرض کے لیے کھُلتے جاتے ہیں۔

سرپاوا صاحب کا یہ مضمون چند اخبارات کے سوا تقریباً شمالی ہند کے اکثر اخبارات و رسائل میں شایع ہوا اور ہمیں ذاتی طور پر اس بات کا علم ہو گیا ہے کہ جن اخبارات و رسائل نے اس مضمون کو شایع کیا، اسکی حمایت میں نوٹ اور مضامین لکھے اُنھوں نے نہایت معقول تجارت کر لی۔ تجارت بُری شے نہیں ہے، لیکن جو اخبار نویس اپنی ذمہ داری محسوس کیے بغیر محض چند سکوں کے معاوضہ میں اس فتنہ کی پرورش کرتے رہے اُنکا ضمیر شاید اُنھیں ہم سے بہتر طریقہ پر بتا سکتا ہے کہ یہ تجارت ہے یا کیا؟

سرپاوا صاحب کا زور ختم ہوا تو مُلّا صاحب کے ارادتمندوں کی طرف سے اُنکی تردید اسی دم خم کے ساتھ شروع ہوئی۔ اور اُنھوں نے ایک طرف تو بعض ایسے اخبارات ہی کو توڑ لیا جو سرپاوا صاحب کی زرپاشیوں سے کافی طور پر مستفید ہو چکے تھے حتیٰ کہ اُن میں سے چند نے اپنی رجعت اور احمق بنائے جانے کا بیانگ دُہل اعتراف کرنا شروع کر دیا ہے اور دوسری طرف کسی مخلص زر سے ضمیمۃ الاخلاص کے نام سے ایک رسالہ لکھوا کر کثیر تعداد میں شایع کیا۔

ردعمل کی یہ کوششیں ختم نہ ہوئی تھیں کہ بمبئی کے زر و نقرہ نے دہلی کی منٹ سے ایک نیا سکہ "سیف بر دین" ڈھلوا کر ملک میں رائج کرا دیا۔ اس رسالہ میں علما و فضلا، شاعر، ادیب، مصلح اور معلم، غرضکہ ہر طبقہ کے نمایندوں اور لیڈروں کے فتاویٰ کی صف بندی کر کے سرپاوا صاحب نے جو فساد برپا کیا تھا اُسکی حمایت کا سامان جمع کیا گیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ حکومت دہلی نے اس پمفلٹ کو پریس ایکٹ کے رو سے ضبط کر کے پوری طرح شایع نہیں ہونے دیا۔ لیکن جو لوگ فریقین کو اُلّو بنا کر اپنی جیبیں بھر رہے تھے اُنکی تشفی کے لیے یہ کافی نہ تھا لہٰذا جو نسخے اس رسالہ کے شایع ہو چکے تھے اُنکی تردید کے لیے اب تک کاغذ اور سیاہی فراوانی کے ساتھ بہائی اور تاجران بمبئی کی دولت اس ٹٹی کی آڑ میں اُڑائی جا رہی ہے۔ چنانچہ کچھ دنوں پہلے خاص لکھنؤ سے ایک رسالہ اسی نوعیت کا شایع ہوا تھا۔ مطبع عالم افروز بمبئی نے اسکے بعد "آئینۂ صداقت" دکھایا اور اب ایک پمفلٹ "سیف الدین علیٰ رؤس المعتدین" میرٹھ سے وصول ہوا ہے۔

ہم نہیں جانتے کہ یہ حماقتیں اور یہ قزاقیاں کب تک جاری رہیں گی، لیکن بالحاظ اسکے کہ جن بندگانِ زر کو اِن ذرائع سے کافی مالی منفعت پہونچ رہی ہے وہ ہمیں بیشمار گالیاں دیں گے ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ ملا طاہر سیف الدین کے ارادت کیشوں اور اُنکے فریق مخالف، دونوں کو آگاہ کر دیں کہ آپ دونوں کو اس جنگ زرگری سے کوئی نفع پہونچنے کی تو بظاہر امید نہیں، البتہ آپ کے پاس جو فاضل روپیہ ہے وہ ضرور اس حماقت میں آپ کی جیب سے نکل کر ان لوگوں کے ہاتھوں میں پہونچ جائے گا جو آپ دونوں میں سے کسی کے دوست نہیں، بلکہ آپ کے روپیہ کے دشمن اور اس قسم کی ڈاکہ زنی میں کافی مہارت رکھتے ہیں آپ دونوں اگر گانٹھ کے پورے ہیں تو ویسے ہی بدبختی سے عقل کے کورے بھی ہیں۔

ہمیں نہایت افسوس معلوم ہوتا ہے کہ اس بحث میں ڈاکٹر اقبال اور مسٹر عبدالماجد جیسے قوم کے ایہ ناز افراد بھی شریک کر لیے گئے ہیں اور اسکی تمام تر ذمہ داری جہاں تک ہمیں علم ہے خواجہ حسن نظامی صاحب کے سر ہے۔

ملا طاہر سیف الدین کے حمایتیوں نے جو تردیدی رسائل شایع کیے ہیں اُنکی حقیقت و نوعیت سے ہم ناواقف نہیں، اور اگر اُن میں خواجہ صاحب کا نام صاف صاف نہ لکھا ہوتا تب بھی ہمیں یہ باور کرنے کے کافی وجوہ موجود تھے کہ خواجہ صاحب بھی اس تجارتی کوٹھی کے شرکاء میں داخل ہیں۔

جب سے خواجہ صاحب کتابوں اور دواؤں کی تجارت میں باقاعدہ طور پر منہمک ہیں ہمیں یہ توقع تھی کہ اس ذریعہ سے جو آمدنی اُنکو ہوجاتی ہوگی اس پر وہ اکتفا کریں گے۔ بلکہ ہم اُمیدوار تھے کہ وہ کسب حلال کے ان وسائل کی موجودگی میں اپنے کمالات تصوف و روحانیت کی نمایش کو بھی رفتہ رفتہ چھوڑ دیں گے لیکن بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب

قناعت میں عیب را کیمیاست

کے فلسفہ پر یقین نہیں رکھتے۔ ورنہ اس گندے کاروبار سے اپنا دامن آلودہ نہ ہونے دیتے۔ ....

اقتباسات بالا سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ باوجودیکہ ہمیں خواجہ صاحب سے وہ قربِ مکانی حاصل نہ تھا جسکی بدولت ہم اُنکے نہاں خانۂ خلوت کے "کاروبار" کا برائی العین مشاہدہ کر کے پبلک کو

بروقت اُنکے کارناموں سے آگاہ کرسکتے، پھر بھی اُنکی خطرناک روش کو سمجھنے اور اُس سے موقع بموقع متنبہ کرکے پبلک کو اس جال میں پھنسنے سے بچانے کی برابر کوشش کرتے رہے۔ اور جو رسالے ہم نے اس قدر دوڑ دھوپ کر اور محض اُنکی تحریری کھیلوں اور کاغذی کھلونوں کو دیکھ کر تمام کی تمام تجربہ نے بخوبی انکی صحت صداقت ظاہر کردی ہے۔ اگر مولانا محمد علی صاحب اور دہلی کے دوسرے وہ اصحاب جنہیں اُن سے قرب حاصل ہونے کی وجہ سے اُنکے حالات کا زیادہ صحیح علم ہوسکتا تھا ابتدا ہی میں اس فتنہ کو دبانے کی کوشش کرتے تو مسلمانوں کو اُنکی مقدس ڈاکہ زنی سے کب کی نجات مل گئی ہوتی۔

ملک میں اور خاص دہلی میں ایسے متعدد "ڈاکو" موجود ہیں جنکے ساتھ مروت و نیک سلوک اگر روا رکھا جائے تو اُنکی زہریلی زندگی کا نشوونما ہزاروں بندگان خدا کی پریشانی و تباہی کا موجب نہ بننے پائے۔

۱۴ - دسمبر ۲۶ء

مقدس ڈاکو

(۲)

گذشتہ نمبر میں صرف النّاظر کے اقتباسات پیش کیے گئے تھے جن سے اندازہ ہوا ہوگا کہ خواہر زادہ حضرت محبوب الٰہیؒ کے متعلق ہم شروع ہی سے کیا رائے ظاہر کرتے رہے ہیں۔ اسی لیے جب مولانا محمد علی نے خواجہ صاحب کی جاسوسی کا پردہ فاش کرنے والی تحریر کا اشاعت سے قبل ایک موقع پر ذکر کیا تو کم سے کم مجھے اس پر ذرا تعجب نہیں ہوا۔ کیونکہ جس شخص کا سالہا سال سے یہ شیوہ رہا ہو کہ علانیہ تصوف کے فریب آمیز بہروپ میں مسلمانوں کو دھوکا دیکر اپنی گرم بازاری کا سامان مہیا کرتا رہے اور دن دہاڑے بھولے، بامروت اور نیک دل لوگوں کو لوٹ لیا کرے اُسکے لیے مخبری و جاسوسی کے خفیہ جرائم کچھ زیادہ سنگین نہیں ہوسکتے۔ خدا معلوم گذشتہ پندرہ سال کے اندر ایسی ہی کتنی وارداتوں کا ارتکاب کیا گیا ہوگا جنکی تفصیلات اور نتائج سے اہل ملک ہنوز بے خبر ہیں۔

ہمدرد میں اس واقعۂ مخبری کے سلسلہ میں جو طولانی مضامین شائع ہوئے ہیں اُنکو ہمنے بالاستیعاب پڑھا اور اس راز کے فاش ہو جانے کی وجہ سے خواجہ صاحب کو جس رسوائی کا سامنا ہے اُسکے دفعیہ کے لیے "غریبوں کا اخبار" جو نکالا گیا اُسکے اکثر پرچے بھی ہمارے مطالعہ میں آئے اور خواجہ صاحب کا مفصل جواب جو اخبار سے علیحدہ بھی شایع کیا گیا ہے وہ بھی ہمارے سامنے ہے۔ اور غالباً یہ کہنا بالکل غیر ضروری ہے کہ مولانا محمد علی نے خواجہ صاحب کا جو خط شایع کیا ہے اُسکی موجودگی میں نہ ہمدرد کے طولانی مقالات کی تائید مزید درکار تھی نہ خواجہ صاحب کے لاطائل جوابات سے مغالطہ کھانا ممکن ہے۔ ایسا کم ہوتا ہے کہ کوئی چور عین ارتکاب سرقہ کے وقت یا رُوداد جرم بیان کرتے ہوئے یا مال مسروقہ کو بغل میں دبائے گرفتار ہو جائے۔ لیکن جب کبھی ایسی صورت پیش آجائے تو پھر چور خواہ کتنے ہی حلف اُٹھائے یا سرقہ کے محرکات اور مال مسروقہ کے قبضہ میں آنے کے اتفاقات کی کتنی ہی ملمّعیں بیان کرے عدالت مجبور ہوگی کہ ایک بات کو بھی باور نہ کرے اور مجرم کو قانون مروجہ کے رو سے زائد سے زائد سزا جو اُس کے اختیار میں ہو بے تکلف دیدے۔ خواجہ صاحب، اگرچہ عین ارتکاب جرم کے وقت نہیں گرفتار ہوئے

مگر اُنکے جُرم کی داستان خود اُنکے معصور فطرت قلم کی لکھی ہوئی رائے عامہ کی عدالت میں پیش ہو چکی ہے - اب اُنکے بچاؤ کی کوئی تدبیر نہیں - اور اُن جیسے طباع و ذہین شخص کا اتنی سی بات کو نہ سمجھنا اس بات کی دلیل ہے کہ ارحم الراحمین نے جو ڈھیل چھوڑ رکھی تھی اُسکی میعاد ختم ہو گئی - اور منتقم حقیقی کی سزا ہی کا وقت آ گیا - ان اللہ یمہل ولا یہمل - اب نہ خواجہ صاحب اگلے حلف اُن کی بیگناہی کا یقین دلا سکتے ہیں نہ اُنکے رفقا و شرکاء کی عیاریاں و ابلہ فریبیاں اس بدنما داغ کو اُنکی پیشانی سے چھڑا سکیں گی - نہ مہذب ڈاکو کا مجرم عادی ہونا اُنکی معصومیت کی دلیل بن سکتا ہے اور نہ مولانا محمد علی پر آریوں سے سازباز، لیڈروں سے رقابت، لامذہبیت، ملت فروشی، اور چندوں کے خورد بُرد کرنے کے انواع و اقسام کے بے حساب الزامات عائد کرنے سے اُنکی قبائے تصوف و عبائے تقدس پاک و صاف ہو جائیں گی -

خواجہ صاحب کی قسمت میں خدا کی لاٹھی سے بچنا لکھا ہوتا تو وہ اس راز کے فاش ہوتے ہی یا تو اعتراف تقصیر کرکے رائے عامہ سے طالب عفو ہوتے یا کم سے کم اس تلخ گھونٹ کو پی جاتے اور کچھ دنوں کے لیے گمنامی و خاموشی میں زندگی بسر کرتے - لوگوں کا حافظہ عموماً بہت کمزور واقع ہوا ہے کچھ عرصہ کے بعد بات آئی گئی ہو جاتی - مگر غرور و انانیت یا حرص و آز نے انھیں اسکی اجازت نہ دی - اور وہ "چوری" کھل جانے پر اور سینہ زوری کرنے لگے جس سے نہ صرف اُنکے گناہوں میں اضافہ کثیر ہوا بلکہ ملک کے تعلیم یافتہ اور دردمند لوگوں کی نفرت و حقارت میں زیادتی ہو گئی - چنانچہ خود اُنکے اخباروں میں جن بے عقل سادہ لوحوں اور چالاک ہوشیاروں کی بکثرت تحریریں شایع ہوئی ہیں اُنھیں سے ہر شخص نے اندازہ کر لیا ہوگا کہ تعلیم یافتہ، معاملہ فہم اور بے لاگ لوگوں نے کہاں تک اُنکی ہمدردی و غمخواری سے اجتناب کیا ــــــ حالانکہ ان تحریروں کے حصول میں خواجہ صاحب نے ایڑی چوٹی کا سارا زور صرف کر دیا اور بہت ممکن ہے کہ اُن کا بیشتر حصہ بھی اُن کی اپنی دوکان کے کاریگروں کی تخلیق ثابت ہو -

جو اخبارات یا اخباروں اور رسالوں کے اڈیٹر اُنکے لیے سینہ سپر کیے ہوئے ہیں اُنکے متعلق اتفاق سے وہ خود اپنے اخبار منادی میں اعلان کر چکے ہیں کہ تبلیغ فنڈ سے اُنکو ماہوار اور وقتی امداد ملتی ہے - جسکے بعد ایسے لوگوں کی تائید کی کوئی وقعت باقی نہیں رہتی - کیونکہ کچھ لوگوں کو تھوڑے دنوں تک تو دھوکے میں رکھا جا سکتا ہے مگر ساری دنیا نے ہمیشہ کے لیے آنکھوں

اور کانوں کو بیکار بنا لینے کی قسم نہیں کھائی ہے۔

روزانہ اخباروں میں لکھنؤ کا وہ بے حقیقت اخبار جسکے اجراء کا گناہِ عظیم راقم الحروف کے سر ہے خواجہ صاحب کی اگر تیس پوت کر رہا ہے تو کچھ مقام تعجب نہیں کہ خود منادی کے اعلان کے بموجب اُسے پچیس روپیہ ماہوار کا وظیفہ تبلیغی راجہ یا مقدس ڈاکو کی سرکار سے ملتا ہے۔ دین و دنیا کے اڈیٹر کی خوش فہمی کا راز بھی اُس قرطاس الحساب سے بآسانی معلوم ہو سکتا ہے جو تبلیغی جریدۂ درویش میں چھپا کرتا ہے۔ اور اڈیٹر پیشوا کے متعلق خواجہ صاحب اور پیشوا صاحب دونوں کی تحریریں خود ہمارے پاس موجود ہیں جنسے ظاہر ہوتا ہے کہ خاندانِ حضرت خواجہ باقی باللہ رحمتہ اللہ علیہ کا نام روشن کرنے والا یہ گوہر شب چراغ "علی بابا" کے جتھے کا مستقل رکن ہے اور جس شخص نے اُنکی گندی اور غلیظ تحریریں پڑھی ہیں وہ بآسانی اس حقیقت سے آشنا ہو جائے گا کہ مقدس ڈاکو کی بساطِ شطرنج پر یہ ڈھائی گھر بھاگنے والا مہرہ کیا منزلت رکھتا ہے۔ اور یہی صورت تقریباً اکثر مؤیدین و معاونین خصوصی کی ہے جو بجا طور پر علی بابا کے "چالیس چور" قرار دیے جا سکتے ہیں۔ کچھ لوگ شاید ایسے بھی ہوں جو محض خواجہ صاحب کے دام ابلہ فریبی کا شکار ہوں یا مولانا محمد علی صاحب سے کبھی کا بدلہ نکالنے کے لیے دانستہ اس جال میں پھنس گئے ہوں۔

خواجہ صاحب نے اگر یہی ارادہ کیا تھا کہ اپنی اشتہار بازی اور پمفلٹ سازی سے دھول اُڑا کر مسلمانوں کو اندھا بنا دیں گے تو اُنھیں صاف انکار کر دینا چاہیے تھا کہ مہذب ڈاکو نے جو خط مولانا محمد علی کو دیا ہے وہ اُنکا نہیں بلکہ مہذب ڈاکو نے کسی اُن سے زائد چالاک جعل ساز سے اُنکو بدنام کرنے اور لوٹنے کی غرض سے لکھوا لیا ہے۔ ممکن تھا کہ خود مولانا محمد علی تھوڑی ردو قدح کے بعد اسے باور کر لیتے کیونکہ شیخ نعیا، الحق باوجودی اپنی پمفلٹ بازی کی وجہ سے بہت ہی ساقط الاعتبار ہیں اور بد اچھا بدنام برا کی مشہور مثل کے مطابق خواجہ جیسے "مقدس بزرگ" کے مقابلہ میں اُن پر اعتماد کرنا آسان نہ تھا۔ اور اگر مولانا محمد علی کو ذرا سا بھی شک پیدا ہو جاتا تو غالباً وہ اس تحریر کی اشاعت میں بہت تامل کرتے۔ مگر خدا کی باتیں خدا ہی جانے۔ جب پردہ داری کا دور تمام ہوتا اور پردہ دری کا وقت آجاتا ہے تو چالاک سے چالاک مجرم کی عقل و ذہانت جواب دے جاتی ہے۔

عدن ڈاکو کا جو خط "مہذب ڈاکو" نے مولانا محمد علی کو دیا اُسکی عبارت یہ ہے :

۹۶ ب

از درگاہ شریف حضرت محبوب الٰہی - دہلی ۱۲-۱ اگست سنہ ۱۹۱۸ء

کرمی - سلام علیکم - دو خط پہونچے - ابھی دو چار دن کی اور مصروفیت ہے اسکے بعد لکھنے کی کوشش کروں گا - لکھائی کا حساب رجسٹر میں دیکھ کر مطلع کروں گا -

کیا عجب ہے کہ گورنمنٹ نے لکھا ہو - میں نے چیف کمشنر صاحب دہلی سے

مفصل حالات بیان کر دیے تھے اور نظام کو پان اسلام زم کے جو سبق دیے جاتے تھے اُن کی باضابطہ اطلاع دیدی تھی - اور مجھے معلوم ہوا ہے کہ اُنھوں نے پنجاب گورنمنٹ کو اس خطرہ سے آگاہ بھی کیا تھا - (یہ خط بالکل خانگی ہے - اسکو چاک کر دیجیے اور اسکی اطلاع کسی کو نہ دیجیے - یعنی میرے اس کام کی خبر سوائے آپ کے کسی کو نہ ہو)

حسن نظامی

خواجہ صاحب نے اس خط کی اصلیت یا اسکی تحریر سے انکار نہیں کیا ہے، اس لیے اسکے مطالب و منشاء کے بارے میں خواجہ صاحب اور اُنکے چیلے چاپڑوں کی حاشیہ آرائیوں کی حاجت نہیں رہتی - خط یونانی، عبرانی یا قدیم مصری زبان میں نہیں ہے کہ اُس کا مفہوم سمجھنا دشوار ہو - ہر اردو داں شخص بآسانی اسکا مطلب سمجھ گیا ہوگا - البتہ اگر کوئی اختلاف رائے ہو سکتا ہے تو اس میں کہ یہ مخبری کس کس کے خلاف تھی اور کون کون اس ناوک جاسوسی کا ہدف بنے -

خواجہ صاحب کی تحریر مندرجۂ بالا کو پڑھ کر یہ حقیقت سب سے پہلے اور نمایاں طور پر سامنے آتی ہے کہ خواجہ صاحب نے چیف کمشنر کو مفصل حالات سنا کر باضابطہ اطلاع دیدی کہ نظام کو پان اسلامزم کے سبق دیے جا رہے ہیں - سبق پڑھانے والا کون ہے؟ اسکا تحریر سے صاف پتہ نہیں چلتا، البتہ پنجاب گورنمنٹ کے حوالہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی پنجاب سے تعلق رکھنے والا شخص ہوگا - مگر مخبری کا راز کھلتے دیکھ کر خواجہ صاحب نے اس خیال سے کہ جرم

کی اصلی نوعیت پر شاید پردہ پڑ جائے، اس معلم کا نام خود ہی ظاہر کردیا - ظفر علی خاں صاحب اپنی سابقہ لغزشوں کی بنا پر قوم کی ایک بڑی جماعت کے منصوب رہ چکے ہیں اور اگرچہ بعد کے دَور ابتلا میں اپنی ثابت قدمی اور مسلسل قربانیوں سے اُنھوں نے بہت کچھ اپنی غلط کاریوں کی تلافی کردی لیکن مسئلہ حجاز میں جو اختلافات ۲۵ء اور ۲۶ء میں رونما ہوئے اُنکی وجہ سے بہت سے لوگوں کو آج بھی اُن سے شدید بیزاری و مخالفت ہے - اس لیے خواجہ صاحب نے غالباً سمجھا کہ اُنکا نام ظاہر کرکے وہ اپنی شیطنت کو لوگوں کی نگاہوں میں بہت کم وزن اور اس بناپر ناقابلِ لحاظ بنادیں گے - مگر خواجہ صاحب کو یاد نہیں رہا کہ مخبری کرتے وقت پیشِ نظر مقاصد کی بدولت اُن کا دل نورِ ایمان سے اور دماغ عقل و ہوش سے قطعاً خالی تھا اسلیے وہ ایک ایسے جرم کا ارتکاب کر بیٹھے جو انسانوں سے ممکن تھا کہ پوشیدہ رہے مگر انسانوں کے خالق سے جو علیم و بصیر ہے مخفی نہیں رہ سکتا تھا - اور اس لیے اُسکا داغ ابدالآباد تک اُنکی پیشانی سے نہ چھوٹے گا -

خواجہ صاحب نے چیف کمشنر کے سامنے ظفر علی خاں صاحب پر ایک ایسا الزام لگایا جو درحقیقت اگر سچا ثابت ہوجائے تو ظفر علی خاں کی تمام لغزشوں کا کفارہ کردیگا - اسلیے کہ کسی تاجدار یا والیِ ریاست کو اخوت و ہمدردیِ اسلام کا سبق پڑھانا بجاے خود ایک ایسی سعادتِ عظمیٰ ہے کہ اُسکے صلہ میں خدا کے فضل و کرم سے بہترین نعمتوں کی توقع رکھنا چاہیے -

خواجہ صاحب نے اپنے بیان میں اور اُنکے جتھے کے لوگوں نے اپنی تحریروں میں اس بات کے ثابت کرنے پر ساری قوت صرف کی ہے کہ چیف کمشنر صاحب سے جو کچھ کہا گیا وہ صرف ظفر علی خاں کے خلاف تھا - حضور نظام کی شکایت نہ تھی بلکہ حضور نظام کی بھلائی کے لیے یہ زحمت بھی گوارا کی گئی ورنہ کہاں مقدس ڈاکو کی محترم شخصیت اور کہاں اس قسم کی مخبری و شکایت - خدانخواستہ وہ یا اُنکے باپ دادا کوئی پولیس کے تنخواہ یاب ملازم تو نہ تھے - اب یہ محض اتفاق ہے کہ ۳۱ء میں ظفر علی خاں سے مقدس ڈاکو محض اس بنا پر ناراض تھا کہ وہ دعویٰ داران تصوف کی شان میں گستاخیاں کرتے رہتے تھے -

مگر ان بدنصیبوں سے کوئی پوچھے کہ جو شخص پان اسلامزم کے سبق پڑھانے کو جرم قرار دے اُسکو اسلام سے بھی کوئی تعلق باقی رہتا ہے - کیا دنیا میں اُس سے زیادہ کوئی بدبخت غدارِ ملت ہوسکتا ہے جو خود اپنے مذہب کی بنیادی تعلیم کی اشاعت کو ایک فرنگی کے سامنے جا کر قابل

گرنت قرار دے۔ کیا صریح بے دینی ولا مذہبیت کے اس مظاہرہ کے بعد بھی حسن نظامی کا یہ منہ ہے کہ اُس خدائے واحد کے نام کی قسمیں کھا کھا کر مسلمانوں کو اپنی معصومیت کا یقین دلائے۔ جسکی تسلیم اُبوت کے گلے پر خود اُنکی سرشت کی خباثت اور نفس کی غداری کے ہاتھوں اُلٹی چھری پھیری جا چکی ہو

لا حول ولا قوۃ الا باللہ۔۔

یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ جسوقت یہ مقدس ڈاکو اپنے آقائے ولی نعمت کے پاس ظفر علیخاں کی شکایت کرنے گیا تھا اُسوقت اسکا یہ منشا شاید نہو کہ رئیس حیدرآباد کو وہ کسی آفت میں مبتلا کرے۔ لیکن اس سے کون شخص انکار کر سکتا ہے کہ ہوا و ہوس کی بندگی میں اُسکے ہوش وحواس بجا نہ رہے تھے اور جو کچھ اُس نے ظفر علی خاں سے انتقام لینے کی غرض سے دہلی کے فرنگی حاکم کے سامنے گفتگو کی اُسکے عواقب و نتایج پر اُس نے ایک لمحہ کے واسطے غور نہیں کیا۔ اور وہ ایسا کرتا ہی کیوں۔ اُس کا تو زندگی بھر پیشہ ہی مسخرگی و عیاری کے سوا کچھ نہیں رہا۔ اُس نے دیکھا کہ مسلمان مذہب و تصوف کے نام سے زیادہ آسانی و فراوانی کے ساتھ لوٹے جا سکتے ہیں۔ اسلیے اُس نے شروع ہی سے اپنا یہی وطیرہ بنا رکھا تھا۔ آج جو کچھ وہ اپنی مدافعت میں کہنے پر مجبور ہے اُس کا سبب تو صرف یہ ہے کہ اُمید کے خلاف اور اہتمام کے باوجود یہ تحریر جس پر اسلام، ظفر علیخاں اور نظام حیدرآباد، تینوں کے خونِ ناحق کی مہر لگی ہوئی ہے چھپ نہیں سکی اور اخبار ہمدرد کے افق پر شفق بنکر اُسکی خونخواری و غداری کی ایک عالم میں تشہیر کر رہی ہے۔ حیدرآباد سے اپنی برات کی فکر اگر ہے تو صرف اس خیال سے کہ وہاں سے اُسکو کثیر آمدنی تھی اور اب اُسکا ہمیشہ کے لیے دروازہ بند ہوا جاتا ہے۔ مہاراجہ کشن پرشاد کی عنایات بے غایات کے باوجود نظام حیدرآباد کی مخبری کا خون اُسکے چہرہ کو داغدار بنائے رہا تو ظاہر ہے کہ دکن کے بھولے بھالے لوگوں پر اسکا داؤ نہ چل سکے گا۔

لیکن درحقیقت اس کا سب سے بڑا قصور یہ نہیں ہے کہ نظام کو یا ظفر علی خاں کو اُس نے نقصان پہونچایا، بلکہ اُس کا اصلی جرم یہ ہے کہ اُس نے خود اسلام سے غداری کی اور ایک غیر مسلم کے سامنے اُس چیز کو جرم و معصیت ظاہر کیا جو ایک مسلمان کے لیے بہترین عبادت و نیکی ہونا چاہیے۔

ظفر علی خاں صاحب کی شکایت سے اگرچہ مقدس ڈاکو نے انکار نہیں کیا ہے لیکن اُمورِ حیدرآباد

کی خیر طلبی کی آڑ میں وہ اس الزام سے بھی بری ہونا چاہتا ہے۔ اور اسکی تائید میں فخریہ کہتا ہے:

"میں نے مولانا ظفر علی خاں صاحب کی نسبت یہ نہیں کہا کہ وہ بمب بنا رہے ہیں، انکو پھانسی دیدو۔ بلکہ یہ کہا کہ انکی صحبت حضور نظام کے لیے مفید نہیں ہے۔ یہ کہنا بے شبہ مولانا ظفر علی خاں کے مالی مفاد کے لیے تو مضر ہوا مگر انکو اور کوئی نقصان نہیں پہونچا۔"

گویا مقدس ڈاکو کے نزدیک کسی شخص کو جب تک وہ پھانسی کے تختے تک نہ پہونچا دے تب تک مخبری کی ملعون خدمت پوری طرح سرانجام نہیں پاتی ------ اس سے حضرت محبوب الٰہیؒ کے اس مغضوب خواہرزادہ کی خباثتِ طینت کا اندازہ کرنا چاہیئے کہ ایک مسلمان کو شدید مالی نقصان پہونچانے اور ریاست حیدرآباد سے نکلوا دینے کے باوجود اسے اپنی بدبختانہ شیطنت پر شرم نہیں آتی بلکہ وہ ریاست حیدرآباد کا خیر سگال بنکر اس مکروہ عیب کو بھی اپنے لیے ہنر بنا دینا چاہتا ہے۔ اور سمجھنا چاہیے کہ اگرچہ ابھی تک یہ امر پردۂ خفا میں ہے لیکن اسکو موقع ملا ہوگا تو اس نے مولانا محمد علی اور دوسرے لوگوں کے خلاف جنکو وہ بجائے خود اسلام کا دشمن سمجھتا ہے اس قسم کی خفیہ بلائیں بھی ضرور دی ہونگی جیسے مولانا محمد علی اور دوسرے قومی کارکنوں کو مالی نقصان اٹھانے کے بجائے اپنی عزیز جانوں سے ہاتھ دھونا پڑے

کہ خبثِ نفس نہ گردد بسالہا معلوم

اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ چیف کمشنر سے شکایت کرتے وقت ممکن ہے کہ مقدس ڈاکو حضور نظام کو نقصان پہونچانے کا خواہاں نہ ہو اور یہ زیادہ سے زیادہ حسن ظن ہے جو اس غدارِ اسلام اور مجسمۂ شیطنت کے ساتھ روا رکھا جا سکتا ہے، لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جو کچھ چیف کمشنر سے کہا گیا اُس سے حضور نظام کو نقصان نہیں پہونچا۔

حیدرآباد کے معاملات پر کچھ ایسے تہ بہ تہ پردے پڑے ہوے ہیں کہ کم سے کم راقم الحروف کو اس بارے میں کچھ لکھتے ہوے ضرور پس و پیش ہوتا ہے۔ لیکن اگر کوئی نیا واقعہ نہ بھی پیش آتا اور وہاں کے حالات میں آج بھی ویسا ہی سکون ہوتا جیسا کہ چند سال قبل تھا، تب بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ نظام کو پان اسلامزم کا سبق پڑھائے جانے کی اطلاع کسی انگریز کو دیجاتی تو اس سے انگریزوں کے دلوں میں نظام کی طرف سے کوئی بدگمانی اور سوءِ ظن پیدا نہ ہوگا۔ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ یورپ کے مدبرین عموماً اور انگریز خصوصاً پان اسلامزم سے حد درجہ

بیزار اور خوفزدہ ہیں۔ چنانچہ مقدس ڈاکو نے خود اپنے بیان میں اعتراف کیا ہے کہ

"پان اسلامزم کی تحریک یورپ کی گوری قوموں کو خوفناک ہوا، اور گوری اقوام کو نگل جانے والا اژدہا نظر آنے لگی"

جو چیز انگریزوں کے خیال میں کہ وہ بھی گوری قوم ہونے کا فخر رکھتے ہیں، اژدہا نظر آتی ہو اُسکے سبب اگر اُنکے کسی یارِ وفادار کو دبے جاتے ہوں اور اُسکی اطلاع ایک ایسا مخبر پہونچائے جو دنیا کو باور کرانا چاہتا ہے کہ وہ بانیٔ اسلام علیہ السلام کا نواسہ ہے اور اُنکے مقربین بارگاہ سے قرابتِ قریبہ کے تعلقات اختصاصی رکھتا ہے تو ظاہر ہے کہ انگریزوں کے دلوں میں اپنے یار وفادار کی طرف سے حسنِ ظن نہ بڑھے گا بلکہ وہ اگر اپنے یار وفادار کے دشمنِ جانی نہ بن جائیں جب بھی اس میں ذرا شک نہیں کہ اُنکے دلوں میں بدگمانی اور خوف کا جاگزیں ہو جانا بالکل یقینی ہے۔ اور یہی وہ سب سے بڑی اسلامی خدمت ہے جو مقدس ڈاکو کے ہاتھوں انجام پا سکتی تھی۔

حسن نظامی کا یہ خط بہت مختصر ہے۔ چیف کمشنر صاحب سے مفصل گفتگو ہونے کا ذکر اسمیں موجود ہے اور ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ چند سطروں کے خط میں جب اس قدر زہر بھرا ہوا ہے کہ خود راقم تحریر کی دلی تمنا یہ ہے کہ خط پڑھ کر فوراً چاک کر دیا جائے اور کسی کو اطلاع نہ ہونے پائے، تو مفصل گفتگو میں خدا معلوم ظفر علی خاں اور حضور نظام کے تعلقات کو کس کس پیرایہ سے بیان کیا گیا ہوگا۔ اور چیف کمشنر نے پان اسلامزم کے اژدہے سے خوف کھا کر اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ گورنر جنرل اور پنجاب کے لاٹ صاحب کو دونوں کے خلاف کتنا بھرا ہوگا۔

قیاس کن زگلستانِ من بہارِ مرا

الناظر کے نئے دور میں، جو جنوری سنہ ۱۹۲۷ء سے شروع ہوتا ہے، ذاتی افکار و ترددات اور مشاغل کے ہجوم و کثرت نے اس کا موقع نہیں دیا کہ خواجہ صاحب کے اُن کارناموں پر کوئی تبصرہ کیا سکتا جنکی بدولت مولانا محمد علی نے انکو تبلیغی راجہ کا لقب عطا فرمایا ہے۔ اسکے یہ معنی نہ سمجھے جائیں کہ خواجہ صاحب کی بازی گریوں اور شعبدہ بازیوں پر ہماری نظر نہیں رہی! خدانخواستہ خواجہ صاحب نے اس عرصہ میں پارسائی کی قسم کھائی تھی۔ اب جو یہ سلسلہ پھر گیا تو خدا نے چاہا خواجہ صاحب کے اس نئے اور بظاہر نہایت کامیاب سوانگ سے بھی ناظرینِ الناظر روشناس ہو جائیں گے۔ وما توفیقی الا باللہ

۲۲۔ جنوری سنہ ۱۹۲۷ء

ظفر الملک

(الناظر، نومبر ۱۹۲۶ء)

خبر دہن

ہندوستان کے تمام علم دوست اصحاب یہ سنکر نہایت افسوس کرینگے کہ خان بہادر شمس العلما مولوی ذکاء اللہ دہلوی نے انتقال فرمایا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مرحوم کے ذوق علمی کا اندازہ اس سے بخوبی ہوسکتا ہے کہ سنہ ۱۸۵۵ء سے سنہ ۱۹۱۰ء تک اونکی تصانیف و تراجم کی تعداد تفصیل فن حسب ذیل تھی۔ تاریخ (۱۸) ریاضی (۸۷) طب و ہیئت (۹) ادب (۱۶) اخلاق (۶) سیاست مدن (۷) کل ۱۴۳۔ ان کتابوں کے سوا وہ بکثیر التعداد مضامین کی ملک کے مختلف اخبارات و رسائل میں وقتاً فوقتاً شایع ہوتی رہی وہ بھی ایک آدمی کے لیے کچھ کم نہ تھی۔ اردو کے تمام مصنفین میں مختلف فنون پر اس کثرت سے آجتک کسی نے نہین لکھا۔ اور یہ ایک بلند فضیلت ہے۔ امید ہے تمام بہی خواہان اردو ہمارے ساتھ مرحوم کی وفات پر اظہار رنج اور اونکے لیے دعاے مغفرت کرنے مین ہم آہنگ ہونگے۔ ہمین مرحوم کے پسماندگان سے دلی ہمدردی ہے۔

خان بہادر مرزا سلطان احمد کے نام نامی سے تمام وہ حضرات بخوبی واقف ہین جو اردو رسالون کو گاہے ماہے بھی پڑھ لیا کرتے ہین کیونکہ ہندوستان کے طول و عرض مین شاید بہت کم ایسے رسالے ہونگے جو اونکے رشحات قلم سے فیضیاب اور اون کے علمی چشمۂ فیض کو سیراب نہ ہوتے ہون۔ الناظر کے حال پر بھی اونکی خاص توجہ ہے۔ چند روز ہوے اونپر ایک عجیب حادثہ گذرا جسکی مختصر کیفیت اونکے گرامی نامہ سے اقتباس کرکے درج ذیل کیجاتی ہے:۔

"مین ۵ نومبر سنہ ۱۹۱۰ء کو میل مین جالندھر سے لاہور کو سوار ہوا جب ٹرین ۱۱ بجکر ۱/۲ ۱۱ بجے دن کے مانانوالہ اسٹیشن پر پہونچی تو وہان سے گذر کر مجھے معلوم ہوا کہ بندوق چلی ہے اور میرے سر کے پچھلے حصہ مین بندوق کی گولی لگی ہے۔ مین نے فوراً مارے درد کے سر پر جو ہاتھ مارا تو کوئی ۳ یا ۴ انچ کے قریب سر کا حصہ متورم تھا اور سخت درد۔ اوسکے ساتھ ہی دیکھا کہ گاڑی مین شیشہ گلاس کے چند ٹکڑے بھی پڑے ہین۔ اسکے بعد فوراً مجھے ۱۰۴ درجہ تک بخار ہوگیا اور بدحواسی۔ آخر مین لاہور آکر اترا اور ۷ کی شام تک بیمار رہا اور ۹ بجے تک ورم رہا۔"

(الناظر۔ یکم دسمبر ۱۹۱۰ء)

ضمیمہ ۱

سرسید مرحوم کی رائے

مولانا شبلی ۱۸۹۳ء میں سفرنامہ کی ترتیب میں مشغول تھے، کہ منشی سراج الدین احمد صاحب اڈیٹر انیسویں صدی نے سیرۃ الفاروق لکھ کر شائع کر دی۔ چنانچہ سید صاحب نے اپریل ۱۸۹۳ء میں منشی سراج الدین احمد صاحب کی پیش قدمی کے متعلق حسب ذیل مضمون شائع کیا۔

"اسمیں کچھ شبہ نہیں ہے کہ ہمارے کالج کے پروفیسر مولوی شبلی نعمانی نے اپنی تصانیف سے ملک کو بہت کچھ فائدہ پہنچایا ہے، المامون، سیرۃ النعمان، کتبخانہ اسکندریہ اور الجزیہ بے مثل اور بے نظیر کتابیں ہیں، اور اگر وہ نعوذ باللہ اپنے رسالہ الجزیہ کی نسبت مسلمانوں کو مخاطب کرکے یہ کہیں کہ "فاتوا بسورۃ من مثلہ" تو کچھ تعجب نہ ہوگا"[1]

ضمیمہ ۲

جرمن مستشرق کی رائے

علماء اور مصنفین ہند میں مجھے چند باتوں کی خاص کمی محسوس ہوئی ہے، اول مادہ تحقیق و تدقیق دوم جانچ پڑتال، سوم جدت، چہارم استحکام رائے، اور قوت استدلال علماء اور مصنفین ہند کا متخیلہ تو بیشک زیادہ زوردار ہے لیکن انہیں مبالغہ کی عادت ہے انکی تاریخی حکایات اور جنگی افسانے مبالغہ اور متضاد خیالوں سے پر ہیں برخلاف اسکے اہل مغرب کے دماغ منطقی استدلال اور موزوں اور درست الفاظ استعمال کرنیکے عادی ہیں۔ اہل مغرب کے محققانہ اور عالمانہ معیار کے لحاظ سے اگر کوئی ہندوستانی تصانیف تحقیق و تدقیق کا پایہ رکھتی ہیں تو وہ علامہ شبلی کی تصانیف ہیں[2]

ضمیمہ ۳

علامہ شبلی کی تحریر اردو نثر کی معراج ہے (اقبال)

ضمیمہ ۴

زبان اردو کی خدمات

انجمن ترقی اردو

مولانا جبتک علی گڑھ میں رہے، ملازمت کی پابندیوں کی وجہ سے اپنے ضلع کے محدود قرب کے علاوہ کوئی عام قومی خدمت نہ کر سکے، ندوہ کی خدمات کیلئے ملازمت سے سبکدوشی حاصل کی لیکن خانگی مجبوریوں کی وجہ سے چند روز کیلئے حیدرآباد کی ملازمت پر مجبور ہوگئے، تاہم اب انکی عام قومی خدمات کا سلسلہ شروع ہوگیا جسکی پہلی کڑی انجمن ترقی اردو تھی، چنانچہ جب محمڈن کانفرنس میں اسکی بنیاد ڈالی گئی، تو سکرٹری شپ کے لیے مولانا کا انتخاب ہوا، اور مولانا نے ایک مدت تک اسکے فرائض ادا کیے، ہربرٹ اسپنسر کی کتاب ایجوکیشن کا ترجمہ مولانا ہی کے زمانہ میں ہوا،

---

[1] حیات شبلی [2] الناظر

اسکے علاوہ اور بھی متعدد کتابوں کے ترجمے ہوئے لیکن مولانا کو جیسا کہ انکا خود بیان ہے، نظر آیا کہ وہ انجمن کا کام اپنے بلند معیار کے مطابق انجام نہیں دے سکتے، اسلیے انھوں نے اس عہدہ کو دیانت کے خلاف سمجھا، اور مستعفی ہو گئے،

ورناکیولر اسکیم کمیٹی الہ آباد اُردو کو ناگری ہونیسے بچایا

سنہ ۱۹۱۳ء میں الہ آباد گورنمنٹ نے ایک ورنیکولر اسکیم کمیٹی قائم کی تھی، جسکا مقصد یہ تھا کہ اسکولوں اور کالجوں میں دیسی زبان کا کورس ایسی زبان میں مرتب کیا جائے جو اُردو ہندی دونوں زبانوں میں ایک ہی عبارت والفاظ کے ساتھ پڑھا جا سکے نیز اُردو کے کورس میں بھاشا لٹریچر بھی ضروری قرار دیا جائے، مسٹر برن چیف سکریٹری نے اسکے متعلق ایک اسکیم مرتب کی تھی، جسکی دفعہ ۳ و ۴ میں اس تجویز کی تائید میں حسب ذیل دلیل قائم کی تھی،

اُردو زبان اور ہندی زبان دراصل ایک ہی زبانیں ہیں، کیونکہ انکی گرامر متحد ہے اور جن زبانوں کی گرامر متحد ہوتی ہے، وہ زبانیں دراصل ایک ہی ہوتی ہیں اس بنا پر ورنیکولر کورس ایسی مشترک زبان میں بننا چاہیئے، کہ صرف رسم خط (کیرکٹر) کے فرق سے وہ اُردو اور ہندی دونوں میں پڑھا جائے،

لیکن ہندی زبان کی ایک یہ خصوصیت ہے کہ اسکی نظم ونثر کی گرامر مختلف ہے اسکی ہندی نظم کی گرامر کی واقفیت اور عبارت کیلئے "رامائن تلسی داس" کورس میں داخل ہونی چاہیئے ہندوؤں کیلئے وہ لازمی کردیجائے اور مسلمانوں کیلئے بھی اسکا پڑھنا مناسب ہوگا،

مولانائے مرحوم بھی اس کمیٹی کے ممبر تھے، اس موقع پر اردو زبان کے تحفظ وبقا کیلئے انھوں نے جو یادداشت مرتب کی تھی معارف میں شائع ہو چکی ہے،

مولانا حبیب الرحمن خان شروانی کے نام

مکرمی تسلیم، میں اُردو ورنیکولر اسکیم کمیٹی کی شرکت کی غرض سے الہ آباد گیا تھا، مسٹر برن نے چند نہایت مضر تجویزیں اُردو کے حق میں پیش کی تھیں، ایک یہ بھی تھی، کہ رامائن بھاشا انٹرنس کے امتحان میں لازمی کر دیجائے، اور اُردو جو مدارس میں ہے وہ ایسی کر دیجائے، کہ ہندی بنجائے، عجیب منطقی دلائل گھڑے تھے، پنڈت سندرلال وغیرہ کمیٹی کے ممبر تھے، تیسرے جلسہ میں کامل فتح ہوئی، تمام تجویزیں اڑ گئیں اگرچہ افسوس ہے کہ مسلمان ممبروں نے کوئی مدد مجکو نہ دی اور دیتے کیا، دینے کے قابل بھی نہ تھے،

"شبلی"

(الناظر، ...)

۱۸؍ دسمبر ۱۹۲۵ء

ایک خط

(جس کے متعلق فی الحال کوئی رائے ظاہر نہیں کی جاتی)

مکرمی جناب ایڈیٹر صاحب رسالۂ الناظر

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ۔ دسمبر سنہ حال کا رسالۂ الناظر میں نے پڑھا۔ مقدمۂ فلسفۂ اجتماع' پڑھنے کے دوران میں (صفحہ ۴۴ پر) وہ واقعہ نظر پڑا جو شمس العلما مولانا نذیر احمد صاحب مرحوم کے رسالۂ امہات الامہ کے متعلق ہے۔ مجھ کو حیرت ہوئی کہ ایک فلسفہ کی کتاب میں واقعہ اس قدر بے تحقیق درج کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب واقعات صحیح نہ ہوں گے تو نتائج بھی غلط نکلیں گے۔ چونکہ میں اس واقعہ کا عینی شاہد ہوں اور اول سے آخر تک حصہ لینے والا میں تھا۔ نیز ایک ایسے نامور کی ذات پر حرف آتا ہے جو آج دنیا میں نہیں ہے۔ اس لیے میرا فرض ہے کہ میں نے جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے وہ قلمبند کر دوں تاکہ آیندہ غلطی سے اہل قلم محفوظ رہیں۔ اس سے پہلے بھی بعض مشہور نامہ نگار اس واقعہ کو ادیبانہ رنگ آمیزی سے لکھ چکے ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ مورخانہ تحقیق اُنھیں بھی نہ تھی۔

واقعہ یہ ہے کہ جب امہات الامہ شایع ہوئی تو اُسکے بعض مقامات پر نہ صرف علما بلکہ اور اہل نظر کو بھی سخت اعتراض تھا۔ اسی بنا پر بعض علمانے تکفیر مؤلف کے فتوے شائع کیے۔ اسپر شورش ہوئی جو کچھ ہوئی۔ اسکے بعد بعض اہل فہم کے سمجھانے سے مؤلف مرحوم کو اپنی غلطی پر تنبّہ ہوا اور اُنھوں نے اعتراف کیا کہ مجھ سے غلطی ہوئی جس کو اب میں واپس لیتا ہوں۔ اسی بنیاد پر اُنھوں نے تمام نسخے رسالۂ مذکور کے (جو اُنکے پاس موجود تھے) اُن صاحب کے سپرد کر دیے جن کے سامنے اعتراف کیا تھا۔ جو رسالے شائع ہو چکے تھے (اُن کی تعداد نوٹ کی تھی) اُنکی فہرست دیدی اور اپنی طرف سے اجازت دی کہ وہ خریداران

(اگر لیں ہوتو) واپس لے لیے جائیں۔ یہ بھی خواہش کی کہ اُنکے اعتراف کا مسلمانوں کے
کسی عام مجمع میں اعلان کیا جائے (مثلاً جمعہ کو جامع مسجد میں) اور تمام رسالے تلف کردیے۔
ابھی رسالے تلف نہ ہونے پائے تھے کہ ندوۃ العلماء کا اجلاس سالانہ شہر دہلی میں ہونا قرار
پایا۔ شمس العلماء مرحوم کی اُسوقت باصرار یہ خواہش ہوئی کہ ندوۃ العلماء میں جو علما تشریف
لائیں اُنکے سامنے یہ معاملہ پیش ہو کر طے ہو اور علمائے موصوف کی جانب سے یہ اعلان ہو کر
رجوع کے بعد مؤلفِ رسالہ کے ذمہ کوئی الزام نہیں رہا۔ یہ واقعات میں نے معتمد ذریعہ سے
سنے ہیں۔

بربنائے خواہش بالا اجلاس ندوۃ العلماء کے خاتمہ پر مشہور علما کا ایک جلسہ کیا گیا
(یہاں سے واقعات میرے چشمدید ہیں) اُس میں معتمد شہادت پیش ہوئی کہ مولفِ رسالہ نے اپنی
غلطی کا اعتراف کرکے مضامین رسالہ کو واپس لیا اور رسالے تلف کرنے کے واسطے حوالے
کردیے۔ یہ پیام سُن کر علمائے حاضرین نے بالاتفاق (جہاں تک اب مجھکو یاد ہے) مؤلف
رسالہ کی براءت لکھی اور طے کیا کہ اب اُنپر کوئی الزام نہیں۔ اس تحریر کے بعد شب کو تمام
رسالے جلا کر تلف کردیے گئے۔ جلانے کے بعد آندھی آئی اور مینھ برسا۔ ہوا نے خاکستر کو
اُڑا دیا اور پانی نے زمین دھو کر صاف کردی۔

جس مجمع علما میں براءت نامہ لکھا گیا اُس میں علامہ شبلی مرحوم موجود نہ تھے نہ اُنکے
دستخط براءت نامہ پر ہیں۔ نہ اُنھوں نے کتابوں کے تلف کرنے میں حصہ لیا۔

میں تیار ہوں کہ اگر کسی صاحب کو شک ہو تو معتبر شہادت سے واقعات بالا ثابت کردوں۔

یہ تو بالکل ظاہر ہے کہ اگر مؤلف مرحوم رضامند نہ ہوتے تو رسالے کیوں حوالہ کردیتے۔

بیانِ بالا سے واضح ہو گیا ہوگا کہ علامہ شبلی کے متعلق جو کمزوریاں مضمونِ الناظر میں ظاہر کی گئی
ہیں اُن کا دامن اُن سے پاک تھا۔

نیازمند حبیب الرحمن شروانی

(الناظر، جنوری ۱۹۱۶ء)

"ایک خط" کے متعلق کچھ عرض

جنابِ من

آپ کے رسالہ کے جنوری نمبر میں مولوی حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی نے مولانا شبلی کے متعلق ایک واقعہ مندرجۂ "فلسفۂ اجتماع" کی تغلیط فرمائی ہے۔ مجھے اس سلسلہ میں مختصراً دو باتیں کہنا ہیں:-

(۱) نفسِ بشری کی نیرنگی و تلوّنِ فطری سے متعلق مجھے جس حد تک استشہاد کرنا تھا، وہاں تک وہ واقعہ بالکل صحیح ہے۔ اور یہ میں خود مولانا شبلی کی روایت کے اعتماد پر لکھ رہا ہوں۔ مولانا مرحوم نے ۱۹۱۳ء میں یہ واقعہ خود مجھ سے بیان فرمایا تھا، اور مجھے اُنکے بیان کے بعد اسکی صحت کے لیے کسی مزید شہادت کی ضرورت نہیں۔ مولوی حبیب الرحمٰن خاں صاحب بہ حیثیت شاہد عینی، اور اس واقعہ میں اول سے آخر تک حصہ لینے والے کے، اس کے جو کچھ جزئیات و تفصیلات تحریر فرماتے ہیں، (یہاں تک کہ بنہایت تحقیق وہ کتابوں کے جلائے جانے کے بعد، آندھی کے آنے، اور مینھ کے برسنے، ہوا کے خاکستر کو اُڑا دینے، اور پانی کے زمین کو دھو کر صاف کر دینے، تک کو نظرانداز نہیں فرماتے) وہ سب حرف بہ حرف صحیح ہوں گے۔ لیکن ان سے مجھے کچھ واسطہ نہیں۔ میرے مقصد کے لیے صرف اتنی حقیقت بس کرتی ہے، کہ "کتب خانۂ اسکندریہ" کے مصنف نے ان کتابوں کی بربادی میں تائید و اعانت کی۔ اور اسکے راوی کوئی زید و عمر نہیں، بلکہ خود مصنف موصوف تھے۔

(۲) مولوی صاحب مکرر غور فرمائیں، تو اُنھیں خود نظر آ جائے گا کہ جن الفاظ میں، اور جس حیثیت سے یہ واقعہ "فلسفۂ اجتماع" میں منقول ہے، اُن سے مولانا مرحوم کی اہانت کا کوئی خفیف پہلو بھی نہیں نکلتا، بلکہ وہ تو اُنکی عظمت کا عین اعتراف ہے۔ مقصود یہ دکھانا تھا، کہ دنیا کی بڑی سے بڑی انسانی ہستیاں بھی انسانیت کی فطری کمزوریوں سے پاک نہیں رہ سکتیں۔ اگر

سقراط، و مولانا شبلی وغیرہ کی زندگی سے ظاہر ہے۔ اگر یہ طرز بیان بھی اہانت آمیز ہے، تو میں نہیں جانتا کہ اعترافِ عظمت کے لیے کیا اسلوب اختیار کرنا چاہیے۔ مولانا مرحوم سے مصنف "فلسفۂ اجتماع" کو عقیدت و شیفتگی تھی، اُسے وہ آج سے پانچ برس پیشتر انھیں صفحات میں حافظ کی زبان سے یوں ادا کر چکا ہے :-

عاشق روے تو صاحب نظرے نیست کہ نیست

منتِ خاک درت بر بصرے نیست کہ نیست

اور مولانا کی وفات بے ہنگام نے اس جوشِ عقیدت کو بجائے ضعیف کرنے کے اور قوی کر دیا ہے البتہ وہ اُنکی علمی یا اخلاقی معصومیت کا کبھی قائل نہیں رہا۔ اور یہ ایک ایسی رائے ہے، جس کی تردید کے لیے ہمارے کرم مولوی صاحب موصوف بھی قلم اُٹھانا غالباً غیر ضروری خیال فرمائیں

۸، فروری سنہ ۱۶ء

عبد الماجد

(الناظر، فروری ۱۹۱۶ء)

ترک قلم

قلم کو نیزے کی بجائے، اور چاقو کو تلوار کے عوض لینے کی حماقت یا دوراندیشی کا ارتکاب مجھ سے تین چار پشت پہلے میرے مرحوم آبا و اجداد سے سرزد ہوا ہوگا! مین نے آنکھین کھولین تو نیزہ و تلوار اپنے قبضۂ قدرت سے بہت دور پایا! مجبوراً قلم دوات ہی میری ساخت کے لیے ماحول بنتی رہی!

میرا حافظہ بتاتا ہے کہ مین نے بذاتِ خود اپنے جوشِ جذبات کا اظہار قلم کے ذریعہ سے' بہ چند احباب ہمت افزائی و تاکید متواتر، علیگڈھ کالج کے حدودِ اربعہ مین رہ کر سب سے پہلے "مخزن" کے صفحات پر کیا! یہ وہ زمانہ تھا کہ جب شیخ عبدالقادر صاحب بیرسٹر اور شیخ محمد اکرام صاحب (جو اسوقت تک بیرسٹر نہین تھے) مخزن کو ہر لحاظ سے دلفریب، نظر فریب، اور کامیاب بنانے مین بہت کچھ راستہ طے کر چکے تھے! "مضمون نگاری" نے اسوقت تک میرے دل و دماغ مین ایک مستقل مرض کی صورت اختیار نہین کی تھی اور مین کبھی کبھار اس شکایت مین آب و ہوا کی نامساعدت سے مبتلا ہو جایا کرتا تھا! اسکے بعد تمدن کی پیدائش اور میرے عنایت فرما عبدالراشد صاحب الخیری کا اصرار اس شکایت کے المضاعف ہو جانیکا باعث ہوے! اسی زمانہ مین بدقسمتی سے "الناظر" نے بھی اپنا اثر مجھ پر ڈالنا شروع کیا! ایک عرصہ تک غالباً عرصۂ دراز تک۔ الناظر کے قطع تعلق کرنے والے ایڈیٹر مولوی اسحٰق علی صاحب ظفر الملک نے مجھے فرصت سے نہ بیٹھنے دیا! میرا خیال ہے کہ وہ شکایت ان حضرت کے بدولت مرض کہنہ بن گئی! اب مجھے بذاتِ خود، فرصت کے اوقات بجائے آرام کے لکھو اس ابروترن بکواس مین ضایع کرنا پڑے! نتیجہ یہ ہوا کہ سال بھر کے بعد اس

تپ کے تیسرے درجہ تک پہونچ گیا، اب اگر لکھنے کو کچھ نہ ملتا تو دماغ کو انگڑائیاں اور جمائیاں آنے لگتیں! متعدد رسائل اس طوفانِ حماقت کے زمانہ میں میری بکواس کے شکار بنا کئے اور یہ مرض ایک مہلک صورت لیتا رہا!

مجھے فی الحقیقت اپنی قلمی سوانحعمری لکھنی مقصود نہیں ہے بلکہ صرف یہ اظہار کرنا ہے کہ قسمت کسی کسی طرح

اسی عرصہ میں مجھے ایسی بندش میں باندھ دیا جو مضمون نگاری کا بار خرافات کسی طرح نہیں اٹھا سکتی! مجبوراً دست کشی کی کوشش میں مبتلا ہوتا ہوں اور بہ ہزار دقت لکھواس کی لہ رہکر پیدا ہونیوالی تحریک کو گھونٹتا ہوں! کسی قدر کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ کہ عزیزم مسٹر وحید احمد ولایت سے واپس آکر "نقیب" کو وجود میں لاتے ہیں! اب جس قدر فائدہ خاموشی کی بدولت ایک عرصہ سے رفتہ رفتہ ہوتا چلا تھا، وہ سب مسٹر وحید کی ضد کے نذر ہوجاتا ہے اور نقیب کے صفحات بار بار مجھے کالے کرنے پڑگے ہیں! اس ناگوار بدپرہیزی سے ظاہر ہے کہ مرض کہنہ از سر نو عود کر آتا ہے اور آثار نہایت برے نظر آنے لگتے ہیں! ادھر النا ظر! "کہکشان" اور "مخزن" ہر طرف سے شکایات کا دار شروع ہو جاتا ہے! میں سکتہ کے عالم میں سوچتا ہوں "خدایا! یہ کیا عذاب آیا؟"

بظاہر اس مرتبہ جانبری کی مطلق امید نہیں رہتی کہ "نان کوآپریشن" کی صدا ملک کے ایک ایک گوشہ سے گونج اٹھتی ہے! میں اس کو سمجھتا ہوں تو کچھ ڈھارس بنتی ہے اور ظفر الملک صاحب کی شکایات کا جواب دینے بیٹھ جاتا ہوں! جن کا الناظر مجھے اور زیادہ ہمت بخشتا ہے۔ جب میں کہ "نان کوآپریشن" کے معنی "ترک تعلق" کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں! اسمیں آپ کو بھی شک نہیں ہوسکتا کہ باوا آدم اگر "نان کوآپریشن" پر عامل ہوئے ہوتے تو یقیناً آج اُن کی ذریات خلد بریں کے حدود اربعہ کے اندر خالص سودیشی میووں اور دودھ کی نہروں سے فائدہ حاصل کرتی ہوتی!

"نان کوآپریشن" کے معنی کیا ہیں؟ . . . . مجھے معلوم نہیں! ممکن ہے، ترکِ تعلقات ہوں، ترکِ حیوانات ہوں ترکِ واہیات ہوں۔ یا مرگ مفاجات ہوں! عملی دنیا میں اس کا مقصد یہ ہے کہ اگر آپ پاٹ دار آواز رکھتے ہیں تو کبھی برسات میں ملہار نہ گائیں! اگر تیز نظر ہوں جب بھی اچھی صورت کو جان بوجھ کر نہ دیکھیں، اگر حجام ہوں تو روئے زیبا کی صفائی سے دست بردار ہوجائیں۔

اگر مضبوط ٹانگیں رکھتے ہوں تو اُن کے بَل پر نہ چلیں! ایک صاحب اسکے معنی خانہ بدوشی اور دوسرے صاحب (جو بلندی کے لحاظ سے ہندوستان کی تمام لاٹوں سے اونچی لاٹ ہیں) اسکو خودکشی بتاتے ہیں۔ او ر دروغ بر گردنِ راوی، ایک محقق نے اسے علمی دُنیا سے زندہ درگور ہو جانا ہے! غالباً یہ خیال صحیح ترین سمجھا جا سکتا ہے؟ کیونکہ ترکِ ضروریات، عادات، نفسیات، تعلقات اور خدا جانے کون کون "آت" کی انتہا ترکِ دُنیا و مافیہا قرار پاتی ہے اِس وہی انسان اور ڈھاک کے تین پات رہ جاتے ہیں! اسمیں کسی شبہ کو گنجائش بھی نہیں، سچ کہتے ہیں "ہے آخر موت"! اور واقعی یہ سب سے بڑا "نان کوآپریشن" ہے جس پر ہر انسان کو با تفریقِ رنگ در وغن ایک نہ ایک دن عامل ہونا ہی پڑتا ہے۔ یہ بات کہ اس ناگزیر نان کوآپریشن" کو اپنی خوشی سے کس قدر افراد منظور کرتے ہیں۔ شاید حضرت عزرائیل کے سوا کوئی نہیں بتا سکتا!

جسطرح کُلمبس نے نئی دُنیا، آئزک نیوٹن نے کشش زمین، پنجاب نے خضاب لاجواب، مائیکل اوڈوائر نے مارشل لا، روسیوں نے بالشوزم، چند مجتہدین اودھ نے مخالفتِ خلافت، اور لیڈروں نے صراطِ مستقیم دریافت کی۔ اسی طرح اگر مہاتما گاندھی نے ستیا گرہ یا "نان کوآپریشن" معلوم کر لیا تو کیا تعجب ہے! البتہ اسمیں شبہ ہے کہ یہ نو ایجاد طریقہ عمل "زامبک" یا "امرت دھارا" کی طرح ہر مرض کی دوا بننے کی صلاحیت رکھتا ہے یا نہیں؟ حامیان مقاومت مجہول بڑے زور کے ساتھ اس طریق عمل کو ہر موقعہ کے لیے اکسیر اور ہر زہر کے لیے تریاق مانتے ہیں! اگر ایسا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ "خیرات اپنے گھر سے ہی شروع کیوں نہ کی جائے" اور ذوی القربےٰ کو اس نعمتِ عظمیٰ سے کیوں محروم رکھا جائے!

ظفر الملک صاحب مجھے لکھتے ہیں کہ میں "نان کوآپریشن" پر ایک مضمون لکھوں! میں اپنے معتقدات و جذبات اندرونی کی سچی کیفیت معلوم کرتا ہوں! چپ و راست نظر دوڑاتا ہوں! اپنی حالت موجودہ کا موازنہ کرتا ہوں اور آہستہ سے قلم رکھ دیتا ہوں! کیوں؟ ...... اس کا صحیح جواب اگر دے سکتا تو قلم ہی کیوں رکھ دیتا! خیر! چھوڑیئے اِس تکلیف دہ خیال کو! ہاں! میرے خیال میں "نان کوآپریشن" کے معنی مختصراً "گفتن بوقت خاموشی" نظر آتے ہیں! یعنی آپ کا دل اگر ہنسنے کو چاہتا ہو تو بھی بسور بسور کر رہ جائیے! اس تعریف کو صحیح مان کر میں نے اپنی طبیعت کا اندازہ کیا معلوم ہوا دل و دماغ ایک نالہ پُر درد کے لیے آمادہ ہے! میں نے اُسی اصول کے مطابق طبیعت کے بر خلاف ہنسنا اختیار کیا! میرے زہر خندہ کو "نقیب" کے سوا اور کوئی جگہ نہ ملی اور غالباً وہی موزوں بھی

تھی! یارانِ قدیم اس پر بھی شاکی ہیں تو میں پوچھتا ہوں کیا کروں؟ جو لکھنا چاہتا ہوں نہیں لکھ سکتا۔ اور جو کچھ لکھ سکتا ہوں وہ لکھنا نہیں چاہتا!

قصہ مختصر! جوں کا الناظر اور ظفر الملک صاحب کا تعلق میری نظر سے گذرتا ہے! "دیوانہ را ہوئے بس است" فوراً صبر و سکون کی امید ہو جاتی ہے! سوچتا ہوں میں بھی "ترک قلم" کیوں نہ اختیار کروں۔ اسمیں "بیک کرشمہ دو کار" کا نتیجہ مضمر ہے! سب سے پہلے انگلی کٹا کر شہیدوں میں داخل۔ دوسرے آئے دن کے تقاضوں سے نجات! دماغ تائید کرتا ہے، دل تیار نظر آتا ہے! اور میں فوراً عزت کے ساتھ قلم سے دست کش ہو جاتا ہوں!

اب میں بھی اعلان کر سکتا ہوں کہ میں اس مرض کہنہ سے افاقہ مستقل کر چکا! میرا ارادہ ہوا کہ میں اپنی تصنیفات و تالیفات کے جملہ حقوق ظفر الملک صاحب کی تقلید میں اپنی اہلیہ صاحبہ کے نام منتقل کر دوں مگر کسی طرح اس کی اہل نہ نظر آئیں، اور مجبوراً مجھے تمام حقوق اپنے نابالغ لڑکے کے نام زبانی طور پر ہبہ کرنے پڑے۔! چونکہ وہ ابھی کمسن اور نابالغ ہے اسلیے اسکے متعلق جملہ خط و کتابت بنام "ایڈیٹر نقیب" ہونی چاہیئے جو بطور مینیجر کل معاملات کا بار اٹھائیں گے۔" آئندہ کوئی صاحب سہواً یا احیاناً مضمون لکھنے کے متعلق راقم الحروف کو تحریر نہ فرمائیں خصوصاً مولوی نور الرحمن صاحب جنھوں نے بقول ظفر الملک صاحب یاددہانی کے خطوط کی بوچھار شروع کر دی ہے اور جو ہرگز نہیں نہ لیں گے"! اس آخری فقرہ کی وجہ سے مجھے "ترک قلم" کا اعلان کرنا پڑا۔ امید ہے کہ تمام رسائل اسے بقدر حاجت نوٹ کر لیں گے!

آبا و اجداد کے ترک شمشیر سے قلم پیدا ہوا۔ کیا اب میرے ترک قلم سے کبھی پھر وہی . . . .

لاحول ولا قوۃ! این خیال ست و محال ست و جنوں!!

سلطان حیدر (جوش)

(الناظر، ستمبر ۱۹۲۱ء)

یکطرفہ جنگ

بخدمت ایڈیٹر صاحب النّاظر۔ السلام علیکم۔ آپ کو معلوم ہے، کہ میں ادھر کئی ہفتے حیدرآباد، بمبئی، بھوپال، باندہ وغیرہ کے سفر میں رہا۔ اثنائے سفر میں دو مختلف مقامات پر، دو مختلف صاحبوں نے، جن سے عین اُسی وقت تعارف ہوا تھا، مجھ سے فرمایا، کہ "آج کل آپ سے اور نیاز صاحب سے تو خوب چل رہی ہے"۔ میں اس "یکطرفہ جنگ" سے محض ناواقف تھا، اس لیے صاف لفظوں میں میں نے عرض کردیا، کہ "نگار میرے پاس نہیں آتا، اس لیے مجھے کچھ خبر نہیں کہ اُس میں کیا لکھا جارہا ہے"۔ سفر سے واپس آیا ہی تھا، کہ کل آپ کا النّاظر بابت جنوری نظر آیا، جس میں جناب زبید احمد صاحب کا مضمون اسی موضوع پر پڑھ کر اور بھی حیرت ہوئی۔

یہ زبید احمد صاحب کون ہیں؟ مجھ سے ان سے تعارف الگ رہا، شاید مراسلت بھی کبھی نہیں ہوئی۔ صرف اتنا یاد آتا ہے، کہ معارف میں ان کا ایک مضمون شاید نماز کے اوقاتِ پنجگانہ کی تائید میں پڑھا تھا، اور اُسوقت انکی دینداری سے دل خوش ہوا تھا۔ ان بیچارے نے از خود سے بیٹھ کر میری جو بقدر حمایت و وکالت فرمائی، اُسکا چاہیے تو تھا مجھے شکریہ ادا کرنا، لیکن میں ایسا ناشکرا، کہ بجائے شکریہ کے اُلٹی اُن سے شکایت رکھتا ہوں، کہ ایک غیر ضروری ولاحاصل مضمون کی تحریر میں اُنھوں نے اپنا وقت عزیز کیوں ضایع فرمایا۔ حُسن ظن کے جوش میں میرے متعلق متعدد الفاظ اور فقرے وہ ایسے بھی تحریر فرما گئے ہیں، جنھیں پڑھ کر بجز اسکے کہ میں ندامت سے کٹ جاؤں، اور کوئی نتیجہ نہیں۔ اُنکی خدمت میں مخلصانہ گزارش ہے، کہ ازراہ کرم وہ چلک میں آئندہ ایسی تحریریں میرے متعلق پیش فرمانے سے قطعاً احتیاط و احتراز فرمائیں، اور اگر ایسی ہی اُنکی عنایت و محبت میرے ساتھ ہے، تو جو کچھ کہنا ہے، بجائے بندوں سے کہنے کے، بندوں کے پروردگار سے اپنی دعاؤں اد

اور التجاؤں میں عرض کرتا رہا کریں۔ اور بجائے حضرت نیاز سے تخاطب کے "ذاتِ بے نیاز" کی بارگاہ میں اپنی عرض و معروض کو جاری رکھیں۔ یہ نقشے اُنکے بھی انشاء اللہ کام آئیگی اور میرے بھی۔
اسی مضمون سے مجھے علم ہوا، کہ کوئی صاحب عبدالمالک آسفی نامے ہیں، اور شاید انھوں نے بھی کبھی نگار میں میری ہمدردی فرمائی ہے۔ میں ان صاحب سے بھی اصلا واقف نہیں، لیکن اُن کی خدمت میں بھی میری بعینہٖ یہی استدعا ہے، جو جناب زبید احمد صاحب سے میں ابھی کر چکا ہوں۔

الناظر کے اسی مضمون میں نیاز صاحب کا یہ فقرہ میرے متعلق نقل ہوا ہے :-

"میرے سامنے اُنکی کوئی خدمت ملک و قوم، دین و علم ایسی موجود نہیں جسکی بنا پر وہ مجھ سے مطالبہ سرِ عجز کے جھکا دینے کا کریں۔"

بالفرض کوئی ایسی خدمت موجود ہوتی، جب بھی مجھے اس قسم کے مطالبہ کا ہرگز کوئی حق کسی شخص سے بھی نہیں پہنچ سکتا تھا۔ لیکن اس سے قطع نظر کرکے نیاز صاحب نے بات ہی بالکل سچی ارشاد فرما دی ہے۔ زبید احمد صاحب اپنی غلط فہمیوں کی بنا پر جو رائے چاہیں قائم کریں، لیکن میں اُس خدائے حی و قیوم کو گواہ کرکے جو اُنکے اور میرے سب کے دلوں کے اسرار و خفایا سے واقف ہے، کہتا ہوں، کہ میرے علم و یقین میں بات بالکل وہی ہے، جو نیاز صاحب نے فرمائی ہے۔ میری کوئی خدمت بھی ہرگز قابلِ ذکر نہیں، اور یہ جو زبید احمد صاحب جیسے سادہ مزاج بزرگوں کے دلوں میں محبت پیدا ہو گئی ہے، یہ محض اللہ کا فضل و کرم ہے، جس میں میرے کسی استحقاق کو قطعاً کسی طرح کا دخل نہیں

مضمون میں نگار کی جو اور عبارتیں نقل ہوئی ہیں، اُن سے مترشح ہوتا ہے، کہ نیاز صاحب کے نزدیک میں اپنے متعلق "عجب و غرور، برتری و تفوق کے جذبات خلق" کر رہا ہوں! استغفر اللہ! ثم استغفر اللہ! اس سے بڑھ کر بے بنیاد خیال اور کیا ہو سکتا ہے۔ لیکن اپنے گہرے امراض نفسانی اکثر خود مریض کی نظر سے مخفی رہتے ہیں۔ اگر فی الواقع میں عُجب و غرور کے مرض میں مبتلا ہوں، تو خدائے کریم سے بہ الحاح و تضرع عرض ہے، کہ اس مرض سے نجات دے۔ باقی اگر نیاز صاحب کے پیش نظر سچ جلد ۴ نمبر ۱۰ کی وہ عبارت ہو، جہاں یہ لکھا گیا ہے، کہ مریض کو دوا کے لیے طبیب کے پاس جانا چاہیے، نہ کسی وکیل اور بیرسٹر کے پاس۔ اور اس سے انھوں نے یہ نتیجہ نکالا ہو، کہ مدیر سچ اپنے کو طبیبوں (دین و مذہب کے ماہرین) کے زمرے میں شامل کرتا ہے۔ تو ہمارا تمام ماننا یہ نتیجہ نکالنا کسی طرح سے صحیح نہیں۔ بیرسٹر بہت ممکن ہے کہ اپنے علم و کمال کے زعم میں، اٹکل سے

کچھ اُلٹی پلٹی دوائیں بتا دے، لیکن ایک محض اناڑی شخص اپنے جہل کا اعتراف کرتے نہ شرمائیگا، اور بہت ممکن ہے، کہ وہ کسی مستند طبیب کی بیاض سے کوئی نسخہ نقل کرکے مریض کو پلا دے! میں بلا تصنع، اور بغیر شائبۂ طنز و تعریض' عرض کرتا ہوں، کہ علم و ادب' دین و سیاست، کسی شعبہ میں بھی میری حیثیت اُس اناڑی سے زائد نہیں۔ جو احباب کرام مجھے نیاز صاحب یا کسی صاحب کے مقابلہ میں کھینچ کر لانا چاہتے ہیں، وہ ہرگز میرے اوپر احسان نہیں کرتے۔ بلکہ صریح ظلم کرتے ہیں ذاتی طور پر مجھے کسی صاحب سے بھی ہمسری کا دعوےٰ مطلق نہیں۔ اپنی بے کمالی اور اپنی نارسائی سے میں خود جتنا واقف ہوں، کاش اس کا عشر عشیر بھی زبید احمد صاحب یا اُنکے ہمخیال واقف ہوتے۔

البتہ دین کی توہین و تحقیر کا سوال دوسرا ہے۔ جب کبھی ایسی کوئی صورت میرے علم میں آئیگی، اور مجھے حملہ آوروں سے دین کی حفاظت کی ضرورت محسوس ہوگی، تو اُس وقت انشاء اللہ مقابلہ کروں گا، اور پوری بے جگری سے مقابلہ کروں گا، خواہ مدمقابل کوئی بیرونی حریف ہو، خواہ نیاز صاحب اور اسلم صاحب کی طرح اپنی ہی جماعت کا کوئی شخص۔ اس ادائے فرض کو میری بے کمالی و نااہلی کے احساس و اعتراف سے کوئی تعلق نہیں۔ والسلام

دریاباد۔ ۱۴؍ فروری سنہ ۱۹۲۹ء — عبدالماجد

(الناظر، فروری ۱۹۲۹ء)

آہ! شیخ ممتاز حسین عثمانی

(جناب سید عقیل احمد جعفری صاحب خیرآبادی)

آج لکھنؤ اُجڑ گیا ہے، اس کی خصوصیات مٹ گئی ہیں پھر بھی وہ ہندوستان کے دوسرے مقامات کی بہ نسبت اب تک کسی نہ کسی حیثیت سے کوئی نہ کوئی مقامی امتیاز رکھنے میں ممتاز ہے۔

"نئی دہلی" کی طرح یوں تو لکھنؤ بھی اب ایک نیا لکھنؤ ہو گیا ہے لیکن پھر بھی اس کا ایک حصہ پُرانے لکھنؤ کی جھلک اب تک دکھلا رہا ہے۔

ہونے کو لکھنؤ میں حضرت گنج بھی ہے اور امین آباد بھی لیکن لکھنؤ جسے کہتے ہیں وہ اصل میں اس کا چوک ہے، جو اپنی پتلی پتلی گلیوں، دو رویہ بڑی بڑی عمارتوں اور گنجان آبادی کے سبب سے آج بھی لکھنؤ کی نمائندگی کر رہا ہے۔

لکھنؤ میں کنگ جارج میڈیکل کالج اور نواب آصف الدولہ کے امام باڑہ کا پاس پاس ہونا بھی ایک عجیب لطیفہ ہے۔ کالج اگر انگریزی تسلط کی داستان ہے تو امام باڑہ اپنے سابق اولوالعزم فرمانروا کی شاندار روایات کا ترجمان!!

ہندوستان میں، مشرقی تمدن کے آخری نمونے "لکھنؤ" کی مذہبی سیاسی اخلاقی اور معاشرتی خصوصیات اب بھی دوسرے مقامات کی بہ نسبت آسانی سے تیز کی جا سکتی ہیں۔

ہندوستان بھر میں اسلامی علوم کے مرکز بدل کے ادھر سے اُدھر ہو گئے لیکن "فرنگی محل" اب تک بدستور اپنی جگہ پر قائم ہے۔

اُردو کی وہ شاعری جو بادشاہوں کے سایے میں پرورش پا رہی تھی سلطنت کے ساتھ ختم ہو گئی۔ ا، لکھنؤ میں اب بھی "انیس کا خاندان" بدستور شاعری کا کوس لمن الملکی بجا رہا ہے۔

طب یونانی نے طب اسلامی کا چولا بدل کے ترقی کے عجب عجیب کرشمے دکھلائے اور پھر ٹھیٹ ہندوستانی بن کے اپنے تنزل کی داستان بھی دنیا کو سنائی مگر "جھوائی ٹولہ" میں اس کا طوطی اب بھی ہمیشہ کی طرح داد نمرش الحانی دے رہا ہے۔

لکھنؤ کی وضع قطع اور اس کی تراش و خراش آج بھی وہی خصوصی اور امتیازی حیثیت رکھتی ہے جس کی بنا پر لکھنؤ کو بجا طور سے ہندوستان کا پیرس کہا گیا ہے۔

اور تو اور لکھنؤ کا خربزہ بھی لکھنؤ کی نہاری کی طرح لکھنؤ ہی کے لئے قدرت کی طرف سے اب تک مخصوص ہے۔

لکھنوی مٹی کی یہ بھبوت آفریں تاثیر بھلا زبان پر کہاں تک نہ اثر انداز ہوتی چنانچہ ہوئی اور جی بھر کے ہوئی۔

دہلی کی گلیوں میں، پنجابی کی آمیزش سے، اردو کی جو خاک اڑ رہی ہے وہ اس بات کا گویا ایک اور ثبوت ہے کہ لکھنؤ اس گئی گزری حالت میں بھی چند در چند خصوصیات کا مالک ہے۔ لکھنؤ میں آج بھی بیگماتی زبان آمیزش سے پاک اور مستند ہے۔

لکھنؤ کی زبان! اللہ اللہ! یہاں کے خوانچے والے تک اپنے فصیح و شیریں لہجے کے لیے مشہور ہیں۔ دہلی اسکول، اگر اپنی صاف سادہ اور جذباتی زبان کی خصوصیت پر نازاں ہے تو لکھنؤ کو یہ فخر ہے کہ اس نے دہلی کی اس خصوصیت میں شوخی اور رنگینی کے اضافے سے دہلی اسکول میں چار چاند لگا کے، اردو کے ایک نئے اسکول "لکھنؤ اسکول" کی بنیاد ڈالی ..... وہ پائدار بنیاد! کہ تاریخ ادب اردو لکھنے والا اردو زبان کی ترقی و ارتقا کے مدارج و منازل سے گزرتا ہوا، تاریخ اردو کے مرقع میں، اردو کی آج کل کی کھینچی ہوئی تصویر رکھے گا تو وہ لکھنؤ اسکول کی اس خصوصیت کو نظر انداز نہیں کر سکتا کہ لکھنؤ اسکول نے زمانے کے اتار چڑھاؤ کے باوجود اپنی شوخی و رنگینی کا دامن کبھی ہاتھ سے چھوٹنے نہ دیا۔

چوک، آصف الدولہ کے امام باڑے، فرنگی محل، جھوائی ٹولے، خاندان انیس اور خربزے کی طرح اردو کے لکھنؤ اسکول کی ذہانت و فراست اور شوخی و رنگینی کا ایک خصوصی اور عجوبی نمائندہ، **لکھنؤ کا "اودھ پنچ"** بھی ہے۔ جو شروع سے اب تک باد مخالف کے نرم و گرم، تیز و تند جھونکے سہتا ہوا اپنی جگہ پر پتھر کی چٹان کی طرح قائم ہے۔

تہذیب الاخلاق، تیرھویں صدی، آگرہ اخبار، ریاض الاخبار، فتنہ، نقاد اور صلائے عام سب پیدا ہوئے، بڑھے، پھلے، پھولے اور مٹ گئے لیکن اودھ پنچ (خدا اسے نظر بد سے بچائے) آج تک

اپنی جگہ پر اسی شان اور اسی آن بان سے قائم ہے۔

متذکرہ رسالوں اور اخباروں کے علاوہ پنچ کی حیثیت سے بھی اودھ پنچ کی تقلید میں لکھنؤ اور اطراف لکھنؤ سے بلکہ ہندوستان بھر میں بہت سے اور بھی اخبار نکلے لیکن کسی کو زندگی کی بہار پانچ روز سے زیادہ نصیب نہ ہوئی۔

"سرپنچ" زندہ رہا مگر لکھنؤ اسکول کے اعلیٰ معیار کی ترجمانی کا حق اودھ پنچ ہی کے ذمے رہا۔ اب بھی لکھنؤ کی سرزمین شوخ و رنگین سے متعدد اخبار اور رسالے نکل رہے ہیں لیکن لوکل کلچر کے اعتبار سے (سید جالب مرحوم کے ہمدم کے سوا) اگر دیکھا جائے تو اودھ پنچ کے مقابلے میں وہ گویا ایک سادہ ورق ہیں۔

نقاد، کو اگر یہ فخر ہے کہ اس نے ایم مہدی حسن اور خالد بنگالی جیسے ادیب پیدا کیے۔

ہمایوں، اگر اس پر نازاں ہے کہ اس نے عطاء الرحمٰن، میاں عبدالعزیز نانک پیا اور ضیاء الدین قیس کے قلم کی بے پناہ طاقت سے دنیا کو آگاہ کیا۔

اور اردو (حیدرآباد) اگر مرزا فرحت اللہ بیگ کی خوابیدہ قابلیت کی نمائش گاہ ثابت ہوا تو اودھ پنچ کی یہ خصوصیت بھی یادگار رہے کہ اس کی آغوش میں وہ لوگ پرورش پا چکے ہیں جو بعد کو آل انڈیا پوزیشن کے مالک ہوئے۔

مرزا مچھو بیگ ستم ظریف، اپنے کمال کے باوجود اب تک گمنام ہیں لیکن اکبر الٰہ آبادی اور جوالا پرشاد برق سے کون ہندوستانی ناواقف ہے۔

بلکہ میں تو شرر اور سرشار کے کارناموں کو بھی بالواسطہ اودھ پنچ ہی کا رہین منت سمجھتا ہوں۔

یہ تو تھا قدیم اودھ پنچ جس کا سہرا منشی سجاد حسین مرحوم کے سر ہے۔ اب رہا جدید اودھ پنچ سو اس کے متعلق صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ آج اُردو میں مشرق اور اسلامی تہذیب کا سمویا ہوا رنگ، تمام ہندوستان میں اگر کہیں نکھرا ہوا نظر آتا ہے تو وہ صرف اودھ پنچ کے اوراق میں!

کاش! شیخ ممتاز حسین عثمانی، شہرت پسند ہوتے۔ یا اگر نہیں تھا تو کاش وہ کم سے کم عزلت پسند نہ ہوتے۔ تو آج دنیا دیکھتی کہ یہ وجود مشخص جسے دنیا شیخ ممتاز حسین عثمانی کہتی ہے ایک شخص نہیں بلکہ تاریخ ہے، "علامہ"، نہیں، بحر العلوم ہے۔

اودھ پنچ زبان کا تو بادشاہ تھا ہی اور ہے ہی، سیاست میں بھی اول دن سے اسکی رائے کو مجتہدانہ وقعت حاصل رہی ہے۔ سیاست کے خارزار میں ظرافت کی کلیاں بکھیرتا ہوا، جس خوبصورتی سے اودھ پنچ کا اڈیٹر بےلاگ دھمان نکل جاتا تھا وہ سچ تو یہ ہے کہ اسی کا حصہ تھا۔

اودھ پنچ کے کارٹون آج بھی تاریخ سیاست کی ایک سربہ مہر داستان ہیں۔ کون ہے جو مہر کھوٹے

اور یہ داستان پڑھے۔

اڈیٹر صاحب اودھ پنچ نے "الناظر" کے اس نئے دور میں مرزا رسوا پر ایک مضمون لکھا تھا اُنھوں نے مرزا کے متعلق بہترین خیالات کا اپنے بھر در کوزہ مضمون میں اظہار کیا تھا وہ آج حرف بحرف خود انھیں پر صادق آ رہے ہیں۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ مرزا رسوا اور علامہ طباطبائی کا فراق شیخ ممتاز حسین کی موجودگی میں برداشت کیا جا سکتا تھا لیکن شیخ ممتاز حسین عثمانی کی جدائی ناقابل برداشت ہے کیونکہ اُن کا جواب یہ موجود تھے لیکن اِن کا واقعی کوئی ثانی نہیں ہے

داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی　　اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

شیخ ممتاز حسین کا مرنا، ایک شخص کا مرنا نہیں ہے یہ اودھ پنچ کا مرنا ہے جو بڑی بڑی تاریخی روایات کا حامل تھا، نہیں بلکہ بجائے خود ایک مکمل تاریخ تھا۔ بلکہ یہ لکھنؤ کے اُردو اسکول کا مرنا ہے کیونکہ اب لکھنؤ میں خالص لکھنوی انداز کا ایسا بے بدل "ماسٹر" اور کوئی نہیں۔

شیخ صاحب مرحوم اگرچہ لکھنؤ اسکول کے متبع تھے مگر ان کا لٹریچر کلاسیکل لٹریچر تھا۔ ابوالکلام، محمد حسین آزاد، نصیر حسین خیال اور مولانا سبط حسن کی نسبت کہا جا سکتا ہے کہ اُن کے رنگ کا چربہ نہیں اُڑایا جا سکتا مگر ممتاز حسین کے متعلق تو قسم کھائی جا سکتی ہے کہ آج ہندوستان میں ان کے تتبع میں انھیں کی طرح جامعیت، سادگی اور ظرافت کی ہلکی چاشنی کے ساتھ صحیح طور سے دو سطریں بھی لکھنا کسی کے بس میں نہیں۔

حکیم آشفتہ صاحب کی اس نظم نے جو شیخ صاحب کے متعلق اس الناظر میں شائع ہوئی ہے میرے جذبات کو بہت اپیل کیا۔ یہ نظم نہیں بلکہ اڈیٹر صاحب اودھ پنچ کی ایک چھوٹی سی خوبصورت تصویر ہے۔

میں انھیں جذبات کے ماتحت جو آشفتہ صاحب کے دل میں بھی شیخ ممتاز حسین صاحب کی نسبت موجزن ہیں آشفتہ صاحب سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ شیخ ممتاز حسین کو مرنے نہ دیں جس کی ایک صورت تو یہ ہے کہ اودھ پنچ کو زندہ رکھا جائے جیسا کہ اس کے آثار، لکھنؤ کے مشہور ادیب جناب ظریف کے عنان ادارت سنبھالنے سے پیدا ہو گئے ہیں۔

اور دوسری صورت یہ ہے کہ آشفتہ صاحب، شیخ صاحب مرحوم کے صاحبزادے کی معیت میں، پروفیسر مسعود حسن صاحب رضوی، مرزا محمد عسکری بی اے، حکیم عبدالقوی صاحب لکھنوی، وصل صاحب بلگرامی اور اڈیٹر صاحب الناظر کا ایک بورڈ بنا کے، الگ الگ عنوانوں کے ماتحت اودھ پنچ کے انتخابات شائع فرمائیں۔ یہ تو خیر ایک بڑا کام ہے فی الحال ممتاز میموریل بورڈ اگر صرف مضامین ممتاز ہی کی ترتیب و تہذیب

اور انتخاب و اشاعت کی خدمت اپنے ذمّے لے لے تو بھی قدر دانانِ ممتاز حسین صاحب ہی پر نہیں بلکہ اردو پر ان حضرات کا یہ گویا ایک بہت بڑا احسان ہوگا۔

انتخاب میں فی الحال اور چیزوں کو نظر انداز کر دیا جائے اگر ان "خامہ کی چیزوں" کو ضرور ملحوظ رکھا جائے۔

اول شیخ صاحب مرحوم کے وہ خطوط جو انھوں نے دوسرے اخباروں اور رسالوں کی مضمون طلبی کی فرمائش کے جواب میں اُن رسالوں اور اخباروں کو لکھے ہیں خواہ وہ اودھ پنچ میں شائع ہوئے ہوں یا نہ ہوئے ہوں۔

دوسرے اڈیٹر صاحب اودھ پنچ کی نوٹ بک کا وہ مثالی سلسلہ جو ہر حیثیت سے بے مثال ہے نیز لغات کے سلسلے میں جو کچھ انھوں نے یا اُن کے دوسرے نامہ نگاروں نے لکھا ہے معہ ان مباحثوں کے جو اس بحث میں ضمناً چھڑ گئے اور جن کا فیصلہ، قولِ فیصل کے طور پر اڈیٹر صاحب اودھ پنچ نے کیا — د،

اور بوا منطق آرا بیگم وغیرہ کے فرضی نام سے جو اصلاحی، سیاسی اور ادبی مضامین لکھے گئے ہیں وہ،

یہ سب اگر ایک سلسلے میں خوبصورتی اور حسنِ انتخاب و ترتیب کے ساتھ شائع کر دیے جائیں تو یہ بھی ایک بہت بڑا کام ہوگا۔

یہ، شیخ ممتاز حسین مرحوم کی، اودھ پنچ کی، لکھنؤ کی، اُردو کی اور ہندی اور اسلامی ملی ہوئی مشرقی تہذیب کی ایک زندہ یادگار رہو گی۔

آخر میں، اتنا میں اور عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ یادگار اس عنوان سے اگر قائم ہوئی تو خیر، ورنہ

بس ہجومِ نا امیدی خاک میں مل جائے گی ۔۔۔ یہ جو اک تھوڑی سی لذت سعیِ لاحاصل میں ہے

(الناظر، ستمبر ۱۹۳۶ء)

نعمت خان عالی

وقائع نعمت خان عالی فارسی کی ایک مشہور کتاب ہے، جسکے اجزا اکثر مدارس کے نصاب میں داخل کیے جاتے ہیں۔ مگر دقتِ مضامین کی وجہ سے شاید ایسے بہت ہی کم اصحاب ہوں گے جو اُس سے پوری طرح لطف اندوز ہو سکیں۔ اس مشکل کو رفع کرنے اور نعمت خان عالی کے کمالِ انشا پردازی کو نمایاں ہونے کا موقع دینے کے لیے ہمارے کرم جناب مرزا محمد عسکری صاحب نے 'وقائع' کو اُردو میں منتقل کیا ہے۔ اور طرزِ تحریر وہی اختیار کیا ہے جو انگریزی کے مشہور ادیب چارلس لیمپ نے شکسپیر کے ڈراموں کو کہانی کی صورت میں پیش کرتے وقت ملحوظ رکھا۔ مرزا صاحب کے کمالاتِ ادبی کو دیکھتے ہوئے غالباً یہ توقع بیجا نہ ہوگی کہ اُنھیں بھی چارلس لیمپ کی طرح اپنے اس ادبی کارنامہ کی بدولت قبولیتِ عام حاصل ہوگی۔

وقائع کے اُردو ایڈیشن کے شروع میں اضافہ کرنے کے لیے مرزا صاحب نے نعمت خان عالی کے حالات اور اُنکے تصانیف و کلام پر جو تبصرہ لکھا ہے اُسے چھپنے سے پہلے ازراہِ کرم الناظر میں اشاعت کے لیے مرحمت فرمایا ہے، جسکے مطالعہ سے اہلِ ملک کو کسی قدر اندازہ ہوسکیگا کہ اصل کتاب کس عرق ریزی اور کاوش سے لکھی گئی ہے۔

وقائع میں شہنشاہ عالمگیر اورنگ زیب کے متعلق جو رویہ مصنف نے اختیار کیا اُسے مسلمان پسندیدہ نہیں سمجھ سکتے، مگر مصنف کے ادبی کمالات کا اعتراف نہ کرنا اور اُس کی انشا پردازی کے محاسن کو نظر انداز کرنا انصاف کے خلاف اور مسلمانوں کی علم دوستی و ادب نوازی کی دیرینہ روایات کے منافی ہوگا

ایڈیٹر

اصل میں میرزا محمد نام تھا، مگر اپنے خطاب کے ساتھ ایسے مشہور ہوئے کہ لوگ اصل نام کو بھول گئے، اور صرف خطاب یعنی نعمت خان عالی یاد رہ گیا۔ عام تو عام بعض بعض و نیز طبقۂ خواص نے بھی دھوکا کھایا۔ حتیٰ کہ بعض تذکرہ نویسوں نے اسی خطاب کو نام سمجھ لیا۔

عالی شیراز کے رہنے والے تھے اور ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ انکے والد کا نام فتح الدین تھا، جو اپنے زمانے کے مشہور و معروف طبیب تھے۔ ہندوستان کی بھی سیاحت کی تھی، اور پھر شیراز واپس چلے گئے تھے۔ انہیں حکیم فتح الدین کے بھیجے یعنی عالی کے چچازاد بھائی حکیم محسن خاں نے بھی ہندوستان آکر شاہ عالم کی مصاحبت اختیار کی اور بڑا عروج پایا۔ اسی طرح محسن خاں کے بیٹے حکیم صادق خاں نے عالمگیر ثانی کے آخر عہدِ حکومت میں اقتدار و اعتبار حاصل کرکے حکیم الملوک خطاب پایا، اور اپنے معاصرین کی نظروں میں اتنا مرتبہ حاصل کیا کہ محسودِ زمانہ ہوئے۔

عالی کی تعلیم و تربیت

مرزا محمد ہندوستان میں پیدا ہوئے، اور یہیں نشو و نما پائی کمسنی ہی کے زمانے میں اپنے والد حکیم فتح الدین کی مراجعت کے وقت انکے ساتھ ساتھ اپنے آبائی وطن مالوف شیراز چلے گئے اور وہیں ضروری علوم و فنون کی تحصیل اور تکمیل کی۔ فارسی اُن کی اصلی زبان تھی، اس لیے اُس کا ذکر تحصیل حاصل سمجھنا چاہیے۔ مگر اُنھوں نے زبان عربی میں مختلف علوم و فنون، صرف و نحو، منطق، فلسفہ، ہیئت، فقہ، حدیث، پڑھی اور ایک عالمانہ قابلیت پیدا کرلی۔ اس کے بعد طب کی طرف توجہ کی، اور جلد اپنے اس آبائی پیشے میں بھی کمال حاصل کرلیا۔ علوم ضروری سے فراغت حاصل کرنے کے بعد شاعری شروع کی اور حکیم تخلص اختیار کیا۔ ابتدائی کلام میں یہی تخلص رکھا، مگر جب ملا شفیعائے یزدی ملقب بہ دانشمند خاں کے زمرۂ تلامذہ میں داخل ہوئے تو خود بخود یا کسی کے سُوجھانے سے یا خود یہ خیال آیا کہ حکیم اور حکیم بالکل ایک ہی طرح سے لکھا جاتا ہے لہذا اس تخلص کو چھوڑ دیا، اور اپنے اُستاد کے مشورہ سے عالی تخلص اختیار کیا، جسکی بابت اپنے دیوان کے دیباچہ میں لکھا ہے

"در بدایت حال بمناسبت شغلِ طبابت کہ سمت موروثی بود حکیم تخلص می نمودم، آخر تصحیف حکیم اختیار تخلص حکیم را مانع شد و بفرمودۂ اُستاد دانشمند خاں عالی تخلص کردم"

چونکہ اُس زمانے میں تیموری فرماں روائی کا آوازۂ کرم تمام عالم میں پہونچ چکا تھا، اس لیے عالی نے دوبارہ ہندوستان کا رُخ کیا، اور یہاں آکر کسی نہ کسی وسیلے سے دربارِ عالمگیری میں پہونچ کر تقرب حاصل کیا۔ اور رفتہ رفتہ زمرۂ ملازمینِ شاہی میں داخل ہوگئے۔ سنہ ١٠٩٧ھ میں جب جنگ حیدرآباد میں اورنگ زیب کو فتح ہوئی تو عالی نے مندرجۂ ذیل تاریخ فتح کہکر حضورِ شاہی میں گزرانی، جو نہایت پسند آئی، اور صلے میں خلعتِ شاہی سے سرفراز کیے گئے۔ تاریخ یہ ہے :-

از نصرتِ بادشاہ غازی گردید دلِ جہانیاں شاد
آمد بہ قلم حسابِ تاریخ شد فتح بہ جنگ حیدرآباد

تاریخ نعمت خاں عالی بابت فتح حیدرآباد

بوالحسن داشت جا بجائے زحل بدرش کرد از مکان تقدیر
چوں بروں رفت او بجاش نشست شاہ اورنگ زیب عالمگیر

اُسی زمانے میں زمرۂ مصاحبین خاص میں شامل ہوئے، اور ١١٠١ھ میں بکاول یعنی داروغۂ باورچی خانہ کی خدمت پر مامور ہوئے، اور نعمت خاں دربارِ شاہی سے خطاب حاصل کیا۔ "شکرِ نعمت واجب" اسکی تاریخ ہے

مذہب و عادات و خصائل عالی مذہبًا امامیہ تھے، اور تحصیل و تکمیل علوم مذہبی کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے مذہب کے ایک مستند عالم تھے۔ مگر فطرتًا نہایت آزاد مزاج، شگفتہ طبع، ہشاش بشاش، ظریف الطبع واقع ہوئے تھے اس لیے مولویت کا اُن پر کچھ زیادہ اثر نہیں پڑا تھا۔ جسکی اُنکے کلام کے ایک ایک لفظ سے شہادت ملتی ہے۔ پھر بھی صورتِ معاملات کچھ ایسی واقع ہوئی تھی کہ انکو متعصب بننا پڑا۔ وجہ یہ تھی کہ فرماں روائے عہد یعنی اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ ایک مولویانہ وضع رکھنے والے سُنی المذہب تھے اور اپنے مذہب کی پاسداری میں اُنکو پورا غلو تھا۔ اُدھر عالی ایک فطرتی ہنسوڑ لاابالی وہ اس تعصب کو بُرا جانتے تھے۔ اور تو کچھ کر نہ سکتے تھے، بادشاہ کی اکثر باتوں کا مضحکہ اڑاتے اور اُنکا اُڑاتے کہ خود بھی تعصب مذہبی سے لبریز معلوم ہوتے تھے۔ کچھ تو یہ، کچھ بات کی پیچ نے اُنھیں بھی اچھا خاصا متعصب بنا دیا تھا۔ اسی مذہبی غلو اور تعصب کی وجہ سے وہ بادشاہ

سے کچھ صاف نہ تھے۔

اس باہمی ناروا داری اور ناراضی کی اطلاع عالمگیر ایسے بادشاہ کو نہ ہونے کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ مگر چونکہ اورنگ زیب عالمگیر اس خشک مزاجی اور انتہائی تعصب کے باوجود بھی قابلیت کے قدردان اور جوہر شناسی میں فرد تھے اس لیے انھوں نے اگرچہ عالی کی متعدد شکایات بھی سنیں مگر کبھی اُن کے جوہر ذاتی کو نظر انداز کر کے انصاف کا خون اپنی گردن پر نہیں لیا، اور اسی لیے کسی قسم کا تعرض نہیں کیا۔ چنانچہ مشہور ہے کہ ایک مرتبہ نکتہ چینیوں نے عالمگیر سے عالی کی شوخ مزاجی اور تعصب مذہبی کے ساتھ صحابہ کرام پر لعن طعن، سب و شتم وغیرہ کا ذکر کیا۔ یہ شکایات سن کر بادشاہ نے عالی کو بلایا، اور باتوں باتوں میں اعتقادات کے متعلق دریافت کیا، تو نعمت خان عالی نے جواب میں یہ رباعی پڑھی:

اصحاب نبی کہ چار یارند　　چوں چار کتاب در شمارند
ہر چار بلا شکے و ریبے　　زاں چار یکے نداشت عیبے

بادشاہ کو یہ سن کر دلی اطمینان ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، مگر بظاہر اس رباعی سے کچھ نہ کچھ مطمئن ہو گئے۔ نکتہ چینیوں اور خوردہ بینوں کی نگاہ تو ایک ایک نقطے اور ایک ایک حرف پر رہتی ہے، چنانچہ جب عالی چلے گئے تو کہا گیا کہ ذرا حضور غور تو فرمائیں، یہ تو کھلا تبرا ہے، ذرا چوتھے مصرعے کو حضور اچھی طرح دیکھیں، چوتھا مصرعہ تو کھلا ہوا ذو معنی مصرعہ ہے۔ سمجھتے ہی بادشاہ کو بھی شبہ ہو گیا۔ پھر بلایا، اور پھر مذہب و مشرب کی بابت تشریح و تصریح چاہی۔ عالی نے یہ شعر پڑھا:

بارہا گفتم بہ تو اے شہریار　　چار یار و چار یار و چار یار

یہ سن کر بادشاہ کو بہر صورت اطمینان ہو گیا۔ بھڑکانے والوں نے کہا بھی کہ حضور اس شعر میں آپ نے صحابہ کبار کی مدح سمجھی ہے مگر دراصل عالی نے دوازدہ امام کی منقبت کی ہے۔ بادشاہ نے یہ سن لیا، اور سمجھ بھی لیا، مگر پھر کچھ نہ کہا۔ ٹالنے کو تو ٹال گئے، مگر دل سے نہ وہ صاف رہے، اور نہ یہ صاف رہے۔ ہاں یہ عالی تو عمر بھر ستم ظریفیوں کے ساتھ بادشاہ پر چوٹیں کرتا رہا۔ مذہبی معاملہ ہو یا غیر مذہبی اسے ہر طرح سے بادشاہ پر تبرا کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ مرزا یار علی بیگ مقربان شاہی میں سے ایک نہایت ممتاز اور موقر مصاحب تھا۔ گردن میں کسی عارضے کی وجہ سے تھوڑا سا زخم تھا۔ اسی طرح بادشاہ کے زانو میں ایک بلند جگہ سے گر جانے کی وجہ سے ہمیشہ درد رہا کرتا

تھا - اور اسی سے مزاج میں ایک عجیب کیفیت پیدا ہو گئی تھی - اسی لیے ہمیشہ دواؤں میں ترمیم ہوتی رہتی تھی اور ہمیشہ نئے نئے نسخے تیار ہوتے تھے - تغمید و تدہین کا سلسلہ غیر متناہی ہو گیا تھا - نئی دوائیں روز روز بنتی تھیں - اسی واقعے کو عالی نے یوں نظم کیا ہے :

زد غنچے چوں پزند فرابد استماں از لوازم دار و ست
بر نذرش بہ پیش یار علی آنکہ کمیاں بود بہ دشمن و دوست
گر کنند ایں علاج گردنِ او بیشک از بہر پائے ما نیکوست
بینے از رمز نکتۂ گفتیم کہ نہاں چوں اشارۂ ابرو ست
نتنہ ہائے کہ ما بپا کردیم وزر ایں ہا ہمہ بگردنِ او ست

اسی طرح ایک مرتبہ بادشاہ کی تعریف میں یہ قطعہ کہکر نذر گزرانا :

اے عمر صورت و عثماں سیرت کہ ابو بکر نگہدار تو باد
روز محشر کہ بجو دو رامی پسر بوسفیاں یار تو باد

بادشاہ کوئی جاہل تو تھے نہیں، چوتھے مصرعے کا مطلب سمجھ گئے - مگر پھر بھی یہ کہکر خاموش ہو گئے :

"اگرچہ ایں کہنہ قرمساق بہ انسبتِ خود ہجو کردہ است، لیکن سادات است - بنویسید دریافتم خاموش"

عالی چونکہ بالطبع ظرافت پسند اور شوخ مزاج واقع ہوئے تھے اس لیے دوسرے معاملات میں بھی انکی یہ ہنسی رو کے نہ رکتی تھی، اور دنیاوی افکار بھی انکی اس عادت خاص پر غلبہ نہ حاصل کر سکتے تھے - چنانچہ ایک مرتبہ ضرورت اور افلاس کے ہاتھوں سے پریشان ہو کر اپنا جنیۂ مرصع زیب النساء بیگم صبیۂ بادشاہ وقت کے پاس فروخت کے لیے بھیجا - مگر کچھ ایسے اتفاقات ہوئے کہ ایک عرصہ گزر گیا اور اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا تو بیگم کی خدمت میں یہ رباعی لکھ بھیجی -

اے بنا گیت سعادتِ اخترِ من در خدمتِ تو عیاں شدہ جوہرِ من
گر جنیہ خریدنی ست پس کو زرِ من ور نیست خریدنی بزن بر سرِ من

زیب النساء نے رباعی پڑھ کر جنیہ واپس کر دیا اور پانچ ہزار روپیہ انعام دیا -

عالی کی شاعری

دورِ عالمگیری کے شعرا کی تعداد اگرچہ عہد اکبری و جہانگیری کے برابر نہیں ہے پھر بھی شاہجہاں کے زمانے کے برابر ضرور ہے - چنانچہ عنایت خاں آشنا، ناظم ہروی، مرزا محمد رفیع قزوینی، رفیع مرزا حسن، مرزا عبدالقادر بیدل،

ملا شفیعائے یزدی، مرزا محمد علی اکبر آبادی، ملا محمد سعید اشرف، عاقل، ملا طغرائے مشہدی، مرزا معزالدین فطرت، علی سہرندی، راسخ، خالص، باذل، طاہر، ارادت خاں واضح وغیرہ وغیرہ عہد عالمگیری کے نامور شعرا میں سے گزرے ہیں۔ ان سب کے مقابلے پر جب عالی کے کلام کو دیکھا جاتا ہے یا اُن سے موازنہ کیا جاتا ہے تو وہ کسی صورت سے اُن لوگوں سے کم نہیں ٹھہرتا بلکہ اُس میں ایک خاص رنگ جھلکتا نظر آتا ہے۔

کلام عالی کی خصوصیات

عالی کے کلام میں چند ایسی خصوصیتیں ہیں، جو انکے معاصر شعرا کے کلام میں نہیں ہیں۔ جنھیں ہم ذرا تفصیل کے ساتھ گنانا چاہتے ہیں:۔

پہلی خصوصیت عالی کے کلام کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ فارسی کے اہل زبان ہونے اور ایران کے رسوم و رواج کو جانے اور انکے بیان کرنے پر قادر ہونے کے باوجود بھی وہ ہندوستان میں رہ کر ہندوستان کے مذاق اور یہاں کے رسوم و رواج کو نظر انداز نہیں کرتے، اور انکے اکثر اشعار میں یہاں کے عادات و حالات اس خوبی سے نظم ہوتے ہیں کہ بیساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اُن کی نگاہیں اس گہرے راز کو دریافت کر چکی تھیں، کہ جس ملک میں شاعری کی جائے اُسکو اُسی سرزمین کے دلکش حالات سے وابستہ رکھا جائے تاکہ وہ زیادہ دلکش اور دلچسپ ہو۔ اور اُس کے اثرات دلوں پر اچھی طرح سے مترتب ہو سکیں۔ برعکس دوسرے شعرا کے کہ وہ ہندوستان میں رہ کر ایران و توران کی باتیں نظم کیا کرتے تھے۔

دوسری خصوصیت زبان فارسی کی شاعری رنگینیِ بیاں، نادر استعاروں، بدیع تشبیہوں میں اُلجھ کر ایسی محدود ہو گئی تھی کہ اس میں اصلیت نہ رہی تھی۔ چنانچہ متاخرین کے دواوین اس کے شاہد ہیں۔ فطرت، شوکت، بیدل وغیرہ سب اسی رنگ کے دلدادہ ہیں۔ مگر عالی نے ان سب باتوں پر ایک غائر نظر ڈالی اور ان عیوب سے اپنے دامنِ کمال کو ملوث نہ ہونے دیا۔ چنانچہ اُنکے دیوان میں استعاروں اور تشبیہوں کی وہ بھرمار نہیں ہے جو اُنکے بیشترو یا اُنکے معاصرین کے یہاں ہے۔ وہ غلو اور اغراق کی آندھیوں سے وہ طوفان بے تمیزی برپا نہیں کرتے جو اُنکے معاصرین نے کیا۔ اُنکو ہمیشہ اس بات کا خیال رہتا ہے کہ زوائد کا شعر پر اتنا اثر ہرگز نہ پڑنا چاہیے کہ فروع باقی رہ جائیں اور اصل غائب ہو جائے۔ وہ نہیں چاہتے کہ

کہ مطالب ضروری اس قدر تاریکی میں چلے جائیں کہ پھر تیز سے تیز نگاہیں بھی انکو ڈھونڈھ نہ سکیں۔ یہ نہیں ہے کہ انہوں نے تشبیہوں اور استعاروں یا صنایع بدایع کو واجب الترک قرار دیا ہے اور کبھی استعمال ہی نہیں کیا۔ مگر اس طرح سے استعمال کیا ہے کہ اہمال پیدا ہونے کے بجائے حسن کلام پیدا ہو گیا ہے۔

تیسری خصوصیت

اساتذہ نے شعر کی خوبی اور تاثیر کو دو باتوں پر منحصر رکھا ہے کہ یا تو شعر میں انبساطی پہلو ہو یا انقباضی۔ اگر یہ دونوں باتیں شعر میں نہیں ہیں تو وہ شعر حدود شعریت سے دور ہے بلکہ ہذیان ہے۔ اسکو شعر کہنا ایک قسم کی زیادتی ہے۔ چنانچہ شعراء متاخرین فارس میں بابا فغانی سے لیکر عرفی و فیضی و ظہوری وغیرہ بلکہ ان سے بعد کے شعراء بھی برابر انقباضی رنگ کو مدنظر رکھتے چلے آئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو رنگ اس قدر عام ہو جاتا ہے، وہ ایک پیش پا افتادہ مضمون سے زیادہ وقیع نہیں رہتا۔ اس میں ایک قسم کا ابتذال اور عمومیت پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر اس کے مقبول بنانے اور اس میں تازگی پیدا کرنے کے لیے تصنعات لایعنی کی ضرورت پڑتی ہے۔ چنانچہ شعراء مابعد میں ایسا ہی ہوا ہے۔ بجز ایسے ایسے مصنوعی خیالات پر صرف شعر کو درد انگیز بنانے کی غرض سے مصنوعی الفاظ اور تلاش و ترکیبات وغیرہ سے آورد کا رنگ و روغن چڑھایا گیا ہے۔ مگر اس تصنع نے شعر میں اثر کی بجائے اور بے اثری پیدا کر دی ہے۔ غالب نے اس بات کا بلکہ اس نقص کا بھی اندازہ کیا۔ اور اسی لیے اس پامال اور مخصوص جادہ کو چھوڑ کر ایک طرز خاص ایجاد کیا۔ جس میں انبساط و انقباض کو ملا دیا۔ سلامت روی اور اعتدال کو ہر جگہ ملحوظ رکھا۔ اور اسی رنگ خاص پر اپنی شاعری کے قصر رفیع کی بنیاد رکھدی۔ مگر چونکہ وہ فطرتاً ظریف الطبع تھے اس لیے پھر بھی انبساطی رنگ انکے کلام پر غالب رہا۔ بلکہ ان کی شاعری کا جزو اعظم بن گیا۔ اسی لیے دور مذکورہ میں غالب کے کلام میں یہ بات ایک خصوصیت کی مد میں داخل ہو گئی۔

چوتھی خصوصیت

مضمون آفرینی اور تخئیل اگرچہ ہر شاعر کے لیے ضروری ہے بلکہ بالفاظ دیگر شعر کا جزو اعظم ہی ہے۔ مگر غالب نے خصوصیت کے ساتھ اس کا بہت خیال رکھا ہے بلکہ التزام کیا ہے۔ اور اکثر جگہ جدت تخئیل میں وہ اپنے معاصرین سے بڑھ گئے ہیں۔ اور زیادہ تر قابل تعریف یہ امر ہے کہ کہیں اپنی قوت متخیلہ کو متمیزہ کی حدود حکومت سے ایک قدم باہر نہیں جانے دیا۔

پانچویں خصوصیت یہ بھی ایک خاص بات ہے کہ وہ مختلف علوم و فنون کے ماہر اور استاد کامل تھے مگر غزلیات اور رباعیات میں خصوصاً اُنھوں نے صفائی زبان کا ہر جگہ خیال رکھا ہے اور اس بادۂ شیرازی میں کسی قسم کا ذرا بھی میل نہ ہونے دیا۔ اسی لیے تمام کلام موج سلسبیل معلوم ہوتا ہے۔ صفائی، شیرینی، روانی، کہیں تسلسل سب اُس میں موجود ہیں۔

اُن کے دیوان میں اصناف کلام، مثلاً غزلیات، رباعیات، قطعات، تاریخیں، ہجویں موجود ہیں۔ ایک مثنوی موسوم بہ سخن عالی بھی اس میں شامل ہے۔

اصناف کلام پر رائے جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا اُنکے کلام میں انبساطی رنگ زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دوسرے مشاہیر کے مقابلہ پر عالی کے یہاں درد و اثر کی کمی ہے۔ مگر ظرافت کی چاشنی اور انبساطی رنگ نے اس کمی کو پورا کر دیا ہے۔ اسوا اسکے تنوع معانی اور معاملہ بندی کے اسلوب نے اور بھی چار چاند لگا دیے ہیں۔ اسی سے غزلیات میں ایک خاص رنگ پیدا ہو گیا ہے۔

رباعیات اگرچہ اُن کے یہاں رباعیوں کی ایک اچھی خاصی تعداد ہے مگر ان میں کوئی ایسی خصوصیت نہیں کہ عمر خیام کی رُباعیوں کی طرح وہ عالی کے نام پر طغرائے امتیاز ثابت ہوں۔

قطعات بعض قطعات ہجو اور مذمت کی تیز اور چمکتی ہوئی تلواریں ہیں، جنھیں بیدردی کے ساتھ اپنے مخاطب کے گلے پر پھیر اگیا ہے۔ بعض واقعات پر مبنی ہیں۔ بعض معمولی ہیں۔

تاریخیں اُنکی کہی ہوئی تاریخیں ایک خاص درجۂ امتیاز رکھتی ہیں۔ مادۂ تاریخ اس قدر صاف ہوتا ہے کہ اسکی نظیر دوسروں کے یہاں ذرا مشکل سے ملتی ہے۔ اسی لحاظ سے وہ نہایت قابلِ تعریف ہیں۔

ہجویں تمام اصناف سخن میں عالی کے یہاں ہجو گوئی کا زور شور رہا ہے۔ اور اسکے ساتھ ہی ساتھ ہجووں کا پایہ اس قدر بلند ہے کہ وہ عیب کے بجائے ہنر معلوم ہوتی ہیں۔ اُنکی ہجووں کا شہرت اُنکے معاصرین بلکہ متقدمین کے یہاں بھی جواب نہیں۔ مولانا غلام علی آزاد تذکرۂ خزانۂ عامرہ میں لکھتے ہیں" ہجوش شمشیر خونریز است یا گہ صور قیامت انگیز"۔ اگرچہ فارسی شعرا میں سیکڑوں شاعر ہجوگو گذرے ہیں، مگر نعمت خان عالی نے جو طرز خاص اختیار کیا وہی اُسکے موجد تھے اور وہی اسکے خاتم ہوئے۔ دوسروں کو اس رنگ کی ہوا بھی نہیں لگی۔ اگر انکی ہجووں کو متانت

کی نگاہ سے دیکھیے تو بھی ان کا مرتبہ عالی ہے، اور اگر ہزل کی نوعیت سے اُن پر نگاہ ڈالیے
تو معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بڑے سے بڑا مسخرہ بھانڈ بھی ان کا مقابل نہیں ہو سکتا۔ عالی ہجووں
میں صرف بیہودہ گوئی اور ہزالی ہی سے کام نہیں لیتے بلکہ اُس میں انتہائی معانی آفرینی کی کوشش
کرتے ہیں۔ پھر لطف یہ ہے کہ کسی ہجو سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ہجو کرنے والا غصے میں ناک بھوں
چڑھائے ترش رو بنا بیٹھا ہے، بلکہ برعکس اس کے صاف صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ کہنے والا
جو کچھ کہہ رہا ہے نہایت خندہ پیشانی سے کہہ رہا ہے، یا ہنس ہنس کر دوسرے کے خرمنِ صبر و قرار پر
بجلیاں گرا رہا ہے۔ ظرافت کا ایک بے پایاں اور زخار دریا موجیں مارتا چلا آتا ہے، جس پر
اُسکی روانی میں، اُسکی چھینٹیں پڑ جاتی ہیں وہ شرابور ہو کر رہ جاتا ہے۔ علی الرغم دوسرے لوگوں
کے کہ جب کچھ کہتے ہیں حرفِ بد کو مُنہ سے نکالتے ہیں پہلے سننے والے کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ
جسکے منہ سے یہ لفظ نکل رہے ہیں اُس سے موروثی دشمنی اور پُرانی مخاصمت ہے۔ عالی کے
تمام قصائد ہجویہ جو اُنکے دیوان کے علاوہ وقائع میں درج ہیں اپنے خاص رنگ میں یکتا
اور بے نظیر ہیں۔ اسکے علاوہ ایک قطعہ جو کامگار خاں پسر جعفر خاں وزیر کی کتخدائی کے موقع پر
کہا ہے اور وہ دیوان میں موجود ہے ایسا ہے جس نے بڑے بڑے ہجویہ قصیدوں کو مات
کر دیا ہے بلکہ شعرا کی ہجو کے دفتر اُسکے سامنے دریا بُرد نظر آتے ہیں۔ ہجو گوئی ظرافت، ہزل، کو
نظر انداز کر کے جب اس قطعہ کی بلاغت پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ زمانۂ جاہلیت کا
کوئی عرب شاعر جوش میں کچھ کہہ رہا ہے۔ ایک ایک لفظ میں معنی کا ایک خزانہ مخفی ہے۔ بہت سے
علوم و فنون کے مصطلحات اس طرح اُس میں سمو دیے ہیں جیسے زہر کے پیالے میں آبحیات
ملا دیا جائے۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ ہر ہجو کرنے والا اتنا جوش میں آ جاتا ہے کہ مشارالیہ کے ساتھ اُسکے
تمام خاندان کو لے ڈالتا ہے۔ موجودہ واقعات میں تمام گذشتہ غیر ضروری واقعات اور ذاتیات
کو بھی شامل کر لیتا ہے۔ مگر خان عالی کا یہ طریقہ نہیں ہے۔ وہ اپنی ہجو کو اکثر دائرۂ تہذیب میں
صرف اپنے مخاطب تک محدود رکھتے ہیں، اور جو شکایت اُنھیں ہے اُسکے سوا ایک لفظ بھی
نہیں کہنا چاہتے۔ اگر اُنکی یہ تہذیب بھی میٹھی چھری بلکہ خانہ بر انداز ظالم ثابت ہوتی ہے۔ مگر وہ
اُسی محدود فضا میں وہ کچھ کہہ جاتے ہیں جسکے لیے دوسروں کے واسطے گالی اور کوسنوں، طعن و تشنیع

لیے وسیع میدان بھی کافی نہیں ہوتے - اُنکی یہ نمائش متانت ایسی ہوتی ہے کہ شوخیوں کے
دفتر کے دفتر اُس پر قربان ہیں -

مثنوی جو "سخن عالی" کے نام سے موسوم ہے، اگرچہ آتشفی وغیرہ اُس زمانے کے دوسرے
مشاہیر کی مثنویوں کی ٹکّر کی نہیں، پھر بھی خیالات عالی جواہر آبدار کی طرح اُس میں چمک رہے
ہیں - فصاحت، بلاغت، روانی کے دریا بہا دیے گئے ہیں - جنسے تشنگان ذوق کے دل
اور روحیں سیراب و شاداب ہوتے ہیں - اسی لیے اُسکا پایہ بھی کچھ کم نہیں ہے -

تصانیف

ظاہر ہے کہ عالی ایسے ظریف مزاج کو تصنیف و تالیف کے ساتھ کیا شغف
ہو سکتا تھا، اُنکی ظرافت ادھر توجہ کرنے کی کب اجازت دیتی تھی - تاہم وہ
ایک مصنف کی حیثیت سے ایک شہرت رکھتے ہیں - تصانیف ذیل اُنکی مشہور ہیں :-

دیوان : جسکا مفصل ذکر اوپر گذر چکا -

وقائع نعمت خان عالی اس میں محاربہ گولکنڈہ کے ۱۰۹۸ھ کے حالات مذاق کے پیرایہ میں
ایسے دلکش مقفٰی طرز عبارت کے ساتھ لکھے ہیں کہ اُس وقت کے مشہور سے مشہور مصنّف
اور مایہ ناز تصانیف میں بھی اس کا جواب نہیں ہے - اسکی عبارت میں رنگینی، شگفتگی، فصاحت،
بلاغت، تمام چیزیں اس طرح جمع کردی ہیں جیسے مختلف رنگ کے پھولوں سے کوئی خوشنما
گلدستہ بنایا جاتا ہے - اپنے طبعی اور خلقی رنگ کے تقاضے کی بنا پر درمیان درمیان میں اُس وقت
کے مشہور مشہور افسروں اور خود شاہ عالم پناہ پر بہت سی چوٹیں کی ہیں - محاربہ و محاصرہ میں
جو جو ناکامیاں ہوئیں اُن کا عجیب و غریب طریقے سے مضحکہ اُڑایا ہے - اور در اصل یہی اس
کتاب کا باعث تصنیف ہے - غالباً یہ تصنیف بادشاہ سے خفیہ لکھی گئی ہے - اور اورنگزیب
کے انتقال کے بعد اسکے وجود سے لوگوں کو خبردار کیا ہے - ورنہ شاید عالمگیر کو اسکا لکھا جانا
گوارا نہ ہوتا -

جہاں تک خیال کیا جاتا ہے، اور جس قدر نظر دوڑائی جاتی ہے اُسی قدر صاف صاف
معلوم ہوتا جاتا ہے کہ نعمت خان عالی کی تصانیف میں شاہکار اُسکا وقایع ہے -
یوں تو اُنکی ہر ایک تصنیف کو ایک خاص رتبہ اور درجہ حاصل ہے - مگر وقایع میں جس قدر
محنت اور نظر غائر سے کام لیا گیا ہے وہ کسی میں نہیں - اسکی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ الفاظ

عبارت میں اس قدر ربط ہے کہ ہر ایک فقرہ صنعت تناسب اور مراعات النظیر کی ایک روشن مثال ہے۔ مگر یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ظہیرا ے تفرشی کی مایۂ ناز تصنیف تبسم شاداب، ظہوری کی سہ نثر، ارادت خاں واضح کی مینا بازار، شیخ عنایت اللہ کی بہار دانش بھی اس صنعت سے مالا مال ہیں۔ اول سے آخر تک مذکورہ کتب میں بھی رعایات لفظی کی گرم بازاری ہے مگر حقیقت میں جو چیز وقائع کو ان سب سے جدا کرتی ہے وہ یہ ہے کہ ان سب میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ عبارت محض صنعت کے لیے لکھی گئی ہے اور وقائع کو دیکھنے سے معاملہ برعکس نظر آتا ہے کہ صنعت عبارت کے لئے لائی گئی ہے۔ یعنی کتنی ہی زبردست رعایت ہو پھر بھی ہر لفظ اپنی جگہ پر اس خوبی اور اس عمدگی کے ساتھ صرف کیا گیا ہے کہ پڑھنے والا ہرگز حشو کا الزام نہیں لگا سکتا۔ اس قسم کی مثالیں پیش کرنا ایک قسم کی تحصیل حاصل ہے۔ کیونکہ تمام کتاب من اولہ الی آخرہ اسی رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ پھر بھی چند فقرے ناقدانہ نظر مثال کے لیے چن ہی لیتی ہے ہر واقعہ کے ابتدائی دو چار فقرے لکھے جاتے ہیں چنانچہ سب سے پہلے واقعے یا شروع کتاب کے یہ فقرے :-

"دمیکہ مدرس کشاف صبح - در صفۂ صدق و صفا - چوں قاضی بیضا تفسیر والشمس وضحٰہا بخط شعاعی آفتاب بر صفحۂ روزگار نگاشت - و عابد شب زندہ دار ماہ با سیاہ پر نور دنیا سجادہ سپہر گسترده ادائے نافلۂ شب بختم سورۂ نور کرده سر بسجدۂ غروب گذاشت"

مدرس، کشاف، صفہ، صدق، صفا، قاضی بیضا، تفسیر، والشمس وضحٰہا، خط شعاعی صفحہ۔ سب الفاظ مناسبت کے لیے لائے گئے۔ لیکن ہر لفظ عبارت کے زور کو بڑھا رہا ہے اور معنی کا اضافہ کر رہا ہے۔ صبح کی رعایت کو دیکھ کر کشاف، صدق صفا، بیضا، والشمس وضحٰہا وغیرہ پر غور کیجیے پھر انھیں الفاظ کو اس خیال سے دیکھیے کہ مصنف کو اس میں ایک قاصد کے آنے اور واقعات فتح و ظفر کے بیان کرنے کا خیال ہے، تو فوراً یہ خیال بدل کر رائے قائم کرنی پڑتی ہے کہ یہ سب براعۃ الاستہلال کی صنعت ہے۔ دیگر شعرا کے یہاں بہت سی جگہ ظہور صبح کے ملازمہ کے لیے الفاظ لائے گئے ہیں۔ مگر وہ اکثر ملازمہ ہی معلوم ہوتے ہیں۔ برعکس اسکے یہاں ہر لفظ ہر نظر کے لیے نئے نئے معنی پیدا کرتا ہے۔ دوسرے وقائع کا ابتدائی فقرہ بھی اسی مضمون سے ملتا جلتا ہے۔ مگر مصنف کے خیال کی پرکاری نے اسکو بالکل بدل دیا ہے

ہنگامے کہ مخبر صادقِ صبح بغولے دار لعبیح از تنفس عالیاں را از قدرت کاملہ حضرت آفریدگار تعالیٰ شانہٗ خبرداد، و جمازۂ سریع السیر گردوں بود اے اللہ نور السموات والارض در اظہار احوال جہانیاں بتقریر واضح لب کشاد

رعایات اور مناسبات وہی ہیں لیکن بالکل نئی ہیں۔

تیسرے وقائع کا نقرۂ اول ملاحظہ کیجیے

"زمانے کہ مذہب قدرت سرلوح طلوع خورشید را بر دیباچۂ بیاض صبح منقوش ساخت و حاشیۂ اوراق فلک را بخطوط شعاعی جدول کشیدہ نقاط کواکب را بہ خط بطلان از نظر انداخت"

مضمون وہی ہے۔ مگر الفاظ تلازمہ نے وہ میناکاری کی ہے کہ پہلے وقائع سے کوئی نسبت نہیں ہے۔

اسی طرح ایک اور شروع کا فقرہ

در حینیکہ سلطان فلک تخت بلند بخت انجم سپاہ خورشید سریر سمت الراس را بموجب "دہو الذی جعل الشمس ضیاءً" بفروغ عالمتابی منور ساخت و سایۂ جہاں پروری و ظل عدل گستری بحکم "الم تر الیٰ ربک کیف مد الظل ولو شاء لجعلہ ساکناً"

مضمون وہی، رعایات اسی قبیل کی مگر بالکل علیحدہ ہیں۔

تمام وقائع کو دیکھ لیجیے، مگر ایک جگہ بھی ایسی نہ ملیگی جو رعایات سے خالی ہو اور رعایات میں ہر لفظ اپنی جگہ برق لامع کا کام نہ کر رہا ہو۔

دوسری خصوصیت انکی عبارت میں یہ ہے کہ ہر لفظ مصنف کے رنگ طبیعت کا ایک آئینہ ہے جس سے خندہ ہاے ظرافت کی بلند آوازیں آرہی ہیں۔ ظاہرا عبارت کو دیکھیے تو پہلی نظر میں نہایت دقیق نظر آئے گی، دوسری نظر غائر میں مناسبات و رعایات کا ایک بحر ذخار نظر آئے گا۔ تیسری نظر میں معلوم ہوگا کہ صرف رعایات کا دریا موجزن نہیں بلکہ معنی کا ایک طلسم ہے، جس سے مذاق سلیم کے موافق ہزاروں گوہر شاہوار نکل رہے ہیں۔ چوتھی نظر میں معلوم ہوگا کہ ظرافت کا ایک ایوان عالیشان تیار ہے۔ ظرافت کی قسموں میں سے بھی ہر قسم کی ظرافتیں اس میں مل سکیں گی۔ ہلکی ہلکی لبوں کو جنبش بھی ہوگی، تبسم دنداں نما بھی ہوگا، خندہ، تہقہہ، غرضکہ تمام اقسام ظرافت اس میں موجود ہیں۔ اس لیے کہ مصنف

نے تمسخر، پھبتیاں، پھکڑ، ہجو، ہجو ملیح، سبھی چیزیں اس میں صرف کردی ہیں۔ کہیں تشبیہوں کے ذریعہ سے عبارت کو کشت زعفران بنا دیا ہے اور کہیں صنایع بدایع سے دیوار قہقہہ کر دیا ہے۔ کہیں ایک کمند کو لکھتے ہیں "دراز تر از عمر خضر و الیاس" کہیں نردبان کو "محکم تر از دلے محکم اساس" کہیں فیروز جنگ پر "بہادر بے بہادر" کا فقرہ، کہیں صلابت خاں میر آتش پر دیو آتشبازی کی پھبتی۔ کہیں عالمگیر کے طبیبوں کے علم کو اجل بتایا ہے۔ کہیں ادھر کے آدمیوں کے جسم کو مرض قرار دیا ہے۔

تیسری خصوصیت یہ کہ قرآن شریف کی آیات یا عربی فقروں کو فارسی کی عبارت کے ساتھ نہایت خوبی اور عمدگی سے ملایا ہے۔ اسکی مثالیں اصل کتاب ہی سے دیکھنا چاہیے۔ از اول تا آخر یہی رنگ وقایع میں موجود ہے۔

مگر مندرجۂ بالا آخری دو خصوصیات یعنی ظرافت کے الفاظ لانا اور عبارت کو شگفتہ بنانا، یا آیات قرآنی کو فارسی عبارت میں ملا دینا صرف وقایع کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ ان کی کتاب مضحکات کا بھی یہی رنگ ہے۔ لہذا یہ دو خصوصیات وقایع کو اگر ادھر جنگنامہ سے جسکی عبارت محض مقفیٰ اور دردناک ہے، جدا کرتی ہیں تو ادھر مضحکات سے ملا دیتی ہیں۔ مگر مخصوص چیز جس کا جواب شاید کہیں جگہ نہ ملے وہ وہ قصائد اور نظمیں شہر آشوب وغیرہ ہیں جو انھوں نے اس کتاب میں لکھی ہیں، ان کا نہ جنگ نامے میں جواب ہے نہ مضحکات میں بلکہ اُن کے دیوان تک میں اُن کا جواب نہیں مل سکتا۔ مانا کہ ایک قصیدہ جو انھوں نے کامگار خاں پسر جعفر خاں وزیر کی شادی کی تقریب میں کہا ہے اس میں بھی کچھ ایسی ہی باتیں آگئی ہیں۔ مگر وہ حد اعتدال سے خارج ہو کر فحش اور پھکڑ بن گئی ہیں۔ برعکس اُسکے یہاں جس نظم کو دیکھیے ایک خاص انداز رکھتی ہے۔ بعض نہیں بلکہ ہر نظم کو کہا جا سکتا ہے کہ یہ رنگ نعمت خان عالی پر ختم ہو گیا ظرافت اور اُس میں متانت یہ ایک ایسی دشوار بات ہے جسکو بڑے بڑے عالی دماغ بھی نہیں نباہ سکتے۔ مگر مصنف موصوف نے نہ صرف متانت ہی کی پابندی کی ہے۔ بلکہ بعض نظموں کو اصلیت پر مبنی کر دیا ہے اور سیاست کی زد سے اس قدر بچایا ہے کہ ہر وقت وہ آسانی کے ساتھ جواب دے سکتے ہیں کہ یہ ایک منظومہ لغت ہے۔ اسی لیے وہ بعض بعض نظموں کو ولی دشت بیاضی کی طرح شروع کرتے اور اس میں نصاب الصبیان کا رنگ پیدا کر دیتے ہیں۔ مگر در اصل وہ سب کھلی ہوئی چوٹیں بلکہ تیز تلواریں ہیں جن کے زخم کبھی بھر نہیں سکتے۔ فردوسی نے

ثمود کی ہجو لکھی - مگر وہی کھلی کھلی گالیاں، طعن و تشنیع کی طرف جا نکلے - اور کہنا پڑا کہ

پرستار زادہ نیاید بکار　　اگرچہ بود زادہ شہریار

اگر مادر شاہ بانو بُدے　　مرا سیم و زر تا بہ زانو بُدے

مگر علی الرغم اُن کے نعمت خاں عالی اپنی ظریفانہ متانت کو بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے چنانچہ ایک جگہ کہتے ہیں اور لشکر شاہی کی بے سر و سامانی کا خاکہ اُڑاتے ہیں، اور ہر تمثیل میں پھبتی کا انداز پیدا کر دیتے ہیں

فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلات　　شعر در بحر رمل باشد بہ از آب حیات

چیست عنقا روپیہ، کبریت احمر اشرفی　　کیمیا، نوکر شدن یک ہفتہ پیش بوالحسن

نقرہ و ناقہ علیہ و عسرت - مبوری انتظار -　　انچہ باشد نوکران بادشہ را درد کن

خیمہ - آں چیزے کہ منع بارش و تابش نکرد　　فرش داں سطح زمیں - ملبوس چہ جلد بدن

اسی میں بعض صنایع سے کام لیتے ہیں

ممتنع معدوم دایں ہر دو بطرزِ لف و نشر　　دانہ و کاہ و داب و نفقۂ فرزند و زن

الثقیل والغلیظ - آبے کہ در ایں لشکر است　　الاجل - حکم طبیباں - المرض احوال تن

نغخ صور دسیمہ - آواز نقیب و چوکی است　　طُعم و ماکول - انچہ آں ہرگز نیاید در دہن

لم یقع چہ - نخ تلمہ - لم یکن - یعنی یورش　　سہو سیبہ لہو زینہ - لغو توپ انداختن

یہ قصیدہ پورا اسی رنگ میں ہے - اور اسکی ظرافت کی کامیابی کا اس سے زیادہ ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کے مشہور ہزال جعفر زٹلی نے اپنے پورے لغت کی بنا اسی انداز پر رکھی ہے کہیں اسی تمسخر اور ہزل میں اپنے تبحر اور ہمہ دانی سے بھی کام لیتے ہیں اور دیکھنے والے کو حیرت میں ڈالتے ہیں کہ ایسا زبردست عالم ایسی باتیں بھی کہہ سکتا ہے - چنانچہ اس قصیدہ میں

دریں ملک خراب امروز کس را نیست سامانے　　چو گنج افتادہ اند اہل ہنر در کنج ویرانے

کہتے ہیں :-

ز فکرِ مفلسی رمال از بس ریش خود کندہ　　نودہ بادِ دستی لحیہ اش را شکل لحیانے

یکے گفت اے سبب ساز کریم از عزتِ یوسف　　بمن بنما ے خوش در خواب اشب گنج پنہانے

یکے بگرفت اے رحماں بحق موسی عمراں　　بیار از آسماں تر انگبیں امرغ بریانے

یکے گفت اے خداوند کریم از حرمت موسیٰ — برائے افرست امروز ہمچوں مائدہ خوانے

بادی النظر میں یہ سب تلمیحات ہیں، مگر دراصل مصنف کے تبحر علمی پر دلالت کرتی ہیں۔ اس قصیدہ میں یہ کمال کیا ہے کہ جس قدر کسی فن یا علم کی مصطلحات ہیں اُن سب کو ظرافت کی روح رواں بنا دیا ہے۔ مثلاً

بسر مدّے رسیدہ خلق را افراط ناداری — کہ معنی ہم ندارد ایں زماں حرف سخندانے

طبیب از علم طب در یاد سیدار ہمیں معنی — نباشد خوب تر از شربت دینار درمانے

منجم را نشد غیر از فلاکت از فلک حاصل — ز ضعف جوع بیند قرص مہ را گردۂ نانے

محاسب سال را بنوشت ماہ روزہ در دفتر — برائے آنکہ معلومش نشد شوال و شعبانے

غرض تمام پیشے، تمام پیشیوں کی اصطلاحات ظرافت کا پورا کام انجام دے رہی ہیں۔ ایک جگہ دلی وحشت بیاضی کی نصاب الصبیان پر مصرعے لگا دیے ہیں

بحر مضارع است دراں گوہر سخن — مفعول فاعلات مفاعیل فاعلن

معراج سلم آمد و زینہ و ہم کمند — زیں ہر دو ہیچ کار نیاید بانصرام

حرب و قتال جنگ ہزیمت شکست داں — آمد ہمہ بجا و زیاں شد ز ہر کدام

سیف و جراز و صارم و عضب حسام و تیغ — کارے نکرد بلکہ بروں نامد از نیام

غرضکہ جس نظم کو دیکھیے وہ اپنے رنگ میں فرد ہے۔ علیٰ ہذا نثر میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو نثر کے لیے ضروری ہیں۔ نثر میں تمام اقسام نثر اور تمام صنائع بدائع موجود ہیں۔ اور وہ اس طرح سے چمک رہی ہیں جس طرح انگشتری میں چمکدار نگینہ۔ ایک جگہ ایک خطبہ میں لکھتے ہیں

"ایہا الناس اعلموا ان اللہ انزل علیکم بلاً وحشاً فاشکروا۔ لعل النجاۃ من ہذا السلطان الحاول عن الحق المشفق من طریق العدل والاحسان، و ہو امام من الائمۃ فقاتلوا کما قال اللہ عزوجل بامرہ : ان دعوتم علیہ لم یبق لکم صورۃ الذنب قلعاً"

اسی طرح اس خطبہ کو فارسی اور عربی میں پورا کر دیا گیا ہے۔ اس خطبے کو دیکھ کر جہاں اُنکے تبحر علمی کا پتہ چلتا ہے، یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی حال میں اپنے اصلی رنگ سے انحراف نہیں کرتے۔ اس کی تہ میں بھی تمسخر اور ہزالی، اور ہجو کا دفتر پوشیدہ ہے۔ چنانچہ پہلا ہی فقرہ "اعلموا ان اللہ انزل علیکم بلاً وحشاً" کے جہاں یہ معنی ہیں کہ خدا نے تم پر ایک بلائے حسنہ نازل کی ہے۔ اور

اس سے اُن احادیث کے معنی پر روشنی پڑتی ہے کہ خدا اپنے نیک بندوں کو اس طرح آزماتا ہے کہ اُنکو بلا اور مصیبتوں میں پھنسا دیتا ہے، وہیں یہ معنی بھی سمجھ میں آتے ہیں اور اس حدیث کا مفہوم نظر میں پھر جاتا ہے کہ خدائے قہار جب کسی قوم کے طغیان و سرکشی کو حد سے زیادہ گزرتے دیکھتا ہے تو اُس پر بلائیں مسلط کر دیتا ہے اور ظالم حاکم کو اُس پر متعین کر دیتا ہے۔ یہی مضمون "لمجبل الخلافة من ہذا السلطان" تک ختم ہو جاتا ہے۔ "سلطان العادل عن الحق" کو دیکھیے، اسکے یہ معنی بھی ہیں کہ بادشاہ عدل کرنے والا حق سے، اور یہ معنی بھی ہیں کہ یہ بادشاہ ایسا ہے جو حق سے عدول کرتا ہے اور پھر گیا ہے۔ "المشفق من طریق العدل والاحسان" کے پہلے معنی یہ ہیں کہ عدل و احسان کے طریق سے وہ اپنی رعایا پر مہربان ہے، اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ وہ عدل و احسان کے راستے میں جاتے ہوئے ڈرتا ہے۔ اِن آخری معنوں پر نظر ڈالتے ہوئے اس عبارت کو دیکھیے کہ وہ ہو امام من الائمة کما قال اللہ عزوجل الخ تو صاف صاف معنی نکل آئیں گے کہ یہ بادشاہ طاغی و باغی گردن زدنی ہے۔ غرض کہ یہ تمام خطبہ اسی ریشخند سے بھرا ہوا ہے۔ نہ صرف یہی بلکہ جیسا کہ کہا جا چکا ہے اس کتاب کے لفظ لفظ سے عبارت کی گرانمایی اور مصنف کی قدرتِ کلام کا پتہ چلتا ہے۔ وہ آسانی کے ساتھ ہر علم کی مصطلحات کو صرف کر کے اُس سے اپنی ظرافت کا کام لے لیتے ہیں۔ مندرجۂ ذیل عبارت کو دیکھیے۔ مکار لوگوں کی شان میں لکھتے ہیں

"بود اے یحرّفون الکلم عن مواضعہ سررشتۂ توجیہ و تاویل را بجد کیہ سرکیسہ بعنبط در آید میکشند و بر خود حلال تر از شیر مادر دانستہ بمحض وساوسِ شیطانی و ہواجس نفسانی عملِ جزمی مضمر بجوے صرف خواہی کرد کہ الف و نون زائدہ غیر منصرف نشود و قیاس اقترانی بدلالت تضمنی ترتیب خواہی داد کہ جزوے دیگر ہم جزئی اضافی گردد و ازانجا کہ مبلغ علم واستعداد ظاہر است صغریٰ و کبریٰ ازیں مقولہ خواہد بود کہ ہمیشہ حلوائے املاے مفرح را از دکانیکہ بر در مدرسہ بود می خریدم و از اُستاد حلوائی کہ مرد شیریں زبان است خطاب آخوند می شنیدم۔"

اس عبارت کا سلسلہ دور تک ہے اور اس میں صرفی، نحوی، منطقی اور ریاضی کی اصطلاحات صرف کی ہیں۔ بلکہ تمام کتاب میں اس سلسلہ کو قائم کر کے دقائق کو باوجود تمسخر اور ہزالی کے

ایک شاہکارِ ادب بنا دیا ہے۔

اسکے علاوہ جب جنگنامے پر نظر ڈالی جاتی ہے تو ایک نئی دُنیا سامنے آجاتی ہے۔ اسکی عبارت مقفیٰ ہونے کے علاوہ اس میں جو شگفتگی پیدا کی ہے وہ بیسوں مقفیٰ مسجع کتابوں میں بھی نہیں پائی جاتی۔ حمد کی عبارت ہی اس قدر دلچسپ ہے کہ ایک پختہ کار کی نظم کا لطف ملتا ہے۔ اور حزن و یاس کے ساتھ فرحت و انبساط۔ واقعات وغیرہ کا دل پر اثر پڑتا چلا جاتا ہے۔ دیکھیے۔ کسی جگہ نہ دماغ کو فکر کی ضرورت نہ تاویل کی حاجت۔ ایک سیدھی سڑک ہے آنکھیں بند کیے چلے جائیے۔

"زیب دیباچہ سخن نیایش بے نیازے است کہ در بارگاہ کبریائیش زبان چون وچرا لال است۔ و در جناب عظمت و الائش مقولۂ کم و کیف از امر محال۔ افعالش ہمہ مقرونِ بہ حکمت اما کسے بر سرِ آں آگاہ نیست۔ و امرش در کل شئون بہ منت لیکن متنفسے را بر کماہی آں راہ نے۔ دو گل از یک شاخ سر بر آورد۔ یکے را بر دستار دولت رسانید و دیگرے را بتاراجِ حوادث ریش گرداند۔ دو گوہر از یک بحر بیروں آورد یکے را رونق تاج سلطنت ساخت و دیگرے را بہ کحل الجواہر عدم اندازد۔ دو لعل از یک کان سر بیروں کشد یکے را زینت اکلیل تاجداری نماید و دیگرے را در زیر ساقِ فنا فرساید۔ دو شمع از یک نور منور کند۔ یکے را فروغ بخش شبستان اقبال فرماید و دیگرے را بہ صرصر نیستی خاموش نماید اگر رقم اقبال است رقم زدہ کلک صنع اوست، و اگر خط ادبار است نگاشتۂ قلم حکم او۔"

کچھ دور تک یہ سلسلہ قائم رکھ کر اسی عبارت سے واقعات کو شروع کر دیا ہے، اور بہت دور جاکر اس فقرے کی مبتدا کی خبر نکالی ہے، وہاں دونوں شاہزادوں محمد معظم شاہ اور محمد اعظم شاہ کے اوپر کچھ متاسفانہ فقرے لکھے ہیں جو تیر و نشتر سے کم نہیں ہیں۔ کہتے ہیں کہ

سمندِ قلم را در فضاے احوال آں دو نیر سپہر سلطنت کہ یکے بہ نیروے توفیقات بلند فروغ بخش ایوان شہریاری گردیدہ و دیگرے را بے مددی طالع رشتۂ حیات بریدہ بہ برجِ خاکی آرمید و دستِ قدرت یکے را علم سلطنت بر افراختہ و ید قضا دیگرے را لواے حیات سرنگوں ساختہ یکے را کوکب مقصود مبنا عدا اعتلا طلوع گردیدہ و دیگرے را خورشید اقبال رو بہ زوال آوردہ۔ یکے را خیل و حشم در حفظ و حراست ایزدی محروس، و دیگرے بقتل اعوان و انصار از فتح و ظفر مایوس۔ یکے را اولاد کرام بسایۂ عنایت صمدی در امان و دیگرے را دو قرۃ العین بچشم زخم فلک در زیان۔ یکے را کوس فتح و نصرت در چار سوے عالم

بلند آوازہ، دیگرے را نوحۂ سوگواری در شبستان دمبدم تازہ"

جہاں تک اس قسم کی عبارت ہے اُسکو ادب کا بہتر سے بہتر نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ اسی طرح مصنف جنگ کے مناظر کو اس حُسن سے بیان کیا ہے کہ نظامی کا سکندرنامہ، اور فردوسی کا شاہنامہ ہی اُسکا جواب ہو سکتا ہے۔ ورنہ اگر نظم و نثر کے فرق پر ایک نگاہ ڈالی جائے تو معلوم کیا کہنا پڑے لکھتے ہیں:-

"کمانہا بہ شکل قوس قزح در دست دلاوران نمودار۔ وسیل خوں از ہر سو دراں عرصۂ پر آشوب پدیدار۔ سنے نے میدان رزم در نظر نظارگیاں خوشتر از گلزار بود۔ وفضائے معرکہ بہ دیدۂ تماشائیاں بہتر از گلشن بہاری نمود۔ صحن حرب گاہ از خون کشتگاں رشک ارغوان زار۔ ونیزہ ہا بدست جوانان چوں سرو و شمشاد نمودار۔ ہزاراں فوارۂ خونیں از بدن مبارزاں در جوش، و جاوشان بسان عندلیبانِ ہزار زباں در خروش۔ جوہائے خونیں از ہر طرف مانند انہار در جریان۔ و مرغانِ خدنگ در عرصۂ ہوا از ہر سو در طیران۔ عرق بر روئے اہل تردد چوں قطرۂ شبنم بر عارض گل ریختہ، و صدائے چقا چاق تیر در میدان لحن چکاوک برانگیختہ"

یہ منظر بھی نہایت حسن سے دکھایا ہے۔ جانبین کے خطوط میں ایک سے حلم و بردباری، دوسرے سے غصہ اور نافرماں برداری بھی قابل دید ہیں۔ محمد معظم شاہ اعظم شاہ کو جنگ پر آمادہ دیکھ کر لکھتے ہیں۔

"اے نوگل باغ سلطنت و جہانداری، و اے خجستہ گوہر بحر خلافت و شہریاری۔ گوہر وجود ما و شما از یک بحر سر برآوردہ و تازہ گل خلقت طرفین از یک شاخ نشو و نما کردہ۔ اگرچہ برادری اما بہتر از فرزندانت می شمارم۔ و ہر چند ہمسری لیکن بہ کالۂ جگرت می پندارم۔ ستودہ آئین خردمندی ہماں ست کہ بہ قسمت پدر بزرگوار راضی بودہ با انتظام مہام دکن کہ ملکیت وسیع و چندیں بادشاہان نامدار در انجا خلافت نمودہ اند بپردازند و بتحریک ارباب غرض سرچشمۂ یگانگی بخاشاک بیگانگی مکدر نسازند۔ سوائے صوبۂ دکن دو سہ صوبہ دیگر مثل گجرات و اجمیر مطلوب باشند مضائقہ نیست۔ والا در صورت کشاکش فائدہ مترتب نمی شود"

محمد اعظم نے خط پڑھ کر جواب دیا۔

"اے دانائے مراتب روزگار چہ مصلحت بخاطر اقدس راہ دادہ، وایں چہ قسمت است کہ بہ قلم

انصاف گزارش نمودہ۔ سلطنت راکہ پرتویست از ظلال افضال ربانی بورثہ چہ نسبت و خلافت راکہ بنائے است از جناب عزت باشرکت چہ مناسبت۔ این نور فیضِ مطلق اوست بر فرق ہر کسے کہ مشیت اوست می تابد و این دولت وابستۂ حکم اوست۔ ہر کرا در عالم قدم نوشتہ اند می یابد۔ اگر تقدیر سرشتۂ این امر خطیر بقسمت بازبستے ہیچ پسرے بحضور پدر بر تخت نشستے؟۔ چنانچہ حرص بدرویشاں مذموم است بادشاہ و تاج ہم ملعون و ملوم۔ باوجود این اگر طریقِ سویت مسلوک می بود مضائقہ نداشت۔ چار صوبہ خود گرفتن و چار صوبہ دگر بمن سپردن بمیزان انصاف درنمی آید و این عقدۂ مالاینحل بناخن جگر درنمی کشاید۔ عروسِ ملک کسے درکنار گیرد تنگ ؎ کہ بوسہ برلبِ شمشیر آبدار زند ؎

غرضکہ تمام عبارت میں بمشکل تشبیہیں ہیں، نہ استعارے، نہ صنایع نہ بدایع۔ مگر پھر بھی ایک کارنامہ ہے۔

حسن وعشق یہ کتاب اُس زمانے کی خیالی نثر نویسی کا اعلیٰ اور بہترین نمونہ ہے جس میں فرضی طریقے پر حسن اور عشق کی شادی کرائی ہے۔ اسی ضمن میں اُن تمام رسوم ورواج کی تشریح کی ہے جو شادی بیاہ کے موقعے پر شرفا اور امرا کے یہاں برتے جاتے تھے۔ عبارت نہایت شاداب اور رنگین ہے۔ نادر نادر استعاروں اور تشبیہوں نے پوری کتاب کو باغ وبہار بنا دیا ہے۔

مضحکات اس میں اپنی خاص طرزِ عبارت میں لطائف وظرائف جمع کیے ہیں اور اپنی شوخی سے لطیفوں پر گویا سونے پر سہاگے کا عالم دکھایا ہے۔ ایک بوستانِ بے خزاں ہے جسکے لفظ لفظ سے خندۂ گل کی آوازیں آرہی ہیں۔ ظرافت کی ایک مجلس آراستہ ہے اور نعمت خان عالی میر مجلس بنے بیٹھے ہیں۔

اسی رنگ کے چند رقعات بھی ہیں جو منشآت عالی کے نام سے موسوم ہیں۔ یہ بھی عجیب و غریب ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ جسکی طرف ہنسکر خطاب کیا ہے، ہنستے ہنستے خود بھی لوٹتے ہیں اور اسکو بھی دیوانہ بنا دیا ہے۔

جنگنامہ اورنگ زیب کے انتقال کے بعد جو اعظم شاہ اور محمد معظم شاہ میں محاربہ اور مجادلہ ہوا ہے اُسکی ایک مختصر دلچسپ تاریخ ہے۔ خوبی عبارت نے اُسکو ایک خوشنما تصویر یا ایک

مصنفی اور مجلی آئینہ بنا دیا ہے۔ عبارت مقفیٰ مسجع اور اس قدر سلیس اور دلچسپ ہے کہ تعریف محال ہے۔ اس تصنیف میں سب سے بڑا کمال یہ دکھایا ہے کہ اپنے رنگ سے علٰحدہ رہے ہیں اور کہیں ظرافت کی ہوا بھی نہیں لگنے دی، جو انکی قادر الکلامی کی بیّن دلیل ہے۔ کتاب کے فقرے فقرے میں درد و اثر اور جوش کوٹ کوٹ کر بھر دیا ہے۔ دیباچے ہی سے ایسی پرواز ڈالی ہے کہ تمام واقعاتِ آئندہ آئینہ ہو جاتے ہیں۔ زیادہ تعجب یہ ہے کہ نعمت خاں جیسا کہ لکھا جا چکا ایک استبدادی اور متعصب مزاج رکھنے والا آدمی تھا۔ شہزادہ محمد معظم اُسکا ہم مذہب یعنی شیعہ اور محمد اعظم شاہ مقتول سُنّی المذہب تھا۔ مگر پوری کتاب کو دیکھ جائیے ایک لفظ بھی ایسا نہ ملے گا جو مرحوم کی شان کے منافی ہو یا جس میں مضحکہ انگیزی، توہین، یا مذمت کا شائبہ بھی ہو۔ بلکہ دونوں بادشاہزادوں کو بالکل ایک ہی مرتبے میں پیش کیا ہے۔ اور کسی ایک کے لیے بھی کوئی فقرہ کم و بیش نہیں ہے

خوانِ نعمت | یہ بھی عالی کی تصنیف ہے۔ اسمیں مختلف شاہی کھانوں کے پکانے کی ترکیبیں ہیں۔

عالمگیر کے آخر زمانے میں نعمت خان عالی کا اعزاز اور پایۂ اعتبار اتنا بڑھ گیا تھا کہ پیشگاہِ سلطنت سے مقرب خاں خطاب ملا۔ اور جواہر خانے کی دارو غگی کی خدمت انکے تفویض ہوئی۔ عالمگیر کے انتقال کے بعد محمد معظم کی ملازمت میں رہے۔ جس وقت شاہ عالم دکن سے محمد اعظم شاہ کے مقابلے کے لیے چلے تو نعمت خان عالی بھی شہزادے کے ہمرکاب تھے۔ جس وقت گوالیار میں آئے تو انکو قلعہ میں داروغۂ جواہر خانہ کی حیثیت سے جواہر خانے کی محافظت کے لیے یہیں چھوڑ دیا گیا۔ جب حرب و ضرب کا ہنگامہ فرد ہو گیا اور محمد اعظم شاہ مغلوب ہو کر مقتول ہوئے تو دوبارہ محمد معظم شاہ سے ملے۔ اس مرتبہ ملازمان خاص میں منسلک ہو کر دانشمند خاں خطاب پایا اور وقائع نویسی کی خدمت پر مقرر ہوئے۔ پیشگاہِ سلطانی سے شاہنامہ لکھنے کا حکم دیا گیا۔ خدا معلوم اس حکم کی کس قدر تعمیل کی گئی تھی کس قدر نہیں کہ ۱۱۲۱ھ (مطابق ۱۷۰۹ء) میں حیدرآباد جا کر انتقال ہوا۔ اور دائرۂ میر مومن واقع حیدرآباد میں مدفون ہوئے۔

نعمت خانِ عالی کی تمام تصانیف علٰحدہ علٰحدہ چھپ گئی ہیں۔ مگر منشآت نایاب ہے اور مضحکات بھی اب کمیاب ہے۔ ان کا کلیات قلمی خوشخط کتب خانۂ آصفیہ حیدرآباد دکن میں محفوظ ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے۔

کار با طرفہ جفا پیشۂ افتادہ مرا
کہ نہ یادم کند و نے رود از یادِ مرا

کشد چو سوے چمن بے قدت ملال مرا
گزد چو مار سیہ سایۂ نہال مرا

نخواہد کرد ترکِ بت پرستیہا دلِ زارم
کہ چوں سنگ سلیماں نیست مادر زاد زنارم

می کند با زاریں دل شوریدہ آزار خودش
من چرا منعش کنم او داند و کارِ خودش

رشتۂ حیاتم را ہمچو رشتۂ تسبیح
صد گرہ بیکار افتاد تا بیار پیوستم

نقش پائے او بہر گامے کند جاں در تنم
خاکِ راہِ دوست گلشن آبحیوان من است

گفتی اگر قرار بگیری رسی بہ کام
بارے ازیں قرار بہ بینم چہ می شود

سیر باغے کہ بود بے تو کم از ماتم نیست
میکند سایۂ ہر نخل سیہ پوش مرا

بہ بزم وصل او کاوش اینقدر ہم می شدم محرم
کہ چوں آئینہ حرفے ازپس دیوار می گفتم

کوکب سوختہ می کرد گر اندک مددے
ہمچو آتش بہ دلِ سنگِ تو جا می کردم

چو یار محرم بزم شراب کرد مرا
بہ نگاہ گرم رقیبان کباب کرد مرا

ز عیش رفت بباد آنچہ بود در گرہم
چو گل شگفتگی دل خراب کرد مرا

ارباب نظر رخصت گفتار ندارند
مانع نہ ہمیں وجہ بود سرمہ صدا را

ذرہ ام امید وار پرتوے از آفتاب
اے سحاب بے مروت میشوی حائل چرا

می کند فرزند آخر دعوے مالِ پدر
میوہ از خورشید گیرد رنگ از گل بودہ را

ہر کہ کمیاب رہ بجا نہ رساند خود را
ایں محال ست کہ تا خانہ رساند خود را

در نشاط آرد وصال دوستاں مشتاق را
حلقۂ صحبت نمی باشد کم از جام شراب

ہیچ ہست ملاقات مردمِ عالم
بہ بیں کہ دست ز دنیا بسر سلام شدہ است

ماہی در کار خود مجنوں چرا کرد ایں قدر
مردنِ عاشق بہ آہے یا نگاہے بیش نیست

سود مسیح و خضر ز دوراک عہد نیست
ورنہ کدام نفع بہ عمر دراز بود

بے تعلق شو کہ تا دے جو می ریزد نبات
قالبے امروز می سازد کہ فردا بشکند

بمروت کنفس نگذاشت دل را پیش من
ایں قدر ہم لائقِ بے اعتباری نیستم

بے تو ہر گاہ تماشائے گلستاں کردم
ہمچو گل دامنِ خود پُر ز گلستاں کردم

ساغرے بے صحبتِ آں نازنیں نتواں زدن
در فراقش جام مے جز بر زمیں نتواں زدن

(الناظر، نومبر ۱۹۲۷ء)

خود نوشت میرزا محمد خاں قزوینی

(جناب مرزا محمد عسکری صاحب بی اے)

چہار مقالۂ عروضی کو قدیم فارسی ادب میں جو منزلت حاصل ہے وہی درجہ عجب نہیں جو آیندہ زمانہ میں بیست مقالۂ قزوینی کو حاصل ہو۔ ہمارے مکرم جناب مرزا محمد عسکری صاحب نے چاہا تھا کہ یہ کتاب بھی لباس اُردو سے آراستہ ہو جائے اور اسی خیال کی بنا پر نہایت ذوق وشوق سے اُس کا ترجمہ شروع کر دیا تھا۔ اور ایک ثلث کے قریب کام ہو چکا تھا کہ کاپی رائٹ کے جھگڑے کی وجہ سے قلم رُک گیا۔

مصنف نے مقالۂ اول میں مختصراً خود اپنے حالات تحریر کیے ہیں، جو مرزا صاحب کی عنایت سے درج الناظر کیے جاتے ہیں۔ امید ہے کہ علم وادب کے شائقین اس کے مطالعہ سے محظوظ ہوں گے۔ انشاءاللہ ترجمہ شدہ اوراق کے بعض دیگر اجزا بھی وقتاً فوقتاً نذر ناظرین ہونگے جن سے ان مقالات کی قدر وقیمت کا اندازہ اُن اصحاب کو بھی ہوگا جو اصل کتاب کے مطالعہ سے بہرہ مند نہیں ہو سکے۔

ایڈیٹر

تاریخ وجائے ولادت - ابتدائی تعلیم

بندہ کا نام محمد اور میرے والد کا نام عبدالوہاب بن عبدالعلی قزوینی ہے۔ میرے والد "نامۂ دانشوراں" کے چار مولفوں میں سے ایک تھے۔ در نحویوں اور اہل لغت اور ادباء و فقہاء کے حالات جو اُس کتاب میں درج ہیں غالباً اُنہیں کے سپرد تھے۔ اُن کا نام اُس کتاب کے مقدمہ میں موجود ہے اور نیز اُنکے کچھ مختصر حالات مرحوم اعتمادالسلطنت

محمد حسن خاں کی کتاب "المآثر و الآثار" میں بھی مذکور ہیں۔ میرے والد کا انتقال ۱۳۰۶ھ میں طہران میں ہوا۔ اور میری ولادت بھی طہران ہی میں محلۂ دروازۂ قزوین میں پندرہویں ماہ ربیع الاول ۱۲۹۷ھ کو ہوئی۔

اساتذہ کا ذکر

علوم متداولۂ اسلامی کی تحصیل اُسی طہران میں میں نے کی۔ صرف و نحو اپنے والد سے اور مرحوم آقائی حاجی سید مصطفےٰ (جو قناعت آبادی کے لقب سے مشہور تھے) سے مدرسہ میرزا ملک میں پڑھی اور فقہ انھیں بزرگوار اور مرحوم حاجی شیخ محمد صادق طہرانی مدرس مدرسہ مذکور سے اور چند دن مرحوم حاجی شیخ فضل اللہ نوری سے اور علم کلام اور حکمت قدیم آقائی حاجی شیخ علی نوری سے مدرسۂ خان مروی میں اور اصول فقہ مرحوم ملا محمد آملی سے مدرسۂ خازن الملک میں اور اسکے بعد اصول فقہ خارجاً مرحوم آقا میرزا حسن آشتیانی کی خدمت میں ان مرحوم کے آخری تین چار سال کی مدت میں حاصل کیے۔ ان بزرگ کا تبحر اور احاطۂ معلومات تمام جزئیات علم اصول میں واقعی حیرت انگیز تھا۔ مثل ان کے کم کوئی شخص اس واقفیت اور معلومات کا پیدا ہوا ہوگا ایک آدمی کسی ایک علم کے فروع و مسائل پر حاوی اور اتنا ذہن و دماغ قیاس میں نہیں آسکتا۔

ادبیات عربی سے طبعی ذوق

میں نہیں کہہ سکتا کہ بچپن ہی سے ان تمام علوم متداولہ میں ادبیات عربی سے اس قدر شوق و ذوق مجھ کو کیوں تھا۔ بچپن اور شباب کا زیادہ تر زمانہ اسی فن کے مختلف شعبوں خصوصاً علم نحو میں صرف ہوا اور عمر گرانمایہ اسم و فعل و حرف کے شغل میں ختم ہوئی۔ اب بھی جب میں اُن گزشتہ ایام پر غور کرتا ہوں اور تلف کی ہوئی عمر پر تاسف کرتا ہوں تو میری بہترین تفریحات اب بھی شرح رضی اور "مغنی اللبیب" ہیں جو میرے واسطے وصل حبیب سے بھی زیادہ خوشگوار اور مزیدار رہیں اور گویا عادت طبیعت ثانیہ ہوگئی ہے۔

۱؎ تقریباً ۱۳۲۰ھ میں یا کسی قدر کم و بیش وفات پائی۔

۲؎ ناصر الدین شاہ کے آخری عہد یا مظفر الدین شاہ کے شروع عہد میں طہران ہی میں وفات پائی۔

۳؎ ۱۲۔ رجب ۱۳۲۴ھ میں طہران میں پھانسی پائی۔

۴؎ تشکیل سلطنت موجودہ یعنی ۱۳۴۴ھ تک زندہ تھے۔ اسکے بعد مجھکو نہیں معلوم کہ کس تاریخ وفات پائی۔

۵؎ مظفر الدین شاہ کے شروع عہد میں یعنی تقریباً ۱۳۱۶ھ میں طہران میں وفات پائی۔ انکے جنازہ پر تقریباً تمام اہل شہر شریک تھے۔ تمام دکانیں اور بازار بند کردیے گئے تھے۔ اور وہ ایسا دن تھا کہ جو کبھی بھول نہیں سکتا۔

ان لوگوں کا ذکر جن سے بغیر درس و تدریس فیض حاصل کیا

ان بزرگواروں میں کہ جنکی مبارک ذات سے بغیر درس و تدریس کتب رسمی کے میں نے اپنی استعداد کے بموجب کسب فیض کیا - مرحوم حاجی شیخ ہادی نجم آبادی ہیں[1] - قریب دو تین سال تک ہر روز غروب آفتاب کے بعد جب دو ایک گھنٹے گزر جاتے تھے اپنے ایک دوست کے ساتھ ان بزرگوار کی مجلس میں جبکہ یہ اپنے مکان کی بیرونی منزل حسن آباد میں ریگ زمین پر بے فرش تشریف فرما ہوتے تھے میں حاضر ہوا کرتا تھا اور اس مقدس ہستی اور اُنکے اصحاب اور شاگردوں کی صحبت سے مستفید ہوتا تھا ......

اُنکی زندگی کی سادگی، اُنکے خیالات کی صحیح معنوں میں آزادی، جو خاصت کہ ملک کی بیداری اور موہومات کے پردوں کو چاک کرنے میں اور اُس عہد کے لوگوں کی آنکھوں اور کانوں کے کھولنے میں اُنھوں نے انجام دی۔ اُن کی مجلس کی عجیب و غریب وضع اور تمامت مذاہب و ملل مسلمان و یہود و بابی وغیرہ کی اُس میں شرکت اور مختلف مسائل مذہبی پر اُنکے مباحث کمال آزادی کے ساتھ جس میں کبھی کبھی طنز و استہزا بھی اُن بزرگوار اور اُن کے اصحاب و تلامذہ کی شان میں شامل ہوتا تھا - اور جو احترام و بزرگی کہ اُنکے اصحاب اُنکے ساتھ کرتے تھے۔ یہاں تک کہ کوئی حرکت بلکہ مسکراہٹ بھی اُن کے سامنے نہیں آسکتی تھی - غرضکہ یہ سب امور اُس زمانہ کے عجائب واقعات سے ہیں جو کبھی نہیں بھول سکتے اور جن کو مفصل بیان کرنے کے لیے ایک کتاب چاہیے - بہرحال اسکو ایک جملۂ معترضہ سمجھ کے میں آگے بڑھتا ہوں۔

دوسرے اُستاد معظم کہ جن کے افادات کثیرہ سے میں مستفید ہوا بقیۃ الفضلا خاتمۃ الادبا آقائی سید احمد ادیب پشاوری مدظلہ العالی ہیں۔ ان بزرگوار کی عادت تھی کہ گرمی کے موسم میں حسب عادت کسی ٹھنڈی جگہ پر امام زادہ صالح تجریش کے صحن میں تشریف فرما ہوتے اور دو ایک گھنٹے اُسی جگہ ایک کونے میں نشست کرتے تھے - میں باوجودیکہ اُنکی تنگ مزاجی سے ڈرتا تھا مگر حیلے بہانے ڈھونڈھ کر اُنکی خدمت میں ضرور حاضر ہوتا اور ڈرتے ڈرتے کوئی سوال اُن سے ضرور پوچھتا جسکا جواب شافی وہ دیتے اور میں اُس کو فوراً اپنے دماغ کے خزانہ یا کسی نوٹ بک میں محفوظ کر لیتا - ان کا تبحر ادبیات فارسی و عربی میں اور ان کا عجیب و غریب حافظہ کہ ہزارہا اشعار علی الخصوص عربی اشعار ان کو ازبر تھے - فی الواقع آجکل کی اصطلاح میں محیر العقول تھا - مثلاً ہر وقت اور ہر مجلس میں جب

---

[1] مظفر الدین شاہ کے شروع عہد میں یعنی سنہ ۱۳۱۲ھ کے بعد طہران میں انتقال کیا۔

کوئی شعر عربی پڑھا جاتا اور اہل مجلس کو یہ نہ معلوم ہوتا کہ وہ شعر کس کا ہے یا کس زمانہ میں کہا گیا ہے تو وہ اُس کو سن کر تمام اشعار اُس قصیدہ کے جسکا وہ شعر ہوتا مع نام شاعر اور حالات شاعر اور معنی شعر وغیرہ وغیرہ کے بے تامل نہایت تفصیل کے ساتھ بیان فرما دیتے۔ میں جب اُنکو دیکھتا تھا تو مجھ کو وہ حکایت یاد آجاتی جو عربی کی ادبی کتابوں میں حماد راویہ کے متعلق مشہور ہے کہ جس کو فقط شعرائے جاہلیت کے حروف تہجی کے اعتبار سے ہر ہر حرف کے سو سو بڑے بڑے قصیدے علاوہ مقطوعوں کے حفظ تھے اور شعرائے اسلام کا کلام مزید براں۔ چنانچہ خلیفہ ولید نے جب یہ حال سنا تو اسکو یقین نہ آیا اور اپنے ایک آدمی کو مقرر کیا کہ وہ جائے اور اُن کا امتحان لے۔ اُس نے دو ہزار نو سو قصیدے تفصیل مذکورہ سے اُن سے نقل کیے[1]۔ غرضکہ اُن کی قوتِ حافظہ، کثرت معلومات، حفظ اشعار و لغات اور نیز اُن کا فلسفیانہ مزاج، زہد و تقویٰ اور گوشہ نشینی اور اُنکے جمیع حالات اطوار کو دیکھ کر میں ہمیشہ اُنکا مقابلہ ابو العلاء معری سے کیا کرتا تھا اور اُس میں بھی یہ فرق تھا کہ ابو العلاء صرف ادبیات عربی میں نادرۂ دہر تھا اور یہ بزرگ دو زبانوں یعنی عربی و فارسی میں نابغہ عصر۔ انکے اشعار کا دیوان اب سے دو تین سال قبل پیرس میں میں نے شاہزادہ نصرۃ الدولہ فیروز میرزا کے پاس دیکھا تھا۔ ہزار افسوس ہے کہ اب تک وہ چھپا نہیں ہے۔

اُن بزرگوں میں کہ جنکا حق تربیت میرے اوپر ہے مرحوم شمس العلماء شیخ محمد مہدی[2] تفرشی عبدالرب آبادی ہیں۔ جو اپنے زمانہ کے مشہور ادیب اور میرے والد کے دوست اور "نامۂ دانشوراں" کے چار مؤلفوں میں سے ایک تھے۔ والد کے انتقال کے بعد ان بزرگ نے ہم چھوٹے چھوٹے بچوں کو اپنے سایۂ عاطفت میں لیا۔ اور والد کی تنخواہ میں سے ایک تھوڑا سا حصہ ہم لوگوں کے واسطے مقرر کرا دیا۔ جسکی مدد سے میری نیک ماں نے کہ اللہ اُن کی روح کو منور کرے ہم کو پالا اور پروان چڑھایا۔

دوسرے وہ بزرگ کہ جنکے احساناتِ عظیم در بارۂ تعلیم و تربیت میری گردن پر ہیں مرحوم میرزا محمد حسین خاں اصفہانی متخلص بہ فروغی ملقب بہ ذکاء الملک ہیں جو موجودہ ذکاء الملک آقائی میرزا محمد علی خاں مدظلہ العالی کے پدر بزرگوار تھے۔ تقریباً دس بارہ سال تک اپنے عہد شباب میں برابر اور ہر شب ان بزرگوار کی صحبت میں جو اُس زمانہ کے شعرا و ادبا اور اہل ذوق کا مجمع تھی حاضر ہوتا اور ان کی

---

[1] دیکھو ابن خلکان حرف حا و ذکر حماد۔

[2] منجملہ عمومی کے زمانہ میں طہران میں وفات پائی۔ ٹھیک سنہ وفات اسوقت یاد نہیں ہے ۱۳۲۲ھ میں طہران میں وفات پائی

صحبت سے برابر مستفید ہوتا - یہ اُنھیں کی مشفقانہ توجہات اور پدرانہ تربیت کا نتیجہ ہے کہ میں نے کسب اخلاق حمیدہ کیا - اس دس بارہ سال کے عرصہ میں برابر اُنکے دونوں صاحبزادوں یعنی آقائی میرزا محمد علی خاں ذکاء الملک اور آقائی میرزا ابوالحسن خاں فروغی کے فیض صحبت سے بھی مستمراً فیضیاب ہوتا رہا - شروع میں باوجود ذکاء الملک کی خدمت میں فرنچ پڑھتا تھا اور وہ مجھ سے درس عربی حاصل کرتے لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں بوجہ توافقت مزاج و اخلاق و خیالات کے تعلیم و تعلم سے آگے بڑھ کے ایک مضبوط باطنی دوستی کا سلسلہ قائم ہوگیا جو آجکل کے ابنائے زمانہ کی دوستی کے موافق نہیں اور اس کا مدار حصول نفع اور دفع نقصان پر نہیں بلکہ اس کی جڑ یگانگی مشرب اور اتحاد مذاق پر قائم و برقرار اور تدریجاً مضبوط ہوتی گئی اور میں امیدوار ہوں کہ یہ دوستی کہ جو اخوان الصفائی دوستی سے کم نہیں ہے جب تک میری اور اُن کی حیات باقی ہے انشاء اللہ محکم و مضبوط رہیگی -

دوسرے اکابر علما میں سے کہ جو میرے ساتھ خاص لطف رکھتے تھے مرحوم شیخ فضل اللہ نوری[1] تھے کہ جنھوں نے اپنے دو صاحبزادوں - یعنے آقائی ضیاء الدین اور آقائی حاجی ، میرزا ہادی کی نحو کی تعلیم میرے متعلق کی تھی اور میں نے ان دونوں آقازادوں کو مسلسل دو تین سال تک پڑھایا اور اپنی ناقص معلومات کے مطابق اُن کو اس فن سے آگاہ کردیا - جب میں پیرس میں پہلی مرتبہ مقیم تھا تو اُن مرحوم کے خط جو اُن کے خاص تعلق کے تھے میرے پاس کبھی کبھی آتے رہتے تھے - جن کو ابتک بطور اُنکی یادگار کے میں نے رکھ چھوڑا ہے - انکے حرکات و اعمال کا برا نتیجہ کہ جو ان مرحوم کی آخری عمر میں اُن سے سرزد ہوئے تھے جسکی وجہ سے اُنکی زندگی کا دفعتاً خاتمہ ہوگیا اُس سے اُن مرحوم کے مقامات علمیہ سے انکار نہیں کیا جا سکتا - اُنھوں نے اپنے اعمال کا نتیجہ اس دنیا میں بھگتا - اصل واقعہ کا علم خدا کو ہے اور اب وہ پیوند خاک ہیں اور دنیا سے اُنکا کوئی تعلق نہیں ہے اور یہ قدیم مقولہ ہے کہ "اُذکروا موتاکم بالخیر" (اپنے مرے ہوؤں کو نیکی سے یاد کرو) راقم الحروف کو اس مقام پر اُنکے ذکر سے اُنکے اعمال کی مدح و قدح مراد نہیں - صرف یہ غرض ہے کہ اس جگہ اُنکی عنایتوں کا شکریہ اور قدیم حقوق محبت کا ذکر کیا جائے اور بس - زمانہ گزشتہ کے واقعات یاد کرکے بقول بیہقی کے میں نے قلم کو تھوڑا سا اُنکے اوپر رُلایا -

لندن کا سفر

شروع ۱۳۲۲ھ میں میرے بھائی میرزا احمد خاں نے جو بالفعل مفتش ادارہ مالیات غیر مستقیم (Auditor of Indirect Revenues) ہیں اور

---

[1] ۱۳ رجب ۱۳۲۷ھ کو طہران میں پھانسی پائی -

وہ اس وقت لندن میں تھے چونکہ قدیم کتب کے ساتھ میرے شوق بلکہ میرے عشق سے واقف تھے، مجھکو لکھا کہ "نامناسب نہیں ہے کہ جب تک میں یہاں ہوں تم بھی لندن میں آجاؤ اور یہاں کے بڑے کتابخانہ (British Museum) کی سیر کرو اس کے بعد ہم دونوں مل کے وطن واپس چلیں گے" میں نے بھی اس مشہور مثل کے موافق کہ "اندھا کیا چاہے دو آنکھیں"، بلا تامل اس دور و دراز سفر کا ارادہ کرلیا۔ اور اپنی مادر شفقت سے ہمیشہ کے واسطے رخصت ہو گیا کہ جو اس وقت میرے پہونچانے کے واسطے دروازہ قزوین کے باہر آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے ہوئے کھڑی تھیں اور جس وقت ڈاک کی گاڑی چلنے لگی تو انھوں نے مجھ سے فرمایا کہ "بیٹا مجھکو یقین ہے اب میں تیرا چہرہ نہ دیکھ سکونگی" الغرض پانچویں ربیع الثانی ١٣٢٢ھ کو طہران سے رخصت ہو کر براہ روس و جرمنی و ہالنڈ (Holland) میں لندن پہونچا اور وہاں اس کتاب خانہ عظیم اور اس کی عربی و فارسی نادر الوجود کتابوں کو دیکھ کر انکے مطالعہ کا اتنا شوق مجھ پر غالب ہوا کہ بے اختیار اپنے خاندان اور وطن کو یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ بالکل بھول گیا مگر البتہ تھوڑے وقت کے واسطے (کہ یہ تھوڑا وقت بھی اب بیس سال سے گزر گیا ہے) ان کا خیال میں نے اپنے دل سے نکال دیا۔

قیام لندن

قریب دو سال تک میں لندن میں رہا اور وہاں انگریز مستشرقین کی ایک جماعت سے ملاقات ہو گئی از انجملہ پروفیسر بیوان (A. A. Bevan) ہیں کہ جو ادبیات عرب علی الخصوص جاہلین اور مخضرمین کے اشعار کے متخصص[5] ہیں اور اس شعبہ میں کمتر کوئی شخص انکی قابلیت کا ہوگا۔ اپنے فن میں بہت بڑے متبحر اور اپنے کام میں انتہا درجہ دقت اور احتیاط سے کام لیتے ہیں جو بعض وقت وہم و وسواس کی حد تک پہونچ جاتی ہے چنانچہ نقائض جریر و فرزدق کو تین بڑی جلدوں میں بیس سال کی محنت میں ١٩٠٥ء لغایت ١٩١٢ء میں بمقام لیڈن (Holland) طبع کرایا اور بے تکلف یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کتاب کی طباعت کو اتنی صحت و دقت کے ساتھ اس آخری صدی میں یورپ کا ایک بڑا ادبی شاہکار سمجھنا چاہیے۔

دوسرے مسٹر ایلس (A. G. Ellis) ہیں جو "برٹش میوزیم" کے کتابدار سابق اور اوقاف گیب (Gibb Memorial) کے ایک ٹرسٹی ہیں۔ کتب قدیمہ کے پہچاننے اور کتب

---

[5] متخصص کی جگہ بالعموم اردو میں ماہر خصوصی کہتے ہیں۔ میں نے متخصص کو اس لیے بحیثیت اصطلاح رہنے دیا کہ اس میں ایک ہی لفظ ہے۔ — مترجم

عربی و فارسی و ترکی کے نام اور انکے مصنفین کے حالات اور تعداد تصانیف کی واقفیت میں یدطولیٰ رکھتے ہیں۔ انکی تیار کردہ "برٹش میوزیم" کی فہرست کتب مطبوعہ عربی کی دو بڑی جلدوں میں ایک نہایت بیش قیمت تالیف ہے۔

دوسرے مأسوف علیہ[1] مسٹر آمدروز[2] (H. F. Amedroz) اوقاف گیب کے ایک رکن۔ ہلال صابی کی "تاریخ الوزرا" اور ذیل تاریخ دمشق ابن القلانسی کی طباعت انکی یادگار ہیں۔

دوسرے مشہور مستشرق پروفیسر ایڈورڈ براؤن (Edward G. Browne) کہ انکی شہرت میری ہر طرح کی وصف و تعریف سے مستغنی ہے یہ بھی اوقاف گیب کے ایک مشہور رکن اور انھیں کے توسط سے بعض کتابوں کی تصحیح و طبع کا کام امنائے مذکور کی طرف سے اس حقیر کو سپرد ہوا تھا۔ (۱۰ جمادی الآخر ۱۳۴۴ھ مطابق ۵ جنوری ۱۹۲۶ء کیمبرج میں وفات پائی) ۱۳۲۴ھ کے شروع میں اوقاف گیب کے ٹرسٹیوں نے "تاریخ جہاں کشائے جوینی" کی تصحیح و طباعت مجھکو سپرد کرنا چاہی اور میں نے بھی باوجود اپنی بے بضاعتی اور عظیم الشان محنت و وقت کے اس کام کو متوکلاً علی اللہ قبول کرلیا اور اس مقصد کی انجام دہی کے واسطے ۱۰ ربیع الثانی ۱۳۲۴ھ میں لندن سے پیرس کو روانہ ہوا کیونکہ وہاں متعدد نسخے اس کتاب کے موجود ہیں اور آخر ۱۳۳۲ھ تک پیرس ہی میں رہا۔

پیرس میں فرانسیسی مستشرقین سے ملاقات

پیرس میں جن مستشرقین سے ملاقات ہوئی اور ان سے میں نے استفادہ کیا حسب ذیل ہیں:—

(۱) مأسوف علیہ ہرتویگ درنبورگ[3] (Hartwig Derenbourg) مشہور عربی داں اور طابع "کتاب سیبویہ" صاحب تالیفات مشہورہ۔ میں انکے لکچروں میں جو یمن کے قدیم خط حمیری (جسکو خط مسند بھی کہتے ہیں) اور اسی خط کے قدیم کتبوں اور تحریروں کے متعلق عجائب خانہ لوور (Louvre) میں ہوتے تھے اکثر شریک ہوا ہوں اور غالباً وہ لکچر ہی لوور ہی میں ہوتے تھے۔

---

[1] یہ لفظ اس موقع پر استعمال کیا گیا ہے جہاں آجکل ہماری زبان میں "آنجہانی" بولتے ہیں۔ میں "مأسوف علیہ" کو "آنجہانی" پر ترجیح دیتا ہوں کیونکہ آخر الذکر لفظ میں کوئی تاسف و ملال کا پہلو نہیں ہے۔ جو ہونا چاہیے۔ مترجم

[2] ۱۹۱۷ء میں وفات پائی۔

[3] ۱۹۰۸ء میں پیرس میں وفات پائی۔

(۲) اسوف علیہ باربیہ دومنار[1] (Barbier de Meynard) جنھوں نے مسعودی کی "مروج الذہب" کا ترجمہ مع اصل نو جلدوں میں چھاپا ہے اور اسکے علاوہ اور بھی کتابیں طبع کرائی ہیں۔

(۳) میسو میہ (A. Meillet) مشہور لغوی ونحوی۔ انھوں نے ہندوستان اور یورپ کی مختلف زبانوں کے صرف ونحو کا موازنہ کیا ہے۔ چند دن انکے لکچروں میں جو سار بون (Sorbonne) میں ہوے تھے حاضر ہوا ہوں۔

(۴) میسو ہوارت (Clement Huart) جنھوں نے عربی و فارسی و ترکی کی اکثر تصانیف کا ترجمہ یا تصحیح کی مگر کسی خاص فن میں متخصص نہیں ہیں

پیرس ہی کے قیام میں آقائی میرزا علی اکبر خاں دھخدا سے شرف ملازمت حاصل ہوا۔ یہ ایک مشہور عالم ومصنف شروع استبداد صغیر[2] میں ایک جماعت اہل ایران کے ساتھ اپنا وطن مالوف چھوڑ کر پیرس آ گئے تھے۔ انکی خدمت میں میں اکثر حاضر ہوتا اور انکی صحبت سے بہت محظوظ ہوتا۔ سچ پوچھیے تو جو لطف میں نے اپنی عمر بھر اس دنیا میں اٹھایا وہ وہی زمانہ تھا اور میں آرزو کرتا ہوں کہ ایک مرتبہ مرنے سے پہلے یہ سعادت پھر نصیب ہو۔

انکے علاوہ جناب آقائی حاجی سید نصر اللہ اخوی دامت برکاتہ سے جو زمانۂ موجودہ کے مشہور عالموں، شاعروں، اور ادیبوں سے ہیں مجھکو غائبانہ ملاقات نصیب ہوئی۔ یعنی جس زمانہ میں میں "مرزبان نامہ" کی تصحیح وطباعت میں مشغول تھا ان بزرگ نے کمال اطمینان و فیاضی کے ساتھ کہ جو صرف انھیں سے متوقع ہو سکتی تھی اپنا صحیح کیا ہوا نسخہ اصل کتاب کا بجائے بغیر کسی سابقہ ملاقات اور اعتماد کے مجھکو عنایت کیا اور اسی وقت سے اب تک سلسلۂ خط وکتابت ان بزرگ کے ساتھ جاری ہے، جو میری سرفرازی کا باعث ہے۔

آخر ۱۳۳۲ھ میں جب جنگ عمومی چھڑ گئی اور دنیا کے تمام کاروبار معطل ہو گئے (وجہ بیان

---

[1] دسمبر ۱۹۰۸ء میں پیرس میں وفات پائی۔

[2] "استبداد صغیر" سے غالباً وہ زمانہ مراد ہے جو مظفر الدین شاہ کے آخر عہد میں آزادی پسندوں کے ساتھ سختی جبر وظلم کا تھا بمقابلہ "استبداد کبیر" کے کہ جو محمد علی شاہ کے زمانہ میں ہوا۔ (مترجم)

لکھنا بے موقع ہے) جس کی وجہ سے میرا خاص کام پیرس میں رہ کر انجام پانا نا ممکن ہو گیا تو آقائی حسین قلی خاں نواب نے جو میرے قدیم عنایت فرما اور اس وقت پیرس میں تھے اور اتفاق سے برلن کی سفارت پر مقرر ہو کر جانے والے تھے مجھ سے فرمایا کہ اب تم پیرس میں رہ کر کیا کرو گے آؤ ہمارے ساتھ برلن چلو اور دو تین مہینے وہاں رہو۔ وہاں کی بھی سیر کرو اور دو تین مہینے کے بعد جب جنگ ختم ہو جائے گی اور کاروبار اپنی اصلی حالت پر آجائے گا پیرس پھر واپس آنا۔

اس تجویز کو کمال شوق سے قبول کر کے ۱۴ر ذی الحجہ ۱۳۳۳ھ مطابق ۲۲ر اکتوبر ۱۹۱۵ء کو پیرس سے روانہ ہوا اور سوئیس (Switzerland) کی راہ سے انھیں کی ہمراہی میں چار دن کے بعد برلن پہنچا۔ راستہ میں باوجود سخت دقتوں کے جو جنگ کی وجہ سے تمام مسافروں کو سفر میں ہوتی تھیں خاص کر جب سفر ایک محارب ملک سے دوسرے میں ہوتا۔ مگر چونکہ میں ایک وزیر مختار کی ہمراہی میں اور گویا انھیں کے اسٹاف میں تھا الحمد للہ کہ ان دقتوں اور تکالیف کا سامنا ہم لوگوں کو نہیں ہوا البتہ ہمارے داخلۂ برلن کے تھوڑے ہی دنوں بعد تمام آمد و رفت لوگوں کی جرمنی سے قطعاً بند ہو گئی اور وہ دو تین مہینے دو تین سال ہو گئے اور پھر بھی جنگ کا خاتمہ نظر نہیں آتا تھا۔ الغرض ساڑھے چار برس یعنی تا اختتام جنگ میں برلن ہی میں رہا اور جو صدمے اور مصیبتیں کہ اس مدت میں "قحط عام" سے تمام اہل ملک نے اٹھائیں ان کا ذکر اس مختصر مقالہ میں قطعاً محال ہے اس کے لیے ایک کتاب "روضۃ الصفا" کے حجم کے برابر چاہیے اور میں اس کام کو ان لوگوں کے حوالے کرتا ہوں جو آیندہ جنگ عظیم کی تاریخ لکھیں۔

قحط عام کا لفظ جو میں نے اوپر کے فقرے میں استعمال کیا اس سے میرا مطلب یہ ہے کہ قحط میں عموماً تنگی رزق صرف دو ایک چیزوں کی ہو سکتی ہے مثلاً روٹی یا گوشت یا اس کے سوا کوئی چیز۔ مگر اس جنگ عظیم کے اثنا میں چونکہ جرمنی کا محاصرہ بحری و بری دونوں متفقین نے پوری طرح کر رکھا تھا اس طرح کہ جنگی جہازوں اور پندرہ لاکھ فوج کے ذریعہ سے گویا اس کے گرداگرد ایک لوہے کی دیوار قائم کر دی گئی تھی کہ جس کا ٹوٹنا یا پھٹنا غیر ممکن تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ تمام چیزیں مطلقاً اور کلی طور پر روٹی، آٹے، گوشت وغیرہ کی قسم سے یہاں تک کہ آلو، چاول، تمام اقسام غلہ، دودھ، پنیر، روغن اور تمام چیزیں کہ جو ان سے بنتی ہیں اور قند و شکر مربے، شہد، صابون، جوتے، تولیے، کمبل، اونی کپڑے تمام ماکولات اور کل استعمال و ضرورت کی چیزیں بالکل نایاب اور عنقا ہو گئی تھیں وجہ یہ تھی کہ ضروری اشیاء کو سلطنت نے اپنے تصرف میں لے لیا تھا اور ملک کے رہنے والوں پر

فی کس ایک معیّن حصہ اور ایک معیّن مدت کے واسطے تقسیم کیا جاتا تھا۔ مگر اسکی مقدار سُنیے!
مثلاً ہفتہ بھر کے لیے فی کس ۲۶ سیر[1] روٹی - ۳ سیر گوشت - ۵ مثقال یعنی ۲۵ گرام روغن اور مہینہ بھر
کے واسطے ½۴ سیر شکر، ایک انڈا اور تمام اشیا اسی پر قیاس کرنا چاہیے۔ اور یہ بھی بتائے دیتا ہوں
کہ ہم ایرانی نسبت اہل ملک کے بہت خوش نصیب تھے اس واسطے کہ آقائی تقی زادہ کی کوشش
بلیغ سے چونکہ ہم لوگ جنگ سے بے طرف (نیوٹرل) اور دولتِ جرمنی کے مہمان تھے ہم کو فی کس
اشیائے مذکورہ کا دونا حصہ دیا جاتا تھا۔ یعنی ہفتہ میں بجائے ۵ مثقال روغن کے ۱۰ مثقال اور
بجائے مہینہ میں ایک انڈے کے دو انڈے بلاکسر مرحمت ہوتے تھے۔

مختصر یہ کہ اس چار پانچ سال کی مدت اپنے قدیم دوست اور عنایت فرما محترم آقائی سید حسن
تقی زادہ کی مصاحبت میں بسر ہوئی اور ان فاضل علامہ کی علمی و ادبی صحبتوں سے میں برابر مستفید
ہوتا رہا۔ ان بزرگوار نے اس زمانہ میں سلطنت جرمنی کی اعانت سے ایک انجمن موسوم بہ کمیٹۂ ایرانی
(Iranian Committee) قائم کی تھی جس میں تمام معزز اہل ایران جو اس اثنا میں بسبب
راہِ آمد و رفت بند ہو جانے اور روابط اتحاد و دوستی منقطع ہو جانے کے مثل بیچارے مسافروں کے
ادھر اُدھر سرگرداں تھے۔ ہر چند کہ وہ اپنے وطن میں خوش حال اور متمول تھے۔ آقائی تقی زادہ نے
اس کمیٹی کے ذریعہ سے ان سب کو ایک جگہ اکٹھا کر لیا تھا جس کی وجہ سے ایک جماعت کثیر ہمارے
ہموطنوں کی اس عالمگیر طوفان کے صدموں سے بے خطر اور اُس گرم ہوا کے تیز جھونکوں سے کہ جو خشک و
تر ہر چیز کو جلائے ڈالتی تھی ہماری حمایت میں محفوظ رہی۔

بلکہ سچ پوچھیے تو اس چار پانچ سال کے عرصہ میں فضلائے ایران کی ایک منتخب اور عمدہ جماعت
برلن میں قائم ہو گئی تھی اور مختلف اشخاص جو اپنے مشاغل و کاروبار کے ذریعہ سے مختلف شہروں
میں پھیلے ہوئے تھے۔ آقائی تقی زادہ کی کوششوں سے ایک نقطہ پر جمع ہو گئے تھے اور جس طرح
بھیڑیوں کا گلہ طوفان کے وقت سر جوڑ کے اکیجا جمع ہو جاتا ہے اُسی طرح ہم مصیبت زدہ بھی
کمال اتحاد کے ساتھ بسر کرتے تھے اور ملیین انسانوں کی قربانی جو ہمارے چاروں طرف
مختلف میدان جنگ میں ہو رہی تھی۔ ہم کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہم کسی سینما میں چند متحرک صورتیں

---

[1] سیر سے ایرانی سیر مراد ہے جو تقریباً ڈیڑھ چھٹانک کا ہوتا ہے۔ ۲۶ سیر تقریباً ½۲ سیر ہندوستانی کے
برابر ہوئے۔ دوسرے اوزان بھی اسی پر قیاس کر لینا چاہئیں۔ (مترجم)

دیکھ رہے ہیں یا کبھی زخمی ہاتھ پاؤں کٹے ہوئے سپاہیوں کا منظر کسی راستہ گلی میں ہمارے پیش نظر ہو جاتا۔ یا بڈھے مردوں اور عورتوں کی لمبی لمبی قطاریں نانبائی و قصاب و بقال کی دوکانوں کے سامنے جبکہ برف پڑتی ہوتی یا مینہ برستا ہوتا اور یہ بیچارے چپکے اپنے مقررہ حصوں کے انتظار میں کھڑے ہوتے۔ بس اس کے علاوہ جنگ کے خارجی آثار ہمارے دیکھنے میں نہیں آتے تھے اور نہایت آرام و اطمینان ظاہری کے ساتھ ہمارا یہ زمانہ گزرتا تھا۔

انجمن علمی و ادبی در برلن

آقائی تقی زادہ نے ان اصحاب کی موجودگی برلن میں غنیمت سمجھ کر ایک ادبی و علمی انجمن قائم کی تھی کہ جس کی نشست ہر شب چہار شنبہ کو ہوتی اور دس پندرہ ممبر "کاوہ" کے دفتر میں جمع ہوتے اور انواع مسائل علمی و ادبی و فنی پر گفتگو کرتے۔ اور یہ بھی مقرر تھا کہ ہر ایک ممبر اس انجمن کا باری باری کسی خاص موضوع پر جو قبل سے وہ خود اپنے واسطے مقرر کر سکتا تھا کوئی مضمون تیار کر کے ممبران انجمن کے سامنے سنائے۔

ممبران انجمن

بانیان انجمن میں یہ حضرات تھے :- (۱) میرزا فضل علی آقا مجتہد تبریزی وکیل سابق آذربائیجان جو فی الحقیقت ادبیات عرب میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ برلن میں آخری تاریخ جمادی الآخر ۱۳۳۹ھ میں وفات پائی۔

(۲) آقائی سید محمد علی خاں جمال زادہ جو اُن لوگوں سے ہیں جن سے ایران کی بہترین آیندہ امیدیں وابستہ ہیں۔ اُن کی کتاب "روابط روس و ایران" اُن کی وسعت معلومات، قوتِ انتقاد، اور نکتہ رسی بطرز یورپ کا بہترین نمونہ ہے۔ اور دوسری کتاب "یکے بود و یکے نبود" سے بخوبی معلوم ہو جاتا ہے کہ ایک انشا پرداز سہل و سادہ اور بے تکلف طریقے سے غیر زبانوں کے الفاظ خارج کر کے، ہر چند کہ یہ کام آسان نہیں ہے، ایک عمدہ اور مفید کتاب کیونکر تیار کر سکتا ہے۔ یہ ایک خاص طرز و شیوہ ہے اگر کوئی ایرانی جدید یہ چاہے کہ اپنی زبان ادری میں کچھ لکھے اور یہ بھی چاہے کہ بسبب عجز و مجبوری کے کسی غیر زبان کے الفاظ و جملے اور اسالیب بیاں اہل یورپ سے نقل کرے جیسا کہ اس زمانے کے بعض لکھنے والوں کا بُرا طریقہ ہے تو یہ بالکل ممکن ہے۔

(۳) آقائی میرزا محمود خاں غنی زادہ آذربائیجان کے نہایت فصیح اور شیریں زبان شاعر جن کا پُر لطف کلام "کاوہ" اور "ایرانشہر" کے صفحات پر اکثر شایع ہوتا رہتا ہے۔

(۴) آقائی میرزا حسین خاں کاظم زادہ مدیر مجلہ (رسالہ) "ایرانشہر" مطبوعہ برلن کہ خود وہ رسالہ اُنکی علمی و ادبی لیاقت کا بہترین ثبوت ہے۔

(۵) آقائی میرزا محمد علی خاں تربیت آذربائیجان کے مشہور فاضل۔

(۶) آقائی سید محمد رضائی مساوات۔ مشہور فاضل و فلسفی۔

(۷) میرے قدیم دوست جو اس وقت برلن میں مقیم تھے آقائی میرزا ابراہیم پوردادو عصر حاضر کے مشہور شاعر صاحب طرز جدید اُس تعصب خاص کے جو اُن کو قوم عرب اور زبان عرب کے ساتھ ہے الفاظ فارسیِ خالص استعمال کرنے پر تُلے ہوئے ہیں، مثلاً خواجہ حافظ کے اس شعر پر سہ

اگرچہ عرض ہنر پیش یار بے ادبی ست زباں خموش ولیکن دہاں پُر از عربی ست

خواجہ سے سخت ناراض ہیں کہ عربی کو جزوِ ہنر کیوں شمار کیا۔ یہ حقیر باوجودیکہ اُن کے اس خیال سے یعنی یہ کہ زبان عربی کے ساتھ اس قدر ہٹ دھرمی برتی جائے، ہرگز متفق نہیں ہے مگر پھر بھی اُنکی عصبیت و جذبۂ قومی و وطن پرستی کا جان و دل سے معترف ہے

برلن کے مستشرقین سے ملاقات اس قیام برلن کے زمانے میں جن جرمن مستشرقین سے میں ملا اور ان کی معلومات سے بہرہ اندوز ہوا، یہ حضرات ہیں:۔

(۱) پروفسور مارکوارت (G. Marquart) مشہور جرمن مستشرق صاحبِ تصانیف کثیرہ مثلاً کتاب "ایرانشہر" جس میں ایران قدیم کا جغرافیہ نہایت شرح و بسط سے بیان کیا ہے وغیرہ۔ فی الواقع ان کا تبحر اور وسیع معلومات عجائب روزگار سے ہیں۔ ان کا حافظہ علوم کا ایک سمندر معلوم ہوتا ہے۔ زبان پہلوی و فارسی و عربی و ارمنی و سریانی کو بخوبی جانتے ہیں۔ ترکوں کے اس مضحک دعوے کا کہ اکثر دنیا کے مشہور لوگ زمانۂ قدیم سے لیکر آج تک قوم تُرک سے تھے یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور زردشت اُن کے عقیدے کے بموجب ترکی الاصل تھے اور اس قسم کے اُن کے عقیدے کے بموجب ترکی الاصل تھے اور اسی قسم کے اُن کے عجیب و غریب خیالات کا اُنھوں نے خوب خاکہ اُڑایا ہے۔ ارمنی لوگ اُن سے بہت اتحاد رکھتے ہیں اور اُن کی معلومات سے سیاسی فوائد کے خیال سے ان کا بہت زیادہ احترام کرتے ہیں مگر ایرانی چونکہ اُن کو نہیں پہچانتے اُن سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھاتے

(۲) پروفسور زاخاؤ (Eduard Sachau) کہ جن کی شہرت دُنیا بھر میں ہے۔ عربی و سریانی و سنسکرت کے عالم متبحر۔ فارسی بھی ایک حد تک جانتے ہیں۔ ابوریحان بیرونی کی "الآثار الباقیہ" اور "تاریخ الہند" کی کمال خوبی سے صحت اور اُس کا ترجمہ بھی زبان انگریزی میں کیا ہے۔ قریب بیس سال سے کتاب مشہور "طبقات ابن سعد" کی طباعت میں مشغول ہیں۔ جس کی اب تک چودہ جلدیں شایع

ہو چکی ہیں۔

(۳) دکتور موریتز (B. Moritz) مدیر کتاب خانۂ مدرسۃ السنۂ مشرقیہ برلن۔ جس قدر خطوط کہ اسلام میں جاری ہیں اُن کے پڑھنے میں متخصص ہیں اور ایک بہت بڑی کتاب جس میں مختلف خطوط اسلامی کے عکس درج ہیں شروع زمانہ ہجرت سے آج تک تمام کتب اور اسناد سے جمع کرکے جو بالفعل دنیا بھر کے کتاب خانوں میں موجود ہیں انھوں نے تیار کی ہے جو نہایت مفید مضمون خطوط عربی کے متعلق دائرۃ المعارف اسلامی میں مندرج ہے انھیں کے قلم سے ہے۔

(۴) ماسوف علیہ پروفسور ہارتمن[1] (Martin Hartmann) مشہور مستشرق اور زبان عربی و فارسی کے متخصص۔ ان کی تصانیف کثرت سے ہیں۔ باوجود کبر سن، سفید داڑھی، اور خمیدہ قد کے ستر برس کی عمر میں برلن میں مجھ سے ادبیات فارسی پڑھتے تھے اور مرنے سے ۹ دن پیشتر تک یہ عمل ایک جوانانہ ہمت کے ساتھ جاری تھا۔

(۵) اسوف علیہ پروفسور مان[2] (Oskar Mann) زبان فارسی و کُردی کے عالم۔ ایران میں متعدد سفر کر چکے ہیں اور زبان کُردی میں مختلف تصانیف رکھتے ہیں۔

(۶) پروفسور میتوو خ (Eugen Mittwoch) مشہور عربی داں۔ "طبقات ابن سعد" کا ایک جزو ان کی تصحیح سے شایع ہوا ہے۔

(۷) پروفسور فرانک (Frank) متخصص زبان سریانی۔

(۸) سباستیان بک (Sebastian Beck) مؤلف صرف و نحو زبان فارسی در زبان جرمن۔ باوجود کثرتِ اغلاط جامع ترین صرف و نحو کی کتاب ہے جو اب تک زبان فارسی کے متعلق خود فارسی یا کسی یوروپین زبان میں لکھی گئی ہے۔

مگر افسوس ہے کہ اس طویل مدت میں بھی میں سب سے بڑے اور سب سے بوڑھے جرمن مستشرق (آجکل ۸۸ سال کے ہیں) اُستاد نولدکیہ (Theodor Noldeke) کی شرف ملاقات سے مستفید نہیں ہوا۔ ہر چند کہ اس کا کمال شوق رکھتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ میرے قیام برلن کے زمانے میں وہ استرازبورگ (Strassbourg) میں تھے اور ظاہر ہے کہ ایام جنگ میں ایک شہر سے دوسرے شہر جانا کس قدر مشکل تھا علی الخصوص الساس و لورن (Alsace + Lorraine)۔ میں۔ اُستاد موصوف مشہور تاریخ ساسانیاں اور مختلف قیمتی تالیفات کے ایک مبسوط کتاب اور نام

---

[1] ۵ دسمبر ۱۹۱۸ء کو برلن میں وفات پائی۔ [2] ۵ دسمبر ۱۹۱۷ء کو برلن میں وفات پائی۔

علوم و فنون میں جو زبان عربی و عبری و سریانی و پہلوی و فارسی سے تعلق رکھتے ہیں کمال واقفیت رکھتے ہیں۔ سنہ ۱۹۰۶ء میں جب استاد موصوف کی عمر ستر سال کی ہوئی تو یورپ کے تمام مستشرقین نے ان کی سالگرہ کے موقع پر دو ضخیم جلدوں میں اُن کے حالات میں تیار اور شایع کی۔ اس کتاب میں استاد بزرگ کی ۷۶۴ تصانیف از قسم کتب و رسالہ جات و مضامین کا ذکر کیا ہے۔ اور اس تاریخ سے آج تک ۱۸ برس گزر چکے غالباً اس عدد پر کچھ اور اضافہ ضرور ہوا ہوگا۔

یادگار نکتہ | چونکہ مستشرقین کی صحبت کا یہاں ذکر ہوا لہذا یہ نکتہ بھی جو میرے ذاتی تجربے سے ہے اس گفتگو کے آخر میں بیان کر دینا نامناسب نہیں ہے اور وہ یہ ہے کہ میرے تمام ہموطنوں پر واضح ہو جائے کہ یورپ میں مستشرقین کے دائرہ میں اکثر جھوٹے عالم نما شارلاتان[1] اصلی اور حقیقی مستشرقین سے بمراتب زیادہ پائے جاتے ہیں۔ اور اگرچہ یہ مسئلہ تمام نوع انسان پر حاوی ہے اور تمام ممالک دنیا میں اور ہر علم و فن کی نسبت یہ پایا جاتا ہے اور یوروپی مستشرقین سے اس کی کوئی خصوصیت نہیں مگر پھر بھی یوروپی مستشرقین کے متعلق یہ عجیب و غریب خصوصیت رکھتا ہے جس کی وجہ شاید یہ ہے کہ بموجب مشہور فرانساوی مثل کے "در مملکت کوراں آدم یک چشم پادشاہ است" (اندھوں میں کانا راجہ) چونکہ اہل یورپ عموماً مشرقی اوضاع اور مشرقی علوم و فنون اور نیز مشرقی زبانوں سے ناواقف ہوتے ہیں لہذا جھوٹے مدعیوں اور شارلاتانوں کے لیے جو محض دو ایک مشرقی زبانیں ایک حد تک جانتے ہیں اور انھیں میں امتحان دے چکتے ہیں ایسا امتحان لینے والوں کی قابلیت امتحان دینے والوں سے کسی طرح زیادہ

---

[1] مصنف علام نے جو نکتہ یہاں ایرانیوں کے گوش گزار کیا ہے وہ ہم ہندوستانیوں کو بھی اچھی طرح یاد رکھنا چاہیے۔ مصنوعی اور نقلی مستشرقین کے متعلق فاضل مصنف نے جو ایک سخت لفظ "شارلاتان" Charlatan استعمال کیا ہے اس کا ترجمہ بعض ہندوستانی انگلستان واپس شدہ عربی و فارسی محققین کی خاطر سے یہاں عمداً ترک کیا گیا تاکہ ان کو اپنے بعض اساتذۂ باکمال کی نسبت یہ لفظ ناگوار خاطر نہ ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم بدنصیب تحصیل علم کی غرض سے جب یورپ جاتے ہیں تو بیشتر ایسے ہی جو فروش گندم نما اصحاب سے دوچار ہوتے ہیں جن کی تعریفیں اس پیراگراف میں کی گئی ہیں۔ اور اپنے زعم میں ہم ان کو آسمان علم و فضل کا ایک درخشاں ترین ستارہ خیال کرنے لگتے ہیں اور جب یہاں واپس آتے ہیں تو انھیں کی جھوٹی علمیت، مصنوعی کمال، نیز اُن کی بد دماغی و نازک مزاجی اور قدیم طریقۂ تعلیم و تعلم سے یکسر نفرت و حقارت کا اظہار انھیں کی تقلید میں کرنے لگتے ہیں اور "ہمچو من دیگرے نیست" کی ہوا ہمارے سر میں سرایت کر جاتی ہے۔ اللّٰہم احفظنا من شرور تہ باتہم۔ (مترجم)

نہیں ہوتی ایک عجیب وسیع میدان اپنے اظہار کمال کا پیدا ہو جاتا ہے لہذا یہ لوگ کوئی نہ کوئی وسیلہ
ڈھونڈھ کر کسی زبان مشرقی کی معلمی پر فائز ہو جاتے ہیں جسکے بعد اُس زبان کی تعلیم مع دیگر زبانوں کے
اُسی ایک زبان میں شامل کر دی جاتی ہے مثلاً فارسی و عربی و ترکی اور نیز تمام علوم و فنون کہ جو ان
زبانوں میں ہیں اور تمام متعدد لہجے کہ جو مختلف مقامات پر رائج ہیں - ان سب کی تعلیم کسی ایک
شخص کے سپرد کر دی جاتی ہے اور یہ لوگ بغیر کسی شرم اور خوف بدنامی کے (اس وجہ سے کہ عام
لوگوں کو اصل و نقل کی تمیز ہی نہیں ہوتی) اُن تمام زبانوں اور علوم سے واقفیت کا دعویٰ کرنے
لگتے ہیں اور درس دینا شروع کر دیتے ہیں اور تصنیفات بھی کرنے لگتے ہیں اور خاص خاص نظریئے
بھی دنیا میں پیش کرتے ہیں اور کبھی یہ غضب کرتے ہیں کہ عربی، فارسی، ترکی کی کوئی کتاب لیکر اُسکو
مسخ کر کے اغلاط فاحشہ کے ساتھ چھپوا دیتے ہیں - برخلاف معلمین زبان یونانی و لاطینی کے کہ ان زبانوں
سے اہل یورپ عموماً کچھ نہ کچھ ضرور واقف ہوتے ہیں مگر ان بیچاروں کے دعوے عربی و فارسی مستشرقین
سے بہت کم بلکہ دسواں حصہ بھی نہیں ہوتے - اور کسی ایک چھوٹے شعبے تک ان دو زبانوں سے
محدود رہتے ہیں اور فضیحت و بدنامی کے ڈر سے یہ لاطینی و یونانی داں اپنی کملی سے پاؤں بڑھانے
کی جرأت نہیں کر سکتے - غرضکہ مقصد یہ ہے کہ میرے عزیز ہموطن ایسے دھوم دھڑاکے کے الفاظ سے
مثلاً "معلم السنہ شرقیہ" و "عضو انجمن علمی فلاں و فلاں" وغیرہ سے ہرگز دھوکا نہ کھائیں اور عام طور پر
اہل یوروپ جو اس معاملے میں لن ترانیاں اُڑاتے ہیں اُس سے چشم پوشی کریں تاوقتیکہ وہ اعتبار
کی کسوٹی پر پوری نہ اُتریں اور اُسکو وحی منزل ہرگز نہ جانیں بلکہ ہر چیز میں حق و باطل کی تمیز کی معیار عقل
خداداد کو تصور کریں اور اُسی معقول ترازو سے تمام ایسے دعووں کو تولا کریں تاکہ راہ کو چاہ سے اور
خضر کو غول گمراہ سے پہچان سکیں -

الغرض شروع جنگ سے لیکر اختتام جنگ سے دو ایک سال بعد تک میں برلن ہی میں رہا
اور ہر چند کہ دلی تمنا تھی کہ "تاریخ جہاں کشائے جوینی" کی طباعت کا انتظام کرنے کے لیے میں پیرس جلد
سے جلد پہونچوں مگر روابط دوستی بین الملی اب تک درست نہیں ہوئے تھے اور اسی وجہ سے ایک
ملک سے دوسرے ملک میں سفر کرنے میں سخت دقتیں بھی واقع تھیں لہذا میری یہ تمنا کسی طرح
پوری نہیں ہوتی تھی کہ حسن اتفاق سے اسی زمانے میرزا محمد علی خاں فروغی ذکاء الملک ایران کی
طرف سے ممبر مقرر ہو کے صلح نامے میں شریک ہونے کے لیے پیرس تشریف لائے - میں نے اپنی غرض
یعنی وہی پیرس میں واپسی کی آرزو اُن کی خدمت میں عرض کی - اُنھوں نے فوراً بدون تاخیر شاہزادہ

نصرۃ الدولہ فیروز میرزا وزیر خارجۂ وقت کی مساعدت سے کہ جو حُسنِ اتفاق سے اُس وقت پیرس میں تشریف رکھتے تھے اور قدیم سے مجھ پر لطف خاص رکھتے ہیں۔ سفر کی مشکلات اور پاسپورٹ کی تحصیل وغیرہ کا معاملہ رفع کر دیا۔ چنانچہ ۱۲ر جمادی الآخر ۱۳۳۸ھ (۲ر جنوری ۱۹۲۰ء) کو برلن سے روانہ ہو کر سویس کی راہ سے چار دن بعد پیرس میں داخل ہوا اور پندرہ سولہ سال کی مفارقت کے بعد اپنے قدیم عنایت فرما آقائی ذکاء الملک سے ملا۔ مگر افسوس ہے کہ اُن کی صحبت کی سعادت بہت تھوڑے دنوں تک حاصل رہی۔ اس وجہ سے کہ آقائی موصوف سات آٹھ مہینے کے بعد ایران واپس تشریف لے گئے اور یہ زمانہ بھی زیادہ تر سفر ہی میں گزرا۔

مصنف علام کے لیے وظیفہ

پیرس سے واپسی کے بعد آقائی ذکاء الملک اُسی قدیمی محبت، بشاشت چہرہ اور خرمی دل کے ساتھ مجھ سے ملے مگر اُس ظاہرداری پر اکتفا نہ کر کے چونکہ میری تنگیِ معیشت کو ملاحظہ فرمایا تو گویا دوستی کے معنی دنیا کے لوگوں کو اس طرح سکھائے کہ فوراً میری تلاش معاش کے لیے کمر ہمت باندھ کر ساعی ہو گئے۔ یہاں تک کہ بالآخر شاہزادہ نصرۃ الدولہ فیروز مرزا کی شرکت اور آقائی میرزا حسن خان وثوق الدولہ رئیس الوزراء کی فوری اجازت سے ایک سالیانہ وظیفہ دولت ایران سے میرے واسطے مقرر فرما دیا اور ایران پہونچ کر مجھ پر مزید عنایت و الطاف کر کے اس وظیفہ کی وصولی اور اُس کا پہونچانا بھی اپنے ہی ذمے کر لیا۔ چنانچہ اُس تاریخ سے آج تک اُنہیں غیر یگانہ کی کوششوں سے وہ مجھ کو برابر پہونچتا رہتا ہے۔ خدا اُن کی جزائے خیر عمر طولانی و سعادت جاودانی کے ساتھ اُن کو عنایت کرے جس کی وجہ سے بالفعل میں آسودگی و آرام سے زندگی بسر کر رہا ہوں۔ آیندہ کا حال خدا کو معلوم ہے۔ مگر جو چیز سب سے زیادہ مجھکو شرمندہ اور منفعل کر رہی ہے وہ یہ ہے کہ اُن کے احسان و مہربانی کی تلافی سوائے خالی خولی زبانی شکریہ کے میں کسی طرح نہیں کر سکتا۔

پیرس میں اپنے قیام ثانی کے زمانے میں جن مستشرقین فرانسادی سے میں ملا اُن میں ایک مسیو پول کزانووا[1] (Paul Casanowa) ہیں جو علاوہ زبان عربی میں متخصص ہونے کے تاریخ و جغرافیائے بلادِ اسلام علی الخصوص مصر اور مختلف مذاہب و فرق اسلامیہ اور دول اسلامی کے سکوں کی شناخت میں کامل مہارت اور ان مباحث پر عمدہ تصانیف رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ بعض غیر مشہور مشکل مسائل کی تحقیق نہایت دقت و موشگافی کے ساتھ اُنھوں نے کی ہے بلکہ اس کو اُن کا ایک خصیصہ سمجھنا چاہیے۔ مثلاً ایک رسالہ لکھا جس میں کتاب مشہور "الف لیلہ" اور اُس کی

---

[1] مارچ ۱۹۲۶ء میں مصر میں وفات پائی

روایات اور مقامات جغرافیائی کہ جو سندباد بحری کے سفر میں مذکور ہیں۔ ان سب کی اُنھوں نے کافی تحقیق کی ہے اور اگرچہ اصل حکایت ظاہر ہے کہ افسانے سے زیادہ نہیں ہے مگر اپنی تحقیق سے ان روابط تجارتی کو جو بصرے اور خلیج فارس کے ایرانی و عرب تجار اور ہندوستان و جزائر بحرِ ہند کے مابین دوسری اور تیسری صدی ہجری میں قائم تھے صاف طور پر دکھایا ہے اور اُن مقامات کو بھی جو اُس سفرنامے میں مذکور ہیں جعلی و افسانہ نہیں بلکہ سب درست اور جزائر بحر ہند کے صحیح نام بتائے ہیں۔ صرف اُن کے زیادہ تر نام اب بدل گئے ہیں۔ دوسرا رسالہ مشہور کتاب "اخوان الصفا" کے متعلق ہے۔ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ اس کتاب کی تالیف کس زمانے میں ہوئی اور اس کا مؤلف یا مؤلفین کون تھے۔ ثابت کیا ہے کہ یہ کتاب چوتھی صدی ہجری کے قبل تصنیف ہوئی ہے اور اس کے مؤلف فرقۂ اسماعیلیہ باطنیہ سے تھے۔ ایک اور رسالہ درخصوص ایک بڑی قلمی کتاب کے تحریر کیا ہے، جو کتابخانۂ پیرس میں علم نجوم و تاریخ کے متعلق موجود ہے۔ ظاہرا یہ نسخہ قلعۂ الموت (Alamut) کے کتابخانے کا حسن صباح کے عہد کا معلوم ہوتا ہے۔ ایک اور رسالہ "اصفہبدان برلم" کے متعلق ہے۔ یہ ملوک طبرستان کا ایک مشہور خاندان تھا جس سے صاحب "مرزبان نامہ" کا بھی تعلق ہے۔ اس میں اُن مسکوکات کا بھی ذکر ہے کہ جو اس خاندان سے باقی ہیں۔ ایک اور رسالہ نہایت عمدہ اُن سکوں کے متعلق کہ جو صاحب الزنج مشہور سے منسوب ہیں۔ جس نے ۲۵۵ھ میں بصرے میں خروج کیا اور وہاں کے حبشی غلاموں کو اور اُن کے مالکوں میں جنگ کرا دی۔ ایک اور رسالہ درخصوص خطوط طلسمات اور منتروں کے ہے کہ یہ کس زبان میں اور کس خط میں لکھے جاتے تھے۔ اسکے علاوہ اور بھی مشہور تالیفات ان کی ہیں جو سب نہایت مفید ہیں۔

ان کے علاوہ مسیو گابریل فراں (Gabriel Ferrand) مدیر "ایشیاٹک جرنل" سے ملاقات ہوئی کہ جو ایک نہایت محترم بڑے آدمی ہیں اور جغرافیائے جزیرۃ العرب و بحر ہند اور روابط تجارتی درمیان ایران و عرب اور بنادر خلیج فارس و جزائر بحر ہند و سماترا و جاوا وغیرہ کے ماہر خصوصی ہیں اور ان کی تالیفات بھی ان مسائل پر کثرت سے ہیں۔

اس زمانے میں پیرس میں آقائی میرزا عباس خاں اقبال آشتیانی مقیم طہران سے غائبانہ ملاقات اور سلسلۂ خط و کتابت قائم ہوا۔ یہ ایران کے ایک نوجوان فاضل ادیب ہیں اور تبحر شرقی کے ساتھ طریقۂ انتقاد و تحقیق غربی کے جامع ہیں اور کمال محنت و مشقت اور جوانی کے زور و شور کے ساتھ آثار ادبی ایران کے ازسرنو زندہ کرنے میں سرگرم ہیں۔

ایک اور فاضل بزرگ جن سے پیرس میں سرسری ملاقات ہوئی مگر کافی استفادہ انکی صحبت سے حاصل نہ کرسکا، چونکہ ان کی مدت قیام پیرس میں کم تھی، آقائی میر محمد حسین خاں عمید الملک حسابی ہیں۔ یہ طرز جدید کے مشہور لکھنے والوں میں ہیں اور ان سے سلسلۂ خط وکتابت بحمد اللہ قائم ہے۔

تصحیح وتالیف کتب

جن دو چار کتابوں کی تصحیح یا تالیف یا ترجمہ اس حقیر نے قیام یورپ کے زمانے میں کیا انکے اسماء حسب ذیل ہیں:- (۱) تذکرۃ الشعراء عوفی موسوم بہ لباب الالباب[1] کی جلد اول کا ایک حصہ (۲) مرزبان نامہ (۳) المعجم فی معاییر الاشعار العجم تالیف شمس قیس رازی (۴) چہار مقالۂ نظامی عروضی سمرقندی (۵) جلد اول و دوم تاریخ جہاں کشائے جوینی (بالفعل اس کی تیسری جلد کی تصحیح وطباعت میں مشغول ہوں)۔ (۶) ترجمہ لوائح جامی زبان فرنچ میں (اس کا انگریزی ترجمہ مسٹر وینفیلڈ نے لندن سے چھاپا ہے)۔ (۷) ایک رسالہ مشہور شاعر مسعود سعد سلمان کے حالات میں کہ اس کا انگریزی ترجمہ اسوقت علیہ استاد براؤن کے قلم سے شایع ہوا ہے۔ (۸) تذکرۃ الاولیاء۔ شیخ فریدالدین عطار کا دیباچہ جس میں ان بزرگوار کے حالات درج ہیں۔ (۹) مضامین متفرق بعض مجلات فارسی میں۔

محمد بن عبدالوہاب قزوینی

۱۶ ربیع الثانی ۱۳۴۳ھ مطابق ۱۴ نومبر ۱۹۲۴ء

(الناظر، اکتوبر ۱۹۲۵ء)

---

[1] یہ کتاب پروفیسر ایڈورڈ براؤن نے تصحیح کرکے چھاپی ہے (مترجم)

عاصی
غلام حسین خاں حنفی آفاق بنارسی
(رام نگر۔ بنارس)

۷؍جون ۱۹۱۶ء کو میں اپنے ایک دوست کے عقد میں شرکت کی غرض سے بمقام گوپی گنج گیا تھا۔ یہ مقام ضلع بھدوہی (اسٹیٹ بنارس) میں شامل ہے اور بنارس سے سولہ سترہ کوس کے فاصلے پر بجانب گوشۂ جنوبِ مغرب واقع ہے۔ واپسی میں علی الصباح اسٹیشن بنارس چھاؤنی پر اترا، چند احباب بھی ساتھ تھے۔ عجب اتفاق کہ اس بڑے اور مشہور اسٹیشن پر اُس وقت کوئی گاڑی یا اِکہ نہیں ملا۔ دوستوں کی رائے ہوئی کہ شہر تک ٹہلتے ہوئے چلیں۔ شہر میں رام نگر پہونچنے کے لیے متعدد گاڑیاں اور بکثرت یکے مل جائیں گے، یا دریا کی راہ بہ آسانی مکان پہونچ جائینگے الغرض ہم لوگ خراماں خراماں فاطمان[1] کی راہ سے شہر کی طرف روانہ ہوئے۔

اس وقت میرے ساتھیوں میں علاوہ دیگر احباب کے میرے چھوٹے بھائی محمد ہاشم علیخاں[2]

---

[1] بنارس کا ایک مشہور قبرستان ہے۔ [2] میرے ماموں زاد بھائی ہیں۔

سلمہٗ اور حکیم محمد نعیم الدین صاحب بھی تھے۔ یہ صاحب حکیم محمد عطا کریم عطا سہسرامی مرحوم کے صاحبزادے ہیں "اور حکیم عطا مرحوم میرے مکتبی یار تھے۔ فاطمان کے قریب پہنچ کر ان لوگوں نے شیخ علی حزیں کی قبر دیکھنے اور اُس پر فاتحہ پڑھنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ قبر شیخ کی دید کا مشتاق پاکر میں فاطمان کے اندر داخل ہوا۔

مرقد شیخ علی حزیں کے آس پاس ہزار ہا پختہ و خام جدید و کہنہ قبریں موجود ہیں۔ اُن میں کوئی قبر سنگِ مرمر کی سفید شفاف چمک رہی ہے۔ کسی قبر پر جرمن سلور کی خول چڑھی ہوئی ہے جس پر آفتاب کی شعاع پڑنے سے نظر کو خیرگی ہوتی ہے۔ بہت سی قبریں معمولی اینٹ پتھر کی ہیں مگر صدہا برس کی کہنہ ہیں، جنکو ہر سال ابر نے بارش کے چھینٹے دے دے کر گھٹا سے بھی کہیں زیادہ سیاہ بنا رکھا ہے۔ اکثر پرانی قبروں کے سنگ تعویذ جا بجا سے ٹوٹ گئے ہیں۔ کسی کا نصف پتھر غائب تو کسی کا پورا پتھر ندارد ہے۔ بعض بعض قبروں کو اونچے اونچے درختوں نے اپنے سایہ میں لے رکھا ہے۔ کچھ قبریں گھانسوں نے اپنے دامن میں چھپالی ہیں۔ ان قبروں کا منظر دیکھکر مجھے زیب النساء کا یہ شعر (جو اُنکی قبر پر کندہ ہے) یاد آگیا:۔

بغیر سبزہ نپوشد کسے مزارِ مرا   کہ قبر پوشِ غریباں ہمیں گیاہ بس است

کچھ قبریں خام بھی تھیں، جن کا نشان اس طرح ملتا تھا کہ بعض مٹی کے ڈھیر زمین سے کچھ اونچے ہو کر بتلا رہے تھے کہ ہم بھی کسی غریب کی قبر ہیں۔ انھیں مٹی کے ڈھیروں سے ملے جُلے بعض گڑھے زمین سے ہاتھ ڈیڑھ ہاتھ نیچے بیٹھکر لاوارث قبر ہونے کا ثبوت دے رہے تھے۔ یہ دیکھکر بیاختہ میری زبان سے نکلا کہ

کوئی آشنا بھی نہیں پوچھنے والا انکا   کیا گذرتی ہے، کہو قبر میں سونے والو

جب ان قبروں سے گذرتا ہوا اُس اکیلی قبر کے پاس پہونچا جو مسجد و روضۂ فاطمان (فاطمہؑ) سے زیادہ قربت رکھتی تھی اور اُس میں تصورات و تخیلات کا بادشاہ میٹھی نیند سو رہا تھا۔ نہ شعر کی فکر، نہ مصرعہ کا خیال، نہ مضمون آفرینی کا ہوش، نہ سخن سازی کے حواس، سنگِ قبر پر دو تین شعر جو کسی زمانے کے موزوں کیے ہوئے تھے، کندہ ہیں۔ وہی بتلا رہے ہیں کہ شیخ علی

غرض نہا دھو کر، کپڑے بدل کر، ڈیڑھ سو برس سے بھی چند سال پہلے اس سنگی قبر کے اندر مٹی کے فرش پر خوابِ استراحت میں مصروف ہیں۔ قبر پر ایک مٹی کا چراغ جو کبھی راتوں کو اُس قبر پر جل جھلکنے کی خبر دے رہا تھا، اور کچھ مرجھائے ہوئے پھول جو کہہ رہے تھے کہ ہم آج ہی کی رات اس پر چڑھائے گئے ہیں پڑے تھے۔

ہم اور ہمارے تمام ساتھی قبر کے چبوترے پر جو بمقابلہ دوسری قبروں کے اونچا تھا، جوتے اُتار اُتار کر چڑھ گئے۔ ہمارے ساتھیوں نے بہت اشتیاق کی نظر سے قبر کا گوشہ گوشہ دیکھا اور فاتحہ خواں ہوئے۔

فاطمان سے روانہ ہونے پر اثنائے راہ میں جہاں تک سُنے سُنائے حالات شیخ کے مجھے معلوم تھے میں نے سنا دیے مگر اس سے ان لوگوں کی پوری تشفی نہ ہوئی۔ بلکہ مفصل حالات شیخ کے سُننے کا شوق بڑھتا نظر آیا۔ لہٰذا ان لوگوں کا بڑھا ہوا اشتیاق دیکھ کر مجھ کو شیخ کے مفصل حالات کے دریافت کرنے کی تلاش و فکر ہوئی۔

کتاب مفتاح التواریخ جو میرے پاس موجود ہے، و نیز کتب ہائے موجودہ کتب خانۂ سرکار آقایم[1] بہادر و دیگر ذرائع سے شیخ کے حالات تلاش و کھنگال کر رہا تھا کہ میرے مہربان حافظ شیخ امام الدین صاحب نے جو، رجون کو میرے ساتھ تھے شیخ کی سوانح عمری فارسی، جس میں خود شیخ نے اپنی سرگذشت قلمبند کی ہے، مطبوعہ مسلم پریس دہلی ۱۳۱۹ ہجری، کہیں سے عاریتاً لا کر مجھے دی۔ اگرچہ اُس سے مجھے مزید امداد نہیں ملی۔ کیونکہ کتب خانۂ سرکار آقایم میں بھی یہی سوانح عمری شیخ کی مطبوعہ پریس معاون ہند بنارس ۱۸۸۱ء موجود تھی اُس سے میں ضروری حالات کا انتخاب کر چکا تھا، تاہم میں حافظ جی کا مشکور ہوا۔

الغرض یہ حالات شیخ کے جہاں تک صحت و اختصار کے ساتھ ملے اختلافات رفع کر کے درج کیے۔

---

[1] تالیف و تصنیف ہز ہائنس مہاراج دھیراج و دیگر القاب سری مہاراجہ صاحب بہادر والی بنارس دام اقبالہم و دام ملکہ

شیخ علی حزیں مغفور

ایک باکمال اہل سخن گذرے ہیں۔ انکی ذات بابرکات آخری دَور میں فارسی شاعری کے لیے مایۂ فخر و ناز تھی۔ علاوہ کمالِ شاعری، و علم و فضل کے معزز امرائے ایران و ذی عزت روسائے اصفہان میں سے تھے اور نہایت نیک نفسی کے ساتھ زندگی بسر کی۔ دنیا و لذاتِ دنیا کو ترک کر کے خلق اللہ سے کنارہ کشی اختیار کرلی تھی۔ گوشے میں بیٹھکر یادِ الٰہی کرتے تھے۔

نام شیخ علی تخلص حزیں، مذہب شیعہ تھا۔ شیخ تاج الدین ابراہیم معروف بہ شیخ زاہد گیلانی کے خاندان سے ہیں۔ نسب نامہ شیخ علی حزیں کا شیخ زاہد گیلانی تک یہ ہے

نسب[1] نامہ ا شیخ علی حزیں بن ابیطالب بن عبداللہ بن علی بن عطاء اللہ بن اسمٰعیل بن اسحٰق بن نورالدین بن محمد بن شہاب الدین علی بن علی بیعقوب بن عبد ابو اصر بن شمس الدین محمد بن احمد بن محمد

---

[1] نسب نامہ میں بہت زیادہ اختلاف پایا گیا۔ مفتاح التواریخ مطبوعہ ۱۲۹۵ء میں تحریر ہے کہ شیخ علی حزیں، شیخ زاہد گیلانی کی پندرہویں پشت میں ہیں، مگر مسلسل نسب نامہ اس میں نہیں ہے۔ سوانح عمری شیخ مطبوعہ مسلم پریس دہلی ۱۳۱۹ ہجری میں جو نسب نامہ درج ہے اُس نے اٹھارہویں پشت میں اور نسب نامہ مندرجہ کلیات حزیں مطبوعہ مطبع نامی منشی نول کشور ۱۲۹۳ ہجری سے سترہویں پشت میں شیخ زاہد گیلانی تک سلسلہ ملتا ہے گر بظاہر اس میں یہ غلطی ہوتی ہے کہ (شیخ نورالدین محمد) اور (علی بیعقوب) دو نام کو سوانحعمری مذکور میں چار نام اس طرح پر دکھایا گیا ہے کہ نورالدین بن محمد و علی بن یعقوب۔ کلیات میں بھی (علی بیعقوب کو دو نام علی بن یعقوب) لکھا ہے۔ تاریخ بنارس مولفہ حکیم سید مظہر حسن صاحب طبیب دربار بنارس مطبوعہ ۱۹۱۱ء میں جو نسب نامہ تحریر ہے اُس میں شیخ علی حزیں کو بن ابی طالب عبداللہ بن علی بن عطاء اللہ لکھا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابی طالب عبداللہ ایک شخص کا نام ہے گر ایسا نہیں ہے۔ ابی طالب ابن عبداللہ صحیح ہے۔ سوانح عمری و کلیات سے صاف واضح ہے۔ اور اسکے تاریخ بنارس میں جہاں شیخ کے اجداد کا تذکرہ کیا ہے وہاں لکھا ہے کہ شیخ ابی طالب و شیخ عبداللہ کے بیٹے تھے اور شیخ عبداللہ شیخ علی بن عطاء اللہ کے بیٹے تھے۔ سوانح عمری شیخ مطبوعہ مفادِ ہند پریس بنارس ۱۹۰۱ء میں جو نسب نامہ درج ہے وہ مطابق تاریخ بنارس کے ہے۔

بن جمال الدین بن شیخ تاج الدین ابراہیم معروف بہ شیخ زاہد گیلانی۔

شیخ زاہد گیلانی شیخ صفی الدین اردبیلی کے مرشد و خسر تھے۔ شیخ صفی الدین اردبیلی آذربائجان کے سجادہ نشین اور شاہان صفویہ کے اجداد و حضرت امام موسیٰ کاظم کے اولاد سے تھے انکا سلسلۂ نسب حضرت موسیٰ کاظمؑ سے اکیسویں پشت میں ملتا ہے۔ بادشاہان صفوی اسی خاندان سے تھے اسی وجہ سے صفوی کہلائے۔

شیخ صدر الدین اردبیلی شیخ صفی الدین اردبیلی کے صاحبزادے اور شیخ زاہد گیلانی کے نواسے تھے۔ یہ نہایت نیک و صالح تھے۔ انکی نیکی و پرہیزگاری تیمور شاہ جیسے ذی حشم بادشاہ کو انکے مکان پر لے گئی۔ جب تیمور شاہ نے پوچھا کہ میں تمہاری کون سی خدمت کروں تو شیخ صدر الدین نے کہا کہ اُن اسیروں کو جنھیں تم روم سے لائے ہو رہا کر دو۔ تیمور شاہ نے انکی یہ درخواست قبول کی جس وجہ سے وہ احسان مندقوم شیخ صدر الدین کی معتقد ہو گئیں اور انکا اعتقاد و یقین یہیں تک نہیں رہا بلکہ اُن قوموں کی اولاد نے شیخ صدر الدین کی اولاد کا ساتھ عرصہ تک ساتھ دیا۔

کتاب مفتاح التواریخ میں تاریخ وفات شیخ صفی الدین اردبیلی اس طرح تحریر ہے:۔

آنکہ سلطان اولیا بودہ　　　　درۃ التاج اصفیا بودہ
وانکہ دریاے فیض عرفان است　　　　جد شاہان ملک ایران است
صاحب اردبیل شیخ صفی است　　　　کاشف نکتۂ خفی و جلی است
ماہ عاشورہ دوّد از دہم　　　　بود کان قطب شد بچرخ نہم
روز تکفین او دوشنبہ گو　　　　صاحب شاہد سال رحلت او

شیخ علی حزیں کے اجداد شہر استارا کے رہنے والے تھے۔ شیخ شہاب الدین شہر استارا سے لاہجان میں کہ عمدہ ترین شہر گیلان ہے آئے اور قیام پذیر ہوئے۔

شیخ کے دادا شیخ علی بن عطاء اللہ اپنے وقت کے عالم و مشہور شخص تھے۔ خان احمد خان بادشاہ

لہ سوانحمری شیخ مطبوعہ مسلم پریس دہلی ۱۳۱۱ ہجری میں یہ نام شیخ جمال الدین علی بن عطاء اللہ تحریر ہے مگر دوسرے نسخوں میں یہ نام صرف علی بن عطاء اللہ تحریر ہے۔

بادشاہ گیلان نے ان سے کچھ پڑھا تھا۔ اس لیے بادشاہ انکی قابلیت علمی کی کمال تعظیم کرتا تھا۔

شیخ علی بن عطاء اللہ کے صرف ایک بیٹے تھے شیخ عبداللہ جنھوں نے کل علوم و فنون کی کتابیں اپنے والد سے پڑھیں اور تقویٰ کے باعث تارک دُنیا ہو کر تھوڑی سی آمدنی پر بسر کرتے تھے شیخ عبداللہ کے تین فرزند شیخ عطاء اللہ و شیخ ابیطالب و شیخ ابراہیم تھے۔ شیخ عطاء اللہ فرزند اکبر تھے جو لاولد مرے۔ شیخ ابراہیم جو سب سے چھوٹے تھے خوشنویسی میں ہفت قلم تھے شیخ ابیطالب (شیخ علی حزیں کے والد) بھی نہایت خوشنویس تھے ستر جلد کتابیں انکے ہاتھ کی لکھی ہوئی انکے کتب خانے میں موجود تھیں۔

شیخ ابیطالب بعد تحصیل علم ضروری بیس برس کی عمر میں ابغرض صحبت علمائے عراق اصفہان میں آئے اور آقا حسین خوانساری سے درس لینے لگے۔

بحالت قیام اصفہان انکی شادی حاجی عنایت اللہ اصفہانی کی لڑکی سے ہوئی جو شیخ علی حزیں کی والدہ تھیں۔ جب سے شیخ ابیطالب کی شادی حاجی عنایت اللہ کی لڑکی سے ہوئی شیخ ابیطالب اصفہان میں رہنے لگے۔

بتاریخ ۲۷[1] ربیع الآخر ۱۱۰۳ہجری روز دوشنبہ شیخ علی حزیں اصفہان میں پیدا ہوئے جب چار برس کے ہوئے تو ملا شاہ محمد شیرازی نے جو اُس وقت کسی ضرورت سے وارد اصفہان تھے بسم اللہ کرائی۔ آٹھ برس کی عمر میں ملا حسین قاری اصفہانی سے قرآن مجید پڑھا۔ دو برس میں قرآن مجید ختم کرکے فارسی کی چند کتابیں نظم و نثر پڑھیں۔ پھر رسالہ صرف و نحو و فقہ حفظ کرکے چند رسالے منطق کے پڑھے۔

طبیعت موزوں ذہن رسا پایا تھا۔ شعر گوئی کی طرف رجوع ہو گئے۔ ہر چند انکے اُستاد منع کرتے تھے مگر انکا میلان طبع اسکو چھوڑنے نہ دیتا تھا۔ جو کچھ یہ موزوں کرتے تھے پوشیدہ رکھتے جاتے تھے

سلہ تاریخ بنارس مطبوعہ ۱۹۱۶ء میں تاریخ پیدائش شیخ ۲۰ جمادی الآخر ۱۱۰۳ھ تحریر ہے جو غلط ہے۔ ملاحظہ ہو کلیات حزیں مطبوعہ مطبع نامی نولکشور ۱۲۹۳ہجری صفحہ ۱۰ و مفتاح التواریخ صفحہ ۵۲۴۔

چند روز کے بعد فرطِ محبت سے انکے والد نے خود پڑھانا شروع کیا۔ کئی کتابیں اپنے
والد سے پڑھیں۔ اسی درمیان میں اپنے والد کے ہمراہ لاہجان اپنے چچا شیخ ابراہیم کے پاس
گئے۔ اور ایک سال تک وہاں مقیم رہ کر، اپنے والد کے ایما سے، اپنے چچا سے رسالہ
خلاصۃ الحساب پڑھا۔ پھر وہاں سے واپس آنے پر حاجی محمد طاہر اصفہانی و حکیم شیخ عنایت اللہ گیلانی
سے بھی کچھ کتابیں پڑھیں۔ اسکے بعد انکے والد نے بخواہش تربیت، شیخ خلیل اللہ طالقانی کے
سپرد کیا۔ تین برس تک اُنکی خدمت میں رہ کر مستفید ہوئے۔ یہ بزرگ، شیخ کو شعر گوئی سے
منع نہیں کرتے تھے بلکہ کبھی کبھی خود حکم دیتے تھے کہ کچھ سناؤ۔ تخلص حزیں اُنھیں کا عطیہ ہے۔

جب خلیل اللہ طالقانی نے سفرِ آخرت اختیار کیا تو شیخ بہاء الدین گیلانی سے درس لینے
لگے اور فرطِ شوق و ذکاوت سے مختلف فنون و علوم کی کتابیں، جنکو پڑھانہ تھا، مطالعہ کیں۔

شیخ اُن لوگوں کو پہونچا کر آپ خرم آباد آئے مگر اب خرم آباد کو بھی سپاہِ روم کے خوف سے
خالی نہ پایا۔ اس لیے وہاں سے روانہ ہو کر بصرہ آئے۔ بصرے آنے پر خیال آیا کہ حج کا زمانہ
قریب ہے۔ فوراً بصرے سے روانہ ہو کر بغداد آئے۔ یہاں جہاز بقصدِ حج کھل رہا تھا سوار
ہو گئے۔ چالیس روز کی مسافت طے کر کے جہاز ساحل یمن پر پہونچا۔ ع۔ تقدیر سے قسمت کی
برائی نہیں جاتی۔ شیخ اس مرتبہ پھر بیمار ہو گئے۔ اور زمانۂ حج گذر گیا۔ شیخ نہایت افسوس کے ساتھ
اُسی حالتِ بیماری میں واپس ہو کر بصرہ و لرستان خلیلی ہوتے ہوئے خرم آباد آئے۔

شیخ بحالتِ بیماری خرم آباد میں مقیم تھے کہ احمد پاشا ابن حسن پاشا سردار روم کے آنے
کی خبر مشہور ہوئی۔ اور یہاں کے لوگ بھاگ کر پہاڑوں میں جا چھپے۔ شیخ بوجہ علالت
مع چند خدمتگاروں کے وہیں رہ گئے تھے کہ احمد پاشا مع فوج ظفر موج شہر میں داخل ہو گیا۔ اب
شیخ نے تنہا رہنا مناسب نہ سمجھا اور لشکر روم میں چلے گئے۔

سردار روم نے اپنی طرف سے ایک شخص کو وہاں کا حاکم مقرر کر کے وہاں سے مراجعت
کی۔ شیخ بھی اُنھیں کے ہمراہ روانہ ہوئے۔ بسبب ضعف و بیماری کرمان شاہاں میں آ کر
رہ گئے۔ جب بخوبی صحت ہو گئی تو کرمان شاہاں سے روانہ ہو کر بغداد پہنچے اور بغداد

سے کربلائے معلی و نجف اشرف میں تین سال مقیم رہے۔ یہاں سے بقصد مشہد و خراسان روانہ ہوئے۔ مگر جنگ کا زمانہ تھا۔ تمام راستہ مخدوش ہو رہا تھا، مشہد نہ جا سکے پھر کرمان شاہاں میں چلے آئے۔ یہاں سے آذربائیجان آئے مگر یہاں بھی آب و دانے نے رہنے نہ دیا اردبیل و گیلان ہوتے ہوئے شہر استارا میں جو کسی وقت شیخ کے اجداد کا وطن تھا، آئے۔

اُسوقت شہر استارا میں یحییٰ خاں حاکم تھا، بوجہ قابلیتِ علمی شیخ کی بہت قدر کی اور قیام کے لیے مُصر ہوا۔ شیخ اُنکے اصرار سے چند روز استارا میں مقیم رہے۔ یہاں شیخ کے چند ہمراہی طاعون میں مبتلا ہو کر ہلاک ہو گئے اس وجہ سے شیخ وہاں سے روانہ ہو کر مازندران آئے۔

جب شاہ طہماسپ فوج روم سے برسرِ پیکار تھا، افغانوں نے موقع پا کر سرحد خراسان تک قبضہ کر لیا تھا۔ کچھ حصے کے مالک تو افغان ہو گئے تھے بقیہ حصہ خراسان پر ملک محمود ... کرتے تھے اور مواضع مشکلہ کو اپنے والد سے پوچھ لیا کرتے تھے۔ اسی طرح بہت سی کتابیں جو پڑھی تھیں حل ہو گئیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ طاعت و عبادت کا بھی شوق بڑھتا جاتا تھا۔ مگر باوجود کثرت مشاغلِ وظائف کے شیخ کو صحبت شعرا و شغلۂ شعر و سخن سے کمال دلچسپی رہا کرتی تھی۔

ایک روز انکے والد کے پاس چند شعرا جمع تھے، انکے والد نے جو انکی مخفی شاعری کا حال جانتے تھے انکو بھی بلوایا۔ شعرائے حاضرین میں سے کسی نے ملا محتشم کاشی کا یہ شعر پڑھا

اے قامتِ بلند قداں در کمندِ تو   رعنائی آفریدۂ قدِ بلندِ تو

انکے والد نے انکی طرف متوجہ ہو کر کہا مجھے علم ہے کہ تم کو شاعری کا شوق ہے اگر ہو سکے تو اسی طرح میں چند شعر موزوں کرو۔ شیخ نے اُسی وقت ایک مطلع موزوں کیا۔ جب انکے والد کی نظر دوبارہ ان پر پڑی اور وہ سمجھے کہ یہ کچھ کہنا چاہتے ہیں مگر ادب و حجاب مانع ہے تو پڑھنے کی اجازت دی۔ شیخ نے فوراً یہ مطلع سنایا۔

صید از حرم کشد خمِ جعدِ بلندِ تو   فریاد از تطاولِ مشکین کمندِ تو

حاضرین جلسہ بہت محظوظ ہوئے فرطِ مسرت سے اُچھل پڑے احسنت و آفریں کی صدائیں بلند

ہوئیں۔ اسی اثنا میں شیخ نے دوسرا شعر سنایا

شد رشکِ طرازِ ام نت کوے عاشقاں   بنشیں کہ باد خردہ جانہا سپند بو

الغرض اسی طرح تھوڑے تھوڑے غور و تامل میں دوسرے اشعار موزوں کرکے سنائے۔ حضار نے بہت تعریف کی۔ اور کہا کہ اس طرح فی البدیہ اشعار موزوں کرنا ہر شخص کا کام نہیں ہے۔ انکے والد نے بہت خوش ہو کر کہا اب میں نے اجازت دی تم شعر کہا کرو مگر اسقدر منہمک نہ ہو جاؤ کہ وقت ضائع ہو۔

اسی زمانے میں شیخ کو چند احباب کی صحبت میں گھوڑا دوڑانے کا شوق ہوا۔ ایک روز چند دوستوں کے ساتھ گھوڑا دوڑا رہے تھے کہ گھوڑے سے گر پڑے اور داہنے ہاتھ کی ہڈی ٹوٹ گئی اور ایک سال تک اصلاح میں نہ آئی۔ شیخ نے بائیں ہاتھ سے لکھنے کی مشق کی اسی وقت ایک مثنوی ساقی نامہ لکھا جس کا ابتدائی شعر یہ ہے

خدایا توئی آگہ از راز و بس   بہشت از تو دارند پاکان ہوس

من و مستی و کنج میخانہ   بہ آزادیم خطِ پیمانہ

واقعات کے دیکھتے ہوئے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شیخ نے تحصیل علم و حصول فیض صحبت علما کے لیے بہت دور دراز کے سفر اختیار کیے اور شدید جسمانی تکلیفیں گوارا کی ہیں۔

اب تک شیخ نے تنہا گھر سے باہر قدم نہیں نکالا تھا والدین کی نظر سے اوجھل نہیں ہوئے تھے کہ بغرض تحصیل علم دار الافاضل شیراز کے دیکھنے کا اشتیاق ہو گیا۔ والدین سے اجازت کے خواستگار ہوے۔ الفت پدری، جو خداوند عالم نے ہر ذی روح میں خلقی پیدا کی ہے، کبھی اسکی مقتضی نہیں کہ نور نظر کو، آنکھوں کے سامنے سے، دم بھر کے لیے بھی اوجھل ہونے دے۔ خصوصًا ایسے لائق اور ہونہار بیٹے کو۔ لیکن انکے والد نے جو خود ایک ذی علم و قابل شخص تھے اور اپنے بیٹے کو سپہر علم کا مہرِ تاباں بنانا چاہتے تھے دل پر نہایت جبر گوارا کرکے اجازت دے دی۔

شیخ اجازت پاتے ہی خوشی خوشی اصفہان سے روانہ ہو کر بعد قطع منازل و طے مراحل . . . شیراز میں داخل ہوے، اور شیخ محمد مسیح فسائی سے کہ جو آقا حسین خوانساری کے شاگرد

تھے درس لینے لگے۔

کئی سال تک شیراز میں مقیم رہ کر چند کتابیں شیخ محمد مسیح فسائی سے پڑھیں۔ اور جب تک شیخ محمد مسیح زندہ رہے دوسرے سے درس نہیں لیا۔ بعد وفات شیخ محمد مسیح فسائی کے چند کتابیں مولوی لطف اللہ شیرازی و باقر صوفی سے پڑھیں۔

عرصہ دراز تک شیراز میں مصروفِ تحصیل علم رہنے کے بعد شیراز سے روانہ ہو کر محال بنفیائے فارس آئے۔ اگرچہ یہاں بجز چند قریہ معمورہ کے شہریت بالکل نہیں رہ گئی تھی مگر اس مقام کو خوبی آب و ہوا سے ممتاز، مکانات و شکارگاہ سے دلچسپ پایا۔ چند روز وہاں قیام کیا اور وہاں کے علما و فضلا کی صحبت سے فیض حاصل کیا۔

محال بنفیائے فارس سے روانہ ہو کر اردکان فارس گئے۔ وہاں عبدالکریم اردکانی سے کہ عابد و عالم تھے علم نجوم میں کامل دستگاہ رکھتے تھے، چندے صحبت رہی۔ وہاں سے پھر شیراز واپس آئے۔ چند روز شیراز میں قیام کر کے شہر فسا ہوتے ہوئے شہر گازرون کی طرف روانہ ہوئے۔ شہر گازرون میں بہ تحقیق معلوم ہوا کہ عارفِ ربانی شیخ سلام اللہ سولستانی جنکا سلسلۂ مشائخ حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ سے ملتا ہے، دنیا سے کنارہ کش ہو کر پہاڑ میں گوشہ نشیں ہیں، اُنکی خدمت میں حاضر ہونے کی غرض سے ایک گانوں میں ٹھہر گئے وہاں کے رہنے والوں سے معلوم ہوا کہ یہ بزرگ کسی کو اپنے پاس نہیں آنے دیتے۔ مگر شیخ کو اُن سے اعتقاد خاص تھا۔ تقدیر راہبر ہوئی، حضوری حاصل ہو گئی۔ چند روز حاضر باشی کے بعد شیخ نے یہ تمنا ظاہر کی کہ بقیہ زندگی اسی مقام پر بسر کروں مگر اُنھوں نے اجازت نہ دی۔ اور رخصت کیا۔ شیخ کا قول ہے کہ اس وقت تک مجھے جسقدر توفیقِ سعادت و خیر میسر ہوئی ہے اُنھیں بزرگ کی برکت اور نظرِ اشفاق کا نتیجہ ہے۔

شہر گازرون سے روانہ ہو کر شہر سولستان و شہر جہرم و خطۂ لار ہوتے ہوئے بندر عباس آئے اور بقصد مکۂ معظمہ جہاز پر سوار ہوئے۔ خوبیِ قسمت سے جہاز ہی پر بیمار ہو گئے۔ جب جہاز ساحلِ عمان پر پہونچا ابھی جہاز سے اُترنے بھی نہ پائے تھے کہ ڈاکوؤں نے لوٹ لیا۔ اکثر سافر

جنگل میں پڑے رہ گئے۔ شیخ بھی اُسی حالتِ علالت میں پڑے رہے۔ جب صحت ہوئی تو زمانۂ حج گذر چکا تھا۔ وہاں سے واپس ہوکر جزیرہ بحرین آئے۔ یہاں سے ساحل فارس بندۂ معمورہ کنگ میں آکر شیراز چلے آئے۔

اس سفر میں شیخ نے ملک فارس کی اچھی طرح سیر کرلی۔ اب انکے دل میں یہ سمائی کہ دنیا و لذاتِ دنیا کو چھوڑ کر پہاڑوں میں کسی مقام پر جہاں گوشہ ویرانی ہو، گوشہ نشینی اختیار کروں اور خلق خدا سے کنارہ کش ہوکر جو کچھ خدا دے اُسی پر قناعت کروں، لیکن ہکل امر مرہونِ با وقاتہا۔ اس وقت شیخ کا یہ خیال پورا نہ ہوسکا، انکے والد کی تحریر بڑے اصرار کی ملی جسکے دیکھتے ہی شیخ کا دل بیچین ہوگیا فوراً بہ ارادۂ اصفہان شیراز سے روانہ ہوئے۔

اصفہان میں پہونچکر والدین کی قدمبوسی حاصل کی، بھائیوں سے ملے۔ شیخ کے والدین نے چاہا کہ انکی شادی کردیں مگر شیخ نے اپنے اشتغالِ علمی کو مانع سمجھکر انکار کیا اور تجرد و فارغ البالی کو انسب سمجھا۔

سنہ ۱۱۲۷ھ ہجری میں انکے والد شیخ ابیطالب نے دنیا سے رحلت کی اور دو سال کے بعد انکی والدہ نے بھی جنت کا راستہ لیا۔ اب گھر میں بجز ایک ضعیفہ جدۂ مادری اور دو بھائیوں کے کوئی نہ رہ گیا۔ انکے چچا شیخ ابراہیم جو لاہجان میں انتظام جاگیر کرتے تھے وہ پہلے ہی مرچکے تھے۔ شیخ ان صدموں سے بہت مغموم رہا کرتے تھے۔ اور انکے دل میں دنیا کی طرف سے نفرت اور گوشہ نشینی کی رغبت بڑھتی جاتی تھی۔ لیکن جب پسماندگاں کی بیکسی پر غور کرتے تھے تو مجبور ہو جاتے تھے۔

کل جاگیر و علاقہ شیخ کا صوبۂ گیلان میں تھا۔ انکے چچا کے مرجانے اور کسی غمخوار کے منتظم نہ ہونے سے اُنکی آمدنی میں جسپر اُنکے تمام اخراجات کا دارمدار تھا، روز افزوں کمی ہونے لگی۔ یہاں تک کہ اس اطراف میں جہاں جاگیر و علاقہ تھا روس کا قبضہ ہوگیا اور وہ ذریعۂ آمدنی کا قطعی جاتا رہا۔ اس کثرتِ حزن و ملال میں بجز مشغلۂ شعر و سخن کوئی دمساز و دلنواز نہ تھا جو دم بھر بھی انکا غم غلط کرتا۔

چرخ ستمگار اس پر بھی خاموش نہ بیٹھا یعنی شیخ اسی رنج و غم میں مبتلا تھے کہ ایران کے تنزل کا زمانہ شروع ہو چکا تھا۔ افغانیوں نے میرویس خاں قندھاری کو سردار بنا کر ایران پر حملہ کیا۔ میرویس خاں اصفہان پہونچا اور شاہ نواز خاں حاکم اصفہان کو قتل کر کے مالکِ خزانہ بن بیٹھا۔ شاہ حسین صفوی ابن سلیمان صفوی سے جسکی فوج ایک مدت سے آرام طلبی کی عادی ہو رہی تھی تدارک و انسداد قرار واقعی نہ ہو سکا۔ یہاں تک کہ میرویس خاں کا انتقال ہو گیا اسکے بعد اُس کا بیٹا محمود خاں قندھاری اسکا جانشین ہو کر کرمان و یزد میں پہونچا اور قتل و غارت کرتا ہوا اصفہان میں آیا۔ یہاں بھی لوٹ او رغارتگری شروع کر دی۔

اسی لوٹ میں اہل شہر کے ساتھ شیخ کا بھی تمام مال و اسباب و کتب خانہ جسمیں قریب ایک ہزار جلد کتابیں تھیں لُٹ گیا۔ شیخ کے دونوں بھائی و جدۂ مادری کا بھی انتقال ہو چکا تھا۔ شہر کے لوگ ہر گوشے سے نکل کر بھاگ رہے تھے۔ یکم محرم ۱۱۳۵ھ ہجری کو شیخ بھی بتغیر لباس اصفہان سے نکلکر قریب کے ایک گانوُں میں پوشیدہ ہو رہے۔

۱۵ محرم ۱۱۳۵ھ ہجری کو شاہ محمود قندھاری نے شاہ حسین صفوی کو قید کر کے تمام شہر پر اپنا قبضہ کر لیا۔ شیخ یہ خبر سنکر اُس گانوُں سے روانہ ہوے اور خوانسار میں چلے گئے۔ خوانسار سے خرم آباد جو لرستان فیلی کا دارالحکومت تھا پہونچے۔ یہاں علی مرداں حاکم خرم آباد کے ہاں جو شیخ کا شناسا تھا، مقیم ہوے۔ علی مرداں بوجہ علم و فضل کے شیخ کی بہت عزت و احترام کرتا تھا۔

بوجہ صدماتِ متواتر و ہجوم رنج و محن شیخ کے قولے داغی بیکار ہو گئے تھے اور کوئی معلومات صفحۂ خاطر پر نہ رہ گئی تھی۔ ایک سال اسی حالت میں گذری۔ جب صحت ہوئی تو خرم آباد کے معززین و علما سے ملے اور صحبتِ احباب و سیرِ مقامات میں بسر ہونے لگی۔

شاہ طہماسپ ثانی پسر شاہِ حسین صفوی بعد قید پدر بخیال تدارک فاغنہ آذربائیجان میں مقیم تھا کہ آمدِ لشکر روم کی خبر معلوم ہوئی۔ شاہ طہماسپ مع لشکر قزلباش فوجِ روم سے برسرپیکار ہوا۔ روم کی جماعت کثیر ہونے کے اسوا فوجِ روم کو برابر مدد پہونچتی جاتی تھی، اس وجہ سے

شاہ طہماسپ روم کی فوجِ ظفر موج کو روک نہ سکا۔

سپہ سالارِ روم نے خرم آباد پر حملہ کرنا چاہا۔ علی مرداں حاکم خرم آباد نے یہ خبر سنکر چاہا کہ خود شہر کو غارت اور خراب کرکے اور رعایا کو ساتھ لیکر کسی پہاڑ پر چلے جائیں کیونکہ فوج روم کا مقابلہ کرنا اور اسپر فتحیاب ہونا مشکل ہے۔ شیخ نے بنظر ہمدردی یہ رائے دی کہ ایسے شہر رشکِ ارم کو اپنے ہاتھوں خراب کرکے خلق اللہ کو پریشانی میں ڈالنا، بوڑھوں، بچوں اور عورتوں کو سرِ ہلاکت رکھنے سے بہتر یہ ہے کہ تمام لوگ متفق و مستعد ہو جائیں اور دشمن کو روکنے کی کوشش کریں۔ اس رائے کو سب نے پسند کیا اور باہم عہد و پیمان ہونے کے بعد سب نے مسلح ہو کر حصار و قلعہ کو مستحکم کیا رومیوں نے آذربائیجان سے چل کر ہمدان پر حملہ کیا اور بعد جنگ عظیم ایرانیوں سے ہمدان لیلیا اور بہت سے معززو نامی اشخاص کو گرفتار کرلیا۔ ان قیدیوں میں کچھ احباب شیخ کے بھی تھے۔ جبکہ شیخ غیروں کے ساتھ ہمدردی و احسان کرنے کے عادی تھے تو اپنے دوستوں کو قید میں دیکھنا انکی حمیت اور ہمدردی کے کب شایان شان تھا جس وقت شیخ نے اپنے دوستوں کا قید میں جانا سنا بے چین ہو گئے۔ اپنی جگہ پر خاموش نہ بیٹھ سکے۔ ستر آدمیوں کو ہمراہ لیکر روم کے لشکر کی طرف روانہ ہوے۔ لشکر روم میں اکثر معززین کرمان شاہاں بھی تھے اور وہ لوگ شیخ کے کے قدیم شناساؤں میں تھے۔ شیخ نے اُن لوگوں کے ذریعے سے تمام قیدیوں کو رہائی دلوائی اور مقام محفوظ میں پہونچا کر آپ خرم آباد چلے آئے۔

سیستانی حاکم نیمروز جو شاہی نمکخوار تھا، بادشاہ سے منحرف ہو کر قابض ہو گیا اور خود صاحب سکہ و خطبہ ہو کر مشہد میں مقیم تھا۔ بادشاہ طہماسپ میں قوتِ محاربہ باقی نہیں رہ گئی تھی جو ملک محمود کو اُسکی خودسری کی سزا دے سکتا۔ بادشاہ اسی فکر میں تھا کہ ایک جماعت استرآبادی اور چند دیگر گروہ آآ کر لشکر شاہی میں شامل ہوئے۔ جب بادشاہ کی طرف جمعیت کافی ہو گئی تو شاہ طہماسپ اور ملک محمود میں مقابلہ ہوا۔ چند روز تک خونریز جنگ ہوتی رہی بالآخر ملک محمود قید ہوا اور قید میں ہلاک کردیا گیا۔

جو گروہ اس جنگ میں شاہی لشکر کے مددگار اور شاہ طہماسپ کی فتح میں ساعی ہوے

ان میں سے ایک گروہ کا سردار نادر[۱] قلی بیگ بھی تھا۔ آدمی شجاع و بہادر تھا۔ جب شاہ
طہماسپ نے اس جنگ میں اسکی کارگذاریاں دیکھیں تو یہ خیال کر کے کہ شاید اسکی بدولت ایران
کی زوالی حالت میں ترقی کی صورت پیدا ہو، نادر قلی کو خراسان کی فوج کا سپہ سالار مقرر کیا۔
تقدیر راہبر تھی، رفتہ رفتہ موردِ الطاف شاہی ہو کر بہت بڑے مرتبے پر پہونچ گیا۔ یہاں تک
کہ طہماسپ قلی خاں خطاب پایا۔ تمام ملکی انتظامات اُسکے ہاتھ میں دے دیے گئے اور اُس کو
پورا استقلال ہو گیا۔ طہماسپ قلی خاں کی روزافزوں ترقی و سرفرازی دیکھ دیکھکر دوسرے
امرا و اراکین دل ہی دل میں بُرا مانتے تھے۔ طہماسپ قلی خاں بھی اُن امرا و ارباب مناصب
سے صفائی نہ رکھتا تھا، بلکہ اُن لوگوں کو خارِ راہ سمجھتا تھا۔

جب بادشاہ طہماسپ مشہد میں مقیم تھا، شیخ مازندران سے روانہ ہو کر استرآباد ہوتے
ہوئے مشہد آئے اور بادشاہ کے حضور میں حاضر ہوئے۔ بادشاہ نے بخیال اُنکے علم و فضل کے
بہت عزت کی۔ شیخ اراکین سلطنت میں شامل ہو کر بادشاہ کے حضور میں رہنے لگے۔

ماہ صفر ۱۱۴۲ھ ہجری میں اشرف خاں افغان محمود شاہ قندھاری کا چچازاد بھائی فوج
لیکر خراسان کی طرف متوجہ ہوا۔ بادشاہ طہماسپ و طہماسپ قلی خاں معہ دیگر امرا و اراکین فوج
موجودہ مشہد لیکر بقصد مقابلہ روانہ ہوئے۔ بادشاہ نے شیخ کو بھی ہمراہ چلنے کا حکم دیا۔ مجبوراً
منزل اول تک شیخ ہمراہ رہے مگر معذرت کر کے عقب لشکر باطمینان روانہ ہوتے رہے۔ شیخ
کو شہر سبزوار سے تپ آنے لگی۔ امغان میں پہونچکر ٹھہر گئے۔ جب افاقہ ہوا تو شہر سارا مازندران
میں آئے یہاں سے چند روز کے بعد طہران چلے گئے۔

اشرف خاں افغان بعد شکست فارس کی طرف بھاگا۔ طہماسپ قلیخاں مع فوج اُسکے
عقب میں مامور ہوا۔ شیراز میں پہونچکر افغان و طہماسپ قلیخاں میں پھر جنگ ہوئی وہاں بھی
افغان کو شکست ہوئی۔ پندرہ روز کے بعد خطۂ لار میں پہونچا وہاں سے بھی شکست کے بعد

۱؎ نادر قلی، امام قلی گڈریے کا بیٹا تھا۔ ۱۱۰۰ھ ہجری میں پیدا ہوا۔ ابتدا میں بہت غریب شخص تھا۔ ایک عرصہ تک
لٹیروں کے گروہ میں رہ کر لوٹ مار سے گذر اوقات کرتا رہا۔

قندھار اور قندھار سے بلوچستان پہونچا۔ ہر جگہ اسکے ہمراہی کم ہوتے جاتے تھے بلوچستان میں پہونچنے پر صرف دو تین ہمراہی باقی رہ گئے تھے، پسر عبداللہ بلوچ نے اشرف خاں افغان کو قتل کر کے اُسکا سر مع ایک وزنی ہیرے کے جو اُسکے بازو پر تھا طہماسپ شاہ کے پاس بھیجدیا۔

طہماسپ قلی خاں اشرف خاں افغان کو شکست دیکر فارس سے روانہ ہوا۔ عربستان و لرستان فیلی ہوتا ہوا قلمرو علیشکر میں آکر حاکم ہمدان و لشکر روم سے برسرپیکار رہا اور فتح پائی۔ وہاں سے آگے بڑھا آذربائیجان پہونچکر رومیوں سے جنگ کی۔ تبریز کو رومیوں کے قبضہ سے چھوڑا لیا، اور آب ارس کے ایک طرف قبضہ کر کے حکام مقرر کر دیے اور دوسری طرف امرائے روم سے صلح کر لی۔ قلعۂ ہرات خالی پاکر دشمن قابض ہو گئے تھے طہماسپ قلیخاں اُنکی طرف متوجہ ہوا اور قلعہ ہرات پر جا کر قبضہ کیا۔

شیخ طہران سے روانہ ہو کر اصفہان آئے۔ بادشاہ طہماسپ اُس وقت اصفہان میں موجود تھا۔ چھ ماہ تک بادشاہ کے حضور میں رہے۔ اس درمیان میں شیخ نے بادشاہ سے چند مفید باتیں کہیں اور بارہا ایسی رائے دی جو باعثِ بقائے ملک و دولت تھی[1] گر موافق پڑی[1] نواح ہمدان میں کچھ لوگ خودسر ہو گئے اور قلعہ درست کیا تھا۔ بادشاہ طہماسپ اُنکی سرکوبی اور بقیۂ آذربائیجان[2] کو چھڑانے کی غرض سے اصفہان سے روانہ ہوا۔ شیخ کو بھی ہمراہ لینا چاہا مگر شیخ سامان سفر درست نہ رہنے کا عذر پیش کر کے رہ گئے اور وہاں سے شیراز چلے آئے۔ چند روز شیراز رہ کر لار ہوتے ہوئے بندر عباس پہونچے اور انگریزی جہاز پر سوار ہو کر جدہ آئے اور ایک قافلہ کے ساتھ جدہ سے مکہ معظمہ پہونچ گئے۔ ایک مدت کی تمنا

---

[1] اگرچہ وہ مفید باتیں جو شیخ نے کہی تھیں معلوم نہیں ہوئیں کہ کیا تھیں گر صورت حال سے یقین ہوتا ہے کہ ہو نہ ہو وہ باتیں طہماسپ قلی خاں کے خلاف تھیں جس وجہ سے شیخ کی طرف سے بھی طہماسپ قلیخاں مکدر تھا۔ اور اُسکا نتیجہ یہ ہوا کہ شیخ کو عمر بھر کے لیے ایران چھوڑنے پر مجبور ہونا پڑا۔

[2] یہ وہی بقیہ آذربائیجان ہے جسکی نسبت طہماسپ قلیخاں نے سرداران روم سے مصالحانہ صلح کر لی تھی۔

(حج بیت اللہ شریف) پوری ہوئی۔

بادشاہ طہماسپ اصفہان سے روانہ ہوکر نواح ہمدان میں پہونچا۔ وہاں احمد پاشا سردار روم سے جنگ عظیم کے بعد صلح کرلی۔ احمد پادشا بغداد چلا گیا۔

اُدھر[ا] تو بادشاہ کا بہادر سپہ سالار طہماسپ قلیخاں جنگ اور دشمنوں کی سرکوبی میں مصروف تھا اِدھر یہ ضعیف العقل بادشاہ، طہماسپ قلیخاں کے مفتوحہ و مقبوضہ مقامات کھو رہا تھا۔

طہماسپ قلیخاں نے صلح ہمدان کو، جو بادشاہ نے احمد پاشا سے کی تھی نامنظور کردیا اور اسی نقص کی وجہ سے طہماسپ شاہ کو تخت سے اتار کر اُسکے بیٹے عباس کو جو صرف چند ماہ کا تھا بادشاہ نامزد کرلیا۔ پھر آپ بطور نائب سلطان انتظام سلطنت میں مصروف ہوا۔

۱۱۴۵ھ ہجری میں جب شیخ بعد حصول شرف حج بیت اللہ شریف بندر عباس میں واپس آئے تو سنا کہ ایران میں تغیر حکومت ہوگیا ہے، بادشاہ طہماسپ قید کرلیا گیا، طہماسپ قلی خود متصرف ہوگیا۔ یہ خبر سنکر شیخ دو ماہ تک بندر عباس میں مقیم رہے۔ وہاں سے روانہ ہوکر اصفہان آئے مگر اصفہان کو جائے اقامت نہ پایا۔ وہاں سے لار آئے لار آنے پر معلوم ہوا کہ لار کا حاکم سابق گرفتار ہوگیا اور خان معظم[۲] کی طرف سے حاکم جدید مقرر ہوگیا ہے۔

بحکم خان معظم، محمد آغا خاں بلوچ سردار فارس مقرر کیا گیا اُسنے باتفاق رائے حاکم شیراز خطۂ لار کا قصد کیا۔ جب محمد خاں بلوچ کی فوج شہر جہرم میں پہونچی اور عبد الغنی حاکم جہرم سے جو شیخ کا دوست تھا کوئی معاملہ طے نہیں ہوا تو نوبت جنگ کی پہونچی۔

اُدھر تو جہرم میں جنگ ہو رہی تھی، اِدھر لار کے لوگوں میں غضب کی شورش پھیل گئی آخر کار بلوہ ہوگیا اور بلوائیوں نے حاکم لار کو مع چند غلاموں کے قتل کر ڈالا۔ طرفداران خانِ

[ا] ملاحظہ ہو تاریخ ایران مولفہ منشی حسینی مدرس مطبوعہ ۱۹۲۵ء مطبع اُردو اخبار پریس دہلی۔

[۲] طہماسپ شاہ کے تخت سے اُتارے جانے کے بعد طہماسپ قلی خاں کا لقب خان معظم ہوگیا۔

عظم نے اس بلوے کو باشارہ شیخ سمجھا۔ سردار فارس جو شہر جہرم کو محصور کیے ہوئے تھا، س بلوے کی خبر سنتے ہی حاکم شیراز کو مع فوج جہرم کے محاصرہ پر چھوڑ کر خود لشکر گراں کے ساتھ خطۂ لار میں آگیا۔ اور شہر میں قتل عام شروع کردیا۔ شہر والے اپنی جان بچا کر بھاگ رہے تھے اُنھیں کے ساتھ شیخ بھی نکل گئے اور بندر عباس چلے آئے۔

احمد پاشا بعد جنگ ہمدان بغداد کی طرف چلا گیا تھا اور خان معظم نے صلح کو جو بادشاہ نے رومیوں سے کی تھی نامنظور کردیا تھا۔ جب یہ خبر روم میں پہونچی تو روم سے توپال پاشا سپہ سالار روم مع فوج کثیر کے امداد کے لیے بھیجا گیا اور بعد جنگ عظیم کے خان معظم کو شکست ہوئی۔ لیکن خان معظم نے چند روز میں پھر فوج جمع کر کے سنہ ۱۱۴۶ ہجری[1] میں جنگ کی اور فتح پائی۔ توپال پاشا مارا گیا اور بغداد شریف میں مقبرہ حضرت امام ابو حنیفہؒ میں دفن ہوا۔

جب شیخ نے ایران کی یہ حالت دیکھی تو دوسری ولایت چلے جانے کا قصد کرلیا جہاز سندھ کی طرف جا رہا تھا۔ ۱۰ رمضان المبارک سنہ ۱۱۴۶ ہجری کو اُسی جہاز پر سوار ہو کر روانہ ہوئے۔ غرۂ[2] شوال سنہ ۱۱۴۶ ہجری کو جہاز ساحل ٹھٹھہ پر جو سندھ کا صدر مقام ہے پہونچا۔ شیخ کا خیال تھا کہ یہاں کوئی شخص مجھے نہ پہچانے گا مگر اُسی روز ایک گروہِ تجار نے کہ فارس میں

---

[1] تاریخ بنارس مطبوعہ ۱۹۱۶ء میں توپال پاشا کا مارا جانا سنہ ۱۱۴۰ ہجری میں لکھا ہے جو صحیح نہیں معلوم ہوتا کیونکہ سوانح عمری شیخ مطبوعہ مسلم پریس دہلی سنہ ۱۳۱۹ ہجری کے صفحہ ۶۵ سطر ۹ میں سنہ (ست اربعین ومائۃ بعد الالف) تحریر ہے۔

[2] تاریخ بنارس میں شیخ کا حج سے سنہ ۱۱۴۵ ہجری میں بندر عباس واپس آکر تغیر ایران کی خبر سننا۔ اور شیخ کا یہ اوضاع ایران دیکھکر بلاد سندھ کی طرف جانا اور ٹھٹھہ میں غرۂ شوال سنہ ۱۱۴۰ ہجری کو پہونچنا لکھا ہے ملاحظہ ہو تاریخ بنارس صفحہ ۴۰۱ سطر ۵ و صفحہ ۴۰۲ سطر ۲ و ۱۴ لغایت ۱۹۔ اس جگہ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ جب شیخ سنہ ۱۱۴۰ ہجری میں بمقام ٹھٹھہ (سندھ) آگئے اور یہ امر مسلمہ ہے کہ سندھ میں آنے کے بعد پھر شیخ کو ایران جانا میسر نہیں ہوا تو پھر سنہ ۱۱۴۵ ہجری میں حج کے بعد بندر عباس کیونکر پہونچ گئے جو تغیر ایران کی خبر سنی۔

شیخ کو دیکھا تھا، پہچان لیا۔

خان معظم توپال پاشا کو مار کر جب اس مہم سے فتحیاب واپس آیا تو سنا کہ شاہ عباس ننھے لڑکا جو بادشاہ کہلاتا تھا فوت ہو گیا تختِ ایران خالی ہے۔ اسی درمیان میں تقریب نو روز ۱۷۳۶ء تمام امرا و سرداران ایران نے جمع ہو کر خان معظم سے استدعا کی کہ آپ بادشاہت ایران قبول فرمائیے۔ مگر خان معظم نے بظاہر انکار کیا۔ جب امرا و ارا کین نے بمنت و سماجت تمام اصرار کیا۔ اس وقت خان معظم جو مذہب شیعہ ترک کر کے سُنی ہو چکا تھا اس شرط پر بادشاہت قبول کرنے کا وعدہ کیا کہ مذہب امامیہ موقوف کر دیا جائے اور سب لوگ سُنی رہیں تاکہ ایک مذہب ہو جانے سے تمام مسلمانوں میں سلوک اور موافقت پیدا ہو۔ اگرچہ یہ شرط تمام قوم کی مرضی کے موافق نہ تھی اور نادر شاہ کے مرنے کے بعد وہ لوگ پھر شیعہ ہو گئے مگر اس وقت اس انقلاب کا اقرار کیا گیا اور خان معظم ۱۱۴۸ھ ہجری مطابق ۱۷۳۶ء میں لقب نادر شاہ بادشاہِ ایران مقرر ہوا۔

شیخ چند روز ٹھٹھ میں رہے وہاں سے بسواریِ کشتی خدا آباد میں جو سندھ کا ایک قریہ دور ٹھٹھ سے چند روز کی مسافت پر واقع ہے، آئے۔ اور خدا آباد سے بسواری کشتی روانہ ہو کر تین روز کے بعد شہر بھکر میں پہونچے۔ یہ شہر دریائے سندھ کے کنارے پر واقع ہے اور خراسان کے تجار اسی راہ سے ہندوستان میں داخل ہوتے ہیں۔ مگر سفارقت ایران اور نکمی بےسر و سامانی نے جو اِن کو ہر دم بےچین و بیقرار رکھتی تھی یہاں بھی نہ رہنے دیا اور بھکر سے روانہ ہو کر ملتان گئے ملتان بہت لانبا چوڑا شہر نہیں ہے لیکن یہاں کے لوگ متمول زیادہ ہیں۔ یہاں بھی تنہائی و ناکامی سے طبیعت پریشان رہی جی نہ لگا۔ بہزار خرابی چند روز تک ملتان میں مقیم رہ کر اپنے ہوش پریدہ و حواس رمیدہ کو یہ ندا دیتے رہے۔

مطرب سماع برکش و ساقی شراب دہ ایام را انجال و فلک را جواب دہ

زمانۂ قیام ملتان میں بموسم گرما دریائے سندھ میں سیلاب آیا اور تمام صحرا و عمارات و مکانات پر پانی چڑھ گیا آمد و رفت بذریعہ کشتی ہوتی رہی۔ جب سیلاب کم ہوا وبائی بیماریاں پھیل گئیں اور پانچ چھ

۵؎ ملاحظہ ہو تاریخ ایران مطبوعہ ۱۸۴۵ء اردو اخبار پریس دہلی صفحہ ۱۶۰

مہینے تک یہ بلائیں ملتان پر نازل رہیں۔ شیخ بھی تپ میں مبتلا ہو گئے۔ اُسی زمانہ سختی میں شیخ ملتان سے روانہ ہو کر لاہور آئے۔ لاہور دریائے انڈس کے (جو کشمیر سے آکر لاہور سے گذرتا ہوا ملتان جاتا ہے) کنارے پر ہے اور بوجہ دار القیام شاہان مغلیہ کے نہایت خوشنما اور بے نظیر شہر ہے۔ ایک تو علالت دوسرے تکلیفِ مسافت، شیخ لاہور میں پہونچ کر نہایت ناتوان ہو گئے تھے جب صحت ہوئی تو کچھ ایسے وجوہ پیش آئے جنکے باعث شیخ کو لاہور سے روانہ ہونا اور بلا خواہش و قصد دلی آنا پڑا۔ دلی میں ایک سال کے قریب مقیم رہے۔

ایران کی محبت کہیں آرام سے نہ بیٹھنے دیتی تھی، رہ رہ کر نشتر کی طرح دل میں چبھکر تڑپا دیا کرتی تھی۔ کابل و قندھار کی راہ سے خراسان چلے جانے کا عصم ارادہ دل میں ٹھان کر شیخ دلی سے پھر لاہور کی طرف روانہ ہوئے۔

اِدھر تو شیخ خراسان کی تمنا میں دلی سے روانہ ہو رہے تھے اُدھر تقدیر انکی تمنا پر ہنستی تھی۔ کیونکہ ملک ہند کی زمین شیخ کو اپنی گود میں قیامت تک سُلائے رکھنے کے لیے آغوش آرزو کھول چکی تھی۔ الغرض ۱۱۴۹ہجری میں جب شیخ لاہور پہونچے تو یہ خبر سنی کہ نادر شاہ کی فوج بارادۂ تسخیر و واپسی قندھار قندھار میں موجود ہے۔ یہ خبر سنکر شیخ نے اپنی بدنصیبی پر سخت تاسف کیا اور لاہور میں ٹھہر کر منتظر رہے کہ معاملۂ قندھار طے ہو اور راہ میں امن ہو جائے تو خراسان روانہ ہوں، مگر راہ میں امن ہوا کیا وہ شورش جو قندھار میں پھیل رہی تھی سیلاب کی طرح

لے تاریخ بنارس میں لکھا گیا ہے کہ ۱۱۴۵ہجری میں شیخ لاہور سے دلی گئے اور ۱۱۴۶ہجری میں پھر بہ ارادۂ واپسی خراسان دلی سے لاہور آئے تو ۱۱۴۸ میں یہ خبر معلوم ہوئی کہ قندھار میں لشکر قزلباش موجود ہے۔ دوسری جگہ لکھا ہے کہ نادر شاہ نے ۱۱۴۹ میں قندھار کا قصد کیا۔ تیسری جگہ لکھا ہے کہ نادر شاہ قندھار ۱۱۴۹ہجری میں آ گئے۔ ملاحظہ ہو تاریخ بنارس مطبوعہ ۱۹۱۲ء صفحہ ۱ سطر ۱۹ و ۲۰ و صفحہ ۴۰۹ سطر ۱ و ۲ و صفحہ ۴۱۱ سطر ۱۸ و صفحہ ۴۱۲ سطر ۵۔ اس جگہ یہ سمجھ میں نہیں آتا (۱) جب ۱۱۴۵ میں شیخ حج کے بعد بندر عباس پہونچے اور تغیر حکومت ایران کی خبر سنی تو پھر ۱۱۴۵ میں لاہور سے دلی کیونکر آئے (۲) اور جب ۱۱۴۹ میں نادر کی فوج قندھار میں آئی تو شیخ نے ۱۱۴۶ یا ۱۱۴۸ میں لاہور پہونچکر یہ خبر کیونکر سن لی کہ قندھار میں نادر شاہ کا لشکر موجود ہے۔

پنجاب کی طرف بڑھنے لگی۔ یہاں تک کہ تھوڑے ہی دنوں میں اُس بڑھتے ہوے سیلاب نے
تمام پنجاب کو گھیر لیا۔ علی الخصوص لاہور خاص میں آمدِ نادرشاہ سے غضب کی ہلچل مچ گئی۔

جب نادرشاہ اطراف لاہور میں پہونچ گیا تو شیخ بخوفِ نادر لاہور سے روانہ ہوکر پھر دلی
آئے اور دو تین خدمتگاروں کو لیکر گوشہ نشینی اختیار کی۔

۱۱۵۱ھ ہجری میں نادرشاہ دلی میں آیا اور محمد شاہ بادشاہ دہلی سے سخت جنگ ہوئی۔ بالآخر
نظام الملک آصفجاہ کی کوشش سے صلح ہوئی اور نادرشاہ مع فوج بتاریخ ۸ ذیحجہ ۱۱۵۱ھ ہجری مطابق
۸ مارچ ۱۷۳۹ء شہر میں آکر قلعہ شاہجہان آباد میں اُترا اور محمد شاہ کا مہمان ہوا۔ دوسرے
تیسرے روز جب بھنگیڑ خانے والوں نے یہ مشہور کر دیا کہ نادر مارا گیا؛ تو ۱۱ ذیحجہ ۱۱۵۱ھ ہجری
کو نادرشاہ نے دہلی میں قتل عام کا حکم دیا۔ اور ۱۶ محرم ۱۱۵۲ھ ہجری مطابق ۱۴ اپریل ۱۷۳۹ء
کو نادرشاہ ایران کی طرف واپس روانہ ہوا۔

مفصل حال نادرشاہ کے دہلی آنے کا یہ ہے کہ نادرشاہ نے جب افغانوں کو قندھار سے
نکالا تو تمام افغان کوہستانی کابل میں پھیل گئے اُس وقت کابل میں سلطنتِ ہند کی طرف سے
صوبہ دار رہتا تھا۔ اسلیے نادرشاہ نے محمد شاہ بادشاہ دہلی کے پاس ایلچی بھیجا کہ آپ بھی اپنے صوبہ
کے نام افغانوں کے نکال دینے کے لیے حکم بھیجدیں جس میں دونوں جانب سے دباکر افغانوں
کو قرار واقعی گوشمالی دی جائے۔

وہ ایلچی نادرشاہ کا راستے ہی میں مار ڈالا گیا۔ یہاں اُن دنوں عیش و عشرت کا کچھ ایسا
غل بلند ہو رہا تھا کہ ایلچی کے قتل کی خبر کسی کے کان تک نہ پہونچی۔ چند روز کے بعد نادرشاہ نے
پھر خط لکھا مگر اُسکا بھی جواب ندارد۔ آخر کو نادرشاہ نے خود ہندوستان کا قصد کیا۔ یہاں
کانوں میں ایسی غفلت کی روئی بھری ہوئی تھی کہ بجز ناچ گانے کے کسی دوسری خبر کی آواز
ہی نہیں سنائی دیتی تھی۔ کابل و لاہور کے حاکموں کی جو عرضیاں آتی تھیں وہ بھی بغیر ملاحظہ
پڑی رہتی تھیں۔ بادشاہ کو انکے ملاحظہ کی بھی فرصت نہ ملتی تھی۔ یہاں تک کہ نادرشاہ نے
کابل کو گھیر لیا۔ کابل کے حاکم نے نہایت اضطراب کے ساتھ عرضی لکھی۔ جسوقت وہ خریطہ محمد شاہ
بادشاہ کے حضور میں پیش ہوا بادشاہ مہتاب باغ میں ناچ دیکھ رہا تھا، سُرور بھی بڑھا ہوا تھا

بادشاہ نے عرضی لیکر اُسکا گوشہ شراب میں ڈبویا اور کہا،

این دفترِ بے معنی غرقِ مے ناب اولیٰ

امیرالامرا نظام الملک آصفجاہ کی دانائی و تجربہ کاری کو اہل دربار مانے ہوئے تھے اسلیے نادرشاہ کی آمد کی خبر سنکر آصفجاہ کو بلوایا۔ اودھر نادرشاہ نے کابل فتح کرکے پھر محمد شاہ کو خط لکھا۔ یہاں دربار میں یہ اُلجھن پڑی تھی کہ کئی خط اور کئی ایلچی آچکے اودھر سے جواب نہیں گیا۔ اب جواب کیا لکھا جائے۔ اور لکھا بھی جائے تو اس میں القاب کیا لکھا جائے! کیونکہ نادرشاہ کوئی خاندانی بادشاہ نہیں ہے۔ اتنے میں خبر آئی کہ نادرشاہ کا لشکر دریاے اٹک اتر آیا۔ یہ خبر سُنکر اب یہاں بھی کوچ کی تیاری ہونے لگی۔ خان دوراں مقابلے کے لیے مع فوج روانہ کیا گیا۔ برہان الملک کی طلبی کے لیے اودھ آدمی بھیجا گیا۔

خان دوراں فوجِ شاہی لیکر دلی روانہ ہوا مگر اس سستی و آہستگی کے ساتھ روانہ ہوا کہ دو مہینے میں دلی سے کرنال تک جو چالیس کوس کے فاصلے پر ہے پہونچا۔ شاہی فوج براتیوں کی طرح نہر کے کنارے پڑی تھی اور برہان الملک کا انتظار ہو رہا تھا۔ جبدن اودھ سے برہان الملک آکر لشکرِ شاہی میں شامل ہوا اتفاق سے اُسی دن نادرشاہ بھی قریب آگیا مگر یہاں کسی کو خبر نہ ہوئی۔

چند گھسیارے زخمی و بد حواس دوڑے ہوے آئے کہ ہم جنگل میں گھانس کھودنے گئے تھے، نادری قراولوں نے کئی آدمیوں کو گرفتار کرلیا، ہم لوگ بھاگ کر یہاں تک پہونچے۔ اِدھر یہ تذکرہ ہی تھا کہ چند قزلباش برہان الملک کے ڈیرے پر ہاتھ مار گئے۔ یہ خبر سنکر برہان الملک فوراً اُٹھ کھڑا ہوا اور فوج لیکر لڑنے کو روانہ ہوگیا۔ خان دوراں کو جو یہ خبر ملی تو وہ بھی اپنی فوج لیکر برہان الملک کی فوج سے آملا۔ اُدھر سے نادرشاہ بھی اُٹھ کھڑا ہوا اور اپنی ولایتی فوج کو تین طرف سے حملے کا حکم دیا۔ تھوڑی ہی دیر میں ہندوستانی ہیش پر ورد فوجیں پریشان ہوگئیں۔ بہت سے سردار مارے گئے خان دوراں بھی زخمی ہوا۔ خانِ دوراں کے زخمی ہوتے ہی لشکر میں شکست کی ہوا اُڑ گئی۔ اب صرف برہان الملک

اپنے چند رفیقوں کے ساتھ میدان جنگ میں رہ گیا اور جواں مردی سے ہاتھی پر بیٹھا ہوا تیر مارہا تھا کہ ایک ایرانی فوج نے چار طرف سے گھیر لیا۔ ایک سپاہی گھوڑا دوڑا کر ہاتھی کے پاس آیا اور گھوڑے سے اُتر کر رسا تھام کر ہودج میں جا بیٹھا۔ برہان الملک نے بموجب دستور ایران اپنے کو گرفتار سمجھکر کمان ہاتھ سے رکھدی۔ ایرانی سپاہی ہاتھی کو گھیر کر اپنے لشکر میں لے گئے نادر شاہ نے جرم بخشی کر کے عنایت فرمائی۔ اُس وقت برہان الملک نے موقع پاکر مصلحت آمیز گفتگو شروع کی اور نادر شاہ کو اس بات پر رضامند کیا کہ حضور ایک معقول نذرانہ لیکر یہیں سے

واپس تشریف لے جائیں۔ نادر شاہ رضی ہو گیا۔ برہان الملک نے اس حال سے بادشاہ کو اطلاع دی اور آصفجاہ کو رقعہ لکھا کہ تم آکر کا فیصلہ کر لو۔ محمد شاہ نے فوراً آصفجاہ کو روانہ کیا۔ برہان الملک آصفجاہ کو ہمراہ لیکر نادر شاہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور بعد گفتگو یہ طے پایا کہ دو کرور روپیہ لیکر یہیں سے ایران کو مراجعت فرمائی جائے۔ نادر شاہ دو کرور روپیہ لیکر ایران واپس چلے جانے پر رضامند ہو گیا۔ آصف جاہ نے واپس آکر بادشاہ کے حضور میں کل حال بیان کیا۔ دوسرے روز محمد شاہ اور نادر شاہ سے ملاقات کی ٹھیری۔ اِدھر بادشاہ بڑے تزک و احتشام سے روانہ ہوا اُدھر سے نادر شاہ نے اپنے بیٹے کو استقبال کے لیے بھیجا۔ وہ راہ میں آکر ملا اور بادشاہ کے ہمرکاب ہو کر نادر شاہ کے پاس لے گیا نادر شاہ لب فرش تک استقبال کے لیے آیا۔ اور اپنے مسند پر نہایت تعظیم سے بٹھایا۔ آپس میں باتیں شروع ہوئیں۔ چائے کا دَور چلنے لگا۔ تھوڑے عرصے کے بعد بادشاہ نے ہنسی خوشی مراجعت کی۔

خان دوران کے زخمی ہو کر انتقال کرنے کے بعد اس لقب و منصب کو برہان الملک اپنا حق سمجھے ہوئے تھا۔ مگر نظام الملک آصفجاہ کے خطاب و خلعت پانے کا حال سنا تو آتش حسد سے جلکر نادر شاہ سے کہا کہ حضور نے یہ کیا غضب کیا جو ہندوستان کے قارونی خزانے کو چھوڑ کر صرف دو کرور روپے پر رضامند ہو گئے یہ رقم تو فقط غلام ادا کر سکتا ہے۔ شہر دہلی یہاں سے چالیس کوس کے فاصلے پر ہے، حضور وہاں تک تکلیف فرمائیں۔ یہ سنکر نادر شاہ خوش

ہو گیا اور اُسی وقت آصفجاہ کو بلا کر کہا کہ تم ٹھہر جاؤ اور اپنے بادشاہ کو بھی بُلا لو۔ آصفجاہ نے کہا کہ عہدنامے میں تو یہ شرط نہ تھی۔ نادرشاہ نے جواب دیا کہ ملک و سلطنت اور بادشاہ کی عزت و آبرو سے ہمیں کوئی تعرض نہیں ہے فقط ایک مرتبہ ہم اور ملنا چاہتے ہیں۔

امیرالامرا نظام الملک آصفجاہ نے ناچار پھر بادشاہ کو اطلاع دی اور بادشاہ کو مجبوراً پھر نادرشاہ سے ملنا پڑا۔ نادرشاہ نے بادشاہ کو عزت و احترام کے ساتھ الگ خیمہ میں اُتروایا

اودھر تو نادرشاہ نے بادشاہ اور آصفجاہ کو یہاں روک لیا، اُدھر اپنے ایک سردار کو فرمان دیکر شہر میں بھیجدیا۔ اُسنے جاتے ہی قلعہ دار سے کنجیاں لیلیں۔ اور تمام کارخانوں پر قبضہ کرلیا

دوسرے دن نادرشاہ محمدشاہ کو لیکر دہلی آیا اور قلعہ شاہجہان آباد میں اُترا۔

دو تین روز کے بعد ایک نیا شگوفہ کھلا یعنی بھنگیر خانے سے دفعتاً یہ خبر اُڑی کہ محمدشاہ رنگیلے نے نادرشاہ کو مروا ڈالا۔ یہ خبر ہوا کی طرح شہر بھر میں پھیل گئی۔ اس خبر کے مشہور ہونے کے ساتھ ہی بڑا غضب یہ ہوا کہ نادری سپاہی ایک ایک دو دو جو گلی کوچوں میں متفرق پھر رہے تھے لوگوں نے اُنھیں بے وارثہ سمجھکر قتل کرنا شروع کردیا۔ رات کو نادرشاہ کو یہ خبر معلوم ہوئی اُس نے اپنی فوج کو حکم دیا کہ سب اپنی جگہ پر قائم رہیں اگر کوئی چڑھ کر آئے تو جواب دیا جائے ورنہ پیشقدمی نہ کی جائے۔ رات بھر یہی حالت رہی۔ صبح تک کئی سو ایرانی سپاہی کٹ گئے۔ مگر اراکین دربار دہلی چپکے بیٹھے تماشا دیکھا کیے۔ کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ صبح اُٹھکر نادرشاہ نے پوچھا تو وہی حال سُنا۔ دُنیا آنکھوں میں اندھیر ہوگئی۔ اُسی وقت سوار ہو کر شہر دیکھتا ہوا چلا کہ شاید مجھے زندہ دیکھکر اب بھی یہ طوفان تھم جائے۔ مگر طوفان تھمنا کیسا اہل شہر نے اُسپر بھی پتھر برسائے بلکہ بندوقیں چلائیں۔ نادرشاہ نے شہر کے گشت میں یہ بھی دیکھا کہ جابجا ایرانیوں کی لاشیں پڑی ہیں۔ یہ دیکھکر آنکھوں میں خون اُتر آیا اور قتل عام کا حکم دے دیا۔ اور آپ روشن الدولہ کی سنہری مسجد میں تلوار کھینچ کر بیٹھ گیا۔ نادری سپاہیوں نے گلیوں میں خون کے پرنالے بہادیے، گھروں میں آگ لگا دی۔ نادر کا غصہ خدا کا قہر تھا۔ بادشاہ اور تمام امرا بیٹھے یہ حالت دیکھ رہے تھے مگر دم نہ مار سکتے تھے۔

دوپہر کے قریب جب شہر میں کہرام مچ گیا، تعداد مقتولین کی شمار سے باہر ہوگئی تو سب نے آصفجاہ سے رجوع کی۔ آصفجاہ نے گلے میں تلوار ڈالی اور سر برہنہ کیے نادرشاد کے سامنے جاکر کھڑے ہوگئے۔ نادرشاہ نے نظر اٹھائی تو آصفجاہ کو روتا پایا۔ پوچھا کہ چہ می خواہی؟ آصف جاہ نے کہا۔

کسے نماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کشی مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی

نادر نے شرما کر سر جھکا لیا۔ تلوار میان میں کی اور کہا کہ بریش سفیدت بخشیدم۔ اُسی وقت ایرانی نقیب شہر میں امان امان پکارتے ہوئے دوڑے۔ واہ رے نادری حکم جس نے جہاں سے نقیب کی آواز سُنی وہیں تلوار روک لی اور دم بھر میں امن ہوگیا۔ سلطنت کے کاروبار کے ساتھ دونوں بادشاہوں کی صحبتیں پھر بدستور جاری ہوگئیں۔

نادرشاہ کو دہلی میں ارا کین سلطنت کی حاسدانہ کارروائیوں کی بدولت دونوں ہاتھوں سے لوٹنے کا موقع ملا۔ اُس نے اور اُسکے ہمراہیوں نے بےشمار زر و جواہر، زیورات یعنی وہ کل دولت جو بابرشاہ کے وقت سے شاہان مغلیہ جمع کرتے آئے تھے سمیٹی۔ یہاں تک کہ تخت طاؤس بھی جو شاہجہاں نے ساڑھے چھ کروڑ روپے کی لاگت میں تیار کرایا تھا نہ چھوڑا۔ سونے چاندی کے چکی کے پاٹ ڈھلوا ڈھلوا کر اونٹوں پر لدوا دیے۔ غرضکہ دہلی سے اس قدر دولت نادرشاہ کے ہاتھ لگی کہ وہ حیران تھا کہ اسکو کیا کروں۔ چنانچہ کل فوج کو تین ماہ کی تنخواہ پیشگی دیدی اور سال بھر تک فارس کے باشندوں سے کوئی محصول نہیں لیا۔ اور صرف اسی قدر کثیر دولت ہی پر نہیں اکتفا کیا بلکہ محمد شاہ کی بیٹی سے اپنے بیٹے کی شادی بھی کرنے کے بعد ۱۶ محرم ۱۱۵۲ھ کو دہلی سے ایران کی طرف واپس روانہ ہوا۔

جب شیخ نے دہلی میں نادرشاہ کا آنا سنا تو شیخ کو بیحد انتشار پیدا ہوا تا چار علی قلی خاں کے مکان میں چھپکر اپنی جان بچائی۔ اُسی زمانے میں شیخ نے ایک قصیدہ اہل ہند کی مذمت میں لکھا تھا جسکی وجہ سے شعرائے شاہجہان آباد کو شیخ کے ساتھ مخالفت پیدا ہوگئی۔ اس وجہ سے شیخ نے دہلی میں رہنا مناسب نہ سمجھا اور تین سال کئی ماہ تک دہلی میں رہ کر بہ ارادۂ بنگال

دہلی سے روانہ ہو کر بنارس آئے۔ اور بنارس میں چندے قیام کرکے عظیم آباد (پٹنہ) چلے گئے
عظیم آباد میں کئی سال مقیم رہے، وہاں کے علما و رؤسا سے ملے۔ ایک روز شہر کی سیر
کو نکلے تو دیکھا کہ شہر کے اُتر جانب دریائے گنگ اور دکھن جانب ندی جلا واقع ہے۔ شیخ کی
نظر میں ملتان کے سیلاب کی تصویر پھر گئی۔ خیال گذرا کہ کسی وقت اگر دریا اور ندی دونوں جوش زن
ہوئے تو شہر عظیم آباد جو دونوں کے درمیان میں ہے غرقاب ہو جائیگا۔ پس ایسی جگہ رہنا مصلحت نہیں
ہے۔ اسلیے عظیم آباد سے روانہ ہو کر بنارس چلے آئے مگر بنارس آنے پر بھی شیخ کی یہی تمنا رہی کہ
ایران واپس چلا جاؤں۔ لیکن خاک بنارس نے کچھ ایسے مضبوط قدم پکڑے کہ پھر ایران جانا کسی طرح
ممکن و میسر نہ ہوا اور بہت سے موانعات پیش آتے گئے۔ جب شیخ کو کامل یقین ہو گیا کہ خاک ہند
مجھے ایران نہ جانے دیگی میری قبر کی جگہ ہند ہی میں ہے تو شیخ نے ہر طرف سے سیر و سیاحت ترک کرکے
بنارس کو اپنا مسکن دائمی قرار دیا اور راجہ بلونت سنگھ سابق والی بنارس سے زمین لیکر روضۂ فاطمان[۱]
(فاطمہ) بنوا کر رہنے لگے۔ جس مقام پر فاطمان ہے پہلے وہ مقام صحرا میں شمار ہوتا تھا۔ احاطہ و
روضۂ فاطمہ و مسجد و شہ نشین و باغ وغیرہ جملہ عمارتیں متعلقہ فاطمان شیخ کی تولی ہوئی ہیں جو ابتک
موجود ہیں۔ مسجد فاطمان ۱۱۶۰ھ ہجری میں تعمیر ہوئی ہے۔ تاریخ تعمیر مسجد شیخ کی کہی ہوئی یہ ہے۔

جبہ بر خاک نہ دریں مسجد   کز برائے عبادت است اینجا
بہر تاریخ این بنا ہاتف   گفت۔ درگاہ حاجت است اینجا

راجہ بلونت سنگھ سابق والی بنارس کو جو علما و فقرا کو بہت دوست رکھتے تھے شیخ سے
خلوص خاص تھا۔ اسلیے شیخ کی نہایت عزت کرتے تھے اور کبھی کبھی خود شیخ کی قیام گاہ پر جایا
کرتے تھے۔ شیخ بھی راجہ ممدوح سے نہایت محبت سے پیش آتے تھے اور راجہ کی ترقی عمر و دولت
کے لیے دعا گو رہتے تھے۔ راجہ ممدوح اپنے صاحبزادے راجہ چیت سنگھ کو جو اُس وقت
بہت صغیر سن تھے کبھی کبھی شیخ کی خدمت میں بھیجا کرتے تھے۔ شیخ بہت شفقت و محبت سے
پیش آتے تھے اور اپنے چاندی کے کھٹولے پر جس پر کسی کو نہ بیٹھنے دیتے تھے بٹھا لیا کرتے تھے

---

[۱] روضۂ حضرت سیدۃ النسا فاطمۃ الزہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا جو اب فاطمان مشہور ہو گیا ہے۔

اور رخصت کے وقت دعا کے ساتھ کچھ بطور تحفہ از قسم جواہرات و اشرفی وغیرہ کے دیا کرتے تھے
بعد وفات شیخ جب حساب کیا گیا تو قریب چالیس ہزار روپے کی اشیا عطیات شیخ سے نکلیں۔

بنارس کے قیام میں شیخ کے اخراجات معمولی نہ تھے بلکہ مثل امرا و شاہزادگان اخراجات ہوا کرتے تھے۔ فاطمان کی تمام عمارتیں شیخ نے اپنے صرف سے بنوائیں مگر کسی کو آمدنی کا حال معلوم نہ ہو سکا کہ کہاں سے آتی ہے۔ اس جگہ اکثر لوگ مختلف روایتیں بیان کرتے ہیں۔ کچھ لوگ دست غیب خیال کرتے ہیں بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ شیخ کا خدمتگار مسمی رمضانی جن تھا اسی کے ذریعہ شیخ کے تمام اخراجات ہوا کرتے تھے۔

نواب شجاع الدولہ جب بنارس آئے تو بنظر علم و فضل و بخیال عزت ایران شیخ کے قیام گاہ پر گئے۔ دروازے پر پہرہ دیکھکر شیخ سے کہا کہ ع در درویش را درباں نباید۔ شیخ نے ازراہ استغنا فی البدیہہ جواب دیا کہ ع بباید تا سگ دنیا نیاید۔

شیخ کی طبیعت فن شعر گوئی میں ایسے تبحر اور ملکہ پر تھی جسکا اندازہ کرنا بہت مشکل ہے شیخ کے ہندوستان آنے پر بڑے بڑے شعرا اپنے عمدہ عمدہ کلام بخیال اصلاح سناتے تھے مگر شیخ اپنی تہذیب و متانت سے سب کی تعریف کیا کرتے تھے۔ زیادہ اصرار ہونے پر اس طور سے الفاظ کو تبدیل کر دیا کرتے تھے جس سے حسن کلام دوبالا ہو جاتا تھا۔ کسی شاعر نے بظاہر اصلاح کی غرض سے یہ شعر سنایا مگر باطن میں بخیال اظہار کمال اپنے نزدیک چوٹی کا شعر پڑھا تھا۔

خجل از روے حبابم کہ دریں ظرف تنک — آنچہ در کیسۂ خود داشت بدریا بخشید

شیخ نے باعتبار مضمون آفرین تعریف کی جب انکا اصرار ہوا تو صرف دو لفظ بدلکر لطف شعر کو دوبالا کر دیا

خجل از چشم حبابم کہ دریں ظرف تنک — آنچہ در کاسۂ خود داشت بدریا بخشید

خجالت کا تعلق چشم سے ہے نہ کہ رو سے اور کیسہ والے کے دینے سے کاسہ والے کا دینا زیادہ قابل تعریف ہے۔

ایک روز کسی شاعر نے شیخ کے سامنے اپنا یہ شعر پڑھا

سیہ چوری و دست آں نگار نازنیں دیدم — بشاخ صندلی پیچیدہ مار عنبریں دیدم

شیخ نے کہا کہ اس طوالت کی کیا ضرورت ہے اسی قدر کہدینا کافی ہے کہ

سیہ چوڑی بادست آں نگارے
بشاخ صندلی پیچیدہ مارے

سنا جاتا ہے کہ مرزا رفیع الدین سودا کا کلام شیخ کو بہت پسند آیا۔ جب شیخ ایران سے ہندوستان میں آئے تو لوگوں سے پوچھا کہ شعرائے ہند میں اندنوں کوئی صاحبِ کمال بھی ہے؟ لوگوں نے سودا کا نام بتایا۔ سودا نے جب سنا تو خود شیخ سے ملنے اُنکی قیام گاہ پر گئے اطلاع کرائی کہ سودا حاضر ہے شیخ نے جواب دیا کہ سودا کا یہاں کیا کام ہے بازار میں جائیے اور کلوخِ طفلاں کھائیے۔ اُس وقت سودا نے کہلا یا کہ مرزا رفیع الدین متخلص بہ سودا حاضر ہے۔ یہ سُنکر شیخ نے بلوالیا اور کلام سنانے کی فرمائش کی۔ سودا نے کہا کہ میں تو حضور کے کلام کا مشتاق ہو کر آیا ہوں۔ شیخ نے یہ شعر پڑھا

تاثیر توزہ کرد کمانے بہ یکمنے
یک صید نیا سود زمانے بہ زمینے

سودا نے تعریف کر کے فی الجملہ سکوت کیا اور یہ شعر پڑھا

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

اُسوقت تک شیخ اُردو کے محاورہ (تڑپنے) سے ناواقف تھے پوچھا (تڑپے ہے) چہ معنی دارد؟ سودا نے کہا اہل ہند طپیدن راتڑپنا میگویند۔ شیخ نے سودا سے شعر مکرر پڑھوایا۔ دوبارہ سننے پر نہایت محظوظ ہوئے اور سودا سے بغلگیر ہو کر کہا تم نے تو قیامت کردی ایک مرغ قبلہ نما رہگیا تھا تم نے اُسکو بھی نہ چھوڑا۔

شیخ کا خادم رمضانی جو بنارس میں شیخ کے ساتھ تھا اور کہا جاتا ہو کہ جن تھا بظاہر رمضانی خدمتگار بنا رہتا تھا، نہایت ذی علم و قابل شخص تھا شیخ کے کلام موزوں کا جواب اکثر موزوں دیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ شیخ نے کہا "رمضانی کسان نمی آیند" رمضانی نے فوراً جواب دیا حضور، "تا کساں پیش کساں می آیند"۔ ایک روز شیخ حجرے میں بیٹھے وظیفہ پڑھ رہے تھے جب وظیفہ سے فارغ ہوئے رمضانی سے پوچھا کہ "از شب چہ قدر گذشتہ باشد؟" رمضانی نے جواب دیا کہ "زلفش بکمر رسیدہ باشد"۔ الغرض رمضانی اور شیخ میں اس قسم کے سوال جواب اکثر ہوا کرتے تھے ایک روز ایک رئیس کی ملاقات کو آئے۔ شیخ نے اپنے باغ کا لیمو بطور تحفہ رمضانی سے

نگوایا، اور رمضانی کو حکم دیا کہ پوست جدا کر کے لاؤ۔ رمضانی نے لیمو لا کر رئیس سے پوچھا کہ حضور ترش پسند ہے یا شیریں؟ رئیس نے ہنسکر کہا کہ ایک ہی تو لیمو ہے، پھر ترش و شیریں کی تفریق کیسی؟ رمضانی نے جواب دیا کہ آفتاب کی طرف کا حصہ شیریں ہے اور دوسری جانب کا ترش۔ رئیس نے جب دونوں جانب چکھا تو واقعی ایک طرف شیریں اور دوسری جانب ترش تھا۔

شعرا اور رؤسا جو شیخ سے ملنے آتے تھے شیخ ازراہِ استغنا اُنکی تعظیم نہ کرتے تھے۔ کیونکہ شیخ کو کسی سے کچھ طمع نہ تھی۔ ایک چاندی کے کھٹولے پر جو اپنے لیے مخصوص بنا رکھا تھا بیٹھے رہتے تھے اور اُس پر کسی کو بیٹھنے نہ دیتے تھے۔

جس وقت شیخ بنارس میں مقیم تھے۔ بنارس میں ملا عبداللہ معروف بہ ملا محمد عمر متخلص ساؔبق بنارسی اگرچہ مولوی سراج الدین علی خاں آرزو اکبرآبادی بھی موجود تھے ان دونوں صاحبوں میں سلسلہ ارتباط و محبت زیادہ بڑھ گیا تھا۔ ملا محمد عمر روزانہ شیخ کی قیام گاہ پر جایا کرتے تھے اور جو کچھ تصنیف کرتے تھے شیخ کو سنایا کرتے تھے اور شیخ جو کچھ موزوں کیا کرتے تھے وہ ملا کو سنایا کرتے تھے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ ایک ہی طرح میں دونوں صاحب طبع آزمائی فرماتے تھے۔ چنانچہ شیخ و ملا کی ہمطرح غزلیں درج ذیل ہیں

غزل شیخ علی حزیں

اے وائے بر اسیرے کز یاد رفتہ باشد ۔۔۔ در دام ماندہ باشد صیاد رفتہ باشد

آوازہ دسیکہ تنہا با داغ او چو لالہ ۔۔۔ در خوں نشستہ باشد چوں باد رفتہ باشد

خونش بہ تیغ حسرت یارب حلال بادا ۔۔۔ صیدے کہ از کمندت آزاد رفتہ باشد

از آہ و درد تاکے سازم خبر دلت را ۔۔۔ روزے کہ کوہ صبرم بر باد رفتہ باشد

رحمت بر اسیرے کز گردِ دام الفت ۔۔۔ با صد امیدواری ناشاد رفتہ باشد

شادم کہ از رقیباں دامن کشاں گذشتی ۔۔۔ گو مشت خاک ماہم برباد رفتہ باشد

پر سوز از حزیں است امروز کوہ و صحرا
مجنوں گذشتہ باشد فرہاد رفتہ باشد

غزل مُلّا سابق بنارسی

جانش چناں بحسرت ناشاد رفتہ باشد ۔۔۔ کز ہجر بردل او بیداد رفتہ باشد

فرہاد وار رحم است بر بیدلے کہ اورا ۔۔۔ با پاس جان شیریں برباد رفتہ باشد

از خار زار امکاں ہر کس کہ چید داماں ۔۔۔ چوں سرو زیں گلستاں آزاد رفتہ باشد

بر حال زار صیدے رحمت کو بحسرت ۔۔۔ در دام جاں سپارد صیاد رفتہ باشد

اے وائے بر غریبے یک جہاں تمنا ۔۔۔ در وقت جاں سپردن از یاد رفتہ باشد

سابق بسوز آورد ایں مصرع حزینم
مجنوں گذشتہ باشد فرہاد رفتہ باشد

ایک روز شیخ سے کسی نے پوچھا گیپا کرا میگویند؟ اتفاق سے ملا محمد عمرؒ بھی اُسوقت موجود تھے۔ شیخ نے کہا کہ از ملا بپرس۔ ملا نے کہا گیپا پُلاؤ کی ایک قسم ہے اور صرف یہی کہکر نہیں خاموش ہوے بلکہ اسکی مفصل کیفیت مع ترکیب تیاری بیان کردی۔ شیخ نے متعجب ہوکر پوچھا کہ آپ نے کھایا ہے؟ مُلا نے کہا میں نے کھایا تو نہیں ہے مگر اُسکی کیفیت مجھے معلوم ہے۔ شیخ نے کہا کل میں آپ کو گیپا کھلاؤں گا۔ دوسرے دن شیخ نے ملّا کو گیپا کی دعوت دی اور ملّا کے ساتھ بہت لوگوں کو مدعو کیا۔

شیخ کا کلام اُنکے مرنے کے بعد جس قدر دستیاب ہوا وہ "کلیاتِ حزیں" کے نام سے مطبع نامی منشی نولکشور در سنہ ۱۲۹۳ ہجری میں چھپا ہے۔ کلیات میں علاوہ غزلیات کے قصائد و مثنویات و رباعیات وغیرہ بھی ہیں اور کچھ حصہ نثر کا ہے جس میں شیخ نے اپنے اور اپنے اساتذہ کے حالات درج کیے ہیں۔ چند اشعار شیخ کے کلیات مذکور سے انتخاب کرکے ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

باد صبا فسانۂ زلف تو ساز کرد ۔۔۔ پیغام آشنا شب ما را دراز کرد

گردید قسمتم ز ازل عشق شعلہ خو ۔۔۔ ساقی مرا بجرعۂ جانگداز کرد

افزوں شد از بہار خطت شور عاشقاں ۔۔۔ نیرنگ باغ نالۂ مرغاں دراز کرد

گویا لبا لب از مے عجز و نیاز بود　　بیمانہ کہ چشم ترا مست ناز کرد

کنا ئے لب بقصۂ راز نہاں حزیں
نواں حدیثِ شوق بعمر دراز کرد

از شورِ نالہ ام دلِ جاناں خبر نداشت　　آں شاخِ گُل ز مرغِ خوش الحاں خبر نداشت

بیہودہ سینہ بر در و بام قفس زدیم　　صیاد ما ز حالِ اسیراں خبر نداشت

شوریدہ را بزیرِ قدم خار و گل یکیست　　سیل از بلند و پست بیاباں خبر نداشت

ہرگز نمیگرفت کسے را حریفِ خویش　　صبرِ من از تغافلِ جاناں خبر نداشت

در موج خیز فتنہ حزیں آرمیدہ ام
آب گہر ز شورشِ طوفاں خبر نداشت

بر ہر زمیں کہ جلوہ کُنی آسماں کُنی　　می زیبدت کہ ناز بکون و مکاں کُنی

ہر جا کشائی از پے دل زلفِ پرشکن　　مرغانِ سِدرہ را ہمہ بے آشیاں کُنی

مشکیں شود غزالِ نگاہت بیک نظر　　اے کاش جیب بخت مرا سرمہ داں کُنی

اے عندلیب با تو مرا حق صحبت است　　خواہم کہ خاک تربت ام گلفشاں کُنی

گردد طرازِ دامنِ دستِ جنوں حزیں
خونا بہ کہ از رگِ مژگاں رواں کُنی

اکثر کلام شیخ کے دوسرے نسخوں میں ملتے ہیں مگر کلیات میں نہیں طبع ہیں۔ چنانچہ ذیل کی غزل جو شیخ نے اپنے حسب حال لکھی ہے تاریخ بنارس میں درج ہے۔

چشم گشودہ است در فیض نو بہار　　از داغ ریختست دلم طرح لالہ زار

منت خدائے را کہ بعون عنایتش　　منت پذیر نیستم از خلق روزگار

مرہون منتے نیم از فیض بحر و بر　　ممنون قطرۂ نیم از ابر نو بہار

ہمت براں سر است کہ خرگہ برون زند　　از تنگنائے عرصۂ ایں نیلگوں حصار

در کودکی کہ بود دلم مائلِ ہنر　　جوشید ذوقِ شعر ز طبع گہر نثار

ہر مصرعم ز زلفِ رسا دلفریب تر | ہر نقطہ ام بہ شوخیِ خالِ عذارِ یار
حسنِ بلاغت و نمکِ گفتگوے من | شورے فگند در دلِ عشاقِ بیقرار
صوفی بجا نقادہ سرا اُید گفتہ ام | مطرب بہ سازِ بزم زِ شعرم کشیدہ تار
ہر صفحہ را ز سنبل و ریحاں چمن چمن | ہر غولہ زیرِ خامۂ من ریختہ یادگار
معنی بہ حشمتے کہ بود بحرِ پرشکوہ | لفظش بجودتے کہ بود موجِ جوئبار
پیرایۂ قبول و صفاے نفس بھنسم | لطفِ اشارت و نمکِ عاشقی بکار
شرمندۂ منست گہرہاے آبگوں | پروردۂ منست سخنہاے آبدار
گاہے گمر بخاطر آیندگان رسم | ما در گذرگہ و سخن ماست پایدار
اکنوں نماندہ است بدل ذوقِ گفتگو | کوتاہی از من و کرم از آفریدگار

خامش حزیں کہ نامہ بپایاں رساندۂ
وقت است خامہ را فگند دستِ رعشہ دار

شیخ نے بحالتِ قیام بنارس، بنارس و اہلِ بنارس کی شان میں باعتبارِ مذاقِ شاعری فرمایا ہے:

پری رُخانِ بنارس بصد کرشمہ و رنگ | پے پرستشِ مہدیو چوں کنند آہنگ
بہ گنگ غسل کنند و بہ سنگ پا مالند | زہے شرافتِ سنگ و زہے لطافتِ گنگ

ایران سے شیخ کے کسی دوست نے شیخ کو خط لکھا کہ کیا اب بنارس ہی میں رہو گے وطنِ مالوف کو نہ آؤ گے تو شیخ نے اُسکے جواب میں یہ شعر لکھ بھیجا۔

از بنارس نہ روم معبدِ عام است اینجا | ہر برہمن پسرے لچھمن و رام است اینجا

جب شیخ بنارس میں مقیم تھے تو اسی اثنا میں سید غلام حسین خاں ابن سید ہدایت علی خاں طباطبائی مولفِ سیر المتاخرین بنارس میں آئے اور حسبِ سفارش ڈاکٹر فلرٹن صاحب، صاحبِ کلاں کی مصاحبت میں مامور ہوے۔ یہ بھی شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے علم و تقویٰ کی وجہ سے شیخ ان سے بہت خوش رہتے تھے۔ اتفاقاً سید غلام حسین خان کے [illegible] بیمار ہو کر دنیا سے رحلت کر گئے۔ ۲ جمادی الثانی سنہ ۱۱۶۹ ہجری کو جب سید غلام حسین خانے

یہ خبر سُنی اور اپنے وطن حسین آباد مونگیر بغرض انتظام جاگیر جانے کا قصد کیا۔ شیخ نے اُنسے کہا کہ میری عمر کے خاتمہ کا اب بہت تھوڑا زمانہ رہ گیا ہے بہتر ہوتا کہ تم اُس وقت یہاں موجود رہتے۔ مگر سید غلام حسین اشد ضرورت کی وجہ سے نہ رُک سکے اور اپنے وطن چلے گئے۔ وہاں جا کر سند جاگیر جو اِن کے والد سید ہدایت علی کے نام تھی، مہاراجہ شتاب رائے منتظم ریاست مرشد آباد کی سرکار سے اپنے نام تبدیل کرائی اور انتظام جاگیر میں ایک سال تک مصروف رہے بنارس نہ آسکے۔

اِدھر شیخ علی حزیں نے بعمر ۷۷ سال تاریخ ۱۱ جمادی الاول ۱۱۸۰ھ ہجری بمقام فاطمان (بنارس) دُنیائے دوں کو چھوڑ کر سفر آخرت اختیار کیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اور جو قبر پختہ شیخ نے اپنی زندگی میں اپنے لیے بنوا رکھی تھی اُسی میں دفن ہوئے۔ قبر نگی ہے محرم و شبہائے رمضان المبارک میں شیعہ اصحاب جمع ہوتے ہیں اور مجلس عزا ہوتی ہے۔

شیخ کے سنگ قبر پر جو الفاظ لکھے ہیں وہ یہ ہیں۔ لوح قبر پر "یا حسن قد اتاک المسیٔ" کے بعد شیخ کا نام ان لفظوں میں تحریر ہے۔ "العبد الراجی رحمۃ ربہ محمد المدعو بہ علی ابن ابیطالب الجیلانی" ہر دو پہلو میں یہ دو شعر ہیں جو شیخ نے پہلے سے کہکر سنگ قبر پر کندہ کرانے کا حکم دے رکھا تھا۔

زباندانِ محبت بودہ ام دیگر نمیدانم ۔۔۔ ہمیدانم کہ گوش از دوست پیغامے شنید اینجا

حزیں از پائے رہ پیما بسے سرگشتگی دیدم ۔۔۔ سرِ شوریدہ بر بالینِ آسایش رسید اینجا

اور پائین قبر میں یہ شعر ہے :-

روشن شد از وصال تو شبہائے تارِ ما ۔۔۔ صبحِ قیامت است چراغ مزارِ ما

کتاب مفتاح التواریخ میں شیخ کی تاریخ وفات یوں درج ہے :-

تہی گشت ہیہات روئے زمیں ۔۔۔ ز شیخ محمد علی حزیں

ایک قطعہ میر غلام علی آزاد بلگرامی نے بھی لکھا ہے مگر اس میں ایک عدد کم ہوتا ہے۔

علامۂ عصر و شاعرِ خوب ۔۔۔ افسوس کہ از میانہ برخاست

تاریخ وفاتِ او نوشتم ۔۔۔ از فوتِ حزیں حزیں دلِ ماست

تاریخ از مولوی محمد عبدالغفور خاں نسّاخ

پئے سالِ ترحیل و فوتِ حزیں   نوشتم بہ غمِ جاودانِ حزیں

قبرستانِ فاطمان میں شیخ کی قبر کے بعد رفتہ رفتہ مسلمانانِ شہر کی ہزارہا قبریں پختہ و خام اندر احاطۂ فاطمان ہوگئی ہیں اور ہوتی جا رہی ہیں خصوصاً شیعہ اصحاب کی قبریں بہت ہیں۔

الفنٹ صاحب کمشنر بنارس کی بی بی ہندوستانی تھیں وہ بھی یہیں دفن ہیں اور اخراجاتِ مجلس وغیرہ کے لیے کچھ جائداد بھی وقف کی ہے۔ کمشنر صاحب کے حکم سے پھاٹک احاطۂ فاطمان کا تیار ہوا ہے اُس پر یہ اشعار کندہ ہیں:-

صاحب کلاں بہادرِ میدان سروری   افراختہ ایں بنا کہ باوجِ سما رسید

بابِ کرم کشاد کہ تاریخ سالِ او   دروازۂ عظیم زہرسو ندا رسید

ذی مقدرت شیعہ اصحاب صدہا روپیہ دے کر احاطۂ فاطمان کے اندر قبر کی زمین مول لیتے ہیں۔ عشرۂ محرم کے روز مرد و عورتوں کا بہت بڑا مجمع ہوتا ہے اور یہ مجمع صرف احاطۂ فاطمان ہی تک محدود نہیں رہتا بلکہ دُور تک سڑکوں اور گلیوں میں پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ شہر کے زیادہ حصے تعزیوں کے یہیں دفن ہوتے ہیں۔

(الناظر، یکم دسمبر ۱۹۱۷ء)

اختر جوناگڑھی

پروفیسر میرزا حیرت

نام میرزا اسمٰعیل بن میرزا محمد علی، ۱۲۵۲ھ مطابق ۱۸۳۶ء میں دار الخلافہ طہران میں پیدا ہوے۔ عالی نسبی، اور شرافت کے لحاظ سے انکا خاندان ایران میں ہمیشہ عظمت و شوکت میں ممتاز اور امور سلطنت میں پورا دخل رکھتا تھا۔ چنانچہ انکے اجداد امجاد میں سے بعض مناصب عالیہ دیوانی پر منصوب تھے۔ میرزا جعفر جو انکے اجداد بزرگوار میں سے تھے سلطان کریم خاں زند کے عہد سلطنت میں وزارت کے جلیل القدر عہدے پر ممتاز تھے۔ علاوہ ازیں تحصیل و کمالاتِ علوم میں بھی ان کا خاندان مشہور تھا، چنانچہ میرزا عبد الباقی المتخلص بہ طبیب جو اپنے زمانے کے طبیب حاذق اور ملک الشعراء تھے، اور میرزا عبد الوہاب خاں معتمد الدولہ المتخلص بہ نشاط جو وزیر ایران اور شاعری میں بے نظیر تھے، اسی خاندان سے تھے۔

چار سال کی عمر میں سایۂ پدری سر سے اُٹھ گیا۔ صغر سنی ہی میں انکے حرکات و سکنات سے جودت و فطانت مترشح تھی، چھ برس کے سن میں ایک روز انکو ایک تختہ کاغذ کے ساتھ جسکو انھوں نے مشق کے طور پر خوش خط لکھا تھا، سلطان محمد شاہ قاچار کے حضور میں لیگئے، سلطان سرور نے باوجود صغر سنی اس فوق العادۃ زیرکی اور خوشنویسی کو دیکھ کے ایک تھیلی اشرفیوں کی اور ایک مطلا قلمدان عنایت فرمایا۔

بچپن ہی سے وہ تحصیل علوم میں مشغول ہو گئے تھے، اور جس سن میں سب لڑکے اوقات کو کھیل کود، لہو و لعب میں صرف کرتے ہیں اُنھوں نے وقت عزیز نہایت شوق سے مطالعۂ کتب

یں صرف کیا۔ تھوڑی مدت میں انکی وسعتِ معلومات علوم رسمی عربی، فارسی میں بدرجۂ غایت ہوگئی تھی جسکے سبب ارکان دولت و رؤسائے قوم اور علماء انکی بہت عزت کرتے تھے۔

طبیعت چونکہ فطرۃً موزوں واقع ہوئی تھی، نیز نکات شاعری کی شناخت میں مہارت تامہ بہم پہنچائی تھی، تھوڑی ہی مدت میں فن شعر میں وہ مہارت پیدا کرلی، کہ میرزا ابوالحسن جندقی اور مرزا حبیب قاآنی ایسے شاعران نامور (جبکہ انکی عمر اسوقت پندرہ سال کی تھی) انکی دل سے قدر کرتے اور داد دیتے تھے۔

انکی فطانت، اور غیر معمولی شخصیت کا شہرہ گوش زد خاص وعام ہو چکا تھا اس لیے سترہ برس کی عمر میں انکو گیلان کی حکومت تفویض کی گئی لیکن انھوں نے کسبِ کمالات کو جاہ وثروت پر ترجیح دی اور اس سے قطعی انکار کر دیا۔ یہ بات انکی والدۂ ماجدہ اور بعض احباب کو جو ان سے ترقیات دنیوی کی اُمید رکھے ہوئے تھے، ناگوار گزری۔ آخر کار ان باتوں سے نیز علائق دُنیوی سے تنگ آکر جلا وطنی اختیار کی، اور متوکلاً علی اللہ بغیر زادِ راہ کے چل نکلے جس کے بعد مدت العمر پھر سرزمین ایران میں قدم نہ رکھا۔ قم وکاشان سے ہوتے ہوئے اصفہان پہنچے، اور وہاں سے تبریز کی راہ سے روم گئے، جہاں کہیں راہ میں فروکش ہوتے لوگ نہایت اعزاز واکرام سے پیش آتے اور حد درجہ خاطر ومدارات کرتے تھے۔ ارذنۃ الروم میں آٹھ مہینے قیام کیا اور وہاں کسی فرانسیسی عالم سے فرنچ سیکھ لی۔ پھر قسطنطنیہ تشریف لیگئے جہاں تین سال سکونت اختیار کر کے ترکی کی تحصیل کی اور روم کی راستہ سے مصر کی طرف مراجعت کی۔ ایک سال کے بعد حرمین شریفین کا ارادہ کر کے عازم عدن ہوئے اور ارادہ کر لیا کہ اس سفر سے لوٹ کر شہر صنعا میں اقامت پذیر ہوں اور عارفان کرام و شعرائے عظام کی صحبتوں میں بقیۃ العمر صرف کر دیں لیکن قضائے الٰہی سے یہ ارادہ قوت سے عمل میں نہ آسکا چندروز جہاز کے انتظار میں عدن میں ٹھیرے رہے، اتفاقاً ایک روز جبکہ وہ شہر کی فصیل اور خندق اور قلعہ کے استحکام کو غور وفکر سے معائنہ کر رہے تھے داروغۂ قلعہ اس طرح دقیقانہ نگاہ سے دیکھنے پر بدظن ہوگیا اور انکو روسی جاسوس سمجھکر پکڑ لیا اور انگریزی فوج کے ایک دستے کے ساتھ دریا کے راستہ سے شہر بلگام میں جو زیر حکومت بمبئی ہے بھیجدیا۔ کچھ دنوں کی تحقیق وتفتیش کے بعد معلوم

ہو گیا کہ اس شخص کے حق میں سوءِ ظنی بیجا ہے۔ لہٰذا رہا کر دیے گئے، اور پھر خاکِ ہند ایسی دامنگیر ہوئی کہ مدت العمر یہاں سے نہ نکل سکے۔

چند سال اطرافِ دکن، اور صوبجاتِ گجرات و سندھ میں مشغولِ سیر و سیاحت رہے اور اسی اثنا میں انگریزی کی تحصیل شروع کر دی چنانچہ تھوڑے عرصے میں انگریزی کے لغات، اصطلاحات و محاورات پر پوری قدرت حاصل کر لی۔

انھیں دنوں میں گورنمنٹ انگلشیہ کی طرف سے خلیج فارس کے محکمۂ تار برقی کے پیشکار مقرر ہوئے، بعد ازاں دفتر دیوانی میں مترجم فارسی مقرر ہوئے اور چند مدت تک اسی میں بسر کرتے رہے۔ اسی زمانہ میں گورنر بمبئی کے حکم سے انھوں نے سر جان ملکم کی انگریزی تاریخِ ایران کی دونوں جلدوں کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا۔ اس تاریخ کے ترجمہ میں جو سلاست ہے وہ مشکل سے تواریخِ ایران میں پائی جاتی ہے، فصاحت کے علاوہ زبان نہایت پاکیزہ اور شستہ ہے جو اس باکمال ادیبِ اریب کی ہمہ دانی اور جامعیتِ علمی پر دال ہے، یہ کتاب غایتِ شہرت سے تعریف و توصیف کی محتاج نہیں۔ کسی جلیل القدر یورپین نے اس فارسی ترجمہ کو پھر انگریزی کے قالب میں ڈھالا ہے۔

میرزا صاحب موصوف سنہ ۱۸۶۰ء میں بمبئی کے الفنسٹن کالج میں فارسی کے پروفیسر مقرر کیے گئے، اور چھبیس برس کی بقیہ عمر اسی شغل میں صرف کر دی۔ حافظہ اتنا قوی تھا کہ درس دیتے وقت کتبِ منظوم کو حفظ پڑھتے تھے۔ کئی ہزار اشعار منظوماتِ شعرائے متقدمین و متاخرین یاد تھے، خصوصاً نظامی، حافظ، اور سعدی کے اشعار۔ علوم عقلیہ و نقلیہ میں پوری مہارت رکھتے تھے، خصوصاً فلسفۂ الٰہیات میں انکو بڑا دخل تھا، تمام اقوام قدیم و جدید کے عقائد و ادیان کی تاریخ سے واقف تھے اور تعلیمی جلسوں میں علمیہ اور حکمیہ مسائل کے غوامض پر اس تحقیق و تدقیق سے لکچر دیتے تھے کہ انکے حسنِ بیان اور وسعتِ معلومات سے لوگوں کو حیرت ہوتی تھی؛

انکے استحقاق، اور حسنِ ظن پر جو انکے بارے میں حکام گورنمنٹ کو تھا، نظر کرتے ہوئے ممکن تھا کہ وہ جلیل القدر مراتب پر پہنچ جاتے لیکن جیسا کہ سابقاً ذکر کیا جا چکا ہے کہ وہ زخارفِ دنیوی اور علائقِ زندگی سے دل برداشتہ تھے، اور اگرچہ شغلِ تدریس انکے شایانِ شان نہ تھا،

تاہم آخر عمر تک اسی شغل پر قناعت کر کے ان مناصب عالیہ سے جو حکام وقتاً فوقتاً انکو دینے کا ارادہ کرتے، وہ انکار کر دیتے۔ مع ذلک گورنمنٹ سے انکو "فیلو آف دی بمبئی یونیورسٹی" کے علاوہ "شمس العلما"، "جسٹس آف دی پیس" وغیرہ معزز ترین خطابات عطا ہوئے تھے، گو انکا ذاتی شرف اس طرح کے اعزاز سے مستغنی تھا۔

ماہ جون ۱۸۹۰ء میں کالج سے علیحدہ ہو گئے تو گورنمنٹ نے پنشن مقرر کر دی۔ اسکے دو ماہ بعد ایک روز جبکہ وہ اپنے پائین باغ میں ٹہل رہے تھے ناگاہ زمین پر گر پڑے جسکی چوٹ کے صدمے نے انکو بستر بیماری پر ڈال دیا۔ نقاہت بدنی، اور نزاکت کے باعث مرض ترقی کرتا گیا۔ بہتیرا علاج کیا گیا لیکن ع مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ آخر کار باسٹھ سال کی عمر میں بروز سہ شنبہ بست و چہارم جمادی الاول ۱۳۱۶ھ مطابق ۱۱ اکتوبر ۱۸۹۸ء رات کے ۹ بجے وفات پائی۔ اور اس سرائے فانی کو خیرباد کہکر عالم جاودانی کو سدھار گئے۔ اور قبرستان مغولیہ میں جو بمبئی میں غربی جانب واقع ہے، مدفون ہوئے۔ انکی تاریخ وفات قطعہ ذیل سے دریافت ہو سکتی ہے۔

چوں روان پاک حیرت شد رواں ۔۔۔ سوے جنت زیں جہان آب و گل
بہر تاریخ وفاتش ہا تفم، ۔۔۔ گفت اغفرلہ بگواز صدق دل

نہایت درویش طبیعت اور صوفی مشرب آدمی تھے۔ عمر بھر انھوں نے تاہل اختیار نہ کیا ضعیفوں، مسکینوں کی دستگیری کرتے تھے۔ حتی کہ کوئی سائل انکے در سے خالی ہاتھ نہ جاتا۔ اگرچہ خود تن تنہا تھے لیکن دس بارہ نوکر مع اہل و عیال انکے سایۂ مرحمت میں نہایت فراغ بالی سے پرورش پاتے تھے۔ کئی آدمی انکی سفارش سے بڑے بڑے عہدوں پر پہنچ گئے تھے۔ نہایت سلیم النفس اور نازک طبیعت تھے۔ اور صداقت و فروتنی کو انھوں نے ہمیشہ سے اپنا شعار بنا لیا تھا۔

مرتے وقت انھوں نے اپنی تمام جائداد مسلمان لڑکوں کی تعلیم کے لیے وقف کر دی اور انھیں کی وصیت سے بمبئی کی "انجمن اسلام" اس رقم کو ہر سال قریب چھ سو روپے کے

بمبئی کے مسلمان طلاب فنون و علوم کی مدد و معاش میں صرف کرتی ہے۔

فنِ شعر میں جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے انکو پوری قدرت تھی۔ مگر کبھی کبھی تفنن طبع کے طور پر شعر کہتے تھے۔ انکی طبیعت زیادہ تر غزل سرائی کی طرف مائل تھی۔ لیکن اس سے انکا ہرگز یہ مقصد نہ تھا کہ اس میں کوئی نام پیدا کریں بلکہ وہ تو ہمیشہ اسی بات میں کوشاں تھے کہ انکے بعد اُنکا نام و نشان صفحۂ روزگار پر باقی نہ رہے۔ اسی سبب سے جب کبھی شعر کہتے ان منتشر اشعار کو جمع کرنے میں بے اعتنائی سے کام لیتے۔ اور ایک دفعہ اواخرِ زندگی میں انکے تلامذہ اور احباب نے جتنے اشعار جمع کیے تھے، سب کو جمع کر کے آگ کی نذر کر دیا۔ انکے انتقال کے بعد سب کو انکے کلام کے دیکھنے کا شوق پیدا ہوا، چنانچہ بہت جستجو کے بعد انکی بعض غزلیات جو مسٹر فریدون جی ابن منوچہر جی پروفیسر دکن کالج پونا کے پاس تھیں، ہاتھ لگیں۔ جو سنہ ۱۹۰۲ء میں بمبئی میں طبع ہو گئیں، ان میں سے ہم یہاں مرزا صاحب کا نمونۂ کلام درج کرتے ہیں جس سے انکی قادر الکلامی کا کچھ اندازہ ہو سکے۔

ہر جا گذرم ز فرش تا عرش	ہر سو نگرم ز پست و بالا
سر تا سرِ بارگاہِ امکاں	در تا درِ کارگاہِ اشیا
ذراتِ شہود مست و ہشیار	افرادِ وجود زشت و زیبا
ہر یک بہ طلاقتے کہ دارند	گویند کہ لا الٰہ الا

کارِ دیوانہ بہ تدبیرِ خرد بہ نہ شود	زیورِ بخت نہ باشد سرِ بے ساماں را
اے طبیب از سرِ ما بہرِ خدا دست بدار	خوے با درد گرفتم چہ کنم درماں را
بنہایت ہمہ کار است کہ با کوشش و جہد	رتبۂ آدمِ خاکی نہ رسد شیطاں را
چند ازیں غلغلۂ دوزخ و غوغاے بہشت	اے خوش آں کفر کہ دشت بر ایماں را

بُت پرستی خیر تا از خود پرستی خوشتر است	خود پرستی عاقلاں را بُت پرستیدن مرا

صبح شد برخیز ورنہ خواب و برکش آدرا ... از تفِ آہِ بسوز این نیلگون خرگاہ را

* * *

ما ئیم یک استخوان و آں نیز ... یک مفصل و صد شکستگیہا

* * *

فرخندہ سرے آں کہ بپائے تو رسیدہ است ... فرخندہ تر آں دیدہ کہ رویت نگریدہ است
آسودہ درآفاق نہ بینم مگر آں را کہ ... با عشقِ تو پیوستہ و زآفاق بریدہ است
خوش طالع آں سر کہ بہ خاکِ تو نہادست ... خرّا دولتِ پائے کہ بخارِ تو خلیدہ است

* * *

گر می کشد جنایت جانِ من و جنابت ... ور می کشد عنایت دستِ من و عنانت

* * *

ہر جا کہ شبے بود سحر آمدش از پے ... یارب شبِ ما را اگر از پے سحرے نیست
در گلشن ما آئی و نظر کن کہ بہ بینی ... بے بانگ انا الحق ورقے بر شجرے نیست

* * *

خدمتِ جام جہاں بیں کن کہ از جم بگذری ... جم جہاں جوئی نہ کہ دے گر کجا این جام را

* * *

زندۂ جاوید کیست در نظرِ ہوشیار ... آں کہ نہد سر بصدق بر سرِ سودائے یار

* * *

رباعی

زین مشو کہ مرکبِ مردانِ مرد را ... در سنگلاخ بادیہ تنہا بریدہ اند
نا امید ہم مباش کہ رندانِ بادہ نوش ... ناگہ بہ یک خروش بمنزل رسیدہ اند

(الناظر، یکم نومبر ۱۹۱۴ء)

Al-Nazir (Lucknow) 1909-37 : Selection – 3

Tazkirey

Khuda Bakhsh Oriental Public Library

Patna